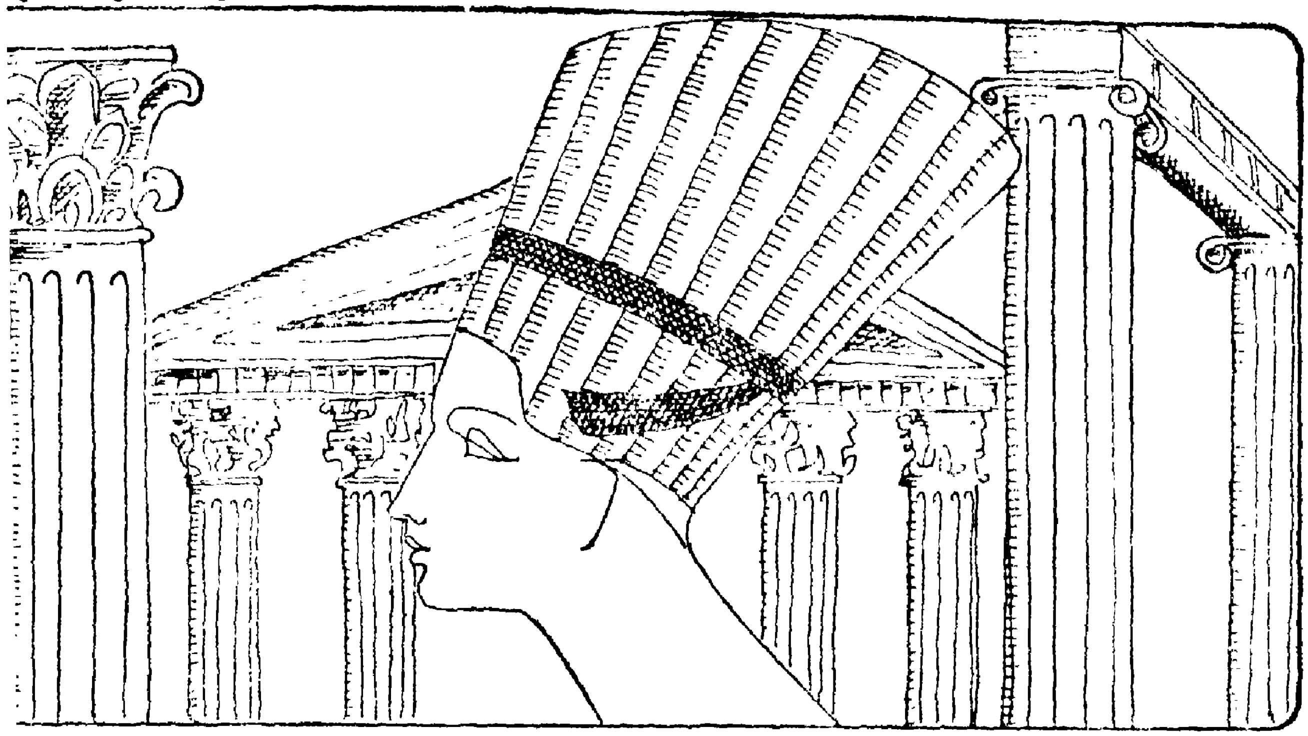


ترقی پسند ادب نمبر

گفتگو

سردار جعفری



'PON MY FAITH, 'TIS NOT ALL THAT'S HOLY THAT IS SAFE!"

ords dating back to 2000 B.C. in Babylon that the people considered temples safest depositories for their wealth. But came a few without scruples who disproved this theory. As the incidence theft grew, the people's trust dwindled. were soon looking for a place less holy more safe to store their wealth. They really looking for a "modern" bank.

urope the idea of an institutionalised bank materialised with the sedentary bankers enice, Genoa and Barcelona. Parallel lopments took place in other countries. ngland the goldsmiths acted as one- banks. Banking in India existed as early 00 B.C. Mainly in the form of money ng, finance for trade, issue of bills of exchange called Hundis and money changing—said to be the most profitable of all. All contributed to the emergence of banking as organised today.

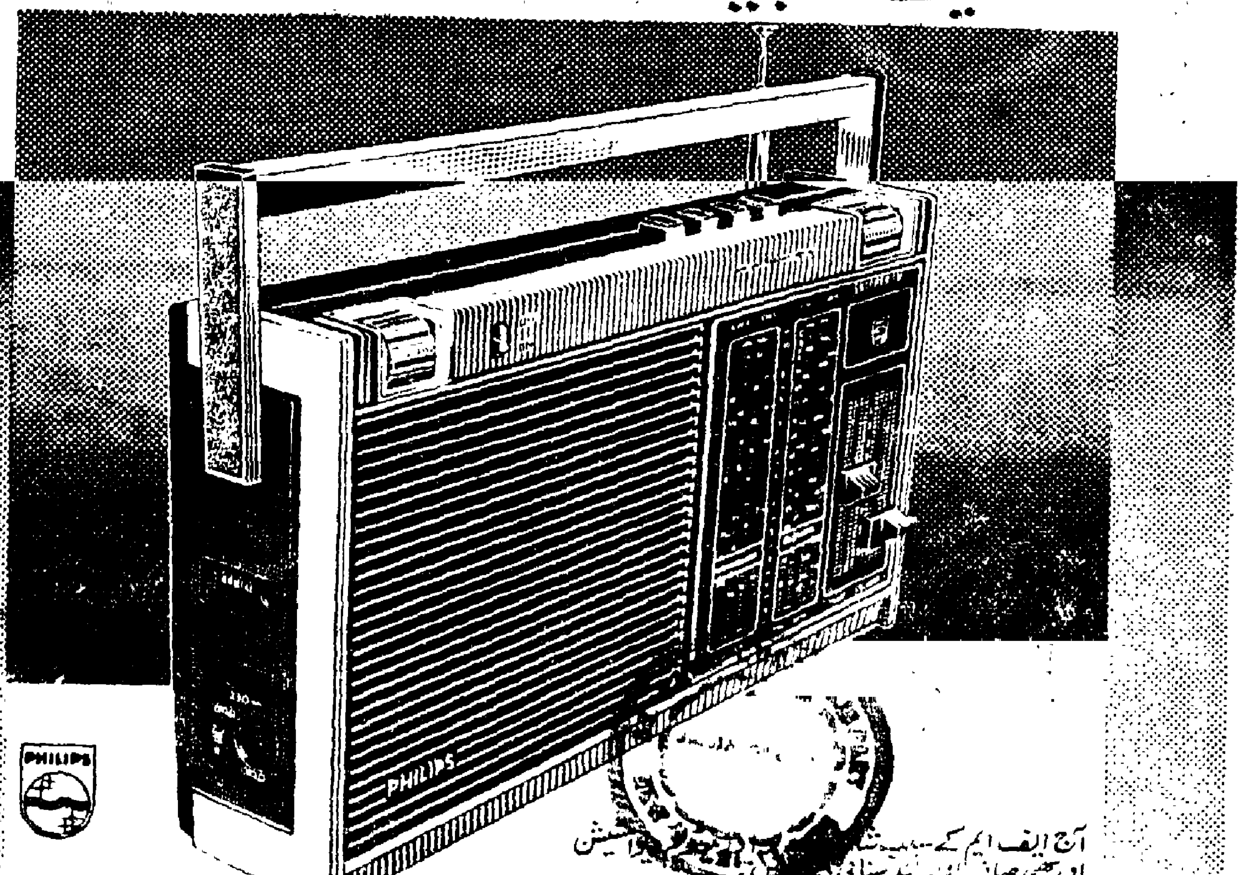
Modern banking systems came to India in the 19th century. Grindlays started operations here in 1854 and grew to be an integral part of India's commercial and financial life, contributing more and more with each passing year. Today we are deeply involved in the country's industrial and social progress.

Grindlays Bank Limited

ASP/R377/58

نیا فلپس سپر ایف ایم

ایک اور بینڈ، وقت سے آگے



آج ایف ایم کے ... اسٹیشن اور بھی صاف اور بلند سنائی دیتے ...

فلپس کے ایف ایم سیٹ کی سرکٹری کا شاندار کام کرتی ہے جس کی وجہ سے شارٹ ویو (SW) اور میڈیم ویو (MW) اسٹیشن بھی ایسے صاف اور بلند سنائی دیتے ہیں کہ آپ نے پہلے کبھی نہ سنا ہوگا۔ ایک ... سینٹی میٹر کے بیضاوی لاؤڈ اسپیکر سے اس کی آواز اور بھی بلند اور سریلی سنائی دیتی ہے۔

مستقبل کی خصوصیات:

* طاقتور آڈیو ایمپلیفائر - آپ کے ٹیپ ریکارڈر / ریکارڈ پلیئر کی خوش آوازی کی بابت کارکردگی میں اضافہ کرتا ہے۔
* آسانی سے ٹیپ ریکارڈ کرنے کا انتظام۔
* سیٹ میں ہی بنی حساس ایریل، ایک ٹیلسکوپک اینٹینا۔

بجلی پر چلنے والا فلپس اسکپٹر ایف ایم ٹرانسمینس بھی ملتا ہے۔ اس میں بجلی بند ہو جانے پر لئے آپ بیٹری پر چلانے والے الیکٹرونک سوئچ اوور کا انتظام ہے۔

کل۔ آپ کا ایف ایم سننے کا لطف اور بھی بڑھ جائے گا۔

ایف ایم آنے والے کل کی آواز ہے۔ ایف ایم کا شاندار کام شروع ہونے میں

اب زیادہ دیر نہیں۔ اب ایف ایم پر شاندار کام شروع ہوگا، بلکہ کچھ کا آپکو صاف اور سریلی آواز کا لطف ٹھیک ویسا ہی آئیگا جیسے کہ آپ کنسرٹ کی بینچ پر بیٹھے ہوں۔

ایف ایم ہے کیا؟

ایف ایم یعنی فریکوینسی ماڈیولیشن، پھیلاؤ میں، خوش آوازی کا پھیلاؤ، آواز بردار کے اندر ہوتا ہے جس سے بیرونی آواز وغیرہ کا اثر نہیں ہوتا۔ موجودہ ایمپلی ٹیوڈ ماڈیولیشن یعنی اے۔ ایم والے پھیلاؤ میں خوش آوازی کا پھیلاؤ آواز بردار کے باہری طرف ہوتا ہے اس لئے شور و غل کا اثر ہو جاتا ہے۔
ایف ایم کی وجہ سے موزوں اور اسٹیریو پھیلاؤ پر آواز موسیقی اور بالکل صاف سننا ممکن ہو گیا ہے۔

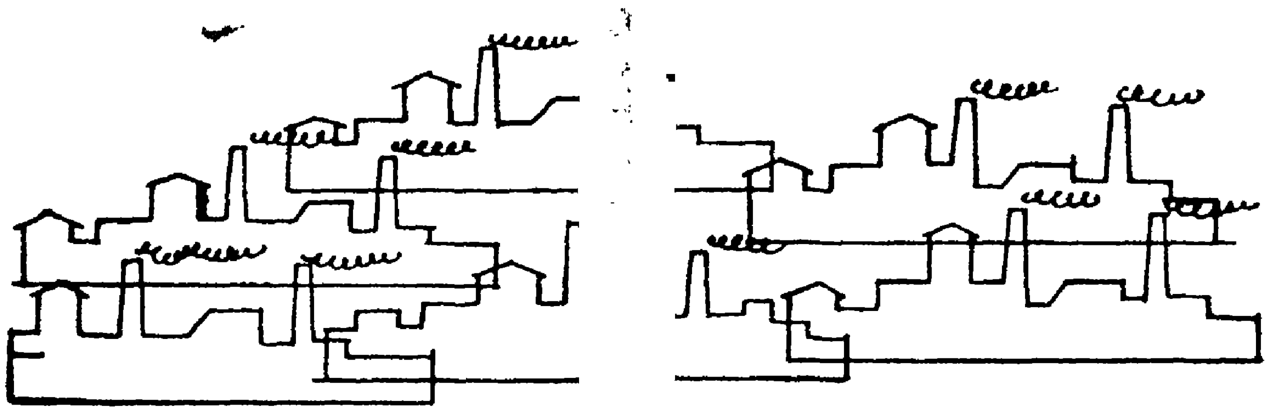
دو طرح کے ماڈل میں سے انتخاب کیجئے:

۱۵ آر ایل ۵۵۷ — ۷۵۰/- روپیے
۱۵ آر ایل ۵۵۸ — ۸۲۵/- روپیے (ٹرانسمینس)

• مینوفیکچر کی انتہائی قیمت ایکسائز ڈیوٹی سمیت، ریاستی سیلز ٹیکس اور دوسرے مقامی ٹیکس علاوہ۔

فلپس

CASPR-659-203-Urd



Principles; not personalities

From Gandhiji to Indira Gandhi and Morarji Desai, no leader has ever received our unqualified support.

Whenever their movements were infiltrated by vested interests, we reported it; right down to exposing the excesses of the caucus during those dark days.

Remember?

Right. Then what is the guiding light by which Blitz charts its apparently shifting editorial stance?

The people, obviously.

On February 1, 1941 we said we would be 'the pulse of the people'; and that principle hasn't changed in thirtyeight years.

That's why the rich and the powerful also read us. They need to keep their fingers on the pulse of the people, and they want the big news first.

Which, somehow, always seems to break in Blitz. Frankly and fearlessly. We are not only the pulse of the people, but their eyes and ears too.

And they love us for it.
Hundreds of thousands of them.

BLITZ

INDIA'S GREATEST WEEKLY

Principles; not personalities

اس مجرم کو اسکا اپنا حق دلانے میں ہم مدد کر رہے ہیں





یعنی ہماری ہی طرح جینے کا حق

جیل خانے میں دس سال تک اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے بعد اور سرکاری معافی ملنے کے باوجود اس کے کنبے قبیلے کے لوگ آج بھی اسکی چھاؤں تک سے کتراتے ہیں۔ لیکن ہم نے آگے بڑھ کر اسے سلائی مشین کیلئے مالی امداد دی جس سے وہ اپنی محنت کی روٹی کما سکے — ایک ایسی حوصلہ افزائی جس کے بل پر وہ جرم اور سزا کے سیاہ دھبے کو دھونے میں کامیاب ہو سکے۔

سماج میں واپس لوٹنے کیلئے بیتاب، سزا کی میعاد پوری کر کے آنیوالے ایسے ہزاروں مجرم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر سماج انہیں ٹھکرا دے تو کیا وہ جرم کی دنیا میں واپس نہیں لوٹ جائیں گے؟

ہم اُن کے لئے کیا کر رہے ہیں

ہم ہر روز ایسے کئی ٹھکرائے جانیوالے مجرموں کو مالی امداد دیتے ہیں — کوئی کاروبار شروع کرنے کیلئے، اپنا گھر بنانے کے لئے، اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کیلئے ... تاکہ وہ سماج میں شامل ہو جائیں، عزت کیساتھ زندگی گذار سکیں۔

بینکنگ میں ایک نئی راہ

اسٹیٹ بینک کا ایک خاص 'سیل' غریبوں کی مدد کیلئے ایسے ہی خاص منصوبے پیش کرتا ہے۔

شہر کی جھونپڑ پٹی والے علاقوں میں بھی بینک اس فلاح و بہبود کے کام میں مدد پہنچاتا ہے۔ اسکول، اسپتال، جیل خانہ، آفت رسیدہ مقامات ہمارے لئے کوئی بھی جگہ ناقابل گذر نہیں۔

کھیت اور کاشتکار

یہی ایک اکیلا بینک ہے جسمیں کاشتکاری کی ترقی کے لئے خاص شاخیں قائم ہیں — کاشتکاری کی روزمرہ ضروریات اور جدید ترین طریقوں کے بارے میں بھی یہ شاخیں آگاہی اور مالی مدد دیتی ہیں۔

خواب کو سچ کر دکھانے والے منصوبے

آپ کے لڑکے کی سمندر پار ملکوں میں تعلیم، ریٹائر ہو جانے کے بعد باآرام زندگی، اپنا گھر، گھریلو باغ باغیچے، نئی نویلی چمچماتی ٹیکسی گاڑی، صاف ستھری آمدنی سے صاف ستھرا کاروبار ...

دنیا کا سب سے بڑا بینکنگ کاروبار

اپنے ... سے زیادہ دفاتر کے ذریعہ اسٹیٹ بینک قومی ترقی کی اسکیموں کو بڑے پیمانہ پر مالی مدد دیتا ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی بینکنگ سطح پر ہندوستان کی زبردست نمائندگی کا فخر بھی اسی بینک کو حاصل ہے۔

ہمارا ایمان ہے ترقی

ہم نہ صرف حجم میں بلکہ ہمہ گیر حیثیت سے بھی بڑھ رہے ہیں۔

اسٹیٹ بینک

آیئے ساتھ بڑھیں

SB.4/04

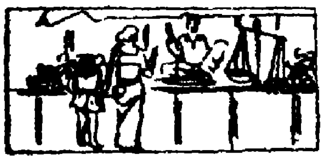
15TH AUGUST 1979
32ND ANNIVERSARY OF INDEPENDENCE



Monopoly Cotton Procurement Scheme – A success.



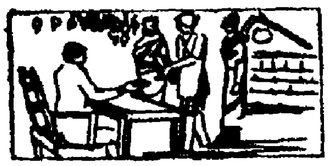
Free legal aid to the poor.



Distribution of essential goods & commodities at fair prices.



Houses for the landless.



Minimum wages to agricultural labour.



Purchase of Adivasi's agricultural produce.



Maharashtra marches on

Issued by,
Directorate General of Information and Public Relations,
Government of Maharashtra Bombay.

ترقی پسند ادب نمبر

گفتگو

(جلد اوّل)

مجلسِ ادارت

مدیر اعلیٰ: علی سردار جعفری

دفتر گفتگو
وڈیرا اپیلی کیشنز، جنرل اشیورنس بلڈنگ (پہلی منزل)
232 دادا بھائی نوروجی اسٹریٹ، بمبئی 400001

شمارہ نمبر ۲۴ - ۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹
دسمبر ۱۹۷۸ء، مارچ ۱۹۷۹ء، جون ۱۹۷۹ء، ستمبر ۱۹۷۹ء، دسمبر ۱۹۷۹ء، مارچ ۱۹۸۰ء

کتابی شکل میں

مدیر : علی سردار جعفری
معاون مدیر : سید احمد شمیم
منیجنگ ایڈیٹر : روشن لال وڈیرا

خوشنویس : ایس ایم منظر
خوشنویس : دیوان چند مونگا
آرائش : فیض مجدّد

قیمت پچاس روپے
بیرون ہند دس ڈالر

تقسیم کار :
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 ، اردو بازار، دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003 ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

طابع، ناشر، مالک اور مدیر علی سردار جعفری نے لبرٹی آرٹ پریس 1528 پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔ نئی دہلی 110002 سے طبع کرا کے 232 ڈاکٹر ڈی این روڈ۔ بمبئی 400001 سے شائع کیا۔

فہرست

پیش گفتار :-

ادبی دستاویزیں :-

میرِ کارواں :-

نقوشِ زنداں

افسانے

ھدیۂ خلوص و محبّت

ترقی پسند ادب اور ادیبوں کے لیے

ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغِ کہکشاں ہے
یہ ہجومِ ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے

سلطان ناتھانی
بمبئی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پیش گفتار



انتساب

آج کے نام اور آج کے غم کے نام
آج کا غم جو ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتّوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض، دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے ہیں
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے
اُن دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں، منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں
اُن حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں میں بیکار کھل کھل کے مرجھا گئے

آن بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے

بیواؤں کے نام
کٹڑیوں اور گلیوں محلّوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جن کی غاروں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو

طالب علموں کے نام
وہ جو اصحابِ طبل و علم کے دروں پر
کتاب اور قلم کا تقاضا لیے
ہاتھ پھیلائے پہنچے
مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھولپن میں وہاں
اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ راتوں کے بے انت سائے

اُن اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں۔

فیض احمد فیض

ہاتھوں کا ترانہ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو، ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

صدیوں سے گزر کر آئے ہیں، یہ نیک اور بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود شکتی کا اوتار ہیں یہ، کب غیر کی شکتی مانتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ہیں زخم ہمارے ہاتھوں کے، یہ پھول جو ہیں گلدانوں میں
سوکھے ہوئے پیاسے چلو تھے، جو جام ہیں اب میخانوں میں
ٹوٹی ہر سو انگڑائیوں کی محرابیں ہیں ایوانوں میں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

خاموش ہیں یہ خاموشی سے سو بربط و چنگ بناتے ہیں
تاروں میں راگ سلاتے ہیں، طبلوں میں بول چھپاتے ہیں
جب ساز میں جنبش ہوتی ہے، تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا، ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں، کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی انسانوں کی تقدیریں ہیں
یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب تحریریں اور تقریریں ہیں
سب حکمت و دانش، علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

سمٹی ہوئی گنگا کی لہریں، بہتے ہوئے بجلی کے دھارے
دھرتی کے مقدر کے مالک، محنت کے افق کے سیارے
یہ چارہ گرانِ دردِ جہاں، صدیوں سے مگر خود بیچارے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ کتنے سبک اور نازک ہیں، یہ کتنے سڈول اور اچھے ہیں
چالاکی میں استاد ہیں یہ اور بھولے پن میں بچے ہیں
اس جھوٹ کی گندی دنیا میں، بس ہاتھ ہمارے سچے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

سردار جعفری

دیباچہ

اپنے استادِ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی محبت، شفقت اور مہربانی کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی درسگاہ میں جتنا علم و ادب مجھے سکھایا اس سے زیادہ علم و ادب کی روشنی اپنی ذاتی صحبتوں میں عطا کی۔ معمولی گفتگو کے دوران اُن کی زبان سے بعض ایسے شگفتہ فقرے ادا ہوتے تھے جن میں ظاہری لطفِ بیان کے ساتھ معنوی بلاغت بھی ہوتی تھی اور یکایک فہم و ادراک کی ایک نئی دنیا روشن ہوجاتی تھی۔ موصوف کا ذوقِ ادب کلاسیکی تھا اور اپنی مخصوص حدوں سے باہر جانے کو تیار نہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ترقی پسند تحریک سے خوش نہیں تھے۔ ایک جگہ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:۔

"اشتراکی عقیدہ یا ادب کی تبلیغ جن لوگوں نے کی اُن میں سے بیشتر ہندوستان کے کچھ ایسے شیدائی نہ تھے۔ نہ اُردو شعر و ادب نہ ان دونوں کے اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات کے۔ وہ بیرونی مصالح اور مقاصد کے ایجنٹ یا آلۂ کار تھے وہ بھی دوسرے اور تیسرے درجے کے۔ ایجنٹ اور آلۂ کار سوا اپنے ملک اور مالک کے کسی اور کا بھلا چاہنے والا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سے بھی مخلص نہیں ہوتا۔ ایسا شخص شعر و ادب کا خیر اندیش اور خدمت گزار کیسے ہوسکتا ہے۔"

(نقش ہائے رنگ رنگ۔ مطبوعہ کاروانِ ادب۔ ملتان صفحہ ۱۲۴)

مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے اپنی اس رائے پر کبھی نظرِ ثانی کی یا نہیں۔ میں نے بھی احتراماً اس مسئلے پر کبھی گفتگو نہیں کی۔ لیکن بہار اردو کانفرنس (پٹنہ ۱۹۵۱ء) کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے ان کے اوپر کے بیان کی تردید خود بخود ہوجاتی ہے:۔

"بذاتِ خود میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد جو کچھ بھی رہا ہو گذشتہ پندرہ سولہ سال میں اردو میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے نئے کامیاب اور مفید تجربے ہوئے ہیں اتنے اردو تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے اور باوجود اس کے کہ ترقی پسند مصنفین میرے کچھ ایسے عاشقِ زار بھی نہیں، میں اس کا قائل ہوں کہ انھوں نے اردو کی بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ یہ بات نہ کبھی پہلے کہنے سے باز رہا نہ اب رہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند مصنفین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک ان نیت کے بہترین مقاصد انسانیت ہی کے بہترین طور طریقوں سے پورے نہ کیے جائیں گے، نہ اعلیٰ انسان وجود میں آئے گا نہ اعلیٰ ادب۔

تقسیمِ ملک کے بعد جو قیامت مچی اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر لینے میں ترقی پسند مصنفین کا قلمی جہاد نہ صرف اردو ادب میں بلکہ اس دیس کی تاریخ میں شکرگزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ اس قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود میں آئیں جن کا اردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔"

(روشنائی۔ سجاد ظہیر۔ پاکستان ایڈیشن صفحہ ۱۳-۱۲ء ماخوذ از ماہنامہ نظام۔ کانپور۔ جولائی ۱۹۵۳ء)

میں اپنے استادِ محترم مرحوم جناب رشید احمد صدیقی صاحب کے اس ارشادِ گرامی کو گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر کے دیباچے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

سردار جعفری

دسمبر ۱۹۷۹ء

تخلیق کی نئی سمت

"انسان مرکزِ کائنات ہے
لیکن اس میں جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں ؟
ہم سب پیار کے بھوکے ہیں اور بھوک میں جلی ہوئی روٹی بھی اچھی لگتی ہے۔"
(گورکی)

اس وقت ادب میں دو آوازیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک آواز کا موضوع تہذیب کا نشاۃ ثانیہ ہے اور اس کا محور اور مرکز انسان ہے جو تاریخ میں پہلی بار عالم گیر پیمانے پر آزادی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ صرف معاشی اور سیاسی آزادی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی آزادی بھی ہے جو انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے۔ دوسری آواز کا موضوع تہذیب کا زوال ہے اور اس میں انسان شکست خوردہ اور حقیر ہے، بے بس اور مجبور ہے، یقین کی روشنی سے محروم ہے اور نجات کے تصور سے بھی بے خبر۔

ان دونوں آوازوں کی نشان دہی شمس الرحمٰن فاروقی نے ان الفاظ میں کی ہے :۔

"داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساسِ جرم، خوفِ تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا (کسی نہ کسی نہج سے) اظہار کرتی ہے جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانکی تہذیب کی سڑی ہوئی مادی خوشحالی ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساسِ بے چارگی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔ پہلے کے ادیبوں نے اپنے خدا تلاش کر لیے تھے۔ شیکسپیر اگر اعلیٰ انسانی اقدار اور عالی ظرفی اور ہیرو ئی توکل کا سہارا ڈھونڈتا ہے تو ٹینی سن مادی خوش حالی اور خداوندانِ ارض وفلک کی بنیادی منصف مزاجی کا، ہارڈی اگر کسی اندھی قوت کے آگے خود کو مجبور پاتا ہے تو یہ بھی امید کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دن یہ قوت شعور وادراک سے بھر جائے گی اور ہر چیز کو حسین بنا دے گی۔ غالب اگر ہونے اور ڈوبنے کا ماتم کرتے ہیں تو کسی نہ کسی لمحے میں انا البحر بھی کہہ اٹھتے ہیں۔ ایلیٹ نے اگر قدیم عیسائیت کی کیفیتِ معصوم (state of grace) ڈھونڈلی تو ییٹس (yeats) نے روحانیت، علم الاسرار اور آئرستانی دیومالا کا سہارا لیا۔ سیسل ڈے لوئس، مخدوم محی الدین اور سردار جعفری نے اگر اشتراکی نظام کے

قیام و استقلال کی امیدیں باندھیں تو بیدی نے پنجاب کے دیہاتوں میں اعلیٰ انسانی اقدار کی تلاش کی۔ نیا شاعر اس طرح کے نشہ آور خوابوں کے سرور، اور خدا، باپ یا قوم پرستی یا خوش اعتقادی کے Father Images کی تحفظاتیت کے سائے سے محروم ہے۔ نئے دور کا المیہ Father Images کی شکست کا المیہ ہے۔ نیا شاعر نہ "ہاتھوں کا ترانہ" کہہ سکتا ہے نہ "طلوعِ اسلام"۔ اس کے پاس نہ اختر الایمان کی یادوں کا سہارا ہے نہ عبدالعزیز خالد کی سطحی علیت زدہ مذہبیت اور دیومالائیت۔ نئے شاعر کے پاس صرف دو چیزیں ہیں۔ اس کی اپنی کچلی ہوئی تڑی مڑی مجروح شخصیت۔ اور اس شخصیت کے زندہ متحرک اور حساس ہونے اور رائے زنی (Com-ment) کرنے کا استحقاق رکھنے کا احساس..... نیا شاعر شاعری کو صرف شاعری سمجھتا ہے۔ فلسفہ، پروگرام، مناظرہ، بحث و تمحیث، نصیحت، وصیت، اشتہار یا اخبار نہیں۔ اگر یہ فن برائے فن ہے تو ہو۔ رجعت پرستی ہے تو ہو۔ لیکن نیا شاعر خود کو ہر طرح سے uncommited سمجھتا ہے۔ وہ نہ میمنہ میں ہے نہ میسرہ میں، نہ سرخ ہے نہ سیاہ، نہ سفید۔"

(کتاب۔ سالنامہ ۱۹۶۷ء)

ترقی پسند ادب پہلی آواز کا ادب ہے اور جدیدیت نے دوسری آواز کے ادب کی تخلیق کی ہے۔ یورپ کے زوال پذیر معاشرتی نظام میں یہ دو آوازیں متقابل آوازیں بن سکتی ہیں لیکن ہندستان، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ان دونوں آوازوں کے درمیان ایک جدلیاتی رشتہ ہے کیوں کہ یہاں تہذیبی زوال اور تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا عمل بیک وقت جاری ہے۔ یہ عمل یورپ میں بھی موجود ہے لیکن وہاں زوال آمادہ اثرات حاوی ہیں۔ اس کے باوجود ایشیا اور افریقہ کا نشاۃ ثانیہ یورپ پر اثر انداز ہوگا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں طلوعِ آفتاب کا افق ایشیا میں ہے جس کا ایک مبارک نام مشرق ہے۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ تہذیبی زوال کو موضوع بنانے والے ادیب جہالت اور مفلسی اور غلامی کو پسند کرتے ہیں یا برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا کرب ایک بیمار کی دل دوز چیخ ہے جو اپنے درد سے نجات پانے کے لیے مضطرب ہے۔ اس طرح یہ ادب آج کے عہد کے ظلم اور استحصال کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی صورت اختیار کر رہا ہے اور یہ احتجاج ہی اس کو بائیں بازو کا ادب بنا دیتا ہے۔ پیشِ نظر انتخاب میں اس کی نمایاں مثالیں انور سجاد کا افسانہ "کونپل" اور سریندر پرکاش کا افسانہ "بجوکا" ہے۔ شعر کی دنیا میں وحید اختر کی آواز اہم ہے۔

پیشِ نظر انتخاب میں اس حقیقت کی صرف ایک جھلک ملے گی کہ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو کیا کچھ دیا ہے۔ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال کے بعد شاعری کو نئے افق بھی اسی تحریک نے عطا کیے ہیں۔ شعر کی دنیا میں یہ تنوع اور وسعت پہلے نہیں تھی۔ اس تحریک نے انسان کا ایک نیا تصور اور زندگی کا بہتر عرفان عطا کیا ہے۔ یہ تحریک ادب کو آسمان کی مابعد الطبیعیاتی بلندیوں سے زمین کی سطح پر اتار لاتی ہے۔ یہ ادب کی پستی نہیں ہے۔ اس کی نئی بلندی ہے (تمام مذہبی صحیفے آسمان سے زمین ہی پر نازل ہوئے ہیں اور ان میں انسانوں کا ذکر ہے) اقبال کے الفاظ میں ؎

گراں نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

ترقی پسند ادب "مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی" سے پاک ہے۔ اسی لیے فراق گورکھپوری نے یہ بات کہی تھی کہ "جس کلچر کو خاکی ہونے سے شرم آتی ہے اسے دنیا نہیں پھلتی"۔ ترقی پسند تحریک ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک ہے جس کا تخلیقی رشتہ ہندوستان کی تمام زبانوں اور

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہے۔ اس کے اثرات صرف ادب تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے زیرِ اثر سینما، تھیٹر اور پینٹنگ نے بھی نئی نئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ ان شعبوں پر الگ الگ ضخیم نمبر نکل سکتے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے یہ انتخاب اتنا مکمل نہیں ہے جتنا ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے کم سے کم دو ہزار صفحات درکار تھے۔ ہماری فہرست میں ایک سو بیس افسانہ نگار تھے اور تقریباً دو سو شاعر۔ سب کے لیے جگہ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں جن کے نام چھوٹ گئے ہیں لیکن ہم ان کو اپنی محفل میں شریک سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند ادب نمبر دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلی جلد آپ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری جلد اسی سال کے اندر منظرِ عام پر آجائے گی۔

میں مجلسِ ادارت کے اراکین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے انتخاب میں مدد دی ہے۔ اس انتخاب میں جو خوبی ہے اس کی داد ان کو ملنی چاہیے اور جو خامی ہے اس کا ذمے دار میں خود ہوں۔

میرا ایک خوش گوار فرض ان احباب کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جن کے تعاون اور امداد کے بغیر ترقی پسند ادب نمبر کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر میرے نہایت عزیز دوست غلام رسول رینزو، جناب اسحاق جم خانہ والا، ہردیو سندھو، سوشیل چکرورتی، جیلانی صاحب، جناب سلطان ناتھانی، جناب کالی داس گپتا رضا، نواب اقبال محمد خاں، اکلیش مِتل اور فاطمہ زکریا ہیں۔

میں خاص طور سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری دیوانگی کو اپنی فرزانگی سے سنبھال لیا اور اتنا خوبصورت شمارہ منظرِ عام پر آسکا۔ آج کی گرانی کے زمانے میں اتنا ضخیم رسالہ نکالنا اور وہ بھی آفسیٹ کے ذریعے سے اچھے کاغذ پر، ایک طرح کی دیوانگی ہی ہے، یہ نفع بخش کاروبار نہیں ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی اچھا اور بڑا کام دیوانگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شاہد صاحب کے ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور برقی آرٹ پریس کے کارکن بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔

سید احمد شمیم گفتگو کے معاون مدیر ہیں پھر بھی ان کی محنت اور جانفشانی کی داد نہ دینا ناسپاسی ہوگی۔ اس خاص نمبر کا سب سے زیادہ کام انھوں نے کیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند ادب نمبر کا استقبال تمام علمی اور ادبی اداروں میں کیا جائے گا اور ممکن ہے کہ کسی اشاعتی ادارے کے دل میں یہ امنگ پیدا ہو کہ ترقی پسند افسانے، ناول، غزل، نظم، تنقید، ڈراما اور رپوتاژ کے الگ الگ مستند انتخابات شائع کرے جو ہمارے عہد کی اہم ادبی دستاویزوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ دنیا کی بڑی زبانیں اپنے ادب کے عہد بہ عہد انتخابات شائع کرتی ہیں اور وہ آنے والے زمانوں اور نسلوں کے کام آتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

میں ترقی پسند ادب نمبر کو ایک تحفے کی طرح اردو ادب کی نئی نسل کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہوں۔ اس منظوم تہنیت کے ساتھ ؎

مجھ سے نظریں چرا کر کہاں جاؤ گے
اے مرے آفتابو
راہ میں رات کی بیکراں جھیل ہے
اور اونچی ہیں لہریں
آسمانِ سخن کے نئے ماہتابو
تیرگی پوچھتی پھر رہی ہے تمھارا پتہ
اور وہ صرف میں جانتا ہوں ۔
درد کی شاہرہ سے گزر کر

آنسوؤں کی ندی کے کنارے
غم کی بستی میں جو نور کا جھونپڑا ہے
اس میں رہتے ہو تم
میری ہی طرح — خانہ خرابو

سازشیں کرگسوں کی طرح اڑ رہی ہیں
ان کے پر تھک کے گر جائیں گے
اور تمھاری بلندی نہ چھو پائیں گے

تم مگر یوں ہی پرواز کرتے رہو گے
اور تمھارے پروں کی چمک
کہکشاں کہکشاں
گیت گاتی رہے گی
اے مرے شعلہ پیکر عقابو

اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا
سچ کہو کیا تمھارے تراشے ہوئے لفظ میں
میری آواز کا شائبہ بھی نہیں ؟
میری آواز جو پہلے غالب کی آواز تھی
اور پھر روحِ اقبال کا زمزمہ بن گئی

آج کے نغمۂ شوق میں ڈھل گئی
صبحِ فردا کی وادی میں جوئے رواں ہے۔

میری آواز پتھر میں شعلہ ہے
شعلے میں شبنم
اور طوفاں میں طوفاں
اور تمھارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے
سچ کہو
آنے والے زمانے کی روشن کتابو
مجھ سے نظریں چرا کر کہاں جاؤ گے !

سردار جعفری

نوٹ : اس خاص نمبر میں جو تصویریں استعمال کی گئی ہیں وہ لیتھوانیا کے انقلابی شاعر "مائی زے لائی تِس" کے مجموعے سے حاصل کی گئی ہیں جس کے لیے میں پروگرس پبلشرز۔ ماسکو کا شکرگزار ہوں۔

رسالہ گفتگو کی ملکیت اور اس سے متعلق دوسری معلومات

فارم IV - دیکھیے رول نمبر 6

۱۔ مقامِ اشاعت : جنرل انشورنس بلڈنگ ۲۳۲۔ ڈاکٹر ڈی۔ این روڈ۔ بمبئی۔
۲۔ وقفہ اشاعت : سال میں ایک بار
۳۔ پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر : علی سردار جعفری
۴۔ قومیت : ہندوستانی
۵۔ رسالہ کے مالک ــــ نام اور پتے :
علی سردار جعفری
۱۰۔ سیتا محل ۔ برمن جی پیٹٹ روڈ۔ بمبئی ۳۶

میں علی سردار جعفری تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
علی سردار جعفری

ادبی دستاویزیں





ترقّی پسند مُصنّفین کا اعلان نامہ

اس وقت ہندستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے ی زندگی کی مدّت بڑھانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پُرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے ب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد مور پرستی میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے، جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور ادب شدید قسم کی ہیئت پرستی رگمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں ائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو واج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک عام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسان ستحصال کی حمایت کرتے ہیں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن و بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اُسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو ہندستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسوم اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیّر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

(انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء میں منظور ہوا۔ صدر منشی پریم چند)

ادب کی غرض و غایت

(ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء کا خطبۂ صدارت)

منشی پریم چند

حضرات! یہ جلسہ ہماری ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سبھاؤں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ اُردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کر لے اس میں خیالات و جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بے تال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔

اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للولال کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔ ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپردِ قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو، اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حیثیتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصّوں یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانہ میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب ان میں ہمارے لیے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرتِ انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے اور اس میں حسن کی تخلیق کر سکتا ہے لیکن اس سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو پھر آپ اسے جس پس منظر میں چاہے رکھ سکتے ہیں۔ چڑے کی حکایت یا گل و بلبل کی داستان بھی اس کے لیے موزوں ثابت ہو سکتی ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دَور سے گزرے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دُنیا بنا کر

ں میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستانِ خیال کی اور کہیں چندرکانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعراء پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار ہوس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لیے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔ یاس اور درد کی کیفیتیں، آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بے شک شعر اور ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرتا ہے لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دُنیا اور دُنیا کی مشکلات سے کنارکشی ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو، ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیش تر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانہ کے لیے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اُردو شاعری۔ دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے اس وقت ادب و شاعری کا جو مذاق تھا اس کے اثر سے بے نیاز رہنا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدردانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لیے اپنا کلام ہی ذریعۂ معاش تھا اور کلام کی قدردانی، رؤسا اور امرا کے علاوہ اور کون کرسکتا۔ ہمارے شعرا کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لیے یا تو موقع ہی نہ تھا یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی، ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے۔ جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ اس دَور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں جب ادب پر دُنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے وہ اب تحریک یا ابہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف ان کے طرزِ خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات، دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لیے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جاکر تخلیقِ ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدتِ احساس ہوتی ہے اتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ زمانۂ قدیم میں مذہب کے ہاتھوں میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوقِ حسن کو جگانے

کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو کوئی ادیب نہیں جس میں یہ احساس نہ ہو ادیب میں یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعہ اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہیے وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے، جو پامال ہیں مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت اس کے احساسِ حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کرکے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے مگر عام وکلا کی طرح وہ اپنے موکل کی جانب سے جا و بے جا دعوئی نہیں پیش کرتا۔ مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ اختراع نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس عدالت کی تالیف جبھی ممکن ہے جب آپ حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائے گی اور آپ کے خلاف فیصلہ سنا دے گی وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ وہ مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوت اظہار بھی ہو وہ فطرتِ انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے وہ نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں کہ جیسے گوشت و پوست کے انسان کرتے ہیں۔ وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے ان نکات پر جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک رو بہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیرکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے کیونکہ تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں ہے۔ ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے ہمیں یہ تحقیق ہونا چاہیے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر ہے یا وہ خود اپنے کیرکٹروں کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لیے ادب کو بعض نقادوں نے مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ہر شخص کی ذہنیت اور زاویہ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اس کا ہم خیال ہو جائے یہی اس کی کامیابی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم ادیب سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی، اپنی وسعتِ خیال سے ہمیں بیدار کرے، ہم میں وسعت پیدا کرے۔ اس کی نگاہ اتنی باریک اتنی گہری اور وسیع ہو کہ ہمیں اس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔

بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے اسی طرح ہم بھی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اسی لیے ہم سادھو اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں، بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔ علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہماری بدمذاقی اور محبت کے جذبہ سے محرومی ہوتی ہے۔

جس میں صحیح ذوقِ حسن ہے، جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کیسے رہ سکتی ہیں۔ محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور محبت کی گرمی اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ ہمارے اندر ایسے جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبۂ حسن سے سرشار نہ ہو اور اس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیوں کر عطا کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں، خوشنوا چڑیاں دیکھی ہیں، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لیے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے۔ سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت

شی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب ٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف ساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے۔ جہاں ان کا فقدان ہے، وہیں افتراق خود پروری اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں، جیسے بیماری غیر فطری زندگی کی، جہاں فطرت سے مناسبت توازن ہے وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشوونما پاتی ہے تو خباثتِ نفس بسراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے مرجاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہوکر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ یاادیب نہ ہوتا۔ وہ آئیڈیلیسٹ ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کی روح بیقرار ی ہے۔ وہ اپنی تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے نظر نہیں آتی۔ اس لیے موجودہ ذہنی اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دُنیا جینے اور مرنے کے لیے بہتر جگہ ہو جائے۔ دردا اور یہی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرمِ کار رکھتا ہے۔ اس کا حساس دل یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت و رسوم کی دمیں پڑکر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کیے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس اہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے مگر یداس تخصیص کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ ترقی کا مفہوم ہر مصنف کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے یس کو دوسری جماعت عین زوال سمجھتی ہے۔ اس لیے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے خیال میں آرٹ صرف بات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات سے فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے، ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورتِ حالات ہے جس سے ہم میں استحکام قوتِ عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں اپنی خستہ حالی کا احساس ہو۔ ہم دیکھیں کہ کن داخلی اور خارجی اسباب کے زیرِ اثر اس جمود و انحطاط کی حالت پہنچ گئے ہیں اور انھیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لیے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ لط ہو جاتے، وہ حسن و عشق کی داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں ہمارے لیے بے معنی ہیں، اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت ں پیدا کرتے۔ اگر ہم نے دو جوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی مگر اس سے ہمارے ذوقِ حسن پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ان کی ہجر کی تکلیفوں پر روئے تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی حرکت پیدا ہوئی۔ ان باتوں سے ہمیں کسی زمانے میں وجد آیا ہو مگر آج کے لیے بے کار ہیں اس جذباتی آرٹ کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔

اب تو حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں ؎

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز
گہے بشاخِ گلم گاہ برلبِ جویم!

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود، پستی، سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ انفرادی

ــــہ مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پھیلی ہوئی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے، کہیں اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ قال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لیے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی ہوتی ہے فطرت سے ہم آہنگی اسی لیے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے۔ فطرت کا قانون نمو اور قا ہے اور جن جذبات، کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے وہ اسی نمو کے معاون ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کرکے اسباب اور وات کو بالیدگی کے لیے سازگار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں، اس کی حیثیت بھی اضافی ہے۔ ایک رئیس کے لیے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے لیے نج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ و شاداب باغیچہ میں بیٹھ کر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک دار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغ دار ہو رہی ہے۔ اخوت اور مساوات ہذیب اور معاشرت کی ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زرّیں خواب رہی ہے۔ پیشوایانِ دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو قیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی یہ بنیاد کھڑی کرنی اہی مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی اور آج اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی وگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشان دماغ کی خلاقی سمجھ کر بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی و تکمیل کے لیے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا۔ اس سے تو ہیں بہتر ہے انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے، جس کے لیے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں، بس کی تکمیل کے لیے مذاہب کا ظہور رہا، انسانی معاشرت کی تاریخ اس آئیڈیل کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ اسے مسلمہ سمجھ کر، ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں نقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے۔ جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔

ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کے پیشِ نظر رکھنا ہے۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا ارٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں، جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لیے اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لیے اس کا "شین" "قاف" درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی دل ہے، اس میں بھی آرزوئیں ہیں، یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا۔

آرٹ نام تھا اور اب بھی ہے محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، اس کے لیے کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں ہے۔ بھگتی اور ویراگ تصور اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخیلات ہیں۔ اس کے لیے یہی معراج زندگی ہے اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کشمکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔ اسے وہ شاید تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لیے حسن حسین عورت میں ہے۔ غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہا رہی ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابروؤں میں فی الواقع حسن کا باس ہے۔ الجھے ہوئے بالوں، پپڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گزر کہاں لیکن یہ اس کی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہِ حسن میں وسعت آ جائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت،

اور خود آرائی اور بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار، اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ ہاں اس میں نفاست
نہیں، نمو نہیں، لطافت نہیں، ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں
کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا، اسے تو
اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا ؎

دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ

یا

چو موج ساز و جودم زسیل بے پرواست
گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم!

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہِ حسن عالم گیر ہو جائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرہ میں آجائے گی۔ وہ کسی
خاص طبقہ تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لیے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے تب ہم بدمذاقی کے
متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر
کی غلامی کریں۔ تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری، اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق
کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کے منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط
اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی
ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ہمیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لیے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندوستان کے ادیبوں کو۔ مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی
کا معزز رکن ہے اور وزراء اور امراء اس سے ملنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں مگر ہندوستان تو ابھی تک قرونِ وسطیٰ کی حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے
جب امراء کی دریوزہ گری کو ذریعۂ حیات بنا لیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر
اس میں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لیے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے جب ادیب کے لیے موزوں طبیعت کے سوا کوئی قید نہیں
رہی یا اسی طرح جیسے مہاتما پن کے لیے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے ان کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے، اسی طرح
ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا لیکن ہم اگر تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے
میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکماء نے بھی ادیبوں کے لیے سخت شرطیں
عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی، جذباتی تہذیب و تربیت کے لیے اصول اور طریقے مقرر کر دیے گئے ہیں مگر آج تو ادیب کے لیے محض ایک
رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس۔ اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لیے ضرورت نہیں۔ وہ سیاسیات، معاشیات یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل
بیگانہ ہو۔ پھر بھی وہ ادیب ہے حالانکہ ادب کے سامنے آج کل جو آئیڈیل رکھا گیا ہے اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں اور اس
کا رجحان داخلیت اور انفرادیت تک محدود نہیں رہا۔ وہ نفسیات اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت
کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے اسے اپنی غرض کا آلہ بنائے گویا جماعت میں اور اس میں ازلی دشمنی
ہے بلکہ اس لیے کہ جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنھیں بہترین تعلیم، اور
بہترین ذہنی قویٰ ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ

عوام کی محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ اسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسے سے اور اونچی
سے اونچی تعلیم پاکر اسے اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے ۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی پسند نہ کرے گا
ـــــ اسی سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدہ کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے وہ ادب کی کسی صنف
میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اسے اس صنف پر خصوصاً اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیے ۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں
پڑھیں تو ہم دیکھیں گے ایسا کوئی علمی معاشی تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو ۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ
علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادیب کے لیے کافی ہے ۔ ہماری ادبی پستی کا باعث
یہی خیال ہے ۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے تاکہ جماعت میں اسے وہ درجہ ملے
جو اس کا حق ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے بحث کر سکے اور ہم دوسری زبانوں اور ادیبوں کے دستر خوان کے جھوٹے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ
کریں بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں ۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور
حاصل کرنا چاہیے ۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ہمارا معیار اونچا رہنا چاہیے اگر ہم پہاڑ کی چوٹی
تک نہ پہنچ سکے تو کمر تک پہنچ ہی جائیں گے ۔ جو سطح زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے
پیش نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں جنھیں دولت اور ثروت پیاری ہے ان کے لیے ادب کے مندر
میں جگہ نہیں ہے یہاں تو ان اُپاسکوں کی ضرورت ہے جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے ۔ جن کے دل میں تڑپ ہو اور محبت کا جوش
ہو اپنی عزت تو اپنے ہاتھ ہے ۔ اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی ۔ پھر اعزاز و
امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں ۔ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے ہمیں جماعت پر
اپنی حقیقت جتانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو ۔ دوسروں سے زیادہ آرام و آسائش سے رہنے کی خواہش ہمیں کیوں ستائے ۔ ہم
اُمرا کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے جو شخص سچا
آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا ۔ اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لیے نمائش کی ضرورت نہیں ۔ اس سے تو اسے نفرت ہوتی ہے ۔
وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے ؎

مردے آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا
می تواں کشت بہ یک جامِ زلالِ دگراں

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو غمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتی ۔
وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں ۔ آئیڈیل کے وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے ۔
حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے جو ادیب اُمرا کا ہے وہ اُمرا کا طرز بیان اختیار کرتا ہے ۔ جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان لکھتا ہے ۔
ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب
کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں ۔ مضامین پڑھے جائیں ۔ مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور
ہوگا ۔ ہم ہر ایک صوبہ میں ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں ۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے
ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موج زن ہیں ۔ ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات نے پہلے
ہی سے کر رکھی ہے ۔ جا بجا اس کے انکھوے بھی نکلنے لگے ہیں ۔ اس کی آبیاری کرنا اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے ۔ ہم ادیبوں میں قوت عمل
کا فقدان ہے ۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے ۔ ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اس کے

لیے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ فقدانِ عمل ہی اس کا جوہر تھا کیوں کہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے اگر کوئی شخص پارسا ہوکر اپنی پارسائی پر غرّا کرے۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہوکر رند ہو رند کی شفاعت کی تو گنجائش ہے پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض وریاں گاگا سلانا، محض آنسو بہاکر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکّر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

ادیب کے فرائض

رابندر ناتھ ٹیگور

تخلیقِ ادب میں تنہائی جتنی مفید ہے اتنی ہی مضر بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تنہائی میں ادیب اپنے نفس سے ہم گوش ہوتا ہے، مطالعے اور مشاہدے کا اصل رمز وہاں ملتا ہے اور دھیان بٹانے کے لیے کسی قسم کا شور و شغب وہاں نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اُس سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتا دینے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اُس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدم ہو جائیں۔ انسان کی رُوح کو صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہو جائیں گے تو رہنمایانِ خلق کو مستقبل کی اصل راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا صور کیا ہے اور زمانہ کس نغمے کو سننے کے لیے بے چین ہے۔ اس وقت انھیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مِل جُل کر انھیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشیں رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں مَیں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے۔ اگر ادب، انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغِ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔

آج، ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام و نشان نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دُکھ کی تصویر بنا ہوا ہے ہمیں اس غم و اندوہ کو مٹانا ہے اور از سرِ نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی رُوح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سُنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرضِ عین ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا، اس وقت تک دُنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تمھیں پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھوں لُٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دُنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے، اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یاد رکھو کہ تخلیقِ ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی کو اتارو۔ کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔

ترقّی پسند مصنّفین

جواہرلال نہرو

علم و ادب پر رائے دینے کا مجھے حق تو نہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مجھ سے بھی کم حق رکھنے والے لوگ رائے دے رہے ہیں تو مجھے بھی جرأت ہوتی ہے کچھ کہنے کی، مجھے دو تین کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے لیکن میرے پاس ان کاموں کے لیے اب وقت نہیں ہے۔ میری طاقت زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوتی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کے لیے لکھتا ہے؟ اور کیوں لکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہر شخص دے سکتا ہے اور دیے گئے ہیں۔ ان کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ زندہ کیوں ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی کا؟ زندگی کا مقصد ایک ہے اور دوسری باتیں اس کی جزو ہیں۔ یا زندگی کی ہر بات کے خانے الگ الگ ہیں؟ لوگ وکیل ہوتے ہیں، ڈاکٹر ہوتے ہیں، پروفیسر ہوتے ہیں، یہ سب الگ الگ ہیں۔ یا کہ زندگی کی تصویر ایک مکمل تصویر ہے اور یہ سب اس کے حصہ ہیں؟ اگر یہ سب تصویر کے جزو ہیں تو پھر ان کو زندگی کی تصویر میں ہونا چاہیے اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو زندگی کی تصویر سے الگ ہو کر ڈھونڈنا چاہیں گے تو ہم بھٹکتے رہیں گے اور کوئی سیدھا راستہ نہ مل سکے گا۔

تم کیوں لکھتے ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزی کمانے کو۔ یہ جواب صحیح ہے اور بہت سے لوگ یہی کہیں گے لیکن یہ جواب کوئی بنیادی جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ جواب یوں دیں گے کہ ہم صرف اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنے کو جی چاہتا ہے وجہ کچھ بھی ہو مگر اسی لیے لکھتے ہیں۔ یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ہم لکھتے ہیں تاکہ لوگوں کی طبیعت بہلائیں۔ طبیعت بہلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو مصیبت میں پھنسا ہو کچھ دیر کے لیے اس کو بہلاوے میں ڈال دیں اس کے دل سے درد دکھ کچھ دیر کے لیے نکال لیں جب پڑھنے والا ایسے ادیب کی چیز کو پڑھتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور کچھ دیر کے لیے اپنی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے۔ گویا ایسے ادب کا دوسرا نام بہلاوا ہے۔ جب ہم موجودہ پریشانیوں سے بہت گھبرا جاتے ہیں تو سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر کے لیے دنیا کو بھول جاتے ہیں اور ہمارا تھکا ماندہ دماغ بہل جاتا ہے۔ ایسا ادب ہوتا ہے لیکن یہ کچھ بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ معقول آدمی کا کام ہے کہ ذرا زیادہ دور تک دیکھے۔ ایسا ادب بہت جلد ختم ہو جاتا ہے جیسے سینما میں ہم تماشہ دیکھتے ہیں۔ اس وقت بہت پسند کرتے ہیں اگر کوئی اس وقت کہانی پوچھے تو بتا بھی دیں گے لیکن دس روز کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں اسی طرح جب تک لکھنے والے کے لیے کوئی بڑی بات، کوئی نئی بات نہ ہو، پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر نہیں کر سکتی دنیا میں بہت سے لکھنے والے گزرے ہیں لیکن ان کی وہی کتابیں باقی رہیں جن میں کوئی بڑا مسئلہ تھا جن میں دنیا کے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب میں پھر اسی سوال کو دہراؤں گا کہ آپ کے سامنے دنیا کی تصویر کیا ہے؟ اگر وہ ایک مکمل تصویر ہے تو وہ کیسی ہے؟ آپ کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ یہ تصویر اگر صاف ہے اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں

اور پڑھنے والے کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں تو ان کی لکھی ہوئی چیز زیادہ اچھی ہوگی۔ انسان کا دماغ موجودہ دنیا سے نکل کر پرواز کرتا ہے اس کے عجیب و غریب خیالات، اس کی عجیب عجیب خواہشیں اس کو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتی ہیں جو آج کل کی دُنیا سے مختلف ہوتی ہے اور جہاں وہ تمام مسئلے حل ہو جاتے ہیں جو اس دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ انسان کا تخیل عجیب چیز ہے وہ اس دماغی دُنیا کو رنگ دے کر ایک مکمل تصویر بنا دیتا ہے اور آدمی بے چین ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ جائے۔

انسان میں سوچنے کی قابلیت تو زیادہ ہے لیکن کرنے کی کم۔ اس لیے بہت سے لکھنے والے دماغی دُنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اسی میں بھُولے رہتے ہیں لیکن ان کو نہ وہاں پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہ وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی دماغی دُنیا ایک خانے میں رہتی ہے اور واقعی دُنیا دوسرے خانہ میں۔

زیادہ ہمت ور لکھنے والے ان دونوں دنیاؤں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دُنیا وہ نہیں ہے جو ان کے دماغ میں ہے یعنی وہ نہیں کر سکتے جو ان کے دماغ میں ہے تو ان کے دل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے؟ اگر پہنچ سکتے ہیں تو اس کا کیا راستہ ہے؟

یہ سوال پہلے زمانہ کے لکھنے والوں کے ذہن میں بھی اُٹھا لیکن ان کو دماغی دنیا تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اس وقت انھوں نے اپنی کتابوں کو خیالی دنیا "یوٹوپیا" (Utopia) بنایا یعنی اگر کرنے کی طاقت ہوتی ہم ایسا ایسا کرتے۔ ایسی ایسی دنیا بساتے ان دنیاؤں کو بسانے کے لیے کبھی الٰہ دین کا چراغ نکالا اور کبھی اُڑن کھٹولا تیار کیا۔ یہ لوگ مجبوراً اصلی دُنیا سے الگ تھلگ رہے اور خیالی دُنیا میں زندگی بسر کرتے رہے۔

لیکن اب دُنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس دماغی دنیا تک پہنچنے کی صورتیں نکال سکتے ہیں مثلاً پہلے کے لکھنے والوں کو نظر آتا تھا کہ غریبی اور امیری کی تفریق ہمیشہ رہنے والی ہے کیونکہ دُنیا میں اتنی دولت ہی نہیں تھی جو اس تفریق کو دُور کرنے کی کوشش کرنے تک ذہن پہنچتا لیکن اب سائنس، صنعت و حرفت اور اسباب نقل و حرکت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں اور ایسی دنیا بنا سکتے ہیں جہاں ہر انسان کو ترقی کے یکساں موقعے میسر ہوں جب ایسی کوشش ہو سکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے کیوں ایسی صورتیں نہ نکالیں جو دماغی دنیا کو موجودہ دُنیا کے قریب لے آئیں، اب ہم ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں پُل بنا سکتے ہیں۔

ہم اس اچھی دُنیا تک کیوں نہ پہنچے۔ وہاں تک پہنچنے میں زیادہ تر لوگوں کا فائدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے وہاں تک نہیں جا سکتے اور زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو وہاں جانا نہیں چاہتے کیونکہ انھوں نے ابھی اس دُنیا کو محسوس نہیں کیا ہے۔

ان دماغی باتوں کو ہم اکیلے پُورا کر سکتے ہیں جب وہ انفرادی ہوں لیکن سماجی باتوں کو اسی وقت پورا کر سکتے ہیں جب سارا سماج اسی طرف جانا چاہے کیونکہ چند خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر انسان ساتھ رہتے ہیں انسان، حیوان متمدن ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی اکیلا جانا چاہے گا تو دوسرے اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں گے۔

ہم دماغی دُنیا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ دنیا کا نہیں۔ مجموعی طاقت ہمارے پاس ہے کہ ہم وہاں پہنچ سکیں۔ سماج کے ہاتھ اتنے پھیل سکتے ہیں کہ وہ دنیا ہمارے قبضہ میں آ جاتے لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند مصنّف وہ ہے جو اس ہونے والی، اس نوزائیدہ دُنیا تک پہنچ گیا ہے۔ اب اس دُنیا کو واقعی دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے چاہتا ہے کہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ وہاں کھینچ لے جائے۔

موجودہ دنیا کو اس خیالی دُنیا تک لے جانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً: سیاسی حضرات ہیں۔ ان کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن سیاسی حضرات اور اس قسم کے کوشش کرنے والے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ دے نہیں سکتے ـــــ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا ہے۔ اس کی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے اسی لیے وہ بڑی بڑی باتوں کو روزمرہ کی چھوٹی باتوں کے چنگل سے الگ کر کے سماج کو دکھا سکتا ہے۔

مثلاً آج کل ایک سوال اُردو ہندی کا ہے۔ یہ جھگڑا ایسا ہے جس نے ملک کی نگاہوں کو پھنسا لیا ہے۔ لوگ بڑی باتوں کو بھول کر اس میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اگر اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو نئے نئے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات اتنے برانگیختہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس پر صفائی سے غور نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی اس کو حل کرنا چاہتا ہے تو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی چال بازی ہے۔

ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لے کر وہ خیالی دُنیا' اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب لوگ دماغی طور پر وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں ہے تو میں اس کو آرٹسٹ نہیں کہہ سکتا لیکن اگر اس کی انفرادیت ایسی ہے کہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ہلاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے۔ اس کی اکیلی طاقت سماج کے آگے نہیں پہنچا سکتی لیکن اگر اس کے بخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں قوم کی طاقت آجاتی ہے اور وہ دنیا کو ہلا دیتی ہے۔ گذشتہ دور میں جتنے بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہوئے شیکسپیر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے دَور کے سماج کے نمائندہ تھے۔

انفرادیت کے معنی میں ایک اُلجھن ہے۔ ہم سوشلزم اور کمیونزم کی طرف جا رہے ہیں یہ بالکل سماجی چیزیں ہیں جو ایسا نظر آتا ہے کہ انفرادیت کو فنا کرتی ہیں' اس لیے کمیونزم کے دور میں آرٹ کے مٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس دَور میں زندگی کا معیار ضرور اُونچا ہو جائے گا لیکن یہ معیار ایسی بلندی ہوگی جس کے اوپر تخیّل کا کوئی پہاڑ نہ ہوگا۔ ایک پلیٹو سا ہوگا۔ آگے نگاہوں کی دوڑ بند ہو جاتے گی۔

انفرادیت کو کمیونزم دبا ضرور دیتی ہے میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن انفرادیت کو فنا نہیں کرتی۔ اس دَور میں دب کر انفرادیت کی صورت کیا نکلے گی یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ آج خیالات اور عمل کی آزادی ہے جو شخص جو چاہے کر سکتا ہے اناطول فرانس نے کہا ہے کہ "ہمارا قانون آزاد ہے۔ اگر غریب روٹی چرائے تو اس کو بھی وہی سزا ملے گی جو لکھ پتی کو اگر وہ روٹی چرائے"۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لکھ پتی کو روٹی چرانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی اس لیے اگر قانون کا ہتھیار چلے گا تو صرف غریب پر۔ ہم کو ترقی کرنے کی بالکل آزادی نہیں۔ جب تک آدمی کو ضروریات کی طرف سے اطمینان نہ ہو' پڑھائی لکھائی نہ ہو' اس وقت تک وہ کیسے ان لوگوں کا مقابلہ کر سکتا ہے جن کو یہ نعمتیں میسّر ہیں۔ شہروں میں اور خاص کر دیہاتوں میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر مواقع میسر ہوں تو ان کی انفرادیت ملک کے کام آئے۔

آج کل دُنیا میں انفرادیت دبائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں انفرادیت ترقی نہیں پا سکتی کیونکہ ہر ایک کو ترقی کرنے کے مواقع نہیں میسّر آتے۔ جب کھانا، پینا، رہنا سہنا میسّر نہیں، تعلیم نہیں، سوچنے کے لیے وقت نہیں تو انفرادیت کیسے ترقی پائے گی۔

اگر انفرادیت ترقی پا سکتی ہے تو صرف سوشلزمی سماج میں پچھلی دُنیا میں' پھر بھی ان لوگوں کو جو موقع حاصل تھا' جو روپیہ پیسہ رکھتے تھے اور اختیارات رکھتے تھے لیکن اب زمانہ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانے میں خیالات کی ترقی کا اور انفرادیت کی ترقی کا موقع ہے یا یہ کہنا کہ سوشلزم آکر انفرادیت کو فنا کر دے گا غلط ہے وہ دَور ایسا نہیں ہوگا کہ سب ایک سے ہو جائیں بلکہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔

لکھنے والا کیوں لکھتا ہے اس لیے کہ اس کے دماغ میں ایک خیالی دُنیا ہوتی ہے۔ جسے وہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا تک پہنچ ہو سکتی ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ دُنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل باندھا جائے۔ زمانہ کے شاہکار اسی طرح کے پُل ہوتے ہیں۔ پہلے تو پڑھنے والے حسرت سے خالی دُنیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر اُدھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے' خاص خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا لیکن معقول لکھنے والے کے لیے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات' ادا

ئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔
ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اور انھوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں حالانکہ ان کاموں کو پا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہیں۔ انقلابِ فرانس میں والٹیر کے ایسے ادیبوں کا بڑا دخل ہے۔ اس کا اثر انقلاب کے بعد سو برس ـ باقی رہا۔

آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا، اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجیے، ان کو راستہ بتائیے بن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جانا چاہیے، نہ کہ منطق کے ذریعہ، آپ کی بات ان کے دل میں اُتر جانا چاہیے۔ آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے وہ رمی کو پکڑ لیتا ہے، پھر منطق اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے۔ مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ گے لے جا سکیں اسی لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

جدید ادب

مولوی عبدالحق

میرے نوجوانو، رفیقو اور دوستو!

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا، چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی"، پھر جھٹ اُٹھ کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے"۔ جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے۔ ایک دو بار نہیں بارہا میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ پہلے کے نوجوان (یعنی تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی۔ بات یہ ہے کہ انسان طبعاً گذشتہ سے بہت حسن ظن رکھتا ہے، اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو تو بھول جاتا ہے اور خوبیاں یاد رہ جاتی ہیں۔ مثلاً یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان میں بچوں کا کوئی اچھا مدرسہ نہیں۔ بچپن میں جو ہمیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی تھیں وہ بڑے ہو کر بھول گئے۔ اور یاد رہا تو یہ کہ مکتب میں خوب پٹتے تھے اور جب ہمیں پڑھانے کا موقع ملا تو ہم نے بھی خوب کان امیٹھے اور قمچیاں لگائیں۔ یہ کچھ انسان کی فطرت سی ہو گئی ہے کہ گذشتہ کو سراہتا اور حال کو سراپتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے کے نوجوان میں نہیں تھی اس لیے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کر سکتا تھا، لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی تو پھر میں نے گذشتہ کی تلافی نہیں بلکہ کفارے کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہ کر سکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جانہار کوہ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لیے ہم ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہوں جب کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اُکتا جاتا ہے اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت آثار حیات گھٹنے لگتے ہیں، قویٰ میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں امنگ نہیں رہتی، دل و دماغ کے اُبھارنے کے لیے طرح طرح کے محرکات استعمال کیے جاتے ہیں لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالم نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی

تھا کہ اہلِ روما جو کچھ کرنا تھا کر چکے اور ان کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا اس لیے وہ لہو و لعب اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے ـــــ دولت و عیش کی گرم بازاری ہوئی اور موج اڑائی جانے لگی، لوگوں کے جذبات اور ہمت کمزور پڑ گئی اور اخلاقی پستی پیدا ہو گئی اور ہوا یہ کہ ہمتیں جاتی رہیں، حوصلے پست ہو گئے، کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیاشی ہے، مزہ آنے لگا، انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انھیں لے جاکر دفن کر دیا۔

ہمارے اصول و عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ مر جاتا ہے تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینے سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔ یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کی دستبرد سے گل سڑ کر گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انھیں کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص کو تسخیرِ جن کا بڑا شوق تھا اور اس کا عمل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک عامل ملا۔ بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دھن میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کر کے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟ جو حکم ہوگا بجا لاؤں گا۔ عامل صاحب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی دانست میں بڑے بڑے مشکل کام اسے بتائے۔ جن نے جھٹ پٹ کر دیے اور اور کام کے لیے حاضر ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اس کے لیے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہیے اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کرتا ہے اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کے لیے جو ہر وقت "ہل من مزید" کی صدا دیتا تھا۔ اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اس جن نے انھیں ستانا شروع کیا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین، انھیں ایک ترکیب بہت خوب سوجھی۔ کہا ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اس پر چڑھو اور اترو، اور اترو اور چڑھو، اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر اترتے چڑھتے رہو۔ کچھ دن تو وہ اترتا چڑھتا رہا لیکن کب تک۔ آخر اس قدر عاجز اور تنگ ہوا کہ چیخ اٹھا اور عامل صاحب کی دہائی دینے لگا۔ خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے بچا لیجیے۔ آپ جو کہیں گے وہی کروں گا اور کبھی کسی قسم کی شرارت نہ کروں گا۔ عامل صاحب نے حکم دیا کہ اب اترنا چڑھنا بند کرو جب ہم کسی کام کا حکم دیں تو اسے کرو، ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو۔ بے کار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی مگر معاً املی کے درخت کا خیال آتا تو وہیں دبک کے بیٹھ جاتا۔ اب بیکاری کی وجہ سے جن صاحب کا یہ حال تھا کہ کونے میں بیٹھے اونگھا کرتے اور منھ پر مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔

یہ قصہ جھوٹ سہی لیکن نہایت سبق آموز ہے۔ اول یہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بلا ہے کہ جن جیسی ہستی جس میں توانائی اور مستعدی کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ بھی اس سے عاجز آ جاتی ہے۔ دوسرے بیکاری انسان کے قویٰ کو مضمحل اور بیکار اور شوق اور امنگ کو خاک میں ملا دیتی ہے یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ توانائی آدمی کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کا اقتضا ہے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ انسان کی تمیز و شعور پر ہے کہ کونسا ایسا کام کرے جو ممدِ حیات ہو، اگر وہ املی کے پیڑ ہی پر اترتا چڑھتا رہا تو سمجھو کہ کھو یا گیا۔

ممدِ حیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممدِ حیات کاموں میں سے ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں، دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ زندگی کو زیادہ پُرلطف اور زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں اور ملک و قوم کو ترقی کے راستے پر لگا دینے میں مدد کر سکتے ہیں لیکن ادب وہی کارآمد ہو سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے اور جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہو سکتی ہے۔

لیکن ترقی کا رستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر و استقلال اور بہت پتہ مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمینِ آزادی ہی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی

نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے ۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اُسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی
چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ
ادب کے قابل مبارک باد ہے ۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔
آپ کو اپنے خیالات صرف تعلیم یافتہ طبقے تک محدود نہیں رکھنے چاہئیں بلکہ اس کثیر طبقے تک بھی پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان سب
نعمتوں سے محروم ہے جو آپ کو حاصل ہیں۔ تعلیم عام نہ ہونے سے اس میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی لیکن پھر بھی ان کا خیال مقدم ہے اس
لیے کہ ان کے دلوں میں جو ابھی بہت سی آلائشوں سے پاک ہیں ان خیالات کا جمانا آسان ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو کہلاتے تو تعلیم یافتہ ہیں مگر دل
زنگ آلودہ ہیں۔ اس پر آپ کو اپنی کانفرنس میں غور کرنا ہوگا یہ نہایت دشوار کام ہے اور اس کام کو انجام دینے والے بہت مشکل سے ملیں گے۔
زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے اس لیے گذشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آئندہ کی تیاری
میں مدد دے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کار آمد ہو۔ یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا
جائے نئی تحریک سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پرانا بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی۔ یہ
تشبیہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں درست ہو لیکن ادب کے معاملے میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہو سکتی ترقی کے لیے تخریب ضروری ہو مگر لازم نہیں۔ ادب
میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی، سوکھی شاخیں چھانٹنی
ہوں گی اور مرجھاتی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑمیں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے
پھوٹیں لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا
چاہیے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہیے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی اپنی
ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔
مجھے معاف فرمائیے گا، میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو دل میں ہے وہ بیان میں
نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالا ہیں، میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا
ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ کیوں ایسا ہے یہ ایک عام اور معمولی بات ہے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہر پرانی چیز بُری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں
ہوتی رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں ۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانہ میں ہوئے ہیں، اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں
کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے ۔ رجعت یا ترقی بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت یا ترقی ہر زمانہ
کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانہ سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں محض ہم اس بنا
پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گذشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہیے، ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہیں۔ ہم گذشتہ کے وارث ہیں اگر کوئی وارث
اپنے ارث سے بے خبر ہے یا کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو، نہ کوئی اصلاح کر سکتا ہے نہ خود فائدہ
حاصل کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اس لیے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گذشتہ تاریخ اور گذشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے
اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام تک پہنچانے
کی ضرورت ہے کیونکہ جو چیز آپ کو ارثاً ملی ہے اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا؟ لیکن "میراث پدر خواہی علم پدر
آموز" ہی کافی نہیں "علم پسر آموز" بھی لازم ہے ہم صرف حال کے ہی سامنے جواب دہ نہیں، آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں اس لیے زندگی کے جس شعبہ میں بھی
ہم ہاتھ ڈالیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آئندہ نسلوں پر کیا ہوگا کیونکہ آئندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی
اصول پر ہوگی۔
دوسری چیز جو آپ کے قابل غور ہے یہ ہے کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں اس پر پوری قدرت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے

کہ جب ہم اپنے گذشتہ ادب کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ زبان کیا ہے ؛ خیال کے ادا کرنے کا آلہ، اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہماری زبان میں، ہمارے خیالات نہیں سما سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو، زبان بھی ارثالی ہے اور جب تک ہم اس پر قدرت حاصل نہ کریں گے۔ ہم اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ ہمارا نہیں، اصل نہیں نقل ہے، شاید مستعار ہے، کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں، اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو یعنی جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہے یا کسی دوسرے کا، لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہیے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح دمکتا ہوا نظر آئے لیکن جب خیال ہی ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کے صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں، لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا اس کا بیان اکثر ناقص، خیال ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنی اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتیں، یہ لازم و ملزوم ہیں، انھیں کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے اس لیے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی ساری کوششیں رائگاں جائیں گی اور ان کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں، پتہ جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

ادب و زبان کے علاوہ جو ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دل عزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ ہے، آپ کے قابل رکن کا یہ کہنا کہ "ہم بعض حضرات کی رجعت پسندی سے ناواقف نہیں مگر ابھی ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ صرف اپنے بل پر کھڑے ہو سکیں تنہا اپنے عقائد کی پاکی یا استقامت سے ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہوتا،" اس لیے کہ اگر یہ بڑھ کر سماج کے خیالات اور بنائے عمل نہیں بن سکتے تو اسی طرح بے کار رہیں گے جس طرح کوئی مذہبی عقیدہ سراسر غلط ہی نہیں گمراہ کن ہے اگر آپ رجعت پسندی کے سہارے ترقی کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شروع ہی میں سیدھے رستہ سے بھٹک جائیں گے اور کبھی منزلِ مقصود تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا حیرت ہے کہ آپ رجعت اور ترقی کو ایک ساتھ کیسے نبھا سکتے ہیں۔ شاید تیل اور پانی کا ایک جا ہونا ممکن ہے لیکن رجعت اور ترقی کا ایک جا ہونا کسی طرح ممکن نہیں یہ کھلی مداہنت اور ریاکاری ہوگی اور یہ ایک چیز آپ کی ترقی پسندی کو بے وقعت کر دے گی اگر آپ کو "اپنے عقاید کی پاکی اور استقامت" پر اطمینان نہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس خیال کو ترک کر دیں رجعت پسندی کے بل کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ نہ کھڑے ہوں؛

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است ‌‌‌‌‌‌ رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

سعدی اس خیال میں آپ سے کہیں بڑھا ہوا ہے وہ تو ہمسایہ کی امداد سے بھی بہشت میں جانا پسند نہیں کرتا اور آپ رجعت پسندوں کی مدد سے جنتِ ترقی میں جانا چاہتے ہیں یہ خیالات نہایت پستی اور کم ہمتی کے ہیں کہ آپ کو کوئی ضرورت تعداد بڑھانے اور شاخیں پھیلانے کی نہیں اگر آپ کے ساتھ بارہ بلکہ بارہ بھی نہیں تین چار بھی ثابت قدم اور راسخ العقیدہ شخص ہیں تو ہندوستان بھر میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں ایک ایک آدمی نے دُنیا کو ہلا دیا ہے اور آپ اتنی تعداد میں ہو کر بھی رجعت پسندوں کی آڑ لیتے پھرتے ہیں۔

آپ کا کام اس وقت وہی ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں انسائیکلو پیڈلیسٹ (Encyclopaedist) نے فرانس میں کیا تھا انھوں نے

رجعت پسندوں کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، قید میں رہے، جلاوطن کیے گئے، کتاب چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ آخری پروفوں میں تحریفیں کی گئیں اور اصل مسودے جلا دیے گئے یہ سب سہا مگر اپنے عزم سے نہ پھرے اس کتاب میں صرف معلومات ہی نہیں فراہم کی گئی تھیں بلکہ انسان کی روشن خیالی، خیالات کی انقلاب انگیزی اور توہمات و تعصبات کی بیخ کنی کا سامان بھی جمع کیا گیا تھا اس کے مؤلفین کی غایت نظریات نہیں تھی بلکہ عمل تھا، ادبی شان دکھانی مقصود نہیں تھی بلکہ ان کا منشا زندگی کی تعمیر تھی۔ یہ لوگ سچے مجاہد تھے باوجود مسخ ہونے کے اس کتاب کا اثر صرف فرانس ہی تک نہیں رہا بلکہ دُور دُور تک پہنچا۔ انیسویں صدی میں جو عقلیت کی ہوا ہندوستان میں چلی تھی، اس کا اگر آپ سراغ لگائیں گے تو اس کا سلسلہ بھی انھیں چند پاک نفوس تک پہنچے گا اس کتاب کو اب کوئی نہیں پڑھتا اور بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جنھیں اس کی کبھی زیارت نصیب ہوئی ہو گی لیکن اس کا اثر اور فیض اب تک جاری ہے۔

یہ صرف چند نفوس تھے مگر دھن کے پکے اور عقیدے کے سچے تھے ان کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، ان کے کاموں کو دیکھیے اور ان کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کیجیے کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔

ہدیۂ تہنیت

ہماری تشنگی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے
جسے ساقی گری کی شرم ہو آتش بجام آئے

(سردار جعفری)

سلطان ناتھانی اور ناتھانی ٹرسٹ
بمبئی

میر کارواں

احمد فیض

سجّاد ظہیر کے نام

نہ ہم اب ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سوئے مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوستداری
نہ غم ہائے وطن پر اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے

سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جامِ ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

دہلی۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

رقصِ شرر

علی سردار جعفری

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے / اور افراد چنگاریاں ہیں / جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بیتاب شعلے / پرورش پارہے ہیں / اس تڑپتے ہوئے شعلے سے جتنی چنگاریاں ٹوٹتی ہیں / اتنی ہی اور چنگاریاں پھوٹتی ہیں / اس طرح زندگی / گل بہ آغوش چنگاریوں سے / ہر گھڑی / اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لیے گوندھتی ہے۔

کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں / جو بھڑکتی نہیں ہیں، تڑپتی نہیں ہیں / اُڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں / موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں / لیکن ایسی بھی کتنی ہی چنگاریاں ہیں / جن کے سینوں سے شعلے بھڑکتے ہیں اور خار و خس پر لپکتے ہیں اور بجھتے بجھتے بھی دنیا و انسانیت کو / رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتے ہیں / گرمیِ بزم صرف ایک رقصِ شرر تک نہیں ہے۔

سجاد ظہیر ایک ایسی ہی چنگاری تھے جو اب ہم میں نہیں رہے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دفن ہیں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خواجہ غلام السیدین جیسے ممتاز اہلِ علم اور وطن دوست ابدی نیند سو رہے ہیں۔

میں سجاد ظہیر سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء کے دوران دہلی میں ملا تھا۔ جہاں بائیں بازو کی قوتوں نے ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسۂ عام منعقد کیا تھا۔ ہم دونوں وہاں تقریریں کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں اسٹوڈنٹ تحریک کی نمایندگی کر رہا تھا اور وہ کانگریس پارٹی کی، یا ہو سکتا ہے ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی، جو ان دنوں غیر قانونی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی کی حیثیت سے اور اُردو افسانوں کے سنسنی خیز مجموعے "انگارے" کے ایک مصنف کی حیثیت سے سجاد ظہیر مشہور ہو چکے تھے۔ برطانوی حکومت نے رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے دباؤ میں آکر "انگارے" کو ضبط کر لیا تھا پھر بھی افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے ادب کا ایک موڑ بن گیا۔ سجاد ظہیر نے بھی ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے میرا نام سُن رکھا تھا جسے ریڈیکل خیالات رکھنے کے جُرم میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ ہم میں فوراً دوستی ہو گئی جو ۳۷ برس، اُن کی زندگی کے آخری دن تک قائم رہی۔

مجھ پر اُن کا پہلا تاثر بہت ہی خوشگوار تھا، وہ پُرخلوص، محبتی اور نرم گفتار نوجوان نظر آئے، ان کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت اور حساس تھے۔ قلم یا چمچہ، پیالی یا کتاب اُٹھانے میں ان ہاتھوں کی دھیمی حرکت سے ان میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی تھی۔ برسوں بعد ممتاز گجراتی شاعرہ اوما شنکر جوشی نے مجھ سے ان ہاتھوں کی خوبصورتی کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ سجاد ظہیر سے پہلی بار ملے تو جی چاہا کہ ان کے ہاتھوں کو بس دیکھتے ہی رہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے انھیں بنّے بھائی کہنا کب شروع کیا۔ وہ مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔

پہلی ملاقات کے دو سال بعد ہم پھر یکجا ہوئے۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے دہلی یونیورسٹی چھوڑ دی۔ بنّے بھائی اس زمانے میں لکھنؤ اور الٰہ آباد میں رہتے تھے اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر زیڈ اے احمد کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جواہرلال نہرو کی رہنمائی میں کام کرتے تھے جو بنّے بھائی سے خاص طور سے لگاؤ رکھتے تھے۔ بنّے بھائی کے سارے بڑے بھائی خوب پیسہ کما رہے تھے لیکن بنّے بھائی نے سیاسی اور تہذیبی کام کو ترجیح دی اور انھیں سرگرمیوں کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ اُن دنوں کمیونسٹوں کو نئے زمانے کے اولیا سمجھا جاتا تھا جنھیں اپنی مفلسی پر ناز تھا۔

اس زمانے میں ہم نے تین چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں — سجاد ظہیر کا مختصر ناول "لندن کی ایک رات"۔ مجاز کی نظموں کا مجموعہ "آہنگ"۔ حیات اللہ انصاری کی کہانیاں "انوکھی مصیبت" اور میرے افسانوں کا مجموعہ "منزل"۔ (بعد کو میں نے افسانے لکھنا ترک کر دیا اور پوری طرح شاعری کا ہو رہا)

ان کتابوں سے مسلح ہو کر ہم ترقی پسند مصنفین کی دوسری کُل ہند کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ پہنچے جہاں کرشن چندر بھی اپنی پہلی کتاب لے کر آئے تھے۔ ہم شائستہ بنگالی ادیب سدھیندر ناتھ دت کے بڑے سے گھر میں ٹھہرے تھے، جنھوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہیں ہماری ملاقات ایک بہت ہی اچھے مگر عالی مذاق شاعر بشنو ڈے اور نوجوان باغی بدھ دیو بوس سے ہوئی۔ ہمیں اصل مسرت اس کی تھی کہ اسی سفر میں ہم جمینی رائے اور ان کی تصویروں سے روشناس ہوئے جو ہمارے لیے "دریافت" سے کم نہ تھا۔ ان کی تصویروں کی قدرے مبالغہ آمیز خوب صورت بنگالی آنکھوں نے، جن میں لوک کلا کی جھلک ملتی تھی، سچ مچ ہماری روح کو بیدار کر دیا۔

کانفرنس کا افتتاح گرودیو ٹیگور کرنے والے تھے جنھوں نے کسی غلط فہمی کے تحت اپنا افتتاحی خطبہ بنگالی میں لکھا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر ملک راج کو اور مجھے یہ کام سپرد کیا گیا کہ ہم ٹیگور سے ملاقات کریں اور یہ درخواست کریں کہ وہ اپنا خطبہ انگریزی میں لکھیں۔ جب ہم ان کی قدم بوسی کے لیے شانتی نکیتن گئے تو گرودیو نے کہا کہ انھیں نہ تو نیا خطبہ لکھنے کی فرصت ہے اور نہ جو وہ لکھ چکے ہیں اسے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا وقت۔ البتہ انھوں نے چند بنگالی ادیبوں کے نام بتائے جو یہ کام کر سکتے تھے ان میں پروفیسر ہیرن مکرجی کا بھی نام تھا۔ اور پھر اچانک انھوں نے ایک نوجوان بنگالی ادیب کا نام لیا اور جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا کہ "خدا کے لیے اس سے میرا خطبہ انگریزی میں ترجمہ کرنے کو نہ کہنا۔ جانتے ہو تم لوگ، وہ ۳۲ سال کا ہے اور چالیس کتابوں کا مصنف ہے"۔ ہم نے انھیں انکساری کے ساتھ بتایا کہ اُردو کے جو ادیب اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہیں وہ صرف ایک ایک کتاب کے مصنف ہیں، تو وہ مسکرا دیے۔

کلکتہ کانفرنس ایک بڑا خوشگوار تجربہ تھی۔ بنّے بھائی وہاں رضیہ کے ساتھ اپنی شادی کے فوراً ہی بعد آئے تھے۔ رضیہ ایک نوجوان دُبلی پتلی لڑکی تھیں جنھیں دیکھ کر حافظ کا شعر یاد آتا تھا:

آں سیہ پردہ کہ شیرینی عالم با اوست
چشم میگوں، لب خندہ دل خرّم با اوست

ترقی پسند تحریک میں یہ رضیہ کا پہلا ورود تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نوجوان دُلہن سے رضیہ آپا بن گئیں، اس بنّے بھائی کی رفیقہ جس نے اپنے گرد ہندستان کے کونے کونے سے ممتاز ادیب اور ہونہار نوجوان جمع کر لیے تھے۔ جن لوگوں نے اس تحریک کی سرپرستی کی ان میں گرودیو ٹیگور، علامہ اقبال، جواہرلال نہرو، سروجنی نائیڈو، وَلاتھول اور منشی پریم چند جیسی ہستیاں تھیں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ پہلے بنّے بھائی گرفتار کیے گئے۔ پھر شروع دسمبر ۱۹۴۰ء میں، میں بھی گرفتا

کر دیا گیا اور مجھے لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا جہاں میں بنّے بھائی کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر اور کانگریسی لیڈر چندر بھان گپتا کے ساتھ تھا۔ بنّے بھائی سنٹرل جیل میں بند تھے۔ دونوں جیلوں کے بیچ میں بس ایک دیوار حائل تھی۔

جس دن میں وہاں پہنچا اسی دن ایک ہمدرد وارڈر نے ایک چھوٹا سا پرزہ لاکر دیا جو بنّے بھائی نے مجھے بھیجا تھا اور قید خانے میں میرا خیر مقدم کیا تھا۔ اب تحریروں کی آمد و رفت شروع ہوگئی جو عام طور سے ادب اور شاعری کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک تحریر جیلر نے پکڑ لی۔ اس نے کیٹس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ کسی بہت بڑی سازش کے لیے شناخت کا نام ہے۔ جب میں نے کتاب کھول کر اُسے دکھائی اور اُسے کیٹس کا ایک سانیٹ پڑھ کر سنایا تب اُس احمق نے میری جان چھوڑی۔ خبر نہیں وہ سانیٹ اس کی کچھ سمجھ میں بھی آیا تھا یا نہیں۔

بنّے بھائی کے لیے اور ہم سب کے لیے خوشی کا ایک عظیم لمحہ جیل خانے سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۴۱ء کے اواخر میں آیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن نے ترقی پسند شعرا کا ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ اپنی قسم کا پہلا مشاعرہ تھا جسے نوواردِ شعرا کا مشاعرہ کہا گیا جس میں مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، جذبی کو اور مجھے شرکت کے لیے مدعو کیا گیا اور لکھنؤ کے اساتذہ حاضرین میں تھے۔ یہ پروگرام بے انتہا کامیاب ہوا۔ ترقی پسند ادب بالغ ہوگیا تھا۔

اگلے سال، ۱۹۴۲ء میں پی سی جوشی نے، جو اس وقت ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے، مجھے پارٹی کے اُردو ہفتہ وار "قومی جنگ" کے ادارتی عملے میں کام کرنے کے لیے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں ۱۲؍جون ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ چند دنوں میں بنّے بھائی بھی بمبئی پہنچ گئے اور ہم دونوں نے پارٹی کے پہلے اُردو رسالے کا پہلا شمارہ نکالا۔ یہ ہمارے ساتھ رہنے اور کام کرنے کی سب سے طویل مدت کا آغاز تھا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر اشرف بھی آ گئے، پھر سبط حسن آئے اور پھر کیفی اعظمی، علی اشرف، محمد مہدی، ظ انصاری، کلیم اللہ اور بہت سے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔

ہم پارٹی کمیون میں رہتے اور کھاتے تھے جس کا نام نہ جانے کیوں راج بھون تھا۔ ہماری ماہانہ اُجرت چالیس روپے تھی۔ (بنّے بھائی ایک الگ گھر میں والکیشور روڈ پر رہتے تھے) ہم مضامین لکھتے، کاپیاں جڑواتے، انھیں پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ چکتا تو پوری ادارتی ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر جا کر چیخ چیخ کر اخبار بیچتی۔ اس سے عوام پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

پارٹی کمیون کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس کے وجود سے دلچسپی ظاہر کی۔ جن ادیبوں کا پارٹی سے باضابطہ تعلق نہیں بھی تھا وہ بھی آتے اور ہمارے ساتھ چند دن رہتے اور کمیونسٹ رفاقت کا خوش گوار تجربہ ساتھ لے کر واپس جاتے۔ فیض فوج میں بھرتی ہوگئے تھے پھر بھی وہ ایک دن کے لیے آئے۔ مجاز ہمارے ساتھ چند مہینے رہے اور انھوں نے اخبار میں کام بھی کیا۔ ان کی اُجرت صرف چائے اور کھانا تھی۔ اس سے زیادہ کا انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ جوش ملیح آبادی اور سمترا نندن پنت کبھی کبھار آجاتے تھے۔ وہ پی سی جوشی کے دوست تھے۔ جوش نے پارٹی کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا سنہرا دور تھا جو ساری زبانوں پر محیط تھی اور اس نے ادب کا بہت بڑا اور بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا۔ ہندستان میں اتنی زبردست تہذیبی تحریک اس سے پہلے کبھی نہیں اُٹھی۔ ہماری تحریک آزادی سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ "ترقی پسند" کا لفظ باعثِ افتخار بن گیا۔

بنّے بھائی کی شخصیت اور ایک بانظریہ تحریک کے بارے میں ان کے تصور کے گرد اُردو کے چھوٹے بڑے تقریباً سارے ادیب جمع ہوگئے۔ وہ لوگ بھی جو ہم سے متفق نہیں تھے، جیسے جگر مرادآبادی ہمارا بہت احترام کرتے تھے اور بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق

نے لکھا کہ "قومی جنگ" ادارت کے نقطۂ نظر سے اُردو زبان کا بہترین اخبار ہے لیکن ہر چیز کی بقا کے لیے مخالفت ضروری ہے۔ کمیونسٹ دشمن نوجوان ادیبوں کی بھی ایک جماعت تھی جو ہمیں ناپسند کرتی تھی اور تجربہ پرستوں کا ایک گروہ تھا جو فن و ادب کو کسی بھی نظریے سے آلودہ کرنے کے خلاف تھے۔

سجاد ظہیر کا گھر، سیکری بھون، ہماری ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہیں ترقی پسند ادیبوں کے ہفتہ وار جلسے ہوتے، نئی نظمیں، کہانیاں اور مضامین پڑھے جاتے، ان پر بحث و مباحثہ ہوتا، تنقید ہوتی جس کا خلاصہ اُردو رسالوں میں چھپتا اس سے اُردو کی تخلیقی تحریر پر بہت گہرا اثر پڑا۔

کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ان دنوں اُردو کے بہت سے صفِ اوّل کے ادیب بمبئی اور پونا میں آ گئے تھے: کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، مجاز، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، اختر الایمان، سبطِ حسن، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور دوسرے لوگ، یہ سب تو ترقی پسند تھے لیکن جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پطرس بخاری اور جگر مرادآبادی جیسے ادبی عمائدین جب بمبئی آتے تو کوشش کرکے ہمارے جلسوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے۔ اس وقت ہندستانی اسٹیج پر انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن چھایا ہوا تھا اور ادبی دنیا میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دَور دَورہ تھا۔ بنّے بھائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے اور سلطانہ ان کی سکریٹری تھیں۔

ہم دن میں پارٹی آفس میں کام کرتے تھے اور شام کو فن و ادب پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ ہم مارکسزم کی روشنی میں کلاسیکی اساتذہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح کے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے کہ غالب اور میر، تلسی اور کبیر کیسے ہمیں آج بھی علوئے فکر عطا کرتے ہیں، ادب کی دائمی قدریں کیا ہیں۔ ہم ریمبو، ملارمے اور بودلیئر کی فن کارانہ خوبیوں پر طویل مباحثے کرتے۔ یہ شاعر فرانسیسی زوال پسندوں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ بنّے بھائی نے اصل فرانسیسی میں ان کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے صرف انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔ ہماری بحثوں میں کافکا کا نام اکثر آ جاتا تھا۔

مصوری کے بارے میں بنّے بھائی مجھ سے بہتر علم اور سمجھ رکھتے تھے۔ انھیں سیزان، گوگان اور پکاسو کی تخلیقات پسند تھیں اور ریمبو، ملارمے اور بودلیئر کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ فرانسیسی زوال پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے ایک مضمون لکھا "شعرِ محض"۔ لیکن اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے لیے اپنی ایک انفرادی اور نجی جمالیاتی دنیا رکھتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بنّے بھائی کے رویے میں تبدیلی آ گئی تھی اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ "شعرِ محض" کو اپنے مضامین کے مجموعے میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔

مجھ میں اور بنّے بھائی میں اقبال شناسی پر ہمیشہ دوستانہ جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ اقبال کی شاعری نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے فیض اور مخدوم جیسے انقلابیوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان میں مُسلم قدامت پرستی کی ایک رَو تھی۔ وہ پہلے اُردو شاعر تھے جنھوں نے ۱۹۱۹ء میں روسی انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا۔ ابتدا میں بنّے بھائی اس تضاد کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے جو لینن نے ٹالسٹائی میں اور گورکی نے پشکن میں دیکھا تھا لیکن یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعد کو انھوں نے اقبال کے بارے میں اپنی رائے بدل دی۔ بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات اس سال مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں ہوئی تھی جب انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں اقبال سیمینار کا افتتاح کیا اور میں نے اقبال پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ سیمینار اقبال کے صد سالہ جشن کی تیاری کے سلسلے میں ہوا تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد بنّے بھائی ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے تاکہ وہاں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کریں۔ شروع میں وہ روپوش رہے اور پھر چند سال بعد انھیں فیض اور پاکستان کے چند افسروں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر لیا گیا۔ سزا کے بعد انھیں بلوچستان کی ایک جیل میں رکھا گیا۔ انھوں نے پاکستان کی جیلوں میں پانچ سال کاٹے۔ سرکاری وکیل نے اُن کے لیے سزائے موت

مطالبہ کیا تھا لیکن اس سے ڈرنے کے بجائے فیض نے جیل میں اپنی بہترین نظمیں اور غزلیں کہیں اور سجاد ظہیر نے اپنے ادبی تاثرات اور یادوں کی کتاب "روشنائی" لکھی اور ایران کے عظیم غزل گو شاعر حافظ پر ایک کتاب لکھی۔ ان کٹھن دنوں میں، اپنے گھر، بیوی بچوں سے دور، انھیں صرف ان کے عقائد کی پختگی نے ہمت و حوصلہ عطا کیا۔

رضیہ آپا لکھنؤ میں اپنی پیاری بیٹیوں کی پرورش کرنے کی جدوجہد اکیلی کرتی رہیں۔ انھوں نے اُن کٹھن دنوں میں بے مثال ہمت کا ثبوت دیا۔ جب بنے بھائی پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں جیل گئے تو رضیہ آپا نے الٰہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لے کر اُردو ادب میں ایم اے کیا اور جب بنے بھائی موت کے سائے تلے پاکستان کی جیلوں میں قید رہے تو رضیہ آپا اعلا درجے کی افسانہ نگار بن گئیں۔

سجاد ظہیر اور فیض پاکستان میں قید ہی تھے جب مجھے دسمبر ۱۹۵۴ء میں ماسکو میں سوویت ادیبوں کی دوسری کانگریس میں شرکت کا موقع ملا۔ جب میں نے ایوان چہل ستون میں تقریر کی اور ہندستانی ادیبوں کی طرف سے تحفے کے طور پر فیض کی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ اور سجاد ظہیر کا نام پیش کیا تو کانگریس کے تمام شرکت کنندگان نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ ہندستانی اور پاکستانی دانشوروں کو، جن کے رہنما سجاد ظہیر اور فیض تھے، سوویت ادیبوں کا خراج عقیدت تھا۔

ہندستان کی تحریک اور ساری دنیا کے دانشوروں کی مہم کے دوہرے دباؤ کے زیر اثر بنے بھائی کو ۱۹۵۵ء میں رہا کیا گیا اور وہ ہندستان واپس آ گئے۔ پہلے وہ لکھنؤ میں رہے اور پھر دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے کلچرل لیڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ہندستان آنے کے سال بھر کے اندر اندر انھوں نے ڈاکٹر ملک راج آنند کے ساتھ مل کر نئی دہلی میں ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس منظم کی جو بالآخر افریشیائی ادیبوں کی زبردست تحریک بن گئی جو ترقی پذیر ملکوں کے سامراج دشمن تخلیقی ادب کے لیے ایک پُرقوت فورم، انسان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی تحریک ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انھوں نے کچھ نظمیں لکھیں اور ان کا ایک مجموعہ شائع کیا "پگھلا نیلم"۔ یہ متنازعہ کتاب ہے۔ بعض لوگ شاعری کی تعریف کے بارے میں اپنے قدامت پسندانہ رویے کی وجہ سے اسے اچھی شاعری نہیں مانتے لیکن اس میں سجاد ظہیر کے نازک جذبات اور حساسیت پوری طرح نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض نظموں کے ترجمے روسی زبان میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

بنے بھائی نے صرف چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، لیکن ان کا اصلی تخلیقی کارنامہ ہے ان سیکڑوں نئے ادیبوں کی صورت میں برصغیر کی بہترین تخلیقی صلاحیت کا اُجاگر کرنا جسے انھوں نے اور ان کی تحریک نے علوئے فکر اور بلندیٔ تخیل عطا کی۔

اُن کی شخصیت بہت ہی دلکش تھی اور ان میں بڑی نفاست تھی۔ انھوں نے ہندستانی اور مغربی تہذیبوں کے بہترین حصّوں کو اپنے آپ میں سمو لیا تھا۔ اُن کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انھیں وہ لوگ بھی پسند کرتے تھے جو اُن کے سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔

وہ خود زندگی کی ساری اچھی چیزوں کا شوق رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ چیزیں ساری انسانیت کو حاصل ہوں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی رضاکارانہ مفلسی میں، انسانیت کے مقصد کے لیے وقف کر دی۔ لینن کے الفاظ اُن پر پوری طرح صادق آتے ہیں: "انسان کی عزیز ترین ملکیت ہے زندگی، اور یہ چونکہ اسے بس ایک ہی بار ملتی ہے اس لیے اس کو اس طرح جینا چاہیے کہ وہ کسی بزدلانہ اور حقیر ماضی کی شرمندگی سے جھلسے نہیں، اس طرح جینا چاہیے کہ اسے ان برسوں کی اذیت نہ ہو جو بے مقصد گزرے، اس طرح جینا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے کہ "میری ساری زندگی اور ساری توانائی دنیا کے اہم ترین مقصد میں صرف ہوئی۔"

(تقی حیدر نے انگریزی سے ترجمہ کیا)

اُردو افسانہ میں 'انگارے' کی روایت

ڈاکٹر قمر رئیس

'انگارے' اُردو افسانوی ادب میں ذہنی بغاوت اور جرأت آزما تخلیقی تجربات کی ایسی دستاویز ہے جس کی اہمیت کا احساس اور علم عام نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ یہ کتاب شائع ہونے کے فوراً بعد بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور ناشر کے پاس اس کے جو نسخے بچے' وہ جلا دیے گئے۔ کہانیوں کا یہ مختصر سا مجموعہ نہ صرف یہ کہ زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرت اور اس عہد کی ذہنی حقیقتوں کا مرقع تھا بلکہ اس آئینہ میں آنے والے دَور کی حقیقتیں بھی اپنا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ پریم چند کے بعد اُردو افسانہ کی جو نئی بساط بچھی' جو نئے رجحانات سامنے آئے اُسے ان کا پیش رو ہی نہیں سرچشمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۲ء کے آخر میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان حلقوں اور اداروں میں غیظ و غضب کی آگ سی دہک اٹھی جن کے مفاد اور ساکھ کو اس سے ضرب پہنچی تھی جو بڑی حد تک اس کا ہدف ملامت تھے۔ اس کی کہانیوں میں گستاخانہ بے باکی' برہمی' تلخ نوائی اور سرکشی تھی وہ ایک نئی نسل کے طرز فکر و احساس اور ایک نئے تصور فن کی آمد کا اعلان تھی۔

یہاں مناسب ہوگا کہ 'انگارے' کی کہانیوں کے ذکر سے پہلے اس دَور کے افسانوی ادب کے تمام رجحانات اور بعض اہم سماجی محرکات کے بارے میں چند باتیں کہہ دی جائیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۳۲ء کے قبل ہمارا ادب انیسویں صدی کے انگریزی ادب کے زیر سایہ نشوونما پا رہا تھا۔ رومان پسند افسانہ نگار مثلاً نیاز اور مجنوں' آسکر وائلڈ' جارج الیٹ' ٹامس ہارڈی اور ارڈنک جیسے انگریزی ادیبوں سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ دوسری طرف پریم چند اور ان کے ہم سفر سدرشن' سلطان حیدر جوش اور اعظم کریوی تھے جن کی اصلاحی حقیقت نگاری اور تصور پرستی بھی انیسویں صدی کے انگریزی ادیبوں کی یاد دلاتی تھی۔ سجاد حیدر یلدرم بھی اس دور کے ممتاز ادیب تھے لیکن وہ ترکی ادب کے عاشق تھے۔ ان کے بیشتر ناول اور افسانے ترکی ادیبوں مثلاً احمد حکمت' ناطق کمال اور خالدہ خانم کی تخلیقات سے ماخوذ یا ترجمہ ہیں اور یہ وہ ادیب ہیں جو خود انیسویں صدی کے رومان پسند یورپی ادیبوں سے متاثر تھے۔ بلاشبہ یلدرم اردو رومانی طرز فکر رکھنے والے ادیبوں کے کارواں سالار تھے۔ ان کی جدت فکر و اظہار نے اُردو افسانہ کو نئی جہتوں سے آشنا کیا لیکن اس واقعہ سے انکار بھی مشکل ہے کہ یہ ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بے زار اور تخیلی حسن کے پرستار تھے۔ شاید وہ آسکر وائلڈ کی طرح اپنے آرٹ کو غیر دلچسپ' پھیکی اور بے رنگ زندگی سے آزاد اور بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی بیشتر کہانیاں رنگین تخیل سے معمور شاعرانہ تمثیلیں بن گئی ہیں۔

انگارے کی اشاعت سے چند سال قبل یعنی ۱۹۲۸ء کے آس پاس پروفیسر مجیب' حیات اللہ انصاری' جلیل احمد قدوائی اور خواجہ منظور حسین نے چیخوف' ٹالسٹائی اور ترگنیف جیسے روسی ادیبوں کے فن سے روشناس کرانے کا کام شروع کیا تھا۔ ان کے افسانوں پر روسی

حقیقت نگاری بالخصوص چیخوف کے فن کے گہرے اثرات تھے۔ بے شک ٹالسٹائی کی کچھ کہانیاں اور ناول پہلے بھی ترجمہ ہو چکے تھے لیکن روسی ادیبوں کی فنی روایت کے اثرات ایک واضح رجحان کی صورت میں اسی دور میں محسوس کیے گئے۔ خود انگریزی کے افسانوی ادب میں انیسویں صدی کے آخر میں روسی ادب کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ تاہم ابھی گورکی کی اشتراکی حقیقت نگاری نے بار نہیں پایا تھا۔

اُردو افسانہ میں ایک خاص صورت حال اور بھی تھی۔ پریم چند کے علاوہ اکثر ممتاز ادیبوں کی کوشش یہ تھی کہ انگریزی، فرانسیسی، رُوسی اور ترکی زبان کے افسانوں کو اُردو میں منتقل کیا جائے اس لیے کبھی حوالہ کے ساتھ اور کبھی بغیر کسی حوالہ کے یورپی ادیبوں کی بے شمار کہانیاں اُردو لباس میں پیش کی جا رہی تھیں۔ اس طرح کہ ان کے اشخاص ہی نہیں ماحول اور واقعات کو بھی ہندوستانی رنگ میں پیش کرنے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ اصل کہانی کے موضوع پلاٹ یا سیرتوں میں پیچیدگی یا تہہ داری ہوتی تھی تو اسے ہندوستانی ماحول میں ڈھالتے ہوئے اکثر سادہ اور اکہرا بنا دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بے شمار کہانیوں میں مغربی تہذیب اور ایک ترقی یافتہ صنعتی معاشرہ سے تعلق رکھنے والے ایسے واقعات اور رشتے راہ پا جاتے جو ہندوستانی زندگی سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ یہ کہانیاں نہ یورپ کی زندگی کی ترجمانی کرتی تھیں نہ ہندوستان کی۔ دراصل پریم چند کے افسانے ہی اس دَور میں اُردو افسانہ کا نقطۂ کمال تھے ان میں ہندوستانی سماج بالخصوص گاؤں کی زندگی ماحول اور مسائل کا حقیقت پسندانہ فنّی تجزیہ نظر آتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں صنعتی ترقی کا جو آغاز ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا مزدور طبقہ اس کے مسائل اور صنعتی سماج کے دوسرے علائم بھی اب رونما ہونے لگے تھے۔ پریم چند کے حساس شعور پر ان نئے حالات کی پرچھائیاں بھی پڑنے لگی تھیں۔ اگرچہ مشکل یہ تھی کہ وہ گاندھی واد کے زیر اثر صنعتی معاشرے کی انفرادیت پسندی، مادّیت اور شور وشر سے خائف تھے۔ نوجوان ادیب اور دانش ور پریم چند کی روایت کا احترام کرتے تھے لیکن نئے تغیر پذیر حالات میں وہ اسے کافی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ نئے سماجی رشتوں اور ذہنی وجذباتی حقیقتوں کے موثر فنی اظہار کے لیے نئے سانچوں کے متلاشی تھے۔

یہ نئی نسل زیادہ سرکش، بے باک اور خود آگاہ تھی۔ مارکسزم یا اشتراکیت نے اسے انسانی سماج اور اس کے مسائل کے ادراک وشعور کی جو صلاحیت دی تھی اس کی بنیاد سائنسی اور عقلی طریقِ کار پر تھی۔ ہر چند کہ یہ بصیرت جو ابھی اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اور نوجوانوں کے جذباتی جوش سے دبی ہوئی تھی۔ تاہم وہ ایک روشن اور واضح تر شعور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سماج کے فرسودہ اداروں، بوسیدہ اور بے جان قدروں اور مصالحت پسندانہ سیاسی تحریکوں سے بیزار اور برہم تھے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں وہ تنگ نظر اور موقع پرست مذہبی رہنماؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اعانت اور شرکت کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی وجہ سے طبقاتی آویزش اور ملک کی اقتصادی آزادی کی جدوجہد سے تحریکِ آزادی عملاً دور ہوتی جا رہی ہے۔ تحریک خلافت کے دور کی بے مثل فرقہ دارانہ یگانگت اور یک جہتی کے بعد کم وبیش ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی جو لہر آئی، مذہب کے نام پر انسانوں کا جو لہو بہا، اس سے بھی نوجوانوں کے حلقے میں مذہبی جنون کے خلاف شدید نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ وہ مذہب پرستی اور روحانیت کو موقع پرستی، ریاکاری، مادّیت اور قدامت کی نقاب سمجھنے لگے۔ سیاسی غلامی، بڑھتے ہوئے افلاس، بے رحم سماجی قوانین، بوسیدہ رسم ورواج اور ان کی قیود سے یہ نوجوان ایک کرب انگیز گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اس کے خلاف ان کے وجود میں بے زاری اور برہمی کی آگ سی دہک رہی تھی اور صرف یہ نوجوان ادیب ہی نہیں، اس دور میں نیازؔ فتحپوری اور پریم چند جیسے ادیب بھی ان حالات کے خلاف اپنے شدید جذبات اور خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ پریم چند نے جون ۱۹۳۲ء میں اپنے باغیانہ مضمون "زندگی میں نفرت کا مقام" میں پجاریوں، پروہتوں اور جنیو دھاری لیڈروں کے خلاف اور سماج کا خون چوسنے والی قوتوں کے خلاف نفرت کو مقدس قرار دیا تھا۔

یہی وہ حالات تھے جب "انگارے" کی کہانیاں منظر عام پر آئیں، نو کہانیوں کا یہ مجموعہ صرف ۱۳۴ صفحات پر مشتمل تھا اور ایک ہزار کی تعداد میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالہ "اُردو" اور دیا نرائن نگم کے "زمانہ" میں اس پر جو ستائشی تبصرے ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف نوجوانوں نے اس باغیانہ تصنیف کو لبیک کہا بلکہ محتاط اور اعتدال پسند ادیبوں نے بھی کھلے دل سے اس کی حوصلہ افزائی

ی۔ لیکن کتاب کو شائع ہوئے ابھی صرف ڈیڑھ دو ماہ ہی گزرے تھے کہ قدامت پسند مذہبی علما کی طرف سے اس پر سخت حملے شروع ہوئے۔ ان کے اعتراض دو قسم کے تھے۔ اول یہ کہ کتاب میں جنت، دوزخ، خدا، علما اور مذہبی تصورات کا مذاق اڑا کر مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ کتاب میں عریانی ہے جس سے نوجوانوں کا اخلاق خراب ہوگا۔ یہ طوفان اس قدر بڑھا کہ یو۔پی کے گورنر کی کونسل میں اس پر بحث ہوئی۔ اور نتیجتاً اسے ممنوع قرار دے دیا گیا جس کا باضابطہ اعلان ۲۵ر مارچ ۱۹۳۳ء کے سرکاری گزٹ میں ہوا۔

مدیر "زمانہ" دیا نرائن نگم کی یہ جرأت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے کتاب کی ضبطی کے بعد اس پر تبصرہ کیا اور اسے سراہا۔ تبصرے کے یہ چند اقتباسات دلچسپی سے خالی نہیں:

"چار نوجوان مصنفوں نے جن میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں 'انگارے' نام سے اپنے دس قصوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان میں ..... موجودہ زمانے کی ریاکاریوں پر روشنی ڈالنے اور مروجہ رسم و رواج کی اندرونی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے نام نہاد اعلیٰ طبقے کی روزمرہ معاشرت کے نقائص کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ گو اس مجموعہ کا طرزِ بیان اکثر مقامات پر سوقیانہ تھا جو مذاقِ سلیم کو کھٹکتا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ نوجوانانِ عالم نے دنیا میں جو علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے اسی کا ادنیٰ کرشمہ اس کتاب کی اشاعت ہے۔ اسلامی بزرگوں اور مولوی صاحبان نے اس کو اپنے تقدس و احترام پر زبردست حملہ خیال کر کے اس پر لعن طعن میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اس طرح اس چھوٹی سی کتاب کے خلاف ایک طوفانِ عظیم بپا ہوگیا ..... سوال یہ ہے کہ اخلاق و روحانیت کے علمبردار اور مذہب کے احترام و تقدس کے دعوے دار حضرات اپنے اپنے طبقے کی کمزوریوں اور خامیوں سے کب تک آنکھیں بند کیے رہیں گے ...... مسلم پریس میں جس انداز سے اس کتاب پر نکتہ چینی ہوئی ہے اس سے زمانہ حال کی مروجہ تنگ خیالی کا پورا ثبوت ملتا ہے .... مولوی صاحبان کچھ ہی کیوں نہ کہیں سوسائٹی کے ہر طبقے میں ریاکاری کے نقائص داخل ہوگئے ہیں .... اب ان نقائص کو نمایاں کرنے والوں کو مردود و ملعون کرنے یا ان کی تحریرات و تصانیف کو سرکاری اثرات سے کام لے کر ضبط کرا دینے سے ملک و مذہب کا کوئی بھلا نہیں کر سکتے۔"

(زمانہ۔ مئی ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۳۰)

تبصرے میں کتاب کا ذکر ماضی بعید کے صیغے میں ہے۔ گویا وہ مرحوم ہو چکی ہے اور لہجے میں نہ صرف اس کی موت پر رنج و تاسف ہے بلکہ ان لوگوں کے خلاف برہمی اور ملامت کا اظہار بھی ہے جو اس کی ہلاکت کا باعث ہوتے۔ دراصل اس طرح کے تبصروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب کے جو نسخے تقسیم یا فروخت ہوگئے تھے وہ خفیہ یا رازدارانہ طور پر پڑھے جاتے رہے۔ اس طرح اس ہنگامے اور تنازعے نے کتاب کی مقبولیت میں اضافہ ہی کیا۔

"انگارے" کے محرک، مرتب اور پبلشر سجاد ظہیر تھے۔ انگلستان میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں وہ چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے تھے اسی دوران انھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اپنی پانچ کہانیوں کے علاوہ (جو غالباً انگلستان سے لکھ کر لائے تھے) اس مجموعے میں انھوں نے احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی چار کہانیاں اور رشید جہاں کا ایک ڈرامہ شامل کیا۔ کتاب میں کوئی پیش لفظ نہیں ہے لیکن بعد میں سجاد ظہیر نے لکھا کہ اس کی کہانیوں میں "سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان کا بے باکانہ اظہار تھا۔" احمد علی نے بھی اگست ۱۹۴۴ء کے ماہنامہ "ساقی" میں اپنے مضمون "ادبی چوری" میں 'انگارے' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کچھ عرصہ ہوا جب چند لوگوں نے اُردو ادب کی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں ORIGINAL افسانے لکھ کر اپنے ملک کی موجودہ دماغی، روحانی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی اصلیت کو پیش کیا تو لوگوں نے وہ ہائے توبہ مچائی کہ کچھ عرصہ تک کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کیونکہ لوگوں کے کان اور آنکھیں اور دماغ جھوٹ کے عادی ہو چکے تھے وہ اب حقیقت کی اس تیز روشنی کو برداشت نہ کر سکے جو آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی اور دماغ کو ہلا دیتی ہے۔" (ص ۱۱)

احمد علی کے اس بیان کے پہلے حصے میں کچھ مبالغہ ہے۔ شاید اس لیے کہ مضمون میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُردو کے اکثر افسانوں کے

پلاٹ اور مرکزی خیال مغربی افسانوں سے ماخوذ ہوتے ہیں اور اس لیے وہ ہندوستان کی حقیقی معاشرت کی عکاسی نہیں کرتے ۔ لیکن پریم چند کی بیش تر کہانیوں پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا ۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ' انگارے ' کے مصنفین نے ہندوستان کی سماجی ' اخلاقی اور ذہنی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا یا انھیں بے نقاب کیا جنھوں نے اس سے قبل یا تو افسانہ میں جگہ نہ پائی تھی اور یا پھر آزادی اور جرأت سے ان کے بارے میں لکھا اور سوچا نہ گیا تھا ۔ مواد اور موضوع کی ندرت سے قطع نظر ' انگارے ' کا ایک چونکا دینے والا عنصر ان کی انوکھی تکنیک اور کہانیوں میں زبان و بیان کا آزادانہ تخلیقی استعمال ہے جو ان کے مواد سے مطابقت رکھتا ہے ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتہاد میں مترجم کے ہم عصر افسانوی ادب کے بعض اہم رجحانات اور تحریکات سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ خاص طور پر جیمس جوائس اور ورجینا ولف کے اسلوب فن سے ۔ جنھوں نے شعور کی رو اور آزاد تلازمۂ خیال کی تکنیک کو اپنی تخلیقات میں نمایاں طور پر برتا ۔ حقیقت نگاری کا یہ انداز کہانی کے روایتی فن سے گریز اس لیے بھی تھا کہ یہ افسانہ میں پلاٹ اور کردار نگاری کے اس احساس سے تقریباً عاری تھا جو اس سے قبل اردو افسانہ کا عام انداز تھا ۔ کہانی یہاں کسی منطق ' فنی ' تار چڑھاؤ یا کسی منصوبہ کی تابع ہونے کے بجائے نہایت شکستہ بے ربط اور بظاہر بکھری ہوئی شکل میں ملتی ہے اس نئے اسلوبِ فن کے مطابق افسانہ میں کسی کردار کو اس کے شعور اور حافظہ کے آزادانہ عمل کے آئینہ میں براہِ راست قاری سے متعارف کرایا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ زبان اور طرز بیان کے مانوس روایتی طریقہ سے گریز بھی فطری ہو گیا ۔ نگم اور بعض دوسرے ناقدین نے ان کہانیوں میں جس طرز بیان کو سوقیانہ یا عامیانہ کہا ہے ۔ وہ دراصل زندگی کے کھردرے اور کہیں کہیں گھناؤنے روپ میں ایک نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش ہے ۔ صرف یہی نہیں ' انگارے ' میں چند کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں سرایلسٹ حقیقت نگاری کا انداز بھی جھلکتا نظر آتا ہے[1]

یہ فنی تحریک فرانس کی نسبتاً زیادہ انتہا پسندانہ تحریک تھی ' جس سے لوئی اراگاں اور پال ویلری جیسے ترقی پسند دانشور بھی ۱۹۳۰ء کے قبل وابستہ رہے ۔ سرایلزم کے زیر اثر امیجز اور علامتوں کے ذریعہ انسان کے لاشعور کی مصوری پر زور دیا جاتا تھا ۔ سرایلسٹ فنکار اپنے ماضی اور حال کے بورژوا تہذیبی اداروں اور کھوکھلی بے جان قدروں سے باغی اور بے زار تھے ۔ انگارے کی بعض کہانیوں میں بھی ذہن و فکر کا یہ انداز اور کہیں کہیں لاشعوری کیفیات کا علامتی اظہار ملتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ سرایلسٹ کی طرح یہ کہانیاں ناقابل فہم نہیں بن سکی ہیں ۔ دوسرے یہ کہ لاشعوری نقوش بھی سماجی احساس و شعور سے عاری نہیں ہیں اس کی ایک نمایاں مثال سجاد ظہیر کی کہانی " پھر یہ ہنگامہ " ہے ۔ جو ایک ایسی سرایلسٹ تصویر سے مشابہ ہے جس میں مختلف رنگوں میں متصادم قسم کے نقوش ثبت ہوں ۔ کہانی ابتدا سے آخر تک ایک ایسی خود کلامی ہے جس میں شعور اور لاشعور آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں ۔ اس میں جو منظر اور ذہنی پیکر ہیں وہ بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے ربط ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ کہانی اس عہد کے ایک ایسے ہندوستانی نوجوان کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئینہ بن جاتی ہے جو ایک بے قرار روح اور دردمند دل رکھتا ہے ۔ یہ چند تصویریں دیکھیے ۔

" عقل اور ایمان ' آسمان اور زمین ' انسان اور فرشتہ ' خدا اور شیطان ...... سوکھی ہوئی خشک زمین جو برسات میں بارش سے سیراب ہو جاتی ہے اور اس میں سے عجیب طرح کی خوشگوار سوندھی خوشبو آنے لگتی ہے ۔ قحط میں لوگ بھوک سے مرتے ہیں ' بوڑھے بچے ' جوان مرد عورت ـــــ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ۔ ہڈیاں پسلیاں جھری پڑی ہوئی کھال کو چیر کر معلوم ہوتا ہے باہر نکلی پڑ رہی ہیں ۔ بھوک کی تکلیف ' ہیضہ ' قے ' دست ' مکھیاں ' موت ' کوئی لاشوں کو گاڑنے یا جلانے والا نہیں ۔ لاشیں سڑتی ہیں ان میں سے بدبو آنے لگتی ہے ۔ یہ پہاڑ جن کی چوٹیاں نیلے آسمانوں سے جا کر ٹکراتی ہیں کیوں کھڑے ہیں ؟ سمندر کی لہریں ' چاروں طرف سانپ رینگ رہے ہیں ۔ کالے کالے لمبے لمبے پھن اٹھا کر جھوم رہے ہیں ۔ ان کو کون مارے ؟ کس چیز سے ماریں ؟ " (ص ۵۵ - ۵۶)

---

[1] حال ہی میں علی سردار جعفری نے دِلّی کی ایک ادبی محفل میں انکشاف کیا کہ سجاد ظہیر نے ان سے انگارے کی کہانیاں لکھتے ہوئے فرانس کی تحریک " سورریلزم " سے اپنی اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے ۔

"برسات میں بادل کی گرج اور پہاڑوں کی تنہائی میں ایک چشمے کے بہنے کی آواز لہلہاتے ہوئے شاداب کھیت اور بندوق کے فیر کی تڑاخے دار صدا۔ اس کے بعد ایک زخمی سارس کی دردناک قائیں قائیں قائیں قائیں۔" (ص ۱۶۶-۱۶۷)

کہانی یہیں ختم ہوجاتی ہے۔ درمیان میں دوسرے بہت سے منظر بھی آتے ہیں۔ یہاں پہاڑ کی چوٹیاں، آسمان، نہریں، سانپ، فیر کی آواز اور زخمی سارس کی دردناک پکار ایسی علامتیں ہیں جو کہانی کے دوسرے ذہنی پیکروں سے زندہ تعلق رکھتی ہیں اور اسی تعلق سے ان کی معنویت ابھرتی ہے۔ یہ کہانی انسان کی مجبوری اور بے بسی کا کرب ناک احساس ہی نہیں، اس کی زندگی اور موت، غلامی اور آزادی اور اس کے دُکھ سکھ کے بارے میں بہت سے سوالات قاری کے ذہن میں پیدا کردیتی ہے۔

احمد علی کی کہانی "بادل نہیں آتے" میں اسی طرح متوسط طبقہ کے مسلم گھرانہ کی ایک شادی شدہ لڑکی کی ذہنی رَو کا انکشاف نظر آتا ہے۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک دین دار مولوی سے کردی جاتی ہے۔ گھر سے باہر لوگ اسے متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں دعائیں اور تعویذ لے جاتے ہیں...... وہ سوچتی ہے:

"نگوڑے بادل نہیں آتے۔ گرمی اس تڑاخے کی پڑ رہی ہے کہ معاذ اللہ تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح بُھنے جاتے ہیں...... عورت کمبخت ماری کی بھی کیا جان ہے...... کام کرے کاج کرے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بچے جننا۔ جی چاہے نہ چاہے۔ جب میاں موئے کا جی چاہا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ ادھر آؤ میری جان۔ میری پیاری۔ تمہارے نخرے میں گرم مصالحہ۔ دیکھو تو کمرے میں کیسی ٹھنڈک ہے۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک ارے آؤ۔ ہٹو پرے۔ تم پر ہر وقت کم بخت شیطان ہی سوار رہتا ہے۔ نہ دن دیکھو نہ رات۔ ہائے مار ڈالو۔ کٹاری مار دو نہ۔ ہائے نگوڑا مروڑا۔ کہاں بھاگی جاتی ہو۔ سینے سے چمٹ کے لیٹ جاؤ۔" (ص ۷۳-۷۴)

یہاں ایک کریہہ جنسی منظر کو بیان کرنے کے لیے ایسے ہی مکروہ اور سوقیانہ اندازِ بیاں سے کام لیا گیا ہے جس سے عورت کے حقیقی ردعمل اور ذہنی حالت کا اظہار ہوسکے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کہانی میں ایک مولوی کو جنسی لذت پرستی، عورت کی بے بسی اور نہایت تعفن خیز ازدواجی تعلق کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ تکنیک اور طرزِ بیان کے اعتبار سے بھی کہانی میں فن کا ایک اچھوتا انداز سامنے آتا ہے۔ یعنی داخلی خودکلامی کے ذریعہ مصنف کی مداخلت کے بغیر کردار کی ذہنی رو کا اظہار و انکشاف۔ یہاں جو اشخاص ہیں۔ ان کے درمیان جو مکالمے ہیں ان پر نہ تو افسانہ نگار راوی کی حیثیت سے کوئی تبصرہ کرتا ہے نہ قاری کو یہ بتاتا ہے کہ فلاں مکالمہ فلاں کا ہے، نہ کسی مکالمہ کو واوین میں لکھا گیا ہے۔ ساری عبارت بیانیہ ڈھنگ سے ایک سلسلہ میں لکھی ہوئی ہے۔ اُردو افسانہ میں یہ ایک نیا تجربہ تھا جسے بعد میں قرۃ العین حیدر اور خود احمد علی نے زیادہ فنی مہارت سے برتا۔ مہاوٹوں کی ایک رات اور سجاد ظہیر کی کہانی "نیند نہیں آتی" بھی اسی تکنیک اور اسلوب کی نمائندہ ہیں۔

تکنیک کی جدت کے علاوہ ان کہانیوں میں جو کردار ہیں وہ اردو کے عام افسانوی کرداروں سے زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار ہیں۔ ان کے وجود کے مختلف پہلوؤں کا اظہار زیادہ آزادانہ ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ ان کے ذہن و شعور کے ایسے نادیدہ علاقوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے جہاں اُردو افسانہ کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان افسانوں میں جذباتیت اور ہیجانی جوش کی فراوانی ہے۔ جس نے اکثر طنز کی صورت اختیار کرلی ہے۔ مذہب کے نام پر انسانوں کے استحصال اور ریاکار مولویوں کی باطنی خباثت کو بے نقاب کرنے کے لیے جس طرح طنز و تضحیک کا سہارا لیا گیا ہے اس میں فکر کی گہرائی کم اور جذباتی اُبال کا عنصر زیادہ ہے۔ نومشقی کی بعض دوسری خامیاں بھی مل جاتی ہیں۔ تاہم اس مجموعہ میں چند کہانیاں ایسی بھی ہیں جو ان کمزوریوں سے تقریباً پاک ہیں۔ ان میں حقیقت نگاری اور فن کا ایک بلند اور نکھرا ہوا احساس ملتا ہے۔ یہ کہانیاں ہیں سجاد ظہیر کی 'دلاری'، احمد علی کی 'مہاوٹوں کی ایک رات' اور محمود الظفر کی 'جواں مردی'۔ حقیقت نگاری کا جو تصور ان کہانیوں میں نظر آتا ہے وہ تصور پرستی اور تخیلی رنگینی سے پاک ہے۔ اس میں انسان کے دکھ درد اور اس کی محرومیوں اور روحانی اذیتوں سے نہ صرف گہری ہمدردی کا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ اس ماحول اور ان حالات کے خلاف نفرت کا شدید احساس بھی پیدا کردیتا ہے جن میں انسان بے کراں دکھ اور محرومیوں کا شکار ہے۔

'دلاری' کو لیجیے ایک امیر اور باعزت گھرانے میں پرورش پانے والی ایک بے سہارا لڑکی یعنی لونڈی کی کہانی ہے۔ بظاہر یہ ایک سیدھی سادی روایتی ڈھنگ کی کہانی ہے لیکن اس میں کرداروں کی پیچیدہ نفسیات اور ان کی اخلاقی قدروں کی آویزش کا موازنہ اور مطالعہ نہایت دقتِ نظر اور فنی حسن سے کیا گیا ہے۔

دلاری شیخ ناظم علی کے گھر میں لونڈی کی طرح پلتی ہے "جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی (میٹھا) بنا دیتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی......"

تہوار کے دنوں میں کبھی کبھی اچھے کپڑے پہن لیتی تو سج جاتی۔ شب برات کا دن تھا۔ وہ اندر شربت بنانے گئی تو بڑے صاحب زادے کاظم بھی پہنچ گئے ——— دلاری نے مڑ کر پوچھا۔ آپ کے لیے لون سا شربت تیار کروں مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دلاری کو آنکھ بھر کر دیکھا ——— دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دی اور اسے گلے سے لگایا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دے دیا...... وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے جا رہے تھے۔" (ص ۴۰، ۴۴، ۴۵)

اور پھر وہ رات کی تنہائیوں میں اسی طرح ملتے رہے۔ کاظم کی پیار بھری باتیں دلاری کے کانوں میں اس طرح گھومتی رہیں اور پھر کاظم کی شادی ایک امیرزادی سے طے ہو گئی۔ جب شادی کے چند روز باقی تھے تو اچانک دلاری گھر سے فرار ہو گئی اور چند مہینوں بعد وہ غریب رنڈیوں کے محلے میں دیکھی گئی۔ کاظم علی کا بوڑھا نوکر اسے کسی طرح بہلا کر گھر لے آیا۔ سب لوگ اس کا تماشا دیکھنے اور ترس کھانے کے لیے جمع ہو گئے۔ بیگم ناظم لعن طعن کرنے لگیں۔ ایک نجس ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھ کر سب اپنی بڑائی محسوس کر رہے تھے۔ مردار خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بے کس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

دلاری سب کا نشانۂ ملامت بنی' بے حس اور ساکت بیٹھی تھی۔ اچانک کاظم علی اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور ماں سے کہنے لگے:

"امی! خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی کیا حالت ہو رہی ہے؟"

دلاری اس آواز کو سننے کی تاب نہ لا سکی...... اس روحانی اذیت اور کوفت نے اسے اس وقت نسوانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے ہٹنا شروع کیا مگر یہ ایک مجروح پرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی وہ پھر فرار ہو گئی۔

یہ کہانی کا بہت بے کیف سا خلاصہ ہے۔ اس کا حُسن دلاری کے تجزیۂ نفس اور اس کے جذبات کی ایسی ترجمانی میں پوشیدہ ہے جس سے وہ ایک مکمل انسان کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے اس کے مقابلے میں کاظم اور دوسرے افراد کا قد اور ان کی کھوکھلی قدریں حقیر ہی نہیں غیر انسانی معلوم ہوتی ہیں۔ دلاری سب کی ملامت برداشت کر لیتی ہے لیکن جب کاظم اس پر رحم کھاتا ہے تو وہ تڑپ اٹھتی ہے۔ کاظم جس کے آغوش میں اس نے اپنا کنوارپن اپنے مدھر خواب اور معصوم جذبات کا سارا سرمایہ لٹا دیا تھا۔ جس کی زبان سے وہ صرف پیار کے لفظ سننے کی عادی تھی اب وہ اس پر ترس کھائے؟ یہ اس کی غیرت کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کی نسوانی حمیت اس اذیت' اس ذلت کو سہنے کے مقابلے میں رنڈی بن کر زندہ رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔

دلاری اور 'انگارے' کی دوسری کہانیوں میں فن کا یہی وہ نیا تصور تھا جس نے نہ صرف حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی جیسے نوجوان ادیبوں کو متاثر کیا بلکہ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیبوں کو بھی اپنے فن کی پرانی روش بدلنے اور 'کفن' اور "نئی بیوی" جیسے افسانے لکھنے پر اکسایا۔

واقعہ یہ ہے کہ 'انگارے' کی کہانیوں میں وہ تمام اہم رجحانات پوشیدہ تھے جو بعد میں ہمارے نئے افسانے میں زیادہ مہارتِ فن اور امتیازی حسن کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ مثال کے طور پر جنسی نفسیات اور تجربات کا بے لاگ حقیقت پسندانہ بیان جس نے بعد میں منٹو' عصمت چغتائی' عزیز احمد' حسن عسکری اور دوسرے افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں ایک میلان کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے ابتدائی نقوش اسی مجموعے میں ملتے ہیں

ی طرح شعور کی رَو اور تکنیک کے دوسرے کامیاب تجربے جو بعد میں قرۃ العین، ممتاز شیریں اور کرشن چندر کی کہانیوں میں سامنے آئے وہ اسی مجموعے میں متعارف ہوتے تھے۔ متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی زندگی اور ذہنی الجھنوں کی مصوری، گھریلو جزئیات کا بیان اور اس طبقے کی عورتوں کی زبان، محاوروں اور فقروں کو کہانی کی زبان میں داخل کرنا عام طور پر عصمت کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے جس کی تقلید بعد میں دوسری افسانہ نگار خواتین نے کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس رجحان کا آغاز بھی 'انگارے' میں شامل احمد علی اور رشید جہاں کی کہانیوں سے ہوتا ہے جن میں دِلّی اور یو۔ پی کے متوسط گھرانوں کے مرقعے ان ہی کی زبان میں کھینچے گئے ہیں[1]۔ اسی طرح اس انقلابی فکر اور سماجی حقیقت نگاری کا نقشِ اوّل بھی اس مجموعے کی کہانیوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس کی نمائندگی بعد میں کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری اور دوسرے افسانہ نگاروں نے کی۔

اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ 'انگارے' کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔ بوسیدہ عقیدوں، فرسودہ اداروں، سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی و اخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔ امیروں، حاکموں اور اہلِ اقتدار کے مقابلے میں زیر دستوں، ناداروں، مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دَور کی آمد کا اعلان تھی جب تخلیقی ادب کی بنیاد طبقاتی شعور اور اشتراکی انسانی دوستی پر رکھی جاتی تھی۔ موضوع مواد اور فن کے نئے تجربے، تخلیقی اظہار کے ان بے شمار نئے سانچوں کی جستجو کی علامت تھے جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں نقطۂ کمال تک پہنچنا تھا۔ اسی لیے وقار عظیم نے کہا ہے کہ "انگارے نئے اور پرانے افسانے کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو دونوں کو جوڑتی نہیں بلکہ الگ کرتی ہے۔"

---

[1] رشید جہاں کی جو کہانی 'دِلّی کی سیر' اس مجموعے میں شامل ہے وہ نسبتاً کمزور ہے لیکن ان کی دوسری کامیاب کہانیوں مثلاً 'چھدّا کی ماں'، 'آصف جہان کی بہو' اور 'بے زبان' وغیرہ میں یہ رجحان نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

کالی پوت کے لچھے

علی باقر ــــــــــ

کالی پوت کے لچھوں سے میری مراد کالے موتیوں کی وہ لڑیاں نہیں ہیں جو حیدرآبادی سہاگنیں اپنے گلے میں پہنتی ہیں ــــ ویسے کالی پوت کے لچھے مجھے بہت پسند ہیں ــــ چھوٹے چھوٹے، کالے کالے، چمکتے ہوئے موتی، ہم شکل، ہم رنگ، ہم وزن، ایک دوسرے سے کندھا ملائے، سر نیوڑھائے، مضبوط دھاگے میں پروئے ہوئے سہاگنوں کے گلے کی زینت بنے رہتے ہیں۔ کالی پوت کے لچھوں سے میری مراد دراصل بنّے بھائی کی وہ تحریریں ہیں جو انھوں نے مارچ ۱۹۶۸ء اور مئی ۱۹۷۳ء کے درمیان مجھے اور نجمہ کو لکھے۔ یہ خط دلّی، حیدرآباد، سری نگر، الجیریا، روم اور ماسکو وغیرہ سے لکھے گئے تھے۔ ان میں کچھ پوسٹ کارڈ بھی تھے، ایرلیٹر بھی اور طویل خط بھی۔ بنّے بھائی تین چار ہفتے میں ایک بار ضرور خط لکھتے۔ سالگرہ یا ایسے ہی دوسرے خاص موقعوں پر ان کے خط ضرور آتے۔ کبھی بنّے بھائی کا خط میرے نام ہوتا، کبھی نجمہ کے اور کبھی ہم دونوں کے۔ ہم لوگوں کے پاس ان کے کوئی ستّر خط محفوظ ہیں، آٹھ دس انگریزی میں ہیں اور باقی اُردو میں۔

بنّے بھائی بہت خوش خط تھے، وہ چھوٹے چھوٹے حروف میں خط لکھتے۔ ان کی تحریر دیکھنے ہی سے پتہ چل جاتا کہ لکھنے والے نے بڑی محنت سے لکھا ہے، پڑھتے ہی یقین ہوجاتا کہ بڑی محبّت سے لکھا ہے۔ میں جب بھی بنّے بھائی کی تحریر دیکھتا ہوں تو مجھے حیدرآبادی سہاگنوں کے گلے میں پڑی ہوئی کالی پوت کی مہین قطاریں یاد آجاتی ہیں ــــ ویسی ہی خوبصورتی، ویسا ہی تسلسل، ویسا ہی پیام کہ محبت کرنے والا ابھی زندہ ہے، سہاگ ابھی سلامت ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ خط نصف الملاقات ہوتا ہے۔ بنّے بھائی کا خط آدھی ملاقات سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ وہ بڑی تفصیل سے سب باتیں لکھتے تھے جیسے کلاسیکل مصوّر کی تصویروں میں ہر چھوٹی چھوٹی بات کی تفصیل ہوتی ہے۔ وہ ہر موضوع کے بارے لکھتے ــــ گھر کی باتیں، محلے واروں کی باتیں، دوستوں اور عزیزوں کی باتیں، سیاست اور سیاسیات کی باتیں، معاشیات کی باتیں، ادب کی اور ادیبوں کی باتیں، شعر و حکمت کی باتیں، شاعروں کی باتیں، وطن کی باتیں، حُبّ الوطنی کی باتیں۔ بنّے بھائی خط لکھتے تو ایسا لگتا کہ وہ اپنے ماحول سے پوری طرح باخبر تھے اور چونکہ ان کی نظر گھر کی چار دیواری میں، یا کسی اور چار دیواری میں مقیّد یا محدود نہ ہوتی تھی، ان کی تحریروں میں کسی خاص قسم کی پابندی نہ ہوتی۔ خط لکھتے وقت وہ جو محسوس کرتے ہوتے، لکھ دیتے۔ ان کی نظر بسیط تھی، ان کی زبان سلیس تھی، ان کا لہجہ نرم تھا، ان کا طرز محبّت سے بھرپور تھا۔ بنّے بھائی کے خط ان کی شخصیت کی طرح جاذبِ نظر ہیں، خوش شکل ہیں، خوش لہجہ ہیں، سنجیدہ ہیں، مخلص ہیں، منفرد ہیں، محبوب ہیں۔

اس مضمون میں میں بنّے بھائی کے کچھ خطوط سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہوجائے کہ وہ

تحریریں جو بنّے بھائی نے شائع کروانے کی غرض سے نہیں لکھی تھیں کس قدر سلجھی ہوئی، کس قدر مہذب، کس قدر پرکشش، کس قدر عالمانہ ہیں ۔ وہ روزانہ چھ آٹھ خط لکھا کرتے تھے ۔ ان خطوں میں دورِ حاضر کی تاریخ چھپی ہوئی ہے اور ایک ترقی پسند، منصف مزاج شخص کا کیا ہوا تبصرہ اور تجزیہ ۔ یہ خطوط بنّے بھائی کا دیا ہوا ایک عظیم عطیہ ہیں مگر یہ خط کچھ اس طرح منتشر ہیں کہ ان کو ایک جگہ جمع کرنا مشکل ہے۔

بنّے بھائی نے اپنی بیٹی اور داماد کو جو بھی خط لکھے تھے ان کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۲۸ر اپریل ۹۶۸ء دلّی

"کل یہاں سوویت کے کلچرل ڈپارٹمنٹ میں مشاعرہ تھا۔ سوویت سے دو شاعر آئے ہیں۔ ایک مرد اور عورت شاعرہ۔ پھر دلی کے شاعر بھی مدعو تھے ۔ ہم نے مشاعرے کی صدارت کی ۔ سردار جعفری بھی تھے اور مشاعرہ اچھا رہا۔"

"مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ تم کو اپنی پروفیسر ڈاکٹر مک لین اچھی لگیں اور تم نے کام بھی شروع کر دیا ہے ۔ یہ تمھاری بڑی خوش قسمتی ہے کہ تمھارے تینوں استاد کرشنن، تلوار اور اب مک لین اچھے اور قابل لوگ نکلے اور ان کے ساتھ کام کر کے تم بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کو اُبھار سکیں ۔ امید ہے کہ انگلینڈ میں جو کام تم کروگی اس سے تم کو ناموری حاصل ہوگی۔"

"تو تم لوگ آکسفورڈ گھوم آئے ؟ تم کو آکسفورڈ تو ضرور اچھا لگا ہوگا اور امید ہے کہ علی میاں نے تم کو ہمارا نیو کالج بھی دکھایا ہوگا ۔ اب تم ایک مرتبہ جون یا جولائی میں آکسفورڈ ضرور جانا ۔ جب وہاں کالجوں کے باغ میں پھول کھلے ہوتے ہیں۔"

"یہ تو عبداللہ ملک نے دوستی کی حد کر دی کہ تم لوگوں کو لینے ایرپورٹ بھی گئے ۔ وہ ہمارے بہت اچھے دوست ہیں اور مرا دل ان سے ملنے کو بہت چاہتا ہے ۔ کیا مشکل ہے کہ ہم لوگ مل ہی نہیں سکتے !"

۱۳ر مئی ۹۶۸ء

"گھر کی ایک اہم خبر یہ ہے کہ منو کا پالا ہوا چوزہ جوانی کی منزل کو پہنچ گیا اور اب باقاعدہ انڈے دینے لگا ہے ۔ اس مُرغی کی قدر و منزلت اب گھر میں کافی بڑھ گئی ہے۔"

"میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا ۔ کارل مارکس کی ڈیڑھ سو سالہ برسی کے موقع پر میں نے سپرو ہاؤس میں ایک مقالہ انگریزی میں پڑھا "کارل مارکس کا اثر ہندستانی ادب پر"۔ حالانکہ میں اپنے مقالے سے زیادہ مطمئن نہیں تھا مگر لوگوں نے اسے پسند کیا جس سے میری پست ہوتی ہوئی انا کو سہارا ملا۔"

۱۲ر جون ۹۶۸ء

"مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ تم دونوں اچھے اچھے کام کر رہے ہو اور اتنا پیسہ بھی کما رہے ہو ۔ مجھے ناصح

بننے کی خواہش نہیں مگر اپنی محنت کی سب کمائی لُٹانا نہیں، کچھ بچاتے بھی رہو۔ میں جب انگلستان میں پڑھتا تھا تو جو کچھ مجھے ملتا تھا خرچ کر دیتا تھا حالانکہ سوچا یہی تھا کہ ہر مہینے کچھ پاؤنڈ تو بچا سکوں گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ خوش رہو، کچھ ایسی باتیں بھی کرو کہ چھپا وا ہو مگر ایک مصروف زندگی گزارو، اخلاقی، رُوحانی اور جمالیاتی تسکین حاصل کرو۔"

"میں جنوبی ہند کے دورے کے بعد ابھی دہلی واپس لوٹا ہوں ـــــ تامل ناڈو آرٹ اور ادب کے فیڈریشن کی کانفرنس میں شرکت کرنے گیا تھا۔ مجھے تو تامل لوگ اور ان کا معاشرہ بہت ہی پیارا لگا۔ علی کیا تمھیں معلوم ہے کہ (چینی کے بعد) تامل دنیا کی سب سے پُرانی زندہ زبان ہے اور ان کا ادب کتنا بیش بہا ہے۔ میں نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی ہے اور تمھیں اس کی کاپی بھیجوں گا۔"

"ان دنوں فرانس میں کس قدر عمدہ تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کارل مارکس کا کہا سچ ہو رہا ہے اور سرمایہ داری نظامِ مغرب کے متمول ممالک میں جلد دم توڑ دے گا۔ ان دنوں مجھے پیرس کے وہ حصے یاد آتے ہیں جہاں میں نے مہینوں قیام کیا تھا۔ اب تو انگلستان میں بھی ـــــ حد یہ ہے کہ سوتے ہوئے آکسفورڈ میں بھی ـــــ طلبا نے زور دکھانا شروع کر دیا ہے۔"

۱۸ر جولائی ۶۸ء

"گزشتہ ہفتے میر عابد علی خاں حیدر آباد سے آئے۔ وہ لندن ہو کر امریکہ جا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ تمھاری ممی نے کچھ مسالے اور ایک ریکارڈ تمھارے لیے بھیجا ہے۔ لندن میں تم ان کی خاطر کرنا، وہ ہمارے بہت ہی اچھے دوست ہیں۔"

"دہلی کا موسم بڑی سخت گرمی کے بعد اب اچھا ہو گیا ہے۔ خوب بارش ہو رہی ہے۔ ایسے اچھے موسم میں تم بہت یاد آتی ہو۔ ہم لوگ خوب آم کھاتے ہیں، آج کل لنگڑے بہت اچھے مل رہے ہیں۔"

"اس زمانے میں ہم نے کئی بڑے لمبے چوڑے مضمون لکھے ہیں جو ہمارے اخباروں میں (اُردو اور انگریزی میں) چھپے ہیں۔ کاش کہ تم اور علی میاں پڑھ سکتے! ممی نے کل ایک بڑی اچھی کہانی لکھی ہے۔ آج اسے ریڈیو پر ریکارڈ کرنے گئی تھیں۔ تم لوگ آل انڈیا ریڈیو کبھی سنتے ہو؟"

۷ر اگست ۶۸ء

"بہت ہی پیاری نجمہ ـــ تمھیں سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ تمھاری عمر کیا ہے یا شاید حساب لگانے میں کاہلی کر جاتا ہوں (تمھارے نکاح کے وقت جب مولوی صاحب نے تمھاری عمر مجھ سے پوچھی تو میں کوئی جواب نہ دے سکا)۔ ملک سے باہر، گھر والوں سے دور، شادی کے بعد یہ تمھاری پہلی سالگرہ ہے اس لیے

تم ہمیں بہت یاد آرہی ہو۔"
"ایک اچھی خبر یہ ہے کہ اب بی بی ہمارے ساتھ رہتی ہیں اور ان کو نیشنل اسکول آف ڈراما میں داخلہ مل گیا ہے۔ انھیں
اپنا کام بہت پسند ہے اور اپنے گرو، القاضی صاحب، کو تو دنیا کا سب سے اہم آدمی تصور کرتی ہیں۔ تمھیں یہ سن کر
تعجب ہوگا کہ اب بی بی صبح ۶½ بجے اُٹھ جاتی ہیں اور جلدی جلدی تیار ہوکر ۸ بجے کی بس سے روانہ ہوجاتی ہیں۔"
"اس سال اچھی خاصی بارش ہوگئی اس لیے غلّے کی کمی نہ ہوگی۔ ویسے بھی ملک میں خاصا امن اور چین ہے۔ یوپی اور
بنگال میں الیکشن ہونے والے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یوپی میں کانگریس کی اکثریت ہوگی اور بنگال میں یونائیٹڈ
فرنٹ کی۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

۱۹ راگست ۶۸ء
"میں بلغاریہ نہ جا سکا حالانکہ عالمی یوتھ فیسٹول میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا لیکن اب مجھے تاشقند
میں ہونے والی ایفروایشین رائٹرس سیمنار کا دعوت نامہ ملا ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا اور اگر تاشقند سے ماسکو پہنچ
سکا تو لندن سے واپسی کا بندوبست کردں گا۔"

۱۰ ستمبر ۶۸ء
"کل تمھارا رجسٹرڈ خط اور اس کے ساتھ کے کاغذات مل گئے۔ اب مجھے اطمینان ہوگیا کہ ان دستاویزوں کے ساتھ انگریز
بہادر انگلستان میں ہمارے آنے پر کوئی اعتراض نہ کریں گے۔ سنو بھئی، ابھی ہمارا وہاں آنا قطعی نہیں۔ اس بات
کے لیے تمھارا شکریہ، تم کہتے ہو کہ اگر میں بندوبست نہ کرسکوں تو تم ماسکو سے لندن تک کا خرچہ برداشت کروگے۔
لیکن میں اس صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ ہندوستان کے قدیم اور اچھے دستور کے مطابق باپ کو
لڑکی یا داماد کو زیر بار نہ کرنا چاہیے۔ تم لوگ انگلستان میں میری مہمان داری کروگے، یہی ایک جدّت ہے لیکن شاید
قابلِ برداشت۔ اس سے زیادہ تو وہی بات ہوگی جس کے متعلق ہماری دیہاتی ماں، نجمہ کی دادی کہا کرتی تھیں 'لاددے
لدادے اور لدانے والا ساتھ کردے'، جو اچھا نہیں لگتا۔ یہ سب تم کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میری سخت خواہش کے
باوجود کہ میں وہاں آؤں، اگر بالفرض میں نہ آسکا تو تم کو زیادہ مایوسی نہ ہو۔ مایوسی تو مجھے بھی اسی قدر ہوگی لیکن
بہتر یہی ہے کہ ہم اس ناخوش گوار صورتِ حال کے امکان کو بھی مدِنظر رکھیں۔"
"ہاں ہم بھی کام کرتے ہیں، ممی اگر تو ـــ ہم بہ مشکل پندرہ یا بیس، پھر شام کو پارٹیوں میں جاتے ہیں، ہفتے میں دو بار
پارٹی دفتر، مضامین اور بے شمار خط ـــ اور ترقی پسند مصنفین کو INSPIRE کرتے ہیں! شاید اپنی مسکراہٹ سے
ـــ اور خاموشی سے!"

۱۰ ستمبر ۶۹ء

"جیسا کہ میں نے تمہیں کسی خط میں لکھا تھا میری آکسفورڈ کے زمانے کی ایک دوست، مسز گورٹن پچھلے ہفتے دلّی آئیں۔ تیس سال بعد ان سے ملتے ہوئے بڑے عجیب قسم کا احساس ہوا۔ رضیہ اور مسز گورٹن میں خاصی دوستی ہوگئی ہے۔"

"کل یہاں کل ہند ہڑتال ہو رہی ہے، مرکزی حکومت کے ملازمین کی ـــ ایک دن کی احتجاجی ہڑتال۔ حکومت اس کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے اور بہت سے لوگ گرفتار کیے جا چکے ہیں۔"

۳۰ ستمبر ۶۹ء ۔ ماسکو

"پرسوں شام ۲۸ کو ہم تاشقند سے ماسکو پہنچے۔ ہم دلّی سے براہ کابل سیدھے تاشقند گئے۔ کابل میں تاشقند کا جنازہ نکل چکا تھا، اس لیے مجبوراً تین دن رُکنا پڑا۔ ۲۳ کی شام کو تاشقند پہنچے۔ کانفرنس میں تین دن شرکت کی۔ بڑی زبردست دعوتیں کھائیں۔ سمرقند بھی ایک دن کو گئے، تیمور لنگ کا مقبرہ اور ان کی ملکہ بی بی خانم کی مسجد دیکھی۔ پلاؤ اور سیخ کباب کھایا، شوربہ اور کونیاک پی اور اب یہاں آگئے۔

تم کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میری نظموں کا مجموعہ 'پگھلا نیلم' روسی زبان میں شائع ہوگیا ہے۔ کل مجھے اس کی کاپیاں ملیں۔ یہاں پہلے اس کا نثری ترجمہ کیا گیا پھر ایک مشہور شاعر نے اُسے منظوم کیا۔"

"کل ایک روسی دوست نے دعوت کی تھی۔ وہاں ہمارے سفیر کیول سنگھ بھی مدعو تھے۔ ماسکو میں غالب کی صدسالہ سالگرہ کے جشن کی (اگلے سال فروری میں) بڑی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کیول سنگھ خوب آدمی ہیں، نہایت مہذب اور پڑھے لکھے۔ ان کے کہنے سے غالب پر میں نے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔"

۲ نومبر ۶۹ء

"ہم کل یکم نومبر کو بہت ساری اچھی یادوں اور بہت سے تحفوں سے لدے پھندے بخیریت تمام گھر پہنچ گئے۔ ماسکو میں بڑی قیامت کی سردی تھی، برف پڑ رہی تھی اور ٹمپریچر زیرو سے بھی نیچے تھا۔ کل دو دن وہاں ٹھہرے۔"

"تم دونوں کی بہت یاد آ رہی ہے اور ان بے حد خوش گوار دنوں اور راتوں کی جو تمہارے ساتھ لندن اور آکسفورڈ میں بتائے۔ میں سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ میری زندگی کے خوش گوار ترین زمانوں میں سے تھے۔ سب سے بڑی مسرت تو تم دونوں کی اچھی صحت، اچھی ذہنی اور نفسیاتی حالت، اور خوش و خرم دیکھ کر مجھے ہوئی ـــ پھر میری بھی تم دونوں نے کتنی خاطریں کیں، کتنے عیش کیے ہم تینوں نے مل کر، کیسے کیسے اچھے، دلچسپ نیز لور قسم کے لوگوں سے ملے اور زندگی کو اس کی رنگا رنگی میں دیکھا۔ سب سے اچھا تو مجھے

آکسفورڈ کا سفر لگا۔ راستہ، آکسفورڈ کے کالج اور گلیاں اور سڑکیں اور لان اور باغ اور ایرک اور ان کی اچھی بیوی کی مہمان داری۔ یہ علی میاں کی بڑی خوبی اور خوش قسمتی ہے کہ ان کے اتنے بہت سے دوست ہیں، آخر زندگی کی سب سے بڑی دولت، دوسروں کی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دوستی، محبت اور احترام اور UNDERSTANDING حاصل کرنا ہی ہے، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو خود اپنے کردار سے اسکا اہل بنے۔ میری دعا ہے کہ اپنی لیاقت، انسانیت، ہمدردی اور سمجھ داری کے سبب تم دونوں کو یہ قیمتی روحانی دولت زیادہ سے زیادہ ملتی رہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہے۔"

۲۷ر نومبر ۶۸ء

"معاف کرنا تم کو گذشتہ ہفتے کسی نے خط نہیں لکھا۔ بات یہ تھی کہ اس درمیان سب لوگ دراصل بے حد مصروف تھے اور باتیں اتنی بہت سی تھیں کہ تم کو چھوٹا سا خط کافی نہ ہوتا۔

پہلی اچھی خوش خبری یہ ہے کہ بنّا اور ونّود نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میری غیر موجودگی میں ہی ونود کے والد اور والدہ رضیہ سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے بڑی انکساری سے کہا کہ آپ لوگوں کا خاندان تو ہم سے بہت اونچا ہے لیکن ہم بنّا کو اپنی بیٹی سمجھیں گے۔ پھر کچھ اپنی جائیداد وغیرہ کی باتیں کیں اور یہ کہا کہ ہم لوگ مذہبی فرق کا بالکل خیال نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اہم دراصل ہمارے لیے بنّا کا فیصلہ تھا۔۔۔۔ ونود نے بھی مجھ سے 'باقاعدہ' باتیں کیں، گذشتہ اتوار کو۔ تو اب یہ طے ہوا ہے کہ ان لوگوں کی شادی غالباً فروری میں ہوجائے گی۔"

"میں آج کل اپنا سفرنامہ لکھنے میں مشغول ہوں، تین قسطیں لکھ چکا ہوں۔ میں نے ابھی تک ناول، شعر، افسانے، خطوط، تنقید ہی لکھی تھی۔ سوچا کہ TRAVELOGUE بھی ایک لکھ لوں۔ کوئی دو تین سو صفحوں کی کتاب بن جائے گی، ابھی تک کوئی پچاس صفحے لکھے ہیں جو 'حیات' میں شائع ہوئے ہیں (تین قسطوں میں) ـــــــــ بھئی تم اکبر (حیدرآبادی) سے کہہ دینا کہ ہم نے ان کی غزل، وہی جو لندن میں میر صاحب کے یہاں سنائی تھی، 'حیات' میں شائع کردی ہے۔ اب ہمیں وہ اپنی اور چیزیں بھیجیں!"

۱۰ر دسمبر ۶۸ء

"میں اچھا ہوں، آج کل وہی سفرنامہ لکھنے میں مشغول ہوں۔ اس کی پانچ قسطیں حیات میں چھپی ہیں۔ لیکن ابھی افغانستان کے چار دن کا ہی حال ہے۔ اب ازبکستان میں داخل ہورہا ہوں۔ نور و میاں کے ہاتھ تم کو بھیجوں گا لیکن اس وقت تک شاید انگلستان کا تذکرہ نہ ہو۔ بہرحال تم کو مزہ آئے گا۔"

"تم دونوں نے ہماری شادی کی تیسویں (!) سالگرہ کی تاریخ یاد رکھی۔ بھئی کمال کردیا۔ یہاں بڑی اچھی پارٹی

ہوئی۔ بس گھر کے ہی لوگ تھے۔ البتہ بعد کو مخدوم اور پریم ساگر گپتا بھی اتفاق سے آگئے۔ میں نے ممی سے کہا کہ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مجھے تیس سال تک برداشت کرگئیں! مبارکباد کا شکریہ!"

"علی میاں! تم نے وہ سب کتابیں مجھے بھیجیں یا نہیں جو تمھارے پاس چھوڑ آیا تھا؟ ان کا بہت انتظار ہے۔ میں نے ماسکو، برلن، لندن میں یہاں بھیجنے کے لیے چھوڑے تھے۔ ابھی تک کہیں کا پارسل نہیں پہنچا۔ مجھے اچھے اچھے اور لمبے خط لکھتے رہو۔ بڑی خوشی ہوتی ہے تمھارا خط پاکر۔ تمھارے ساتھ لندن میں رہنے کے بعد تو ہم کافی ایک دوسرے کے دوست بھی ہوگئے ہیں نا! تم دونوں کو ہم سب کی طرف سے عید مبارک!"

۱۲ فروری ۶۹ء

"یہ بتاؤ کہ کتنی نئی، پُرشور، ہنگامہ خیز کتابیں پڑھیں اس زمانے میں۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ وقت نہیں ملتا۔ وقت نکالو۔ نہیں تو تمھارا ذہن، ہمارے اردگرد کے بیشتر پڑھے لکھے دوستوں کی طرح زنگ آلود ہوجائے گا یا یک طرفہ، اور پھر تم اپنے اردگرد کے لوگوں کو بور کرنے لگوگے۔"

"ان دنوں ایک بین اقوامی کانفرنس کے لیے تراب میاں یہاں آئے ہیں۔ ہمارے 'پاس' بھی آئے۔ اپنے ساتھ ایک SWEDE لڑکی کو بھی لائے (وہ سویڈن کی ڈیلی گیٹ ہے) اتنا زیادہ MINI لباس پہنے تھی کہ ممی کو سخت شاک ہوا۔ دراصل بات یہ تھی کہ

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

لیکن لڑکی بڑی انقلابی نکلی۔ کاسترو اور چے گے وارا کی ماننے والی۔ پھر پرسوں رات ہم نے بھی بڑی پارٹی دی۔ تراب، ڈاکٹر ظہیر، الطاف، یہ سوئیڈ لڑکی اور ایک دو آدمی اور آئے۔ بہت ہی اچھی محفل رہی۔ اتنی زیادہ کہ تمھاری ممی ناراض ہوگئیں۔ اور جب سب چلے گئے تو مجھے ایک بڑا لیکچر پینا پڑا۔ (جو دیگر مشروبات کے بعد زیادہ معلوم ہوا)"

۲۸ فروری ۶۹ء

"ان دنوں غالب جشن کے سلسلے میں، ساری دلّی میں غالب کے بہت پُرزے اُڑے۔ پہلے تو وگیان بھون میں ذاکر صاحب نے تقریبوں کا افتتاح کیا۔ اس میں شرکت کے لیے سوویت، امریکہ، انگلینڈ (رالف رسل) چیکوسلواکیہ اور ایران سے علما آئے۔ سوویت سے ہمارے دوست ایکیڈمیشین باباجان غفوروف آئے۔ ان سے ملاقاتیں رہیں۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف پیوپلس آف ایشیا ماسکو کے ڈائرکٹر ہیں — تین دن کا سیمنار بھی غالب کی شاعری اور فکر پر ہوا۔ میں نے بھی مقالہ پڑھا۔ رجعتی بہت تلملائے۔ کیفی نے ایک چھوٹی سی فلم (بیس منٹ) بھی بنائی ہے (بہت ہی اچھی ہے) حبیب تنویر نے ڈراما کھیلا اور شیلا بھاٹیہ نے غالب

پر میوزیکل ڈراما کھیلا۔ اس کے علاوہ نمایش۔ ایک غالب اکاڈمی کھل گئی (ہمدرد والے حکیم عبدالحمید نے نظام الدین میں بڑی خوبصورت نئی عمارت میں قائم کی ہے) اور ایک بائیس لاکھ روپے سرکاری گرانٹ سے بڑی عمارت بن رہی ہے۔ بیچارے غالب، جو اپنی زندگی میں بھیک مانگتے رہے، جن کی شاعری کو ان کے ہم عصروں نے پسند نہیں کیا اور جن کی زبان اُردو کو مٹانے کی کوشش آج بھی ہو رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر کیا کہتے! عجیب و غریب ملک ہے ہمارا!"

۶ر مارچ ۶۹ء
"میری بہت بہت پیاری بیٹی نجمہ اور بے حد پیارے بیٹے علی! اپنی شادی کی پہلی سالگرہ پر میری دلی مبارک باد قبول کرو۔ میرا حافظہ ہمیشہ سے کمزور تھا، اب ساٹھ برس سے زیادہ ہو کر شاید اور بھی کمزور ہو گیا ہے۔ ۲۰ر فروری یا پہلی کو تم کو خط بھیجا، اس میں ساری باتیں اِدھر اُدھر کی لکھیں۔ تم دونوں کو نئی زندگی کی کامیابی، دو نیک اور پاک دلوں کے ارتباط اور محبت کی فراوانی اور مضبوطی اور نت نئی تازگی کی تمنائیں بھیجنا بھول گیا گو کہ اس زمانے میں گھر میں سارے وقت تمھاری ممی اور بہنوں کے ساتھ تمھاری شادی کی ہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ تو لو ان سب دل کی گرم اور بے چین پیار کی لہروں کو اب تمھارے پاس بھیجتے ہیں۔ ہمارے دل کی مضبوطی اور طاقت بھی تو انھیں کی وجہ سے ہے کہ ہمیں ایسے بچے ملے ہیں جن پر ہم فخر کر سکیں۔"

۲۰ر مارچ ۶۹ء
"آج کل دہلی کا سیزن زوروں پر ہے۔ ۲۲ر کو (پرسوں) سری رام والا مشاعرہ ہے لیکن اب چونکہ پاکستانی شاعر نہیں آتے وہ پہلے کا سا مزہ اس مشاعرے میں نہیں رہا۔"
"۲۲ر مارچ کو میں ایک ہفتے کے لیے آسام جا رہا ہوں۔ وہاں آسام کے ترقی پسند مصنفین کی اسٹیٹ کانفرنس ہے جس کا افتتاح میں کروں گا۔ اس کے لیے ایڈریس لکھنا ہے۔ مختلف کتابوں سے آسامی ادب اور آسامی لٹریچر کے بارے میں پڑھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ملک کے مختلف لوگوں کی تہذیب اور کلچر سے (اپنے گروہ کے علاوہ) بہت ہی کم واقف ہیں۔ روس اور امریکہ، انگلینڈ اور فرانس اور جرمنی کے ادب سے تو واقفیت رکھتے ہیں اور یہ بہت کم معلوم ہوتا ہے کہ تامل ناڈو، آسام یا گجراتی ادب میں کیا ہو رہا ہے!"

۱۳ر اپریل ۶۹ء
"میں آسام سے ۳ر کو واپس آیا۔ پھر ۵ر کو سہارن پور گیا۔ غالب پر سیمنار تھا۔ میرا مقالہ بھی تھا۔ ہماری (یعنی ترقی پسندوں کی)

A ٹیم گئی تھی ! ڈاکٹر محمد حسن ، ڈاکٹر نامور سنگھ ، ڈاکٹر قمر رئیس اور میں ۔ معرکہ سر کر لیا ۔ میرا مقالہ لوگوں نے پسند کیا ۔ اصل میں بات یہ ہے سہارن پور میں اُردو سمجھی جاتی ہے ۔ وہاں بولنے میں لطف آیا "

" تم دونوں کے پیرس کے سفر کا احوال سُن کر بہت خوشی ہوئی ۔ غائبانہ میں نے پھر ان جگہوں کی سیر کی جو تم نے دیکھے ۔ اب ایک بار جانا گرمیوں میں تاکہ VERSAILLES کے محل اور باغ اور فواروں کا نظارہ بھی دیکھو ۔ امید ہے کہ میلو کی زہرہ اور مونالیزا دیکھ کر تم نے مجھے بھی یاد کیا ہوگا ۔ ہم کو وہ دو پہر یاد ہے جب تمھارے ساتھ نیشنل گیلری میں لیونارڈو کی غار والی بی بی مریم کو دیکھا تھا "

۱۲ر جون ۶۹ء

" ممی لکھنؤ سے بہت سے دسہری آم لائیں ۔ اب کے گھر کے پیڑوں میں آم کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے "

" انگلینڈ میں نسلی تعصب کے بڑھنے کی خبریں سُن کر وحشت ہوتی ہے ۔ کل اخباروں میں انیک پاول کی بہت بُری تقریر تھی ، اور آج رنگین لوگوں پر پابندیوں کی خبر ہے ۔ امید ہے کہ انگلینڈ کے روشن خیال لوگ اس جہالت اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کریں گے "

" میں نے تم کو لکھا تھا کہ غالب کے سلسلے میں ایک بڑا اچھا ڈیلی گیشن ازبکستان ، تاجکستان اور ماسکو گیا تھا ۔ احتشام صاحب اور کیفی واپس آ گئے ۔ کیفی ہمارے یہاں ہی ٹھہرے تھے ۔ وہ وہاں کی غالب شناسی اور ہندوستان دوستی اور عام حالات کے متعلق رطب اللسان تھے ۔ کئی نئی نظمیں وہاں لکھی ہیں ۔ پرسوں انھوں نے دہلی میں ایک جلسے میں اپنے تاثرات بیان کیے ۔ میں نے جلسے کی صدارت کی "

۲۶ر جون ۶۹ء

" بھئی ہم لوگ کشمیر آ گئے ـــ ممی ، بی بی ، منو اور میں ۔ صادق صاحب نے اپنا خاص مہمان بنا کر چیف منسٹر کے بنگلے میں رکھا ہے (وہ خود اپنے پہلے والے ذاتی گھر میں رہتے ہیں جو تم دیکھ چکی ہو) میں اس مہمان خانے میں داخل ہوا تو کہا کہ ایک کمیونسٹ کے لیے یہ بہت DEMORALISING ہے کہ اتنے عیش سے رہے ـــ یہاں والے برابر اصرار کر رہے ہیں کہ ہم لوگ کھلن مرگ جائیں (جہاں تم لوگ گئے تھے) لیکن منو کی طبیعت ذرا خراب ہو گئی ہے (اس نے سونا مرگ کے راستے میں پہاڑ سے برف توڑ کر خوب کھائی اس لیے گلے میں درد ہو گیا) ، اس لیے نہیں جا رہے ہیں ۔ ویسے بھی ساٹھ برس کا ہونے کے بعد ہوٹل کے لان پر دھوپ میں بیٹھ کر اونگھنا گھوڑے کی سواری سے زیادہ اچھا لگتا ہے ! "

۲۲ر جولائی ۶۹ء
"آدمی چاند پر جاکر واپس آرہا ہے۔ کتنا عظیم واقعہ ہے، انسان کی فتح کا۔ کاش کہ اس دھرتی پر بھی انسان فتحیاب ہو۔"

۳۱ر جولائی ۶۹ء ۔ الجیریا
"فسٹی ول کل ختم ہوجائے گا، لیکن میں یہاں تقریباً ایک ہفتے اور رُک رہا ہوں تاکہ الجیریا کے ادیبوں اور دوسرے لوگوں سے مل سکوں۔ فسٹی ول کے دوران نہ تو ان لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، نہ سیر و سیاحت کا۔ فسٹی ول بہت ہی دلچسپ اور شان دار تھا۔ سارے شہر کو چراغاں کیا گیا۔ افریقہ کے تمام حصّوں سے گانے، ناچ اور تھیٹر کے ٹروپ آئے، جو تھیٹروں میں اور شہر کے چوکوں میں اپنے تماشے دکھاتے۔ افریقہ میں اتنی جان ہے، اتنا حُسن ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زبردست انقلابی اُبھار ہے، اس کا مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے ان میں STOKEY CARMICHALL امریکہ کے بلیک پاور کے نوجوان لیڈر بھی تھے اور ان کی بیوی MIROAM MEKEBE جو مشہور اور معروف نیگرو گانے والی ہیں ..... ادیبوں اور مفکروں میں سب سے زیادہ ذہین، گنی، داہومی اور سینیگال کے ادیب معلوم ہوئے۔ ایشیا کے ادیب یہاں بہت کم ہیں۔

افریقہ اور عرب ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں سے جب اپنے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا مقابلہ کرتا ہوں تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ہم لوگ دس سال پہلے سب سے آگے تھے، لیکن اب ہمارے ادیبوں پر (مع ترقی پسندوں کے) جیسے مردنی سی ہے اور یہاں اتنا اُبھار، جوش اور زندگی ہے۔ اس لحاظ سے مجھے یہاں آکر بڑا فائدہ ہوا ہے سیاست کو ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی آئیڈیلزم اور انسانیت کی بھلائی کے جوش سے ہی ادب میں جان آتی ہے۔ یہاں اس کی بہتات ہے اور ہمارے یہاں فی الحال اس کا فقدان ـــ خیر ـــ اب ہندستان میں بھی کوشش کریں گے کہ لوگوں میں جان پیدا ہو۔ ترقی پسند اور سیاسی طور پر بائیں بازو والے متحد ہوں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو ادب اور کلچر پر بھی اثر پڑے گا۔"

۹ر ستمبر ۶۹ء ۔ ماسکو
"تم دونوں بے حد یاد آتے ہو، خاص طور صبح کے وقت جب تم چائے لے کر میرے پاس آتے تھے اور رات کو سونے کے پہلے جب دن کا فائنل سشن ہوتا تھا۔ یہاں ایمبیسی کے شاندار کمرے میں جہاں میں ٹھہرا ہوں، کتنی سخت تنہائی ہے! تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہندوستانی پہاڑی نوکر بلبیر سنگھ ہماری دیکھ بھال کرتا ہے لیکن وہ محبت، وہ گرمی، وہ بے تکلفی کہاں۔ اب تو یہی دل چاہنے لگا ہے کہ ہمیشہ تم دونوں کے ساتھ رہیں۔"

۱۴ اکتوبر ۶۹ء

"بہت بہت شکریہ اتنے لمبے اور پیارے خطوں کا۔ میاں تم کبھی کبھی جب سائکو اینالیسس کرکے، لوگوں کے کردار اور افعال کی جو توجیہہ کرتے ہو، اس میں ہمیں بہت مزہ آتا ہے، پھر اس کے بعد معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ ہم ہمیشہ تمھاری باتوں سے اتفاق تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"بس تم لوگ جیتے رہو، اچھے رہو، کام کرتے رہو، ترقیاں کرتے رہو، اپنے محنت کش عوام سے محبت اور ان کی خدمت کرتے رہو، کبھی مغرور نہ ہو اور کسی مغرور کے سامنے سر نہ نیچا کرو، یہی ہماری سب سے بڑی خواہش اور تمنا ہے۔"

۱۲ فروری ۷۰ء - حیدرآباد

"ہم پرسوں میسور اور بنگلور سے ہوتے ہوئے حیدرآباد پہنچے۔ یہ حیدرآباد میں ہمارا سمدھیانہ ہونے کے بعد پہلی بار آنا ہے، اس لیے تم لوگ بہت یاد آرہے ہو ـــ کل شام تراب میاں اور نسیمہ کے گھر بڑی شان دار دعوت رہی۔ وہاں کی فضا بالکل طلسمی تھی۔ بنجارہ ہل کی چٹانوں سے گھرا ہوا، ایک پیالہ نما نشیب میں پیارا مکان۔ باہر صحن میں نشست تھی، تیرھویں کا چاند اور کچھ ابر اور ٹھنڈی ہوا اور بڑے پیارے دوستوں کا مجمع ـــــ تم دونوں نہیں تھے لیکن چرچا بار بار تمھارا ہی تھا۔ اب بھئی تم لوگ جلدی آجاؤ نا!"

۲ مارچ ۷۰ء

بھئی علی میاں تم نے تو بڑی زبردست خبر سنائی ہے، لندن سے ہفتہ وار نکالنے کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تو بالکل میری مرضی اور خوشی کا ہے۔ یہاں سے میں تم کو پوری پوری مدد کروں گا اور ان تمام ادیبوں کی چیزیں تم کو بھجواؤں گا جن کے تم نے نام لکھے ہیں، نیز رضیہ کی اور اپنی چیزیں بھی۔ لیکن ہفتہ وار کا نام تو رکھو۔ پیام تو اس کے بعد ہی بھیجا جا سکتا ہے۔ گمنام ہفتہ وار کو پیام بھیجنے کے لیے کسی سے کہنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ لندن سے ایک اچھا اُردو ہفتہ وار نکل سکتا ہے، یعنی معیاری، اس طرح کا گھٹیا اور بازاری نہیں جو محض پیسہ کمانے اور بیچارے ہندستانیوں اور پاکستانیوں کی ادبی اور قومی بھوک مٹانے کے لیے نکلتا ہے لیکن انھیں اچھی چیزیں نہیں دیتا۔"

۲۵ مارچ ۷۰ء

"میں کلکتہ میں چار پانچ دن رکا۔ بڑے فیصلہ کن قسم کے اور ہیجانی اور طوفانی دن تھے۔ منسٹروں اور گورنر صاحب

دھون سے ملا۔ اس کے دوسرے دن وزارت ٹوٹ گئی۔ اڑیسہ کی سوتنترا پارٹی کی وزارت ڈانوا ڈول ہے۔ ایک بزرگ نے کلکتہ میں مجھ پر فقرہ کسا کہ آپ جہاں جاتے ہیں، وزارت کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں"۔
"بھونیشور میں ہم گورنر ڈاکٹر انصاری کے مہمان تھے، بڑی خاطر داریاں ہوئیں، راج بھون میں۔ البتہ چار دن وہسکی پینے کو نہیں ملی۔ بیگم انصاری نے راج بھون میں شراب بندی مسلط کر دی ہے۔ اس کے علاوہ بہت آرام تھا اور عیش کیے"۔
"کونارک کا مندر بھی دیکھا اور اس کے حسن سے مبہوت ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستانی ہونے پر فخر ہونے لگتا ہے۔ دراصل ہماری قوم بے حد خلاق اور ثمر پرور ہے۔ لیکن آج کل کیوں اتنی پست ہو گئی ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا"۔
"نئی موٹر خریدنے کی مبارکباد قبول کرنا۔ برائے مہربانی اس وقت تک ACCIDENT مت کرنا جب تک ایک بار میں اس میں سواری نہ کر لوں۔ اس کے بعد تم کو اختیار ہے"۔

۹، جولائی ۷۰ء

"ہم نے ایک بڑی لمبی چوڑی اسکیم بنائی ہے، ہندوستان کے شاعروں، ادیبوں، آرٹسٹوں، ریڈیو والوں، فلم والوں اور دیگر دانش وروں کو مجتمع اور منظم کرنے کی تاکہ سب مل کر فرقہ پرستی کے خلاف زبردست نظریاتی اور نفسیاتی دھاوا کریں۔ رسالے، پمفلٹ، پوسٹر، ڈرامے، شعر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم سب اس کام کے لیے استعمال ہوں۔ سوشلزم، سکولرزم کے حق میں، رجعت پرستی اور فرقہ پرستی کے خلاف"۔

۵، نومبر ۷۰ء

"تو (آج) ہم آخر کار ۶۵ برس کے ہو گئے۔ تمہارا مبارکباد والا خوبصورت کارڈ ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ تم کو سن کر خوشی ہوگی کہ میری صحت یعنی جسم، دماغ اور تخیلہ، سب بڑی اچھی حالت میں ہیں حالانکہ اس دو تین مہینے اور آج کل جتنا کام کر رہا ہوں شاید اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا"۔
"سنو بھئی تم دونوں سب سے پوچھ رہے ہو کہ فرمایش کیا ہے، لندن سے لانے کے لیے ـــــ ہم سے کیوں نہیں پوچھا؟ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم بڑے 'شوقین' آدمی ہیں، ہم کو ایک اچھا سا ڈریسنگ گاؤن چاہیے، لیکن لمبا والا نہیں، بلکہ کمر سے ذرا نیچا والا ـــــ اور مجھے اس کی تو بے حد امید ہے کہ تم ہمارے لیے کم از کم ایک وہسکی (اسکاچ) لاؤ گے"۔
"ہماری کانفرنس کے ایک سشن میں اندرا گاندھی بھی آئیں گی اور تقریر کریں گی۔ ہمارے مخالف اس پر یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہم انقلابی نہیں رہے بلکہ 'سرکاری' آدمی ہو گئے!"

۲۰ر مارچ ۷۱ء

"تمہارا ایک خط مجھے ملا، اور ایک نجمہ کا، اس کے بعد معلوم ہوتا ہے تم لوگ خط بھیجنے کی کوئی سبیل نہیں نکال سکے۔ یہ دراصل بڑے تعجب کی بات ہے کہ انگریزوں جیسی قوم بھی اب ایسی تنگ دست اور کوتاہ نظر ہوگئی ہے کہ اس کی سمجھوتے اور مصالحت کی صلاحیت جیسے سلب ہوگئی ہے۔ کتنی لمبی چلی یہ پوسٹل اسٹرائیک اور کل سے اور بھی بڑی ہڑتالوں کی خبریں آرہی ہیں! ویلفیر اسٹیٹ کیا ہوئی؟ ذرا لکھو کہ کیا ہونے والا ہے وہاں؟"

۲۰ر جولائی ۷۱ء

"انسانیت کیا ہے؟ یہی تو کہ اس گرمی سے ہم بھی جلیں جو ہمارے ہمسایوں کو جلا رہی ہے اور اگر ہم باغِ عدن (بہشت) میں بھی ہوں تو نجد میں چلنے والی زہریلی اور گرم ہوا کی تپش محسوس کریں ـــــ مجھے اگر افسوس ہے تو اس کا کہ اب جسمانی طور پر مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ بنگلہ دیش کی آزادی کی جد وجہد کی تحریک کے لیے اتنا کچھ کرسکوں جتنا میرا جی چاہتا ہے، ان دنوں 'ویت نام سے آنے کے بعد ہی' میں دس دن جو کلکتہ رہا اور وہاں سے سرحد گیا، تو ذرا سا تھک سا گیا اور پھر بخار آگیا۔ خیر اب اچھا ہوں تم فکر مند مت ہونا۔"

"اس مرتبہ کلکتہ میں میں پرتیش نندی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ بڑی دوستی ہوگئی ان سے ـــــ وہی جو انگریزی کے شاعر ہیں اور ڈاکٹر غنی کے داماد۔"

۱۵ر جولائی ۱۹۷۱ء

"کل آل انڈیا ریڈیو پر بنگلہ دیش کے مسئلے پر ایک گروپ کی بحث تھی جس میں میرے علاوہ تمہارے دوست ڈاکٹر ادیب، مونس رضا، اور اسٹیٹسمین کے اڈیٹر کلدیپ نیر نے حصہ لیا۔ میں نے ہندستانی ادب پر بنگلہ دیش کے واقعات کے اثرات کا ذکر کیا۔ ہمارے شاعر بڑے زوروں میں بنگلہ دیش کی آزادی کی لڑائی کی حمایت میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔ کیفی اعظمی نے بڑی زوردار نظم لکھی ہے۔ دوسری زبانوں کے ادیب اور شاعر بھی متاثر ہیں۔"

"دلّی کا موسم آج کل برساتی، سبز اور سہانا ہے۔ کل رات بڑے زور کی بارش ہوئی اور آج دن بھر بوندا باندی ہے۔ البتہ جب دھوپ نکلتی ہے تو گرمی بُری طرح ستاتی ہے۔ اس مرتبہ آم کی فصل لاجواب ہوئی ہے۔ دسہری دو روپے کیلو اور لنگڑا روپے یا ڈیڑھ روپے کیلو مل رہا ہے۔ تم لوگ یاد آتے ہو۔"

۵ر اگست ۱۹۷۱ء

"بہت اچھی اور پیاری بیٹی نجمہ، سالگرہ مبارک ہو۔ آج دہلی میں بالکل ویسا ہی موسم ہے جیسا اس وقت لکھنؤ میں

تھا جب ہم نے تمھاری پیدائش کی خبر سُنی تھی! لیکن حالات اس سے بالکل مختلف ہیں، اس وقت ہم آرام سے اپنے گھر میں بیٹھے یہ خط لکھ رہے ہیں، دوسرے کمرے میں تمھاری ممی کام کر رہی ہیں، اور بی بی اور منو اپنے اپنے اسکول گئی ہیں۔ اُس وقت ہم ایک منحوس جیل کی کوٹھری میں بند تھے۔ ہاں ایک بات مشترک ہے۔ اُس وقت بھی تم ہم سے دور اجمیر میں تھیں اور اس وقت ہم سے دور یورپ میں ہو اور پتا نہیں کب ملاقات ہوگی۔"

"آج کل بیدی (راجندر سنگھ) دہلی میں اپنی نئی فلم دستک لے کر آئے ہیں۔ آج ہم لوگ اس کی خاص شو دیکھنے جا رہے ہیں۔ سُنا ہے کہ بہت اچھی فلم بنی ہے۔ تم وہاں پر ضرور دیکھنا۔ ہم اچھے ہیں۔ آیندہ ہفتے بمبئی جائیں گے۔ ساحر نے بلایا ہے۔"

۹ر نومبر ۷۱ء

"تم کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ میں نے دو تین مہینے سے روز صبح تھوڑی سی ورزش کر کے اپنی توند کافی گھٹالی ہے۔ اب میں نے اپنی سوانح حیات لکھنا پھر شروع کر دی ہے۔ آج کل لکھنؤ سنٹرل جیل کے حالات لکھ رہا ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ اس مرتبہ نئے سال کی پارٹی میں ہم سب نے سال بھر میں کچھ کام کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن اب سال ختم ہونے کو آیا اور میرے کل پچیس تیس صفحے ہوئے ہیں۔ بڑا افسوس ہوتا ہے۔ خیر کوشش کرتے ہیں کہ ان دو مہینوں میں کتاب آدھی تو لکھ جائے۔ اصل میں میرا بہت سا وقت طرح طرح کے چھوٹے موٹے کاموں میں بہت ضائع ہو جاتا ہے۔"

۱۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء

"تمھاری ممی کے آنے سے سب سے زیادہ سکون مجھے ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس درمیان ساری 'گھرداری' کے کام میں کرتا تھا! اب انھوں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی ہے۔ سب سے پہلے تو گھر اور کوٹھریوں کی صفائی کروائی انھوں نے۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں ہم لوگوں نے گھر کو بالکل کباڑ خانہ بنا دیا تھا۔ ان کے آجانے سے گھر بہت صاف لگنے لگا ہے۔"

۲۲ر فروری ۷۲ء

"ہم نے 'امر پریم' فلم دیکھی۔ اس میں راجیش کھنا ہیرو تھا۔ کیا کمال کا ایکٹر ہے اور کتنا خوبصورت ہے۔ اب میں سمجھا کہ کیوں ہندستان کی تمام لڑکیاں اس پر عاشق ہیں۔ گانے بھی اچھے تھے۔ آنند بخشی کے لکھے ہوئے، کشور کمار کے گائے ہوئے۔ بڑا مزہ آیا (مجھے بھی!) تم لوگ ضرور دیکھنا۔ فلم کا خاتمہ البتہ حسب دستور لمبا ہے اور بور ہو گیا ہے۔"

۲۳رجون ۱۹۷۲ء ۔ ماسکو

"میں ۲۶رجون کی صبح کو دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور پھر وہاں سے تم کو مفصل خط لکھوں گا۔ یہاں پر میرے سب کام ٹھیک سے ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے فیض سے بھی ملاقات ہو گئی ہے جو یہاں ایفرو ایشین رائٹرس کی میٹنگ کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ یہاں سے لندن بھی جائیں گی وہ افضل کے یہاں ٹھہریں گے۔ تم اور نجمہ ان سے ضرور
کا نیا کلام (جو بہت اچھا ہے) تم ضرور ٹیپ کر لینا"
ملنا۔ فیض کا نیا کلام (جو بہت اچھا ہے) تم ضرور ٹیپ کر لینا"

۱۰رجولائی ۷۲ء

"شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد میں میرے متعدد جاننے والے، آشنا اور دوست تھے۔ انھیں میں وہ بزرگ بھی تھے جنھوں نے ۱۹۵۱ء میں مجھے گرفتار کیا تھا (بہ نفسِ نفیس)۔ ہم اور وہ خاص طور پر بڑے 'خلوص' سے ایک دوسرے سے ملے اور پرانی باتیں ہنس ہنس کر یاد کیں۔ بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ ان کا رد ِ عمل صلح کی گفتگو کے دوران بہت اچھا رہا۔ ہند پاک دوستی کے لیے دل سے خواہاں معلوم ہوتے تھے:
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!"

۳راگست ۷۲ء

"دہلی میں اور شمالی ہندستان میں عام طور سے بارش تین ہفتے سے نہیں ہوئی۔ بڑی گرمی بھی ہے اور پریشانی بھی۔ اللہ اپنا رحم کرے! ادھر آسام میں طغیانی آگئی ہے! میری کتابیں کب اور کیسے بھیجو گے؟ PABLO IERUDA کی کتاب خاص طور پر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

۲۴راگست ۷۲ء

"آج کل دہلی میں ہماری گجرال کمیٹی FOR PROMOTION OF URDU کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ وگیان بھون کے ایک ٹھنڈے اور اچھے کمرے میں۔ ہم لوگ اردو والوں اور سرکاری افسروں اور وزیروں کی گواہیاں لے رہے ہیں۔ آج کل ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور دہلی سے گواہ آرہے ہیں۔ بڑا لطف رہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کمیٹی کی سفارشات اور ان پر عمل درآمد سے اردو والوں کی بیشتر شکایات دور ہو جائیں گی۔"

راکتوبر ۷۲ء
ہم براہِ کل وتاشقند، جہاز بدلتے ہوئے پہلے عشق آباد گئے (کیسا رومانی نام ہے!)........ وہاں کی
نفرنس میں کافی اچھا مقالہ پڑھا۔ پہلے بہت گھبرائے ہوئے تھے، لیکن اچھا ہوگیا۔ موضوع تھا 'ہندستان
ی جدوجہد آزادی میں ترقی پسند ادب کا رول'۔ مولانا حالی سے لے کر، اقبال، پریم چند، جوش، ابوالکلام آزاد
ے ذکر کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا ذکر کیا اور کرشن چندر، مخدوم، فیض، سردار جعفری، کیفی اور ساحر
ہ لاکر تان توڑی۔ خوب واہ واہ ہوئی اور ہمارا دل مضبوط ہوا۔"
ہم نے اپنے بہت سے دوسرے کام بھی کیے، یعنی عشق آباد، دوشنبہ (تاجکستان کی راجدھانی) تاشقند اور
بل میں فارسی اُستادوں سے ملے اور جشنِ خسرو کے لیے فضا تیار کی اور تعلقات قائم کیے۔ بے شمار قلمی نسخے
سرو کے ہر جگہ کی لائبریری میں دیکھے۔ کیا شخص تھا خسرو بھی کہ اس کی غزلیں دہلی اور حیدرآباد میں ہی نہیں
چ بیک تاشقند، دوشنبے، فرغانہ، کابل، لاہور اور تہران میں بھی گائی جاتی ہیں اور دلوں کو گرماتی ہیں۔
شنبے اور کابل میں ان محفلوں میں بھی شریک ہوئے جہاں خوبانِ خوبرو غزل سرا تھے اور حوض خاص،
لق آباد اور نظام الدین بستی میں گھومنے پھرنے والے، سات سو برس پہلے کے اس شاعر کا کلام سُنا رہے
ھے اور لوگ وجد میں آکر اپنا سر دُھنتے تھے۔"

ار نومبر ۱۹۷۲ء
مجھے ڈر یہی لگتا ہے کہ کہیں تم لوگوں کی شہرتیں اتنی نہ بڑھ جائیں کہ اہلِ مغرب تم دونوں کو ایسا پکڑلیں کہ
م اپنے پُرانے دھرانے، مٹی دھول والے پیارے دیس میں آنے ہی نہ دیں۔ خیر تم لوگ جہاں بھی رہو انسان
ی ترقی اور بھلائی کے لیے کام کرو، یہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور اسی سے تم کو بھی روحانی تسکین
سب سے زیادہ ہوگی۔ دنیا کا حال و منال اچھا اور خوش گوار ہے، وہ بھی روز افزوں تم کو ملتا رہے، لیکن
ن کی دولت، سب سے بڑی دولت ہے۔ اسے نہ بھولنا میرے پیارو! یہ سچائی ہمارے بزرگ سنتوں
وفیوں، درویشوں اور اولیاء اللہ نے دریافت کی تھی اور یہ ہی ہم ہندستانیوں کی سب سے بڑی دریافت ہے!"

ر دسمبر ۷۲ء
دلی کا موسم آج کل بہت اچھا ہے، اس اچھائی میں سیاسی موسم کو بھی شامل سمجھو۔ کل جو یہ خبر آئی ہے کہ
لِ مانک شاہ اور جنرل ٹکا خاں کے مابین سرحدوں کے مسئلے پر سمجھوتہ ہوگیا، اس سے دل کی بند کلی کھل گئی،
س طرح منو کے لگائے GLADIOLI آج کل ہمارے گملوں میں کھل گئے ہیں۔ اس کی بڑی خوشی ہے،
ب ہند اور پاکستان کی فوجیں پیچھے ہٹیں گی، علاقے خالی ہوں گے، پھر راستے کھلیں گے، تجارت کھلے گی،

سفارتی تعلق قائم ہوگا۔ ہند پاک کے مشاعرے ہوں گے، بنگلہ دیش تسلیم ہوگا، قیدی چھوٹیں گے، ہندستان سے پاکستان ہوتے ہوئے موٹر سے کابل جاسکیں گے اور تم دونوں اپنی نئی فوکس واگن پر ٹھاٹھ سے سوار ہوکر سیدھے لندن سے دہلی آسکو گے اور پھر یہاں سے نیشنل ہائی وے پر حیدرآباد جاسکوگے۔

"یہ حقیقت ہے یا خواب؟ اگر تمہیں شیخ چلی کی داستان معلوم ہوتی ہو تو اپنے شکوک وشبہات سے مجھے ضرور مطلع کرو تاکہ اس کے تدارک کا بندوبست کرکے اس حسین خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش ابھی سے شروع کردی جائے۔"

"کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے! اس موقع پر تم دونوں بہت یاد آؤگے! اچھا فی الحال خط ختم کرتے ہیں۔ منو کو لانے اسکول جانا ہے۔"

۶ جنوری ۷۳ء

"تم نے مجھ کو کرمپلین کی قمیص بھیجی وہ مجھے بہت ہی زیادہ اچھی لگی اور مسلسل اسے پہنتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسا کرتا ہوں جہاں ذرا میلی ہوئی، دھوکر پہن لی۔ یہ قمیص نرم بھی ہے، گرم بھی ہے، اور اس کا رنگ بھی میرا محبوب رنگ ہے۔ اس کا بہت شکریہ۔"

۲ فروری ۷۳ء

"میاں، وہ جو درد کی مجھ کو شکایت ہوگئی ہے، اور پہلے سے بہتر ہے لیکن ابھی گئی نہیں ہے۔ درد ٹخنوں میں نہیں ہے بلکہ داہنی طرف سے شروع ہوکر گھٹنے کے اوپر ختم سا ہوجاتا ہے۔ کبھی بالکل کم ہوجاتا ہے کبھی زیادہ۔ غنیمت یہ ہے کہ درد کے باوجود چلنے پھرنے سے معذور نہیں ہوں اور عام صحت غیر معمولی طور پر اچھی ہے .... علاج طرح طرح کے کیے، ڈاکٹری، ہومیوپیتھی اور وہ بھی جو ہر ہندستانی دوسرے ہر شخص کے صلاح ومشورے سے کرتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ہندستانی دوسرے بیمار کو طبی مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے البتہ ایک چیز ابھی تک کسی نے نہیں کہی ہے اور وہ یہ کہ حضرت نظام الدین کی درگاہ یا آستانۂ خواجہ معین الدین چشتی پر جاکر درد سے نجات کی دعا مانگوں۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس لیے صلح کل، میرا ایمان ہے۔

"صلح پر خیال آیا کہ ویت نام کی خبر کتنی خوش گوار ہے۔ ہم ویت نامیوں کی ایمبیسی رضیہ کے ساتھ گئے سب کو خوب گلے لگایا۔ وہ لوگ دراصل خوش نظر آرہے ہیں۔ دراصل یہ ایمان کی کفر کے خلاف فتح ہے، اور قرآنی لفظوں میں 'انا جعلنا لکم فتح مبین' اس موقع پر پڑھا جاسکتا ہے۔"

۲۱؍مارچ ۷۳ء
ارے میاں، یہ ہمارے پیارے انگلستان کو کیا ہوگیا ہے؟ اتنی گڑبڑ، اتنی ہڑتالیں، جھگڑے، بکھیڑے۔ ویسے ں وقت سرمایہ دار دنیا میں گڑبڑ عام ہے۔ امریکی ڈالر کا بُرا حال ہے، اور مغربی یورپ اور جاپان اور امریکہ کے مابین تصادم اور رقابت میں اضافہ ہے۔ ایسے ہی بحرانی دور میں قبلہ و کعبہ حضرت مارکس علیہ السلام کی دوربینی ور ژرف نگاہی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔"
آج کل ہم ترقی پسند ادب کے مسائل پر ایک مقالہ لکھ رہے ہیں اور پھر پاکستان میں اُردو ادب پر لکھنا ہے۔ ں کے لیے بھی پڑھ رہے ہیں۔"

۲۱؍اپریل ۷۳ء
تمہارا یہ خیال مجھے بھی اچھا لگا کہ میں ستمبر میں آلما آتا میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے پہلے لندن آؤں ور تم لوگوں کے ساتھ کچھ دن رہ کر پھر وہاں سے سوویت یونین جاؤں لیکن اس معاملے میں ابھی بڑے پیچ یں۔ اگر یہ پیچ سلجھ گئے تو شاید میں آسکوں۔"
ہم نے اس درمیان کافی لکھا ہے اور پھر بے شمار میٹنگیں! ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ اپریل کو ہمارے پارٹی مرکز نے کمیونسٹ پارٹی کے ادیبوں کی میٹنگ بُلائی تھی۔ سارے ہندستان سے 'سُرخ' ادیب جمع ہوئے۔ دن دن بھر بحث و مباحثہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہمارے مرکز میں ایک ادبی شعبہ قائم ہوگا۔ یہ میری بہت دنوں سے خواہش تھی۔ میں اس سے کافی خوش ہوں۔"

۱؍مئی ۷۳ء
ہم انجمن ترقی اُردو کی مجلس عام میں شرکت کرنے کے لیے ۵ اور ۶ مئی کو علی گڑھ گئے تھے۔ واپس آئے تو تمہارا خط ملا۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تم دونوں اچھے ہو۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ تمہاری تیسری کتاب کے پانچ باب مکمل ہو گئے ہیں۔ (ہمارے ناول 'لندن کی ایک رات' کے ہیرو چار باب لکھ کر پانچواں اور آخری نہ سال لکھتے رہے اور آخر تھیسس نامکمل چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے) شکر ہے کہ تم نے اس پانچویں باب کے مرحلے کو پار کرلیا! اب کتنے باب باقی ہیں؟"
'ریجنٹ پارک میں چیری کے شگوفوں کا ذکر کیا تو میں تڑپ اُٹھا اور وہ بہشتی منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میاں! آپ نے اپنے خط میں دو مرتبہ 'چیری بلوسم کے پھولوں' کا فقرہ لکھا ہے۔ یعنی جیسے الہ آباد والے 'جنابِ جج کاٹپل' کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اب بالکل پروفیسر ہوتے جا رہے ہو۔ تجمہ کی کیوڑے کی شیشی گرادی اور ہم کو 'بلوسم کے پھول' لکھ رہے ہو!"

۲۶ر مئی ۷۳ء (آخری خط)

"مجھے ابھی ابھی ماسکو سے ایفرو ایشین رائٹرس کی میٹنگ کی تیاری کے لیے بات چیت کرنے کے لیے دعوت نامہ ملا ہے۔ اب میں ۵ر جون کو ایروفلوٹ سے ماسکو کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ وہاں سے میرا لندن آنا ممکن ہے۔ میں ماسکو پہنچ کر تمھیں فون کروں گا۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے!"

بنے بھائی کا پہلے ماسکو سے فون آیا، دس دن بعد وہ خود آئے۔ ڈھائی مہینے ہمارے ساتھ لندن میں رہے اور بقول خود ان کے ہم لوگوں نے بہت "عیش" کیے۔ دوستوں سے ملے، گھر پر ایک ادبی محفل منعقد کی۔ جس میں بنے بھائی نے اپنی سوانح حیات کے شروع کے باب کوئی ۲۵ احباب کو پڑھ کر سنائے اور جو میرے پاس ٹیپ پر ان کی آواز میں موجود ہیں۔ بی بی سی سے پروگرام نشر کیے، باغوں کی سیر کی، چیری کے گلابی پھول ان کے لندن آنے سے پہلے مرجھا چکے تھے مگر گلابوں کی بہار تھی، مشاعروں میں شرکت کی، تھیٹر اور فلم دیکھے، کتابیں پڑھیں، شرابیں پیں اور پھر ایک دن بنے بھائی مجھ سے اور نجمہ سے لندن ایرپورٹ پر یہ کہہ کر وداع ہوئے کہ ہم جلد ملیں گے۔ چند دن بعد ان کا الما آتا میں انتقال ہو گیا۔

بنے بھائی نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا ؎

آسمان کے سب کواڑے کھول دو
اور اس بجھی بجھی دھرتی کو
کائناتی کرنوں کی
سیمابی روشنیوں سے نہلا دو،
کامناؤں کے سنہرے تاروں سے جگمگاتا
لال جوڑا اسے پہناؤ
خوشیوں کی صندل سے مانگ بھرو
اور ماتھے پر
امید کی
جھلملاتی بِکلی لگا کر
بے قرار تمناؤں کی چُلبلی
شریر انگلیوں سے
اسے اتنا گدگداؤ
کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے

("نیا سال"، پگھلا نیلم)

اس مضمون میں بنے بھائی کے صرف چند خطوں سے اقتباس لیے ہیں، یہ خط میں نے کسی خاص مصلحت سے نہیں چُنے۔ کبھی موقع ملے گا تو میں بنے بھائی کے زیادہ سے زیادہ خط ان کے دوستوں، عزیزوں اور ملاقاتیوں سے حاصل کر کے ایک طویل مضمون میں

شامل کروں گا۔ ان اقتباسات سے ایک بات واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہ تحریریں ایک ایسے انسان کی ہیں جس نے دوستی کے رشتے کو اور رشتوں پر ترجیح دی۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد میں اور بنے بھائی اچھے دوست بن گئے تھے۔ یہ دوستی لندن میں اور گہری ہوگئی تھی۔ وہ پانچ چھ بار لندن آئے اور کل ملاکر تقریباً دس گیارہ مہینے ہمارے مہمان رہے۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنے، ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ ان دنوں میں اکثر سوچتا کہ سقراط کے اطراف یونہی لوگ بیٹھ کر اس کے علم و دانش سے فیضیاب ہوتے ہوں گے۔ افسوس یہ ہے کہ میری اور بنے بھائی کی دوستی صرف چھ برس کے مختصر عرصے تک ہی قائم رہ سکی، مگر یہ چھ سال میرے لیے بہت قیمتی تھے۔ بنے بھائی کی مخلص اور پُرکشش شخصیت کے بہت سے پہلوؤں نے ان چند برسوں کو جگمگا دیا تھا۔ "سیمابی روشنیوں سے نہلادیا" تھا۔

بنے بھائی کے یہ خط جو انھوں نے مجھے اور نجمہ کو لکھے تھے ان خطوں سے الگ طرح کے ہیں جو انھوں نے جیل سے رضیہ آپا کو لکھے تھے اور "نقوشِ زنداں" کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپے تھے۔ ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر جیل میں قیدی اپنی میعاد کی تلخی اور صعوبت کو کم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ جن میں تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں ادب کا سہارا لیتے ہیں۔ کہانیاں اور ناول، مضمون اور خط وغیرہ لکھتے ہیں۔ بنے بھائی کے پاس اُن دنوں کافی وقت ہوتا۔ سوچنے اور فکر کرنے کی مہلت ہوتی۔ ان کے ذہن میں ایک لگن تھی، برطانوی سامراجیت سے زور آزمائی کا ولولہ تھا، رگوں میں جوانی کا خون تھا، وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان دنوں بنے بھائی ملک اور قوم کی سیاسی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے۔ ان دھاراؤں کے بیچوں بیچ تھے جو سیاست میں انقلاب لانے کے لیے کوشاں تھیں۔ ادب بنے بھائی کے ہاتھ میں تلوار تھا۔

بنے بھائی کے یہ خط، جن کے اقتباس اس مضمون شامل ہیں، بالکل دوسرے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ ملک کو آزادی ملے پورے اکیس برس ہوچکے تھے جب بنے بھائی نے مجھے پہلا خط لکھا تھا۔ دلی میں ان کی زندگی بہت مصروف ہوگئی تھی۔ لوگ ملنے آتے، انھیں جگہ جگہ جانا پڑتا مگر اس تیز بھاگ دوڑ میں ہر مہینے کم از کم ایک یا دو بار ہمیں خط لکھنے کا موقع نکال لیتے۔ یہ ان کا بڑا احسان تھا۔ بنے بھائی میں اب پہاڑی دریاؤں کی سی تیزی نہیں رہی تھی، وہ ایک شانت، اتھاہ اور گمبھیر سمندر کی طرح تھے۔

ان خطوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری چھ برسوں میں انھوں نے کیا کیا، کیا سوچا، کون سی کتابیں پڑھیں، کیسے مضامین اور مقالے لکھے، کون کون سی کانفرنسوں میں شرکت کی، کن کن لوگوں سے ملے۔ داخلی اور خارجی، مقامی اور بین اقوامی، ذاتی اور عالمی، سیاسی اور سماجی، ادبی اور تاریخی عناصر نے ان کی فکر پر کیا اثر چھوڑا، وہ کن کن باتوں سے متاثر ہوئے۔ یہاں یہ بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں کہ بنے بھائی نے جو خط مجھے اور نجمہ کو لکھے وہ ادبی تخلیقات کا مقام رکھتے ہیں یا نہیں۔

بنے بھائی نے افسانے لکھے ہیں، ناول لکھا ہے، اُردو ادب کے ایک اہم دور کی تاریخ لکھی ہے، تنقیدی مضامین لکھے ہیں، سیاسی مضامین لکھے ہیں، سفرنامہ لکھا ہے، خود نوشت لکھی ہے، شعر لکھے ہیں، نظمیں لکھی ہیں، مگر خطوں میں بنے بھائی کی انفرادیت مسلم ہے۔ وہ بات کچھ ایسے پیارے لہجے میں کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ سننے کو دل چاہتا ہے۔ اپنے ماحول سے خوبصورتی کو ڈھونڈ نکالنے کا جو سلیقہ بنے بھائی میں تھا وہ شاید پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئے۔ بنے بھائی نے جو باتیں اپنے خطوں میں لکھی ہیں وہی باتیں اپنے مقالوں، مضمونوں اور تقریروں میں بھی کہی ہیں۔ کسی دن کوئی محقق جب ان کی دیگر اور تحریروں اور ان کے خطوں کا موازنہ کرے گا تو یہ بات سب پر عیاں ہوجائے گی کہ بنے بھائی کا ظاہر اور باطن ایک

تھا۔ وہ باتیں جو وہ اپنے بچوں کو خانگی طور پر لکھتے تھے انھیں بر سرِ عام بھی کہہ دیتے تھے۔ جو باتیں وہ اخباروں، ریڈیو یا کسی کانفرنس کے پلیٹ فارم پر کہا کرتے تھے انھیں اپنے بچوں سے بھی کہہ دیا کرتے تھے اسی خلوص اور سچائی سے۔

بنّے بھائی کے ان خطوں سے ہمیں ان لمحات کی چند جھلکیاں مل جاتی ہیں جو ان کے اپنے نجی اور پرائیویٹ ہوا کرتے تھے۔ غربت یا دولت کی افراط سے ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں میں نمایاں فرق نہیں پڑتا۔ یہ راز ہمیں بنّے بھائی کی تحریروں سے مل جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اطلس و کمخواب کے درمیان بھی گزاری اور کھدّر اور ٹاٹ کے درمیان بھی مگر انھوں نے ہمیشہ کوشش یہی کی کہ وہ سب کام کر سکیں جو ان کے لیے مقدس اور ضروری تھے۔ ان کاموں میں لکھنا بھی شامل تھا حالانکہ انھیں لکھنے کے مواقع کم ملتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی خط میں اس بات پر افسوس نہیں کیا کہ حالات نے انھیں صرف ادب پرستی اور ادیب و شاعر نوازی کا تو موقع دیا مگر لکھنے کی مہلت نہ دی۔ بنّے بھائی کی ادبی، تخلیقی اور تحریری صلاحیتوں کا ثبوت وہ بے شمار خط ہیں جو انھوں نے نہایت پابندی سے، نہایت باقاعدگی سے، نہایت خلوص سے اپنے دوستوں کو لکھے۔ ان خطوں کو، یا ان کی نقلوں کو، ایک جگہ اکٹھا کرنا اور ان کا تجزیہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

بنّے بھائی کے خطوں سے ایک بات صاف ظاہر ہے کہ وہ تحریریں ایک ایسے شخص کی ہیں جسے انسانوں سے محبت تھی، انسانیت سے محبت تھی، جس نے محبت کرتے وقت لوگوں کو اچھے اور بُرے گروہوں میں بانٹنے کا فلسفیانہ عمل نہیں کیا بلکہ جس نے ہر انسان، ہر بات، ہر ماحول، ہر دَور، ہر حرکت میں خوب سے خوب تر کو تلاش کیا اور جس کی جستجو ناکام نہ رہی۔ یہ ایک شخص کی تحریریں ہیں جس کی نگاہ صرف خوبصورتی پر جا کر رُکتی تھی اور جسے ہر جگہ، ہر زمانے، ہر حالت میں خوبصورتی مل جاتی تھی۔ بنّے بھائی اور حُسن کی جیسے کوئی خفیہ سازش تھی، یہ دونوں طرح طرح کے بہانے ڈھونڈکر ایک دوسرے سے مل جاتے تھے ـــــ جون کے مہینے میں جہنّم کی طرح تپتے ہوئے دہلی میں اور برف سے چھپے ہوئے ماسکو میں، افریقہ کے پہاڑوں اور سمندروں کے قریب، انگلستان کے باغات اور مرغزاروں میں، جوانوں کے جوش اور دلولے میں، بوڑھوں کے تجربے اور روایات میں، نظموں اور شعروں میں، اخباروں اور افسانوں میں، کشمیر میں غربت کو کم کرتے ہوئے کاشت کاروں میں، کونارک کے مندر کی مورتیوں میں، تامل ناڈ کے کلچر میں، حیدرآباد کی معتدل آب و ہوا میں، ویت نام کے جواں ہمّت انسانوں میں، سہارن پور کے باسیوں کے اُردو سمجھنے کے سلیقے میں، چھوٹی سی اسکرٹ پہنے ہوئے سویڈش لڑکی کے انقلابی رجحانات میں، ساؤتھ افریقہ کی مشہور موسیقار کی آواز میں ـــــ بنّے بھائی حُسن کو تلاش کرتے تھے، حُسن بنّے بھائی کو پالیتا تھا اور ہر وہ چیز جو بنّے بھائی کو حسین لگتی، اسے اپنے ہر احساس میں جذب کر لیتے اور پھر دوسروں سے کہہ دیا کرتے، کبھی خطوں کی سرگوشی میں، کبھی جوشیلی تقریروں میں تاکہ سننے والے بھی اپنی نظر، اپنی فکر، اپنے تخیّل، اپنے عمل میں رنگین پھولوں کی خوشبو اور ان کی ریشمی پتیوں کا گداز سمو لیں۔ خلقت اور انسان کی بے شمار اور تہہ دار خوبصورتیوں کو ڈھونڈنے، پرکھنے اور ان کی تعریف کرنے کے لیے غیر معمولی نظر اور توانائی درکار ہوتی ہے اور یہ توانائی اپنی پوری آب و تاب سے بنّے بھائی کے خطوں سے عیاں ہے۔

بنّے بھائی کے خطوں میں طرح طرح کے حالات، احساسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کے بارے میں ذکر ہے، کبھی ضمنی طور پر کبھی تفصیلی طور پر، مگر اس رنگا رنگی میں ایک عجیب طرح کی ہم آہنگی ہے جیسے قوسِ قزح کے رنگ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ یہ پھولوں، پتیوں، درختوں، پہاڑوں سے محبت؛ یہ موسیقی، آرٹ، کلچر سے لگاؤ؛ یہ تاریخ کو ایک نئے اور معنیٰ خیز انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کا سلیقہ؛ یہ سیاست کے داؤ پیچ؛ یہ مباحث، یہ ادبی اور شعری رجحانات پر تبصرے؛ یہ تمام دُنیا کے انسانوں سے دوستی کرنے کی دُھن ـــــ یہ سب اور ایسی بہت سی اور

باتیں ہمیں بنّے بھائی کے خطوں میں ملتی ہیں۔ جب تک ہمیں بنّے بھائی کی ان جمالیاتی احساسات اور ادبی اور سیاسی قدروں کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں ہوگا ہم ان کی مکمل شخصیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

بنّے بھائی کے پاس چاہے آرام و آسایش کے سامان نہ رہے ہوں مگر محبّت کی فراوانی تھی — محبّت جو انھوں نے دوسروں سے کی، اپنے دوستوں سے کی، اپنی بیوی اور بچیوں سے کی، اپنے ساتھیوں اور رفیقوں سے کی، اپنے عزیزوں اور واقف کاروں سے کی، اپنے ملک اور کلچر سے کی اور ان ہزاروں اور لاکھوں انسانوں سے کی جن سے شاید وہ کبھی نہیں مل سکے مگر جن کا درد وہ سمجھتے تھے چونکہ وہ درد خود بنّے بھائی کا اپنا درد تھا۔ میرے لیے بنّے بھائی کے خط خوشبوؤں میں بسی خوش گوار ہوا کا حسین جھونکا تھے — وہ کالی پوت کے چھلے!!

ھدیۂ تہنیت

ھے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(غالبؔ)

کالی داس گپتا رضا
بمبئی

یادیں!

سجاد ظہیر

۱۹۳۵ء عجیب سال تھا۔ مَیں اس زمانے میں لندن میں اپنی طالب علمی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ طالب علمی کیا تھی، وہ زندگی جس میں کچھ مہینوں بعد مَیں پوری طرح پڑ جانے والا تھا ایک طرح سے شروع ہو گئی تھی، قانون جسے پڑھنے کے لیے مَیں لندن میں ٹھہرا تھا میرے لیے ایک چھوٹی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا، بالکل معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی، اصلی بات تو یہ تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے یورپ میں خاص طور پر، اور طرح پر ساری دُنیا میں جو دن بدن تبدیلیاں ہو رہی تھیں، یہ جو معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ مِٹ رہا ہے، اور ایک دوسری زندگی کے پیدا ہونے کے آثار ہیں، اس کا نقشہ ہر گھڑی رہتا تھا۔ یہ اس لیے نہیں کہ میں کوئی غیر معمولی سمجھ کا نوجوان تھا۔ اس لیے بھی نہیں کہ میرا دل دنیا کے دُکھ کو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔ میرے سامنے کے بہت سے پڑھے لکھے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، ہندوستانی اور انگریز کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ وہ وقت، وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا۔ ۱۹۳۳ء سے پہلے کے دو سال کا ذرا خیال کیجیے۔ ساری دُنیا پر نازل ہونے والی اکنامک کرائسس (معاشی بحران) کا پولٹیکل اثر جرمنی میں ہٹلر اور نازی پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم کو لندن میں اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے یا نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے گنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ خوفناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سرقلم ہونے کے بارے میں اخباروں میں چھپتے، وہ اندوہناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمک دار دُنیا سے جس کا نام جرمنی تھا پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراؤنی پرچھائیں ڈال رہا تھا، ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کے طوفان کا مقابلہ کر سکتی تھی، اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت، اس جماعت کی طاقت، جو اکٹھا ہو کر کام کرنے سے اشتراکِ عمل سے، سرمایہ داروں کے مظالم اور استحصال کا ہر روز دو بدو مقابلہ کرنے سے، مسلسل طبقاتی جدوجہد کا تجربہ حاصل کر کے، ایک ایسا انقلابی جماعتی شعور پیدا کرتی جا رہی تھی، جو اسے سماج کے نیچے گھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست دینے اور مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کرنے کا بدرجہ اتم اہل بناتی تھی۔

کیا یہ صرف ہماری امید تھی؟ صرف ایک خواہش؟ ایک اندھیرے میں کھوئے ہوئے مسافر کی تمنا کہ کہیں سے بھی روشنی کی ایک دُھندلی کرن تاریکی کی مہلک چادر کو چاک کرے۔

جرمنی ہی میں پہلی بجلی چمکی۔ کمیونسٹوں کو بدنام کرنے کے لیے ہٹلر اور اس کے ساتھیوں گوئیرنگ و گوئبلس وغیرہ نے سازش کر کے جرمن پارلیمینٹ کی عالی شان عمارت میں خود آگ لگوا دی (مارچ ۱۹۳۳ء) اور چند کمیونسٹ لیڈروں کو یہ کہہ کر گرفتار کروا لیا کہ یہ انھیں کی حرکت ہے۔ ان ملزمین میں دمتروف بھی تھا۔ یہ شخص بلگیریا کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک لیڈر تھا جو ان دنوں برلن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کئی مہینے حراست میں پڑے رہنے کے بعد

جب مقدمہ شروع ہوا تو دفعتاً ساری دُنیا کی نظریں شہر لائپزک کے جرمن ہائی کورٹ کے ایک کمرے کی طرف منتقل ہوگئیں۔ دمتروف نے ایسے بیانات دیئے جس کی وجہ سے نہ صرف اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی بے گناہی ثابت کی بلکہ جرمن فاشزم کو اُلٹا مجرم ٹھہرایا اور ساتھ ہی اپنے اس غیر فانی عقیدے کا بھی اظہار کیا کہ جرمنی میں فاشزم ہمیشہ نہیں رہے گا اور ایک نہ ایک دن جرمن مزدور اپنے کندھوں سے سرمایہ داری کے بوجھ کو ضرور اُتار پھینکے گا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب دمتروف اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی رہائی کے لیے امریکہ، انگلستان، فرانس وغیرہ میں مزدوروں کے بڑے بڑے مظاہروں کی خبریں آئیں، سرمایہ داروں کے اخبار بھی دمتروف کی بے گناہی کا اعتراف کرتے تھے، اور اس کی اس دلیری کی تعریف کرتے تھے کہ ہر طرح کی جسمانی اذیتوں اور سزاؤں کی دھمکیوں کے باوجود کچہری میں حقیقت کا صاف صاف اظہار کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔

اب اہلِ علم میں بھی کچھ ہل چل ہونے لگی۔ جرمنی کے بڑے بڑے مصنفین (ٹامس مان، ٹولر وغیرہ) بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سائنس دان (آئنشٹائن، ہابر وغیرہ)، آرٹسٹ ماہرانِ موسیقی، ڈاکٹر وغیرہ جلاوطن ہوکر بے سر و سامانی کی حالت میں تھے ہی اب دمتروف کے مقدمہ کے سلسلہ میں، اور جرمنی جلاوطنوں کی حمایت کے لیے مغربی یورپ اور امریکہ کے اہلِ علم، ادیب، غرض کہ اس طبقہ کے بہت سے لوگ جن کا پیشہ لکھنا، پڑھنا ہے فاشزم کی مخالف تحریکوں میں کسی نہ کسی طرح کھنچے چلے آرہے تھے۔

یہ احساس عام ہونے لگا کہ فاشزم کی وبا کا اگر تدارک نہ کیا گیا تو وہ جرمنی تک محدود نہ رہے گی بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ وہ حالات فاشزم جن کا نتیجہ ہے ان ممالک میں بھی تیزی سے پیدا ہو رہے تھے جہاں نام نہاد جمہوریت تھی۔ یہاں بھی سرمایہ دار طبقہ جو ابھی تک "جمہوریت" کا نام لے کر محنت کشوں کا استحصال کرتا آیا تھا اپنے اس بھیس کو اتار پھینک کر، شہری آزادیوں کو کچل کر، مزدوروں کی طرح کی تنظیم کو توڑ کر، اور تمام نیابتی اداروں کو خاک میں ملا کر، برہنہ آمریت کو اپنا سکتا تھا۔

چنانچہ فرانس میں دن بدن یہ خطرہ بڑھنے لگا۔ جرمنی کی طرح وہاں بھی مسلح فاشسٹ جھنڈ مزدوروں کے جلسوں اور جلوسوں پر حملے کرنے لگے۔ حکومت جانتی تھی کہ ان غیر قانونی کارروائیوں کے پیچھے لوہے اور کوئلے کی کانوں کے مالکوں، فولاد و بجلی کے کارخانے والوں، بینکوں کے کرتا دھرتاؤں کی روپیوں کی تھیلیاں ہیں لیکن وہ سرمایہ داروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کے خلاف قانون مظاہروں کو دیکھتی اور کچھ نہ کرتی۔

یکایک خبر آئی کہ رجعت پسندوں نے فرانسیسی پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا، پیرس میں ایک جمِ غفیر نے چیمبر آف ڈپوٹیز (ایوان پارلیمنٹ) کو گھیر لیا۔ وزارت نے خوف زدہ ہو کر استعفا دے دیا، اور پہلے سے زیادہ رجعت پسند وزارت بن گئی۔ اس واقعہ نے سب کی آنکھیں کھول دیں، لوگ پوچھنے لگے کہ کیا ہٹلر کی طرح اس حریت، مساوات، اخوت کی جنم بھومی میں بھی سرمایہ دارانہ آمریت کا بول بالا ہوگا؟

مزدور جماعت نے اس سوال کا فوراً جواب دیا۔ فرانس میں زبردست عام ہڑتال ہوئی، کمیونسٹ لوگوں نے "متحدہ محاذ" کا نعرہ بلند کیا اور سوشلسٹ اصلاح پسند لیڈروں کے باوجود مزدور بھائیوں میں اتحاد و یک جہتی نظر آنے لگی۔ ہر مزدور یہ سمجھنے لگا کہ اگر ان میں ایکا ہو تو ان کی طاقت ایک مشین پر دار و مدار رکھنے والی معاشرت میں فیصلہ کن ہو سکتی ہے، فرانس کے مزدوروں کی عام ہڑتال نے تمام آزادی پسندوں کے دلوں کو مضبوط کیا اور فرانس میں اس واقعہ کے بعد جیسے نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب رجعت پسند جماعتیں پسپا ہونے لگیں، اور مزدور جماعت کے اتحاد، ڈسپلن اور عملی قوت نے درمیانی طبقوں کو بھی اپنی طرف مائل کرنا شروع کیا۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر آسٹریا میں ایسے واقعات ہوئے جو المناک ہوتے ہوئے بھی انقلابی تابناکی رکھتے تھے۔ صلح نامہ ورسائی نے آسٹریا کو کانٹ چھانٹ کر ایک چھوٹی سی ریاست بنا دیا تھا۔ ایک ایسی ریاست جو اپنی معاشی مشکلات کی وجہ سے یورپ کی کسی نہ کسی بڑی سلطنت کے زیر اثر ہوئے بغیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہٹلر اور مسولینی کے عروج کے بعد فرانسیسی سامراج کا اقتدار وسطی یورپ اور بلقان میں گھٹتا جا رہا تھا۔ آسٹریا پر اب اٹلی اور جرمنی دونوں للچائی نظریں ڈالنے لگے۔ عام اقتصادی بحران وہاں بھی اپنے اثرات پیدا کر رہا تھا۔ وہ جمہوری نظام جو صلح نامہ ورسائی کے بعد آسٹریا میں نافذ کیا گیا تھا (یعنی وہ نظام جو سرمایہ پرستی پر جمہوریت کی نقاب ڈالتا ہے) لڑکھڑا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ

آسٹریا کا دستورِ اساسی منسوخ ہوگیا۔ پارلیمنٹ ہمیشہ کے لیے برخاست کر دی گئی، میونسپلٹیوں کے ہاتھ سے سب طاقت چھین لی گئی اور ایک پستہ قد انسان، ڈالفس نے اپنے اکیلے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ ڈور لے لی! یعنی یورپ کے ایک اور ملک میں فاشیت قابض ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی، یا کچھ ہی دن بعد دوسری خبر: ویینا، لینز، گراتز، آسٹریا کے بڑے صنعتی شہروں کے مزدوروں نے غاصب حاکم کے جابرانہ احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ ڈالفس نے مزدوروں کی جماعتوں سے تمام ہتھیار چھین لینے کا حکم دیا، اس پر مزدوروں اور سرکاری فوجوں میں لڑائی شروع ہوگئی، مزدور بڑی بہادری سے لڑ رہے ہیں، شہر کے بہت سے حصوں پر وہ قابض ہوگئے۔ پھر دوسری خبریں، حکومت کے پاس بہتر اسلحہ جات ہونے کی وجہ سے مزدور پسپا ہو رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب ان کے جیتنے کی امید باقی نہیں وہ بڑی بہادری سے لڑتے جا رہے ہیں۔ آخر میں شکست، لیکن فاتح کی خونی کامیابی اور اس کے مظالم کی شدت سے مزدور جماعت کی طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ہمیں محسوس ہونے لگا کہ فاشیت کی گو آج جیت ہوئی ہے لیکن دوسری طرف محنت کشوں کا انقلابی شعور بڑھ رہا ہے! انھیں ناکامیوں کا تجربہ کامیاب انقلاب کو ممکن بنائے گا۔

دمتروف کا مقدمہ، فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکامیاب مزدور انقلاب، آج ان واقعات کی اہمیت اکثر لوگوں کے لیے کچھ نہیں لیکن ہمارے لیے بہت تھی۔ یہ تو بالکل ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت کے لیے بہت دنوں تک امن، سکون، چین کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ بڑی سخت کشاکش، جد وجہد، بین الاقوامی جنگ، انقلاب کے دَور کا آغاز ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا آدمیت کبھی بھی اس سیلابِ آتش و آہن سے نجات حاصل کر سکے گی؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان جن کی رگوں میں زندگی کا گرم خون گردش کر رہا تھا، اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں گے؟ ہماری محبت کی دُنیا سڈول، اچھے جسم کی کشش، آنکھیں جنھیں ہم دیکھتے ہی رہ جاتے تھے، باتیں جو ہم چاہتے تھے کہ سُنا ہی کریں، دو لپٹے ہوئے سینوں کی باہمی دھڑکن، اس کا کیا ہوگا؟ اور ہمارے خیالوں کی دنیا، وہ رنگین دُنیا، قدامت پرستی کو ٹھوکر لگانے والی، ہر بری چیز سے باغی، حسن پرست، آسمان سے اس کی نیلاہٹ، پھولوں سے خوشبو، پانی سے روانی، غرض ہر مادہ سے اس کا جوہر کھینچ لینے کے لیے بے چین، وہ اس آگ لگے سنسار میں کے دن تک بچے گی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی نجی زندگی کو سماج کے مضطرب، بیاکل جیون سے الگ کر لیں؟

ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے، تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیلِ علم کی ابتدا تھی!

ہمارے چھوٹے سے گروہ میں اکثر مصنف بننا چاہتے تھے اور کرتے بھی کیا؟ مزدوری کرنے کی ہم میں اہلیت نہ تھی، کسی قسم کا ہُنر ہم نے سیکھا نہ تھا، سامراجی سرکار کی نوکری کے خیال سے گھن آتی تھی تو پھر باقی کیا رہا؟ کافر نتوانی شُو، ناچار مسلمان شو۔ ملک راج آنند کا ناول 'اچھوت' چھپ چکا تھا، اور 'قلی' چھپنے والا تھا۔ ریجنٹ اسکوائر کی چوتھی منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ شخص بیٹھا لکھا ہی کرتا یا پھر اسی کے کمرے میں ہم سب جمع ہو کر باتیں کرتے اور چائے پیتے، یا پھر وہ اپنی کسی معشوقہ سے لڑ جھگڑ کر اپنی کُرن کہانی سُناتا، کبھی اس کی آواز دھیمی پڑ جاتی، بہت، اور کبھی وہ زور زور سے ہنستا بولتا .... ایک شعلہ، روشن، گرم، لرزتا ہوا۔

آکسفرڈ سے کبھی کبھی ڈاکٹر جیوتی گھوش آ جاتے تھے۔ ان کے علم وفضل کا ہم پر بڑا رعب تھا۔ انھوں نے انگریزی ادب میں آکسفرڈ یونیورسٹی کی جتنی ڈگریاں ممکن تھیں حاصل کر لی تھیں۔ ایک پرانے زمانے کے انگریز شاعر پر ان کی دو ضخیم کتابیں حال ہی میں چھپی تھیں، اور انھوں نے انگلستان میں زبانِ انگریزی کے ماہروں میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ ایک ہندوستانی کے لیے کافی بڑی بات تھی۔ باوجود ان باتوں کے ان میں دقیانوسیت نہیں تھی۔ وہ آکسفرڈ میں بنگالی کے لیکچرر تھے، اور انھیں بنگالی ادب سے بہت دل چسپی تھی۔ عام طور پر وہ ادب میں فنی کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ـــــ وہ

ہندوستانی ادب کو پرانے تصوفانہ (ویدانتک) بندھنوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ پرانی ہندوستانی شاعری (ہندی اور بنگالی) کی مخصوص بچار دھارا یعنی مذہبی عقیدت مندی میں غلو کے وہ شدید مخالف تھے۔

سنگھ سے مجھے آنند نے ملایا۔ یہ اس زمانے میں لارنس اور جوائس کے طرزوں کو ملا کر ایک ناول انگریزی میں لکھ رہے تھے۔ بڑی عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ خدا معلوم کس طرح زندہ رہتے تھے۔ انگریزی خوب اچھی جانتے تھے، سوشلسٹ تو شاید تھے لیکن مارکسیت سے بہت سے اختلاف رکھتے تھے، ہم تو ان کو عینی (آئیڈیلسٹ) سمجھتے تھے، لیکن وہ خود کہتے تھے کہ وہ اپنے کو کسی سسٹم سے باندھنا نہیں چاہتے۔ بہرحال ان سے بھی خوب بحثیں رہیں۔ ہم سب امید لگائے تھے کہ ان کی کتاب جلد چھپے تاکہ وہ بھی باقاعدہ مصنّفین کی صف میں جگہ پائیں۔ کچھ دن بعد ان کا ناول چھپا اور اس کے بعد انھوں نے گوتم بدھ پر ایک موٹی کتاب انگریزی میں شائع کی۔

انگریزوں میں یوں تو ہم بہتوں سے ملتے جلتے رہتے، لیکن ان میں سے ایک شخص قابلِ ذکر ہے رالف فاکس گو ہم سے سن میں آٹھ دس سال بڑا رہا ہوگا، لیکن وہ ہم میں اس طرح گھل مل جاتا کہ نسل، عمر، زبان کا امتیاز مٹ جاتا اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مشہور اور مستند انگریزی مصنّف ہے اور ہم صرف مصنّف بننے کے آرزومند! ایک دن میں نے اُسے شام کے کھانے پر اپنے کمرے میں مدعو کیا تھا، خاص طور پر ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے۔ میرے ایک بنگالی دوست نے کھچڑی اور پلاؤ کے قسم کی ایک درمیانی چیز پکائی تھی۔ فاکس نے بڑے شوق سے کھایا، پھر دیر تک اس نے ہندوستان آنے کے منصوبوں کا ذکر کیا۔ ادبی بات چیت کے سلسلہ میں اس نے بار بار یہی کہا کہ ہمیں ترقی پسندی کے جوش میں تنگ نظری اور تعصّب سے بچنا ضروری ہے۔ ہمارے ایک بنگالی ساتھی نے رابندر ناتھ ٹیگور پر اعتراض کرتے ہوئے ٹیگور کو ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کا نمائندہ کہہ کر رجعت پسند قرار دیا۔ فاکس اس پر بہت برہم ہوا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنا اصل میں مارکسیت کا خاکہ اڑانا ہے۔ کسی شاعر یا مصنّف کو اتنی آسانی کے ساتھ ایک خاص تخیّلی خانہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فاکس اپنی کتاب "چنگیز خاں" لکھ رہا تھا، فاکس کے بھورے بال، نیلی آنکھیں، خاص طور پر اس کی شگفتہ، بے تکلف ہنسی کی یاد، دوسری طرف اسپین میں دو برس بعد اس کی موت، ایک آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں، سرمایہ دارانہ رجعت پسندی سے لڑتے ہوئے، یہ مجھے کہیں نہیں بھولے گی۔ کبھی نہیں۔

ایک دن کئی آدمیوں کے مشورے سے میرے کمرے میں باقاعدہ میٹنگ ہوئی جس میں چھ سات آدمیوں سے زیادہ نہ تھے اور ہم نے "انڈین پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن" کو آرگنائز کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنالی۔ پہلے تو کام بہت ڈھیلا رہا لیکن جلد ہی سب کی دلچسپی بڑھنے لگی اور یہ طے ہوا کہ اپنے مقاصد کا مختصر اظہار ایک مینی فیسٹو (اعلان) کے ذریعے کرنا چاہیے۔ چار یا پانچ آدمیوں کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ آنند نے پہلا مسودہ تیار کیا، وہ لمبا بہت تھا، پھر یہ کام ڈاکٹر گھوش کے سپرد ہوا، انھوں نے اپنا مسودہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا، پھر میرے ذمّہ یہ کام کیا گیا کہ آنند اور گھوش کے مسودوں میں ترمیمیں کرکے (جن کے بارے میں کئی بار گھنٹوں بحثیں کی گئی تھیں) آخری مسودہ کمیٹی کے سامنے پیش کروں۔ بڑے جھگڑے بکھیڑے اور ایک ایک جملے اور لفظ پر لمبی بحثوں کے بعد آخر کمیٹی نے مسودہ منظور کر لیا۔ ہم نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ منعقد کی۔ اس درمیان میں لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج کے ادبی ذوق رکھنے والے ہندوستانیوں میں ہم نے کافی پروپاگنڈہ کرایا تھا۔ لندن کا ایک چینی ریستوران والا ہم پر خاص طور پر مہربان تھا وہ اپنے غریب پرور ریستوران کا ایک پیچھے کا کمرہ ہمیں اپنی میٹنگوں کے لیے مفت دے دیا کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے بے ہوا کے تہہ خانے کے کمرے میں چالیس پچاس آدمی ٹھس سکتے تھے۔ وہیں ہماری پہلی باضابطہ میٹنگ ہوئی۔ ملک راج آنند پریسیڈنٹ چنے گئے، اور پھر ہم نے کمیٹی کی طرف سے مینی فیسٹو کا مسودہ پیش کیا جو چند مزید ترمیموں کے بعد ایسوسی ایشن نے منظور کیا۔ ہم تین چار جو ایسوسی ایشن کی ایگزیکیٹو میں چنے گئے اس میٹنگ سے بہت مطمئن تھے۔ لندن میں تیس پینتیس ہندوستانیوں کو اکٹھا کر لینا ہی بڑی بات تھی، دوسرے یہ کہ مینی فیسٹو کا مرتب ہو جانا ہمارے اپنے خیالات کو جو ابھی تک منتشر سے تھے منضبط کرنا تھا۔ ترقی پسندی کیا ہے، ترقی پسند مصنّفین کا مقصد کیا ہے انھیں کس طرح کام کرنا چاہیے ان سوالوں کا جواب ابتدائی شکل میں ہمارے اعلان میں موجود تھا اور یہ بڑی بات تھی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ابھی تک (۱۹۴۰ء) میں یہ بحثیں ہمارے رسالوں میں جاری ہیں جیسا کہ ہونا بھی چاہیے، تو اس اعلان کی جامعیت کی قدر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب پی۔ڈبلیو۔اے (جس نام سے ہم اپنی انجمن کو لندن میں پکارتے تھے) کے جلسے مہینے میں ایک یا دو مرتبہ لندن میں ہونے لگے۔ ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے رومن لپی کی حمایت میں ہماری انجمن میں تقریر کی۔ ہم لوگ خود بھی رومن لپی کو اپنانے کے قائل تھے، ان کی سائنٹفک تقریر کے بعد تو بالکل ہی اس اصلاح کے موافق ہو گئے۔ تمام ہندوستان میں ایک رسم الخط کا خیال بہت دل کش تھا، اور لندن میں تعصب اور جذبات کی وہ آگ جو ہندوستان میں اس مسئلہ کے چھیڑنے سے دہک اٹھتی ہے، بالکل نہ تھی۔ ہندی اردو والے، مدراسی، بنگالی اور گجراتی غرض کہ ہندوستان کے ہر حصّہ کے نوجوان وہاں موجود تھے، اور سب نے ایک رائے ہو کر یہ طے کر لیا کہ ترقی پسند مصنّفین کو رومن لپی کا پرچار کرنا چاہیے۔

ایک جلسہ میں ایک بنگالی ممبر نے قاضی نذر الاسلام کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا اور اس کی انقلابی اہمیت بتائی۔ یہ مضمون انگریزی میں تھا ہمارا دستور یہ تھا کہ ہر جلسہ میں مضمون یا افسانہ پڑھے جانے کے بعد اس پر بحث اور تنقید کرتے تھے۔ بعد کے جلسوں میں ایک بار آنند نے اپنا ایک افسانہ "دی ٹروسٹ" سنایا جو بعد کو امریکہ کے رسالہ "ایشیا" میں شائع ہوا۔ پھر میں نے اپنا اُردو کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "بیمار" پڑھا۔ "انگارے" کی کہانیوں کے بعد یہ میری پہلی تصنیف تھی۔ ہماری انجمن میں اُردو داں کم تھے، اس لیے ڈاکٹر تاثیر (جو اس زمانہ میں کیمبرج میں پڑھتے تھے) اور سنگھ اور آنند کی تنقید نے مجھے کافی خوش کیا، لیکن میرے دل میں چور تھا، بھلا چند افسانے اور ایک چھوٹے سے ڈرامہ کو لکھ کر "مصنف" بن بیٹھنا یہ بھی کوئی بات تھی! "انگارے" کی شہرت، لندن کے ہندوستانیوں تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اس کی تو خوشی تھی کہ ادبی میدان میں میری ابتدائی کوشش نے قلا عوذیوں کی داڑھیاں جھلسا دی تھیں، اس سے بھی اطمینان تھا کہ عبدالحق کے 'اردو' میں ان افسانوں کو اچھا کہا گیا تھا، لیکن اپنی ادبی قابلیت کے بارے میں مجھے کسی قسم کا مغالطہ نہیں تھا! اس ادبی ہل چل میں اپنے ضمیر کی سالمیت کو بچانے کے لیے، مَیں نے 'لندن کی ایک رات' لکھنا شروع کر دیا۔

یہ تو ہم شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ لندن میں رہ کر ہندوستانی ادب پر نہ اثر ڈالا جا سکتا ہے اور نہ اعلیٰ قسم کا تخلیقی کام ہی ہو سکتا ہے۔ لندن کی انجمن قائم ہونے سے جہاں بہت فائدے ہوئے وہاں یہ احساس بھی پکا ہو گیا۔ دس پانچ جلا وطن ہندوستانی سوا اس کے کہ آپس میں مل جُل کر طرح طرح کے منصوبے باندھیں، اور یورپی کلچر سے اثر قبول کر کے یتیم قسم کا ایک ادب پیدا کریں، زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑی بات جو ہم نے اس زمانے میں یورپ میں سیکھی وہ یہی تھی کہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اسی وقت بارآور ہو سکتی ہے جب ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی ترویج ہو، اور جب ہندوستان کے ادیب اس تحریک کی ضرورت کو سمجھ کر اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں۔ لندن کی انجمن کا بہترین کام یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب کی ترقی پسند ادبی تحریکوں سے ہمارا رشتہ جوڑے، ہندوستانی ادب کی مغرب میں نمائندگی کرے، اور مغربی ادیبوں کی تخیئلی اور ان جدید معاشرتی مسائل کی ہندوستان میں ترجمانی کرے جو مغرب میں ادب پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔

ٹھیک اسی وقت فرانس میں چند ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے ہمیں اپنے ارادوں میں بڑی مدد ملی۔ مَیں نے شروع میں ذکر کیا کہ فرانس میں فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی تحریک ۱۹۳۳ء سے شروع ہو چکی تھی اور درمیانی طبقے بھی مزدوروں کے متحدہ محاذ کے ارد گرد کھنچے چلے آ رہے تھے۔ مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی لگاتار کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیرس میں جولائی ۱۹۳۵ء میں ایک ورلڈ کانگریس آف رائٹرس فار دی ڈیفنس آف کلچر "یا" بین الاقوامی مصنّفین کی کانگریس برائے تحفظِ کلچر" ہونا قرار پائی۔ اس کانفرنس کو مدعو کرنے والوں میں میکسیم گورکی، رومین رولاں، آندرے مالرو، ٹامس مان، والڈو فرینک جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں تھیں۔ یہ اجتماع جو پیرس کے ایک مشہور ہال "بال بولیے" میں ہوا دنیا کے ادب میں بہت بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دُنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح و مشورہ کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدّن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لیے ان کی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی جماعت کو منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہی ایک مؤثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ ترقی اور فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں، اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشو و نما کا پُورا پُورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا

ہو جانے سے بچا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدت کے ادیب جمع تھے، لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادیٔ خیال و رائے کے حق کے تحفظ کی کوشش کرنا چاہیے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں، یا ان کے خیالات کی بنا پر ان پر مظالم کریں، اس کے خلاف پُرزور احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے "متحدہ محاذ" کا جز بن کر، محنت کش طبقوں کی پشت پناہی حاصل کریں۔ فرانس اور چین کے مصنفین، کا تجربہ اسی خیال کے ٹھیک ہونے کا ثبوت تھا۔ چین کے بہترین لکھنے والے شاعر، ناولسٹ، ڈرامہ نگار، ماہر تعلیم و فلسفی وغیرہ ایسے وقت جب کہ چین جاپانی سامراج کے خلاف، بڑی سخت لڑائی لڑ رہا ہے، اپنی ساری لیاقت کو اپنے ملک کی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں صرف کر رہے ہیں۔ "چینی مصنفین کی انجمن" سامراج دشمن متحدہ محاذ کا ایک اہم حصہ ہے، جو چینی عوام کی تمام لطیف ادبی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے، چینی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت، جاپان کے خلاف جنگ کے اصلی رُوپ رنگ کو عوام کے سامنے رکھ کر ان کو نفسیاتی طور سے جنگِ آزادی کے لیے تیار کرتی ہے۔ فرانس کے بڑے بڑے ماہرین سائنس، فلسفی، شاعر، ناول نگار اور دوسرے ادیبوں نے بھی ہنری باربس کی رہنمائی میں اپنا ایک ادارہ فاشیت کے خلاف جدوجہد کے لیے قائم کر لیا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان صاحبانِ علم و فضل کی ان تھک کوششوں اور ان کے عام اثر کا ہی بڑے حد تک نتیجہ تھا کہ فرانس میں درمیانی طبقے بھی مزدوروں کی متحدہ محاذ کی تحریک میں شامل ہوتے جا رہے تھے اور وہ پاپولر فرنٹ یا عوامی محاذ، قائم ہوتا جا رہا تھا جس کی بالآخر وسط ۱۹۳۶ء میں وزارت بن گئی۔ اس کے علاوہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ادیبوں کی ایک علاحدہ انجمن تھی جس کا اپنا ایک ماہنامہ بھی تھا۔

اس بین الاقوامی کانفرنس کے اجلاس اور اس کی کمیٹیاں پیرس میں کئی دن تک منعقد ہوتی رہیں۔ کھلے اجلاسوں میں ہزار ہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا اور ہال میں جس میں داخلہ ٹکٹ سے تھا، تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔ سب سے بڑی خاص بات تھی کہ مزدور جماعت کے لوگ یہاں بکثرت تھے۔ وہ گویا اپنی موجودگی سے ادیبوں اور عوام الناس کے اس نئے سرے سے قائم کیے ہوئے رشتہ کا بیّن ثبوت دے رہے تھے جس کے لیے خاص طور پر یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ ادیبوں کی جماعت موجودہ سرمایہ دارانہ دَور میں عوام سے الگ ہو گئی ہے، وہ ان سے کچھ خائف بھی ہے، اور اس کے دل میں ان کے لیے کچھ حقارت بھی پوشیدہ ہے۔ بہرحال وہ ان سے غیر مانوس ہے۔ جدید ادب کے ایک بڑے حصہ کے روحانی طور سے مفلوج ہونے کی وجہ ادیبوں کی زندگی کے سرچشمے، یعنی محنت کش طبقوں کی حیات سے دوری ہے۔ سوویٹ روس کے مصنفین کے وفد کا اس کانفرنس میں بڑا شاندار خیر مقدم ہوا، جس کی وجہ یہی تھی کہ اس جدید اشتراکی معاشرت میں مصنف اور اس کی پبلک کے درمیان کا فاصلہ اب باقی نہیں رہ گیا۔ اشتراکی مصنف عوام کا ہے، اور عوام اس کے ہیں۔ ان مصنفوں میں اتحاد اشتراکیہ سوویٹ کی مختلف قوموں کے نمائندے تھے، جن میں تاتار، ازبیک اور تاجک مصنف تھے۔ (تاجکستان کی سوشلسٹ ریاست کشمیر کے شمال میں ہے اور وہاں کے لوگ فارسی بولتے ہیں)۔

افسوس ہے کہ جہاں اکثر شرقی اقوام کے نمائندے وہاں موجود تھے۔ چینی، جاپانی، ایرانی، ترک، عرب اور تاتار وغیرہ وہاں اس تاریخی موقع پر ہندوستان کے مصنفین کی نمائندگی کے لیے جناب صوفیہ وادیا صاحبہ، بمبئی کی ایک پارسی خاتون تھیں، گویا یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان وہاں موجود نہ تھا کیونکہ ان خاتون کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہوتا، اور رہ گئے ہم لوگ، تو ہم مٹھی بھر نوجوان ہرگز اس مغالطہ میں نہیں تھے کہ ہندوستان کے عظیم الشان ادب کی ہم اس اجتماع میں نمائندگی کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں ہم کو ہندوستان کی کسی ادبی جماعت کی طرف سے اس طرح کی نمائندگی کا حق بھی نہیں دیا گیا تھا۔

اس کانفرنس کے ہو جانے کے بعد ساری دنیا کی ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک بین الاقوامی مرکز پیرس میں قائم ہو گیا جس کے کارکن اس کانفرنس کے نمائندوں ہی نے چنے۔ دُنیا کی مختلف قوموں میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اب صرف تخئیلی طور سے نہیں تنظیمی طور سے بھی ایک رشتہ میں منسلک ہونے لگی۔ بین الاقوامی کلچر کی تخلیق میں یہ ایک بڑا قدم لیا گیا تھا۔ ہماری لندن کی ترقی پسند انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ باقاعدہ اس

بین الاقوامی ادبی مرکز سے ملحق ہو جائے اور بعد کو جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہو جائے، تو پھر اس مرکزی ہندوستانی انجمن کی ایک بیرونی شاخ کی حیثیت سے وہ اس الحاق کو قائم رکھے، اور مرکزی انجمن کے ہدایات کے مطابق بیرون جات میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کرے۔

اس درمیان میں میں قانونی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے لندن و انگلستان کو آخری خیرباد کہہ کر کچھ دنوں کے لیے پیرس میں مقیم تھا۔ یہاں میں اپنے دوست شوکت اللہ انصاری کے ساتھ رہتا تھا، جو اس زمانے میں پیرس میں ڈاکٹری پڑھتے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت 'لندن کی ایک رات' لکھنے میں صرف ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ اس ناول کو ختم کر لوں پھر وطن واپس آؤں، کیونکہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر فرصت نہ ملے۔

موسم سرما کے آخری دن تھے جب میں پیرس آیا۔ کشادہ سڑکوں کی پٹڑیوں پر لگے ہوئے چار رویہ اور شش رویہ پیڑوں کی پتیاں ہری بھری تھیں۔ دریائے سین اپنی پوری بہار پر تھا، اس کے کنارے پرانی کتب فروشوں اور دوسری سکنڈ ہینڈ چیزوں کی دوکانوں پر لوگ کھڑے کتابوں کو الٹتے پلٹتے رہتے۔ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے۔ دریا کے داہنے کنارے پر 'نوتردام' کے مشہور گرجا کے دو بڑے بڑے چوکور مینارے اوپر اٹھے ہوئے دکھائی دیتے، اور اس بلندی سے اس پر نصب کیے ہوئے عجیب غریب بھیانک شکل کے شیاطین کے بت، نیچے چلتی پھرتی ہوئی انسانوں کی دنیا کا مذاق اڑاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں سے کوئی دو میل کے فاصلے پر اسی کنارے لوور کے محل کا منظر ہے اور پھر اسی سے ملا ہوا توئی لری کا باغ۔ پیرس کے اس حصہ کا چپہ چپہ تاریخی ہے اور دنیا کے بہترین آرٹ کے خزانوں کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے۔ گرمیوں کی لمبی شام کو لوور کی سیاہ دیواریں، ان کے اردگرد کے سرسبز درخت اور محل کے دونوں بازوؤں کے بیچ فصلی پھولوں کے بڑے بڑے خوش نما تختے، جابجا فرانس کے مشاہیر کے مجسمے، یا پھر یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے قد آدم بت، درمیانی سڑک پر موٹروں کا ایک بہتا ہوا دریا، توئی لری باغ کے بڑے بڑے خوبصورت پیڑ، بنچوں پر نوجوان عاشق اور ان سے لگی بیٹھی ان کی محبوبہ، ایک وسیع حوض اور اس کے بیچ میں والہانہ اچھلتا ہوا فوارہ، اس کے کنارے بچے کھلونے کی ناؤ چلاتے ہوئے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا جاتا ہے، ہم باغ کی ایک بلند سطح سے پچھم کی طرف دیکھتے ہیں: ایک بڑا چوکور میدان جس کے اردگرد کالی کالی کول تار کی چلتی ہوئی سڑکیں، بیچ بیچ میں ایک پتھر کی ٹھوس گاؤدم لاٹ، مصری جس پر قدیم مصری حروف کندہ ہیں، یہ بالکل اس مقام پر نصب کی گئی ہے جہاں انقلاب کے وقت وہ گلوٹین (سولی) تھی جس پر لوئی سیزدہم، اس کی ملکہ ماری انتوانت اور دوسرے سیکڑوں انقلاب دشمن امراء کے سر قلم ہوئے تھے، اس کے ہر چہار طرف حوض اور فوارے، اور تیز روشنیوں کا ہجوم، درمیان سے نکلی ہوئی دنیا کی وہ مشہور سڑک شانزا الیزے، جس کے معنی ہیں خطہ ہائے بہشت، بہت چوڑی اپنے دونوں طرف درختوں کی قطاروں کا ایک جنگل لیے ہوئے، اور پھر اس کے آخر میں توئی لری سے صاف نظر آتا ہوا، کوئی دو میل کے فاصلہ پر سڑک کی دوسری حد پر آرک دِ تریومف، یا درِ فتح، بلند و ارفع، کافی رعب دار لیکن خوبصورت بھی، نپولین کا تعمیر کیا ہوا، ٹھیک اسی جگہ حدِ نظر پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے فضا رنگین ہے۔ اتنی بہت سی تیز تیز چلتی ہوئی موٹروں کے باوجود بھی یہاں اس وقت کچھ سکون سا ہو جاتا ہے۔ انسانیت اور قدرت کی ہم آہنگی ایک خاموش درد انگیز مسرت ــــــــــ یہاں ہم زیادہ دیر رک نہیں سکتے، کیونکہ شام کا اندھیرا بڑھنے پر توئی لری باغ بند ہو جاتا ہے اس کے ایک کنارے سے باغ کا محافظ پوں پوں بھونپو بجاتا ہوا چلا آرہا ہے، اور باغ میں بیٹھے ہوئے عشاق کے جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بادلِ ناخواستہ باہر نکل رہے ہیں۔

یہ وہ شہر تھا جسے پیرس والے ملکۂ جہاں کہتے تھے، جسے شاید میں آخری بار دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا: یہی وہ بھی دن تھے جب ہماری نوخیز امیدوں کے چراغ کو فرانسیسی مزدوروں اور عوام الناس کے متحدہ محاذ کی تحریک نے روشن کر دیا تھا۔ ہم سمجھنے لگے تھے کہ یہ شعلہ اب دن بدن تیز ہوتا جائے گا۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی تمازت پہنچے گی، رفتہ رفتہ انقلاب کی آگ بھڑک اٹھے گی اور آخر میں ہماری نئی دنیا، نئے آسمان، نئی زمین بلکہ نئے انسان کی تعمیر ہوگی۔ ہم اپنے راستہ کو یہ تو ضرور سمجھتے تھے کہ بہت مشکل ہوگا، اتنا پیچیدہ ہوگا، جیسا کہ اب دوسری عالمگیر جنگ کے چھڑ جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے، یہ اس بہار کی حرارت انگیز فضا میں وہم و گمان تک نہ تھا۔

جدید ادبی تحریک کے مرکز میں قیام کو میں نے اپنی تہذیبِ دماغ کے لیے مناسب سمجھا۔ افسوس کہ بین الاقوامی کانفرنس کے چند ہی دنوں بعد باربس کا انتقال ہو گیا، اس لیے اس عظیم الشان ہستی سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ کئی سال پہلے اس کی تقریر سن چکا تھا لیکن بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ باربس

کے جنازے کے ساتھ کئی لاکھ آدمیوں کا ہجوم تھا اور پیرس کے اطراف میں رہنے والے تمام مزدور اس ادیب رہنما کے آخری درشن کے لیے شہر میں امنڈ آئے تھے۔ شاید اس وقت تک دنیا میں کسی ادیب کا جنازہ اتنی شان سے نہ نکلا ہو۔ اتنی عقیدت مندی، خلوص، محبت، غم کا اظہار عوام الناس نے شاید ہی کسی دوسرے مصنف کے ساتھ کیا ہو۔ ان کے لیے یہ دُبلا پتلا، لمبا سا زرد رو شخص، جس کے کندھے کچھ جھکے ہوئے تھے، جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں لڑائی کی ٹھنڈی اور نم خندقوں سے تپ دق کا تحفہ پایا تھا اور جس نے اس سرمایہ دارانہ بہیمیت کے خلاف اپنی پُرجوش آواز اپنے ناول "آگ" میں بلند کی تھی، صرف ایک پُرزور مصنف نہ تھا، وہ نشان تھا انقلابی انسانیت کی جدوجہد کا، مستقبل کی درخشاں اُمیدوں کا۔

اس زمانہ میں پیرس کی ادبی دنیا میں آندرے جید کے قلبِ ماہیت نے ایک کہرام مچا دیا تھا۔ آندرے جید کا رتبہ جدید فرانسیسی ادب میں بہت بڑا ہے حالانکہ بیرون جات میں جدید فرانسیسی ناول نگاروں میں رومین رولاں، اناطول فرانس، مارسل پروست چوٹی کے لوگ گنے جاتے ہیں، لیکن فرانسیسی ادبی نقادوں کے نزدیک جید کا درجہ ان سے کچھ نیچا نہیں، بلکہ اُوپر لکھے ہوئے تینوں ادیب (جن میں سے رولاں اب زندہ ہیں) جدید ترین نہیں سمجھے جاتے تھے۔ درآنحالیکہ آندرے جید کی مقبولیت ۱۹۳۵ء میں دن بدن ترقی پر تھی۔ جید کی بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت سے، ہی فرانس کے قدامت پسند نقادوں کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ وہ شخص جس کی فلسفۂ زندگی کی بے عنوانیوں اور شرارتوں سے وہ محظوظ ہوتے تھے اور جس کے طرزِ تحریر کی نفاست سے ان کے مضطرب ادبی ضمیر کو تسکین ملتی تھی، یکایک میلے کچیلے مزدوروں کے مجمع میں جاکر تقریر کرے اور اپنی ادبی خدمات کو عوام الناس کے لیے وقف کر دینے کا وعدہ کرے انھوں نے کہنا شروع کیا کہ جس طرح آندرے جید کا فلسفۂ گناہ، کوئی سنجیدہ فلسفۂ زندگی نہیں، اسی طرح اب جید کا نفرنس کا عوامی تحریک کے ساتھ ملحق ہونا ایک غیر سنجیدہ فعل ہے لیکن جب جید کی کتاب "لے نودل ولوری تور" یا غذائے نو" کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد چھپی تو پھر تو جید کے پرانے دوستوں کے غصّہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس کتاب میں جید نے، جو کہ ہمیشہ سے مروجہ اخلاق کے خلاف انفرادی بغاوت کا سبق دیتا آیا تھا، اور جواز ارتکاب گناہ کو انسانی کی روحانی تکمیل اور نجات کے لیے ضروری بتاتا تھا۔ اشتراکیت کے نصب العین کو قبول کر کے کہا کہ انفرادیت کا بلند ترین درجہ اشتراکیت ہے۔

جید کی کتاب شائع ہونے کے کچھ دنوں بعد مجھے ایک بار اس کا موقع ملا کہ میں جید کے جدید ادبی رجحان پر ایک مشہور فرانسیسی ادیب پروفیسر آلبیر سارو کی تقریر سنوں۔ جلسہ فرانسیسی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے دفتر کے چھوٹے سے ہال میں ہوا تھا۔ اسی جگہ بین الاقوامی ادبی مرکز کا بھی آفس تھا۔ ہال میں مشکل سے ڈیڑھ سو آدمی سما سکتے ہوں گے لیکن اس دن ڈھائی تین سو آدمی گھس پل کر اسی جگہ جمع ہو گئے تھے۔ کرسیاں سب بھر گئی تھیں اور بہت سے لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے۔ پروفیسر سارو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جید کا اشتراکیت کی طرف جھکنا ایک قدرتی امر تھا، اس لیے کہ جس شخص کی ساری ادبی کاوش انسان کو خود پرستی اور گناہ کے وسیلے سے مکتی کی راہ دکھانے پر منحصر ہو، وہ اگر ایماندار ہے تو موجودہ سرمایہ دارانہ سماج میں بھی انفرادیت کے کچلے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا اور اس طرح سے لازماً اشتراکیت کے فلسفہ کو صحیح تسلیم کرے گا۔ ایک مشہور قدامت پسند نقاد بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ سارو کی تقریر کے بعد عام بحث شروع ہوئی تو انھوں نے سارو سے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک جید کا جدید رجحان اس کے آرٹ کے انحطاط کی نشانی تھا کیونکہ جید اب ایک آرٹسٹ کی حیثیت کو چھوڑ کر اپنے فن میں سیاسی جانب داری گھسا رہے تھے، اور بقول ان کے ایسا کرنا آرٹ کا گلا گھونٹنا ہے۔ بلند پایہ فرانسیسی شاعر اور ناول نگار آراگون بھی اس جلسہ میں شریک تھا۔ اس نے بھی بحث میں حصّہ لیا اس نے جید کے نئے رجحان کو فرانسیسی ادب اور فرانسیسی پاپولر فرنٹ (عوام الناس کا متحدہ محاذ) دونوں کے لیے مبارک شگون سمجھا لیکن ساتھ ہی اس نے کہا کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جید اگر آج اشتراکیت کے حامی ہیں تو اس کی وجہ زیادہ تر جذباتی ہے۔ وہ مارکسی اشتراکیت سے دُور ہیں جو علمی ہے اور جس کی بنیاد ٹھوس ہے۔ اس نے کہا کہ ایک آرٹسٹ کے لیے سوشلزم کی طرف اس طریقے سے آنا ایک قدرتی امر ہے لیکن اگر وہ جلد ہی اشتراکیت کی عقلی اور علمی بنیادیں مضبوط نہ کر لے تو کسی بھی پیچیدہ اور نازک تاریخی موقع پر وہ رجعت پسندی کی دلدل میں دوبارہ پھنس سکتا ہے۔ افسوس کہ آراگون کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور آندرے جید ایک سال بعد ترقی پسندوں کی صف سے علاحدہ ہو کر، خود پرستی کی کال کوٹھڑی میں پھر بند ہو گئے۔

اسی سلسلہ میں آراگون کا بھی تذکرہ کردوں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں، زندگی کا توازن درہم برہم ہو گیا تھا، اس کا اثر ادب اور آرٹ

پر بھی پڑا۔ ایک گروہ ادیبوں اور آرٹسٹ کا یورپ میں ایسا پیدا ہوا، جس نے پرانے طرز، طریقوں، جذبات، عقلیت غرض ہر چیز کو ٹھوکر مار کر، اپنے آرٹ اور ادب کو مہملیت کی حد تک پہنچا دیا۔ ان کی شاعری نہ کسی کی سمجھ میں آتی تھی اور نہ ان کی بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے ہی کوئی معنی نکلتے تھے۔ یہ تحریک داداکے نام سے مشہور تھی اور پیرس اس کا مرکز تھا۔ آراگون داداگروہ کا ایک نوجوان شاعر تھا لیکن جلد ہی اس بغاوت، محض و مطلق سے اس نے اپنا دامن چھڑا لیا اور فرانس کی جدید شاعری کی پہلی صف میں اپنے لیے جگہ پیدا کرلی۔ سرزمینِ سوویٹ کا بھی اس نے سفر کیا اور وہاں اپنی آنکھوں سے اشتراکی سماج کی تعمیر کو دیکھا، نئے بنے ہوئے بڑے بڑے پانی کے بند جن سے بجلی پیدا کی جاتی ہے، نئے نئے کارخانے، مشین سے کھیتی، حکمراں مزدور اور کسان، علم و فن کی روز افزوں ترقی ان چیزوں کے مظاہرے میں آراگون کو بلند ترین رومانیت نظر آئی اور اس نے محسوس کیا کہ یہی وہ ذرائع ہیں جو روح انسانیت کو مردہ مادے کی غلامی سے سبکدوش کرکے، آزادی کی فضا میں بالیدگی کا پورا موقع دیں گے۔ سوویٹ کے بارے میں اس کی نظمیں جو فرانس بھر میں مشہور ہوئیں حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی ان نظموں کی تعریف کی جو اشتراکی نہ تھے۔ ان کے خلوص، جدت، ادا، جوش کا اعتراف نہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اپنے پیرس کے قیام کے موقع پر آراگون کو فرانسیسی مصنّفین و اہلِ علم کی ترقی پسند تحریک میں پیش پیش دیکھا۔ یہ میانہ قد، چھریرے بدن کا خوبصورت شاعر اور ناول نگار، نہایت عمدہ مقرر بھی تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس میں انتظامی قابلیت بھی بہت تھی۔ فرانسیسی ادیبوں کی انجمن کا وہ سیکرٹری تھا، بین الاقوامی ادیبوں کی انجمن کے نئے قائم شدہ دفتر میں بھی وہ کام کرتا تھا۔ فرانسیسی مزدور جماعت میں وہ بہت ہر دل عزیز تھا اور پیرس کے سب سے زیادہ نفاست پسند، نازک مزاج اور مخصوص ترین ادبی حلقوں میں بھی اس کے لیے جگہ محفوظ تھی۔ ایک باہمی فرانسیسی دوست نے میرا تعارف آراگون سے کرایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ آراگون مجھ سے دیر تک ہندستانی ادب کے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ ہندستان میں بھی اس تحریک کو شروع کیا جائے۔ پھر میں نے آراگون سے پوچھا کہ فرانسیسی اور بین الاقوامی ادیبوں کی انجمن کے بارے میں اس کے تنظیمی تجربات کیا ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے خاص فرانسیسی طرز سے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور ہنس کر جواب دیا ——

"یہ نہ پوچھیے! ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر مشکل دُنیا میں اور کسی جماعت کی تنظیم نہیں۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ نکالنے کی کوشش کرتا ہے، تاہم ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ زمانہ کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی حفاظت اور ترقی کے لیے تنظیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں"۔ جب میں آراگون سے مل کر اپنی قیام گاہ پر جانے کے لیے باہر نکلا تو شام کا اندھیرا چھا گیا تھا، سڑکوں پر روشنیاں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ میرا مکان کافی دُور تھا۔ میں ایک بس میں بیٹھ گیا۔ بس کا راستہ پیرس کے سب سے زیادہ شان دار بازار کی کشادہ سڑکوں سے ہو کر جاتا تھا جو "گراں بُولوار" کے نام سے مشہور ہیں۔ لفظ رونق کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہاں سے بہتر شاید ہی دنیا میں اور کوئی جگہ ہو۔ فرانسیسیوں نے اپنی دوکانوں، ریستوران، سینما اور تھیٹر کے دروازوں پر روشنی کی فراوانی سے ہر رات، شب برات بنا دی تھی اور پھر یہاں پر چہل پہل بھی خوب تھی۔ سڑک کی پٹڑیوں سے ملے ہوئے قہوہ خانوں میں لوگ بھرے تھے، خوش پوشاک حسین عورتیں اِدھر اُدھر دکھائی پڑ جاتی تھیں۔ زندگی خوش گوار معلوم ہوتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے آراگون کے آخری ناول "لے کلوش د بالی" یعنی شہر بازل کے گھنٹے، کی ہیروئن کا خیال آیا۔ میں نے حال ہی میں اس ناول کو پڑھ کر ختم کیا تھا وہ لڑکی بھی فرانس کی تھی، جس کی زندگی محبت کی برکت حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ اس کے جذبات کی انانیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی دنائت نے ایک لطیف انسانی رُوح کو کچل ڈالا اور شاید اس چمک دمک اور طمطراق کے مقابلہ میں فرانس کی مقید لیکن زندہ دل گداز انسانیت کی زیادہ صحیح ترجمانی اسی شخصیت سے ہوتی تھی۔

جب میں پیرس سے وطن لوٹنے کے لیے روانہ ہوا تو پت جھڑ شروع ہو گیا تھا، درختوں کی سبزی غائب ہو چکی تھی پتیاں پیلی، سُرخی مائل مسرخ تھیں، ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ دھوپ جب نکلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اس میں سے کسی نے گرمی کھینچ لی ہے اور خالی روشنی چھوڑ دی ہے۔ یورپ چھوڑنے کے لیے ایسا ہی موسم مناسب ہے۔ مجھے ایک اطالوی جہاز سے آنا تھا اس لیے جنیوا جانا پڑا۔ یہاں کی فضا میں جنگ کے بادل گھرے ہوئے تھے، اٹلی اور حبش کی لڑائی چھڑ چکی تھی، چاروں طرف فوجیں ہی فوجیں دکھائی دیتی تھیں۔ جہاز حالانکہ ہندستان جا رہا تھا لیکن اس پر انگریز اور ہندستانی قریب قریب ندارد تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ شاید انگلستان اور اٹلی میں بھی لڑائی چھڑ جائے اور اس حالت میں ہم برطانوی رعایا ہونے کے ناطے، اٹلی کے قیدی ہو جائیں گے۔ برطانوی غلام اور اٹلی کے قیدی میں کچھ زیادہ فرق نہ سمجھ کر میں نے اس خطرہ کی زیادہ پرواہ نہ کی اور چونکہ میں پہلے ہی سے اطالوی جہاز کا

ٹکٹ خرید چکا تھا، اسی پر سفر کرنا مناسب سمجھا۔

جہاز سنسان تھا۔ بہت سے اطالوی مزدور حبش جانے کے لیے مساوا تک جا رہے تھے، لیکن وہ ہم سے علاحدہ تھے۔ میں اکیلا اِدھر اُدھر خالی ڈکوں پر ٹہلتا اور زیادہ تر وقت اپنے ناول کی تحریر میں صرف کرتا۔ بحیرۂ روم نیلا اور پُرسکون نہ تھا بلکہ سیاہی مائل سفید ہو رہا تھا اور کافی خشمگیں بھی تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ اطالوی مزدوروں میں سے ایک نے سمندر میں کود کر خودکشی کرلی۔ جہاز کچھ دیر کے لیے بیچ سمندر میں رُکا، لیکن بدنصیب کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ آخر اس بے چارے نے حبش جاکر اطالوی سامراج کے لیے سڑک بنانے کے مقابلہ میں موت کو کیوں ترجیح دی، یہ سوال بار بار میرے دماغ میں اٹھتا تھا لیکن وہاں اس کا جواب کون دیتا؟ میرے کیبن (کمرہ) کے ساتھی فرانس میں افغانی سفارت خانہ کے ایک معزز عہدے دار آغا صاحب تھے۔ جہاز میں وہ صرف مجھ سے ہی بات چیت کرسکتے تھے، کیونکہ وہ صرف فارسی اور فرانسیسی بول سکتے تھے اور جہاز پر اطالوی یا انگریزی ہی سمجھی جاتی تھی۔ انھیں پیرس چھوڑنے کے غم نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ جناب کی ایک ہسپانوی معشوقہ اس مرکزِ حُسن و مستی میں چھوٹ گئی تھیں اور کابل میں ان کی محترمہ خانم اور ماشاء اللہ دو بچے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کشاکش میں کس کا دماغ سالم رہ سکتا تھا؟ وہ اپنا دکھڑا بار بار مجھے سناکر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرتے۔ میں اپنا غم کسے سناتا؟

زندگی کا ایک دَور ختم ہو چکا تھا اور خاتمہ ہمیشہ اپنے ساتھ اُداسی لاتا ہے۔ دوسرا اور زیادہ اہم دَور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اُمیدیں اور آرزوئیں، ارادے اور منصوبے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے۔

بحرِ عرب میں موسم معتدل تھا اور سمندر پُرسکون۔ رات کو چاروں طرف گھرے ہوئے اندھیرے کے بیچ سمندر میں چاند کے عکس سے دُور تک ایک جھلملاتی ہوئی سیمیں نہر سی بن جاتی، اس وقت صرف جہاز کے پانی کاٹنے کی سرسراہٹ سنائی دیتی، یا پھر کبھی کبھی میرے افغان دوست کے گراموفون سے ایک درد انگیز فارسی نالہ بلند ہوتا۔

"عاشق نہ شوی کہ عاشقی بدبخت است
گاہے بینی، گہے نہ بینی سخت است"

ترقّی پسند مُصنّفین کی پہلی کانفرنس

سجّاد ظہیر

ہمیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ اگر لکھنؤ میں باقاعدہ استقبالیہ کمیٹی بنائی نہیں جاسکتی تو کم ازکم استقبالیہ کمیٹی کے نام پر سو پچاس ٹکٹ بیچ کر کچھ چندہ ہی فراہم ہوجائے اور اگر پوری کمیٹی نہیں تو کم ازکم استقبالیہ کمیٹی کا ایک صدر ہی بنالیا جائے۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ موزوں چودھری محمد علی صاحب رودولوی کو سمجھا۔ یوں تو چودھری صاحب تعلقہ دار ہیں اور اودھ کے رؤسا میں سے ہیں اور وہ ہم سے ایک نسل پہلے کے فرد ہیں، لیکن ان کی ذات میں کچھ عجیب خصلتیں جمع ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شخصیت سرزمین اودھ کی دلچسپ ترین شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ ان کے اخلاق و آداب اودھ کے قدیم رئیسوں کی طرح ہیں۔ لیکن ان کی صورت، داڑھی مونچھ صاف، گورا چٹا رنگ، جدید انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سی ہے۔ وہ اُردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطافت، طنز اور تفنن ہوتا ہے جس سے پُرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے۔ لیکن باتیں کرنے پر آجاتے ہیں تو نیتشے اور مارکس، ٹیگور اور اقبال ایک طرف، تو جنسیات اور نفسانیات کے ماہرین فرائڈ اور ہیولاک دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائداد اور ان کی اولاد کا تذکرہ کریں گے۔ اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ باتیں کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ اگر کسی محفل میں خوبصورت عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مجمع ہو تو وہ ان کے جھنڈ میں یوں پہنچ جاتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس سے کھنچتا ہے اور پل بھر میں اپنی اجنبیت کو کھوکر ان سے ایسی رازدارانہ باتیں کرنے لگتے ہیں جو صرف راجہ اندر اپنی پریوں سے کرتے ہوں گے۔ نوجوان ترقی پسندوں کو وہ ہمیشہ شفقت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اُردو ادب کی بہترین روایات سے واقف اور ایک لطیف طرزِ تحریر کے مالک تھے اور جدید ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب ہم نے ان سے اپنی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت کے لیے کہا تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ درخواست ان سے کی گئی۔ رسماً نہیں بلکہ بڑے خلوص کے ساتھ انھوں نے اس سے اپنی معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ وہ کبھی کسی "تحریک" میں شامل نہیں ہوتے ہیں اور ہر قسم کے سیاسی جھگڑوں اور ہنگاموں سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن ہمارے، خاص طور سے رشید جہاں کے اصرار پر وہ نہیں بھی نہ کرسکے اور آخر میں راضی ہوگئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ بہت معذرت کے ساتھ چپکے سے سو روپے ہمیں عطیہ بھی دے دیا۔ یہ ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ چودھری صاحب کو اس کی شرمندگی تھی کہ یہ رقم بہت کم تھی۔ لیکن انھیں معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کانفرنس کے لیے کسی ایک شخص سے دس روپے سے زیادہ چندہ نہیں ملا تھا۔ اور ہم کل جملہ ڈیڑھ سو روپے لے کر کل ہند کانفرنس کرنے چلے تھے۔

ہم نے کانفرنس کے ہال کے لیے کوئی دو تین سو کرسیاں کرائے پر لے تو لیں لیکن اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہال بھرے گا بھی یا نہیں۔
لک کے مختلف حصوں سے جن ڈیلیگیٹوں کے آنے کی ہمیں اطلاع ملی تھی۔ ان کی تعداد مشکل سے تیس چالیس رہی ہوگی۔ دو بنگال سے،
ن پنجاب سے، ایک مدراس سے، دو گجرات سے، چھ مہاراشٹر سے اور شاید بیس پچیس صوبہ متحدہ کے مختلف حصوں سے، لکھنؤ میں
س وقت تک ہماری تحریک بالکل جاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ الٰہ آباد میں تو فراق، اعجاز حسین، احمد علی وغیرہ یونیورسٹی میں پڑھاتے
تھے اور ان کے زیر اثر طلبا کی خاصی تعداد ہمارے جلسوں میں آجاتی تھی۔ یہاں یونیورسٹی میں بھی ہمارا کوئی نہ تھا۔ اس وقت
ک ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما، احتشام حسین اور آل احمد سرور لکھنؤ یونیورسٹی میں مقرر نہیں ہوئے تھے۔ ہماری
بے سروسامانی اور کمزوری کا اس سے بڑا اظہار اور کیا ہوتا کہ لکھنؤ ایسے ادبی شہر میں ہماری کانفرنس میں دلچسپی لینے والے
گنتی کے ہوں۔ ہمیں اس کا احساس تھا کہ اگر ایسا ہوا تھا تو یہ اہل لکھنؤ کی بدذوقی یا رجعت پسندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ
س سبب سے تھا کہ انھیں ہماری تحریک یا کانفرنس کے بارے میں مطلع نہیں کیا گیا ہے اور ان میں کانفرنس کے لیے
دلچسپی نہیں پیدا کی گئی ہے۔ چند دنوں میں چند آدمی اس کمی کو کس طرح پورا کر سکتے تھے؟ پھر بھی ہم نے ہار نہیں مانی۔

یونیورسٹی میں چند طلبا کے ذریعے ہم نے اشتہار تقسیم کروائے۔ اور جب کانفرنس کے دو دن پہلے بڑے
پوسٹر چھپ کر آگئے تو محمود الظفر اپنے ساتھ ایک دو اور ساتھیوں کو لے کر شہر کے خاص خاص حصوں، نکڑوں اور چوراہوں
پر رات بھر انھیں چسپاں کرتے پھرے۔ رشیدہ لکھنؤ میں چند سال پہلے ڈاکٹری کی پریکٹس کر چکی تھیں اور یہاں پر بہتوں
سے واقف تھیں۔ انھوں نے گھوم گھوم کر کانفرنس کی ریسپشن کمیٹی کے تین تین روپے والے ٹکٹ بیچنے شروع کیے۔ اگر یہ
لوگ ادب سے دلچسپی لینے والے نہیں بھی تھے تو تین روپے کی حد تک تو انھیں ادب نوازوں کی صف میں داخل
ہی کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ہزاروں آدمی لکھنؤ آنے لگے
تھے۔ ان میں سوشلسٹ لیڈر اور کمیونسٹ کارکن بھی تھے جن میں اکثر اگر ادیب نہ تھے تو ترقی پسند ادبی تحریک کے ہمدرد
تھے۔ آچاریہ نریندر دیو سنسکرت، پالی، ہندی کے عالم تھے اور اردو کے بہترین مقررین میں سے شمار کیے جاتے تھے۔
جے پرکاش نرائن کی سوشلسٹ سیاسی زندگی کا دلکش آغاز تھا۔ کملا دیوی چٹوپادھیا ایک سرخ شعلے کی طرح فروزاں
تھیں۔ میاں افتخار الدین بڑے شد و مد کے ساتھ کانگریس کے بائیں بازو کی سیاست سے منسلک ہو گئے تھے۔
ان سب نے ہماری کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا۔ سروجنی نائیڈو شاعروں اور ادیبوں کی دلچسپی، دلجوئی
اور مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ وہ بھی لکھنؤ میں تھیں اور انھوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا۔

جوں جوں کانفرنس کا دن قریب آتا ہماری گھبراہٹ بڑھتی جاتی۔ روپیوں کی کمی کی وجہ سے ہم اپنے ڈیلیگیٹوں
کو ٹھہرانے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چند کو ہم نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے یہاں
ٹھہرانے کا بندوبست کیا تھا۔ بہت سے کانگریس کے کیمپ میں جا کر ٹک گئے تھے جہاں ایک جھونپڑی چند روپیوں میں
کرائے پر مل جاتی تھی۔ اور کھانا بہت سستا تھا۔ بعض یونیورسٹی کے ہوسٹل کے خالی کمروں میں ٹھہرے۔ یہ انتظام
ہمارے لیے بڑی زحمت کا باعث تھا۔ اس لیے کہ کانفرنس ہال اور میرے گھر سے جہاں کانفرنس کا عارضی دفتر تھا۔
یہ سب جگہیں کئی کئی میل کے فاصلے پر تھیں۔ لیکن مجبوری تھی، ہم نے اپنے مہمانوں کو اپنی حالت بتا دی تھی۔ اور ان سے
پہلے کہہ دیا تھا کہ لکھنؤ میں ان کے ٹھہرنے کا خاطر خواہ انتظام کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

باہر سے آنے والے لوگوں کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال بھی ہم نہ کر سکتے تھے۔ تین چار آدمی آخر کیا کیا کرتے۔
تاہم اپنے صدر منشی پریم چند کو اسٹیشن پر لینے جانے کا ہم نے تہیہ کر لیا۔ محمود کسی اور کام میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے

رشیدہ اور میں نے طے کیا کہ ہم دونوں اسٹیشن جائیں گے۔ کہیں سے تھوڑی دیر کے لیے ہم نے ایک موٹر بھی حاصل کر لی تھی صبح کا وقت تھا۔ گاڑی نو بجے کے قریب آنے والی تھی۔ ہم نے سوچا کہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے روانہ ہوں گے۔ ہم تقریباً آٹھ بجے بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ گھر میں ایک تانگے کے داخل ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی نوکر نے آکر مجھے اطلاع دی کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں باہر نکلا تو کیا دیکھا کہ پریم چند جی اور ان کے ساتھ ایک اور صاحب ہمارے مکان کے برآمدے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھ پر حیرت اور شرمندگی سے تھوڑی دیر کے لیے سکتہ چھا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں پریم چند جی نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی تمھارا گھر بڑی مشکل سے ملا ہے بڑی دیر سے ادھر اُدھر چکر لگا رہے ہیں۔" اتنے میں رشیدہ بھی باہر نکل آئیں اور ہم دونوں اپنی صفائی اور معذرت پیش کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں ٹرین کے وقت کی غلط اطلاع تھی۔ اس کے آنے کا وقت ایک گھنٹہ پہلے کا تھا۔ پہلی اپریل سے وقت بدل گیا تھا لیکن اب اُلٹے پریم چند جی نے معذرت شروع کر دی: "ہاں مجھے چاہیے تھا کہ چلنے سے پہلے تم لوگوں کو تار دے دیتا لیکن میں نے سوچا کہ کیا ضرورت ہے اگر اسٹیشن پر کوئی نہ بھی ملا تو تانگہ کر کے سیدھا تمھارے یہاں چلا آؤں گا۔"

میں دل میں سوچ رہا تھا کہ عام طور سے کانفرنسوں کے صدر کا شان دار استقبال کیا جاتا ہے۔ انھیں پلیٹ فارم پر ہار پہنائے جاتے ہیں ان کے جلوس نکلتے ہیں۔ ان کی جے جے کار ہوتی ہے اور ہمارا صدر کہ خود اپنی جیب سے ریل کا ٹکٹ خرید کر چپکے سے آگیا۔ اسٹیشن پر استقبال تو کیا راہ بتانے کے لیے بھی کوئی اسے نہ ملا۔ ایک معمولی سے تانگے پر بیٹھ کر وہ خود ہی بے تکلفی سے کانفرنس کے منتظمین کے گھر پر چلا آیا۔ ان کی کوتاہی کا شکوہ شکایت تو درکنار، اس کے ماتھے پر بل بھی نہیں پڑا۔ اور ان سے یوں گھل مل گیا جس سے معلوم ہوتا کہ رسمی باتوں پر وقت ضائع کرنا اس کے نزدیک بالکل غیر ضروری ہے۔ یقینی ہماری تحریک ایک نئے قسم کی تحریک تھی اور اس کا صدر نئے قسم کا صدر تھا۔ اس کی شان اس کی انکساری اور سادگی سے ظاہر ہوتی تھی۔

منشی جی ہمارے یہاں ہی ٹھہرے۔ ان کے ساتھ جو صاحب تھے ان سے ہم پہلے سے ناواقف تھے۔ یہ ہندی کے مشہور افسانہ اور ناول نگار دلی کے بابو جینندر کمار تھے۔ منشی پریم چند نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ وہ بھی ہمارے مہمان ہوئے۔ ہمیں اس کی خوشی ہوئی کہ منشی جی ہندی کے ایک ادیب کو جو ان کے دوست تھے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس وقت تک ہندی کے بڑے ادیبوں میں سے (منشی پریم چند کے علاوہ) ہماری تحریک میں کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ بابو میتھلی شرن گپت، پنڈت بنارسی داس چترویدی، سمترا نندن پنت، سبھدرا کماری چوہان، پنڈت بال کرشن شرما، نوین وغیرہ نے ہماری تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے نہیں آرہا تھا۔ ہندی کے ادیبوں میں گروہ بندی بھی بڑی سخت تھی، بعض ان میں سے شاید ایسے بھی تھے جو اردو کے ادیبوں کے ساتھ مل کر کچھ کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے پریم چند جی سے ان کے ان رجحانات کا ذکر بھی کیا تھا انھوں نے مجھے لکھا کہ ہندی کے بہت سے ادیب شاید احساسِ کمتری (Inferiority Complex) میں مبتلا ہیں۔ بہرحال ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنا چاہیے ان تمام باتوں کے مدِ نظر بابو جینندر کمار کا کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لانا ہمارے لیے دگنی خوشی کا باعث تھا۔

کانفرنس شروع ہونے کے دن ہم نے اپنی فائلیں کاغذات اور ٹائپ رائٹر سنبھالا اور صبح سے ہی رفاہِ عام کو چلے گئے۔ اب ہال کے بغل میں ایک چھوٹے دفتر میں کانفرنس کا دفتر قائم کیا گیا اور محمود الظفر اس کے انچارج ہوئے۔ انھیں ٹائپ کرنا بھی آتا تھا اس لیے رزولیوشن اور ہر ایک سشن کا پروگرام وغیرہ کا ٹائپ کرنے کا کام بھی انھی کے ذمے پڑا۔ رشید جہاں اور ہاجرہ بیگم کے سپرد ہال کے دروازے پر بیٹھنا ٹکٹ فروخت کرنا اور لوگوں کو ان کی نشستوں تک پہنچانا

تھا اور عام دیکھ بھال کا کام بھی تھا۔ ان دونوں نے اپنی مدد کے لیے معلوم نہیں کیسے اور کہاں سے تین چار خوش خصال اور سبک گام خواتین کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ان کے علاوہ ہال میں سجاوٹ مطلق نہ تھی۔ ہال کے باہر اور اندر کے دروازوں پر سرخ ڈل کی چوڑی چوڑی پٹیوں پر اردو، ہندی اور انگریزی میں "کل ہند ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس" لکھ کر لٹکا دیا گیا تھا اور بس۔ ڈائس بھی بے حد معمولی تھا۔ یہ کوئی ایک فٹ اونچے چھ گز لمبے اور چار گز چوڑے کھرّے تختوں کا تھا۔ جس پر ایک معمولی لکڑی کی میز تھی۔ ڈائس پر چار کرسیاں تھیں جو ہتھے دار تھیں مگر ان کی وارنش اڑ چکی تھی۔ ہال میں باقی جو کرسیاں تھیں بغیر ہتھے کی تھیں۔ فرش پر دری وغیرہ کچھ نہیں تھی۔ ڈائس پر بھی دری نہیں تھی۔ یہ سادگی اور بے سروسامانی ہم پر ہماری مفلوک الحالی کی وجہ سے عاید ہوئی تھی۔ اچھے فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان حاصل کرنے کے لیے زیادہ روپیوں کی ضرورت تھی۔ جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ اس وقت تک ہم کو جو روپیہ ملا تھا وہ زیادہ تر پریس کی نذر ہو گیا تھا۔ جو کرسیاں وغیرہ ہم نے کانفرنس کے لیے کرایے پر لی تھیں وہ ادھار تھیں اور ہم یہ توقع کرتے تھے کہ ایک ایک روپے کے وزیٹروں کے دو سو ٹکٹ بیچ کر ہم ان کا کرایہ چکا دیں گے۔

کھلی کانفرنس صرف دو دن کے لیے ہونا قرار پائی تھی، دس بجے صبح سے ساڑھے بارہ بجے تک اور پھر دوپہر کو تین بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک، درمیان کے وقفوں میں دو بار ڈیلی گیٹوں کی میٹنگ کر کے آئینی اور تنظیمی امور طے کرنے کا پروگرام تھا۔

نو، ساڑھے نو بجے کے قریب ایک ایک کر کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے آنے والوں میں ہمارے صدر منشی پریم چند تھے۔ جو بے تکلفی سے ہمارے پاس آ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ان کے چہرے سے آج جیسے خوشی اور اطمینان کے آثار نمایاں تھے جس سے ہم سب کی ڈھارس بندھی۔ صدر استقبالیہ کمیٹی چودھری محمد علی صاحب آئے تو تھوڑی ہی دیر میں ان کی گفتگو اور منتظم خواتین کے قہقہے بلند ہونے لگے۔ ڈاکٹر عبد العلیم (ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر تھے) اپنے ساتھ سنجیدگی لے آئے۔ ڈاکٹر عبد العلیم حالانکہ ہمارے ہم عمر تھے اور برلن یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی، لیکن ان کی باقاعدہ کتری ہوئی نکونی داڑھی، کھدر کی مکلّف ٹوپی اور شیروانی، گول چہرہ اور گورا رنگ، تول تول کر قدم رکھنا اور احتیاط سے بات کرنا ان میں ایک مولویانہ اور محتسبانہ انداز پیدا کرتا ہے۔

وہ غازی پور (مشرقی یوپی) کے قاضیوں کے خاندان کے فرد ہیں اور ان کی ذات میں شرعی تعلیم، علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور جرمن تربیت کا میل ہوا ہے۔ ان کے منطقی ذہن میں سیاسی اور ادبی ترقی پسندی نے اس طرح جگہ بنائی ہے جیسے عربی مصادر کی گردانوں نے۔ اور ترقی پسندی کی صراطِ مستقیم سے لغزش یا انحراف کو وہ اس طرح پکڑتے ہیں جیسے پرانے طرز کے مولوی گردان رٹاتے وقت اعراب کی غلطیوں کو، ان کی وسیع المشربی میں ایک دل کش سخت گیری ہے۔ اور ان کی آزاد خیالی اور جدید سائنسی فکر قومی روایات کے مضبوط اور چمکدار چوکھٹے سے گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ ہال بھرنے لگا۔ مدراس، بنگال، گجرات، مہاراشٹر، پنجاب، سندھ، بہار اور یوپی کے ڈیلی گیٹوں سے آگے کی دو صفیں بھر گئیں۔ ان کے برابر پندرہ بیس ریسپشن کمیٹی والے لوگ رہے ہوں گے۔ اور ہال کے دو تہائی حصے میں ایک روپے ٹکٹ والے وزیٹر رہے ہوں گے۔ طالب علم، دفتروں میں کام کرنے والے دبلے پتلے کسی قدر جھینپے اور شرمائے ہوئے ادب کے شوقین، مدرّس، ٹیچر، نوجوان وکیل، کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹی کے چند ادب سے شوق رکھنے والے کارکن، ٹریڈ یونینوں کے کارکن، چند کسانوں میں کام کرنے والے کارکن، جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے اس وقت لکھنؤ میں جمع ہوئے تھے اور جنھیں نئے ترقی پسند، قومی اور سماجی آزادی کے ادب سے دلچسپی تھی۔ یہ تھے ہمارے ملک کے نئے

قومی اور معاشرتی احساس اور شعور رکھنے والے دانشوروں کے نمایندے۔ ہال میں گہما گہمی اور شور و غل نہیں تھا۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں دھیمی تھیں اور سکون کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ اس مجمع میں جوش بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔

کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب جب ہال تقریباً دو تہائی بھر گیا تو ہم نے کانفرنس کی کارروائی شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں باہر ایک تانگہ آکر رکا۔ اس میں سے ایک چھوٹے قد کے بزرگ اچھل کر اترے۔ ہم نے دیکھا تو یہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ منشی پریم چند، ڈاکٹر علیم اور میں، جو پاس ہی کھڑے تھے اور مولانا کو پہلے سے جانتے تھے ان کے استقبال کے لیے بڑھے۔ ہمیں خوشی تھی کہ مولانا نے صرف ایک دعوت نامہ پاکر ہماری کانفرنس میں شرکت کے لیے کانپور سے لکھنؤ آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ انھوں نے اپنے آنے کے بارے میں ہم کو پہلے سے اطلاع نہیں کی تھی۔ اس لیے ہمیں ان کے آنے کی کوئی خاص توقع بھی نہیں تھی۔ عام دستور تو یہ ہے کہ شاعروں کو جب مدعو کیا جاتا ہے تو پہلے وہ اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر لوگ ان سے جاکر ملتے ہیں اور شرکت کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ سکنڈ کلاس کا آنے جانے کا کرایہ اور اس کے علاوہ زادِ سفر دیا جاتا ہے۔ اسٹیشن پر استقبال کیا جاتا ہے۔ ضیافتیں اور مہمان داریاں ہوتی ہیں اور پھر جائے قیام سے موٹر پر بٹھاکر شاعر کو محفل میں لایا جاتا ہے۔ یہ دستور ایسا برا بھی نہیں کیوں کہ ان موقعوں کے علاوہ شاعر اور ادیب کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور عام طور سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی زندگی تنگدستی اور فاقہ کشی کی ہوتی ہے اور اگر ایسا ہے تو عام لوگوں کا کیا قصور؟ خود عام لوگوں کی زندگی بھی تو ایسے ہی بسر ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں اگر ایسی کوئی ہستی تھی جسے ہر قسم کے "تکلف"، بناوٹ مصنوعی اور رسمی آداب سے شدید نفرت تھی اور جو اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ لوگ اس کی بات کا برا مانیں گے یا ناراض ہوجائیں گے، سچی بات کہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے کبھی نہیں جھجکتی تھی، وہ حسرت موہانی کی ہستی تھی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ جو بات کہتے تھے وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ لیکن جب سیاست یا ثقافتی اور معاشرتی امور میں وہ کوئی پوزیشن اختیار کرتے تھے تو اس کی صحت اور سچائی پر انھیں پورا اعتماد ہوتا تھا اور پھر دنیا ادھر کی ادھر ہوجائے اور اس کی وجہ سے ان پر مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں وہ اپنی جگہ پر اٹل رہتے تھے۔

مولانا کا قد چھوٹا تھا۔ اور وہ جی بھر کے بدصورت تھے۔ جسم گدبدا تھا جس پر وہ ایک کالی لمبی میلی سی ملی دلی گہرے سلیٹی رنگ کی کھدر کی شیروانی پہنتے تھے۔ ان کی تصویریں سب نے دیکھی ہیں اور ان کی صورت سے سب آشنا ہیں۔ چیچک رو ڈھلتا ہوا رنگ اور سارا چہرہ ایک بڑی گھنی گول سی داڑھی سے ڈھکا ہوا تھا جو شاید چھ انچ سے بھی کچھ لمبی ہی تھی اور جس کے بال کھچڑی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس داڑھی کو وہ نہ کبھی کترتے تھے اور نہ اس میں کنگھی کرتے تھے، اس لیے وہ چاروں طرف اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر پر وہ ہمیشہ بڑے شوخ سرخ رنگ کی چھوٹی سی فیلٹ کی ترکی ٹوپی پہنتے تھے جس میں پھندنا نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگاتے تھے جس کا فریم لوہے کا تھا اور جس کے شیشے پرانی وضع کے چھوٹے چھوٹے اور بیضاوی تھے لیکن ان کے پیچھے سے بھی ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک اور پھرتیلا پن جھلکتا رہتا تھا۔ ان کے اندازِ گفتگو میں شوخی اور لطافت تھی۔ وہ تیزی سے مسکراکر بات کرتے تھے۔ اس عمر اور بزرگی کے باوجود ان کے جسم میں ایک چلبلاہٹ اور پھرتی سی تھی۔ ان کی آواز پتلی تھی اور جب وہ جوش میں آکر بڑے انہماک سے بولتے تھے، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بچے کی ٹوٹی ہوئی سیٹی ہو جسے زور دے کر پھونکا جارہا ہے لیکن جو پھر بھی مشکل سے بجتی ہے۔

ہم نے مولانا کو سیدھے لے جاکر ڈائس پر بٹھا دیا۔ درمیان میں منشی پریم چند تھے۔ ان کی داہنی طرف مولانا بیٹھے اور ان کے برابر چودھری محمد علی۔ میں منشی جی کی بائیں طرف نیچے تخت پر کنارے کی طرف بیٹھا تھا تاکہ پروگرام اور کاغذات د

انھیں وقتاً فوقتاً دے سکوں۔

چودھری صاحب کے استقبالیہ خطبے سے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ انھوں نے یہ خطبہ لکھ لیا تھا۔ افسوس ہے کہ اب وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ نہیں تو اس سے معلوم ہوتا کہ کس طرح ہماری (خاص طور سے لکھنؤ کی) قدیم تہذیب اور ادب کے ایک رسیا نے جدید ترقی پسند ادب کی تحریک کا خیر مقدم کیا تھا۔ چودھری صاحب کے خطبے کے بعد منشی پریم چند متفقہ طور سے کانفرنس کے صدر چنے گئے اور انھوں نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ سلیس اردو میں لکھا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس مجمع میں غیر ہندوستانی بولنے والے علاقوں کے جتنے بھی ڈیلی گیٹ اور وزیٹر تھے (جن کی تعداد آدھی سے کچھ ہی کم تھی) ان کی سمجھ میں وہ بالکل نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ تو خاموش تھے ہی لیکن ہم اردو ہندی والے بھی جو اسی خطبے کو خاموشی سے سن رہے تھے بالکل خاموش تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرح کی محویت سی مجمع پر طاری ہو گئی ہے۔ کسی جلسے میں زبانی تقریر کے بجائے اگر کوئی چیز لکھ کر پڑھی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں جی اکتانے لگتا ہے لیکن اس خطبے میں ہماری زبان اور ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ ایک بڑے ادیب نے ہمیں ترقی پسند ادبی تحریک کی نوعیت اور مقاصد سے آگاہ کیا تھا۔ اس خطبے میں ہماری زبان کے افسانہ نگار اور ناول نویس نے ہمیں سیدھے سادے اور پُراثر الفاظ میں بتایا کہ اچھے ادب کی بنیاد، سچائی، حسن، آزادی اور انسان دوستی پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔

"جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔"

انھوں نے ادیبوں کو یاد دلایا کہ ان کی عدالت سوسائٹی ہے اور اس عدالت کے سامنے ان کی جواب دہی ہوگی اور عوام کی اس عدالت میں ان کا استغاثہ اس صورت میں کامیاب ہوگا اگر وہ انسانیت، شرافت، انصاف اور حق کی بے لاگ تلقین کریں گے۔ پریم چند نے کہا کہ ایک آرٹسٹ میں "صحیح ذوقِ حسن اور محبت کی گرمی" ہونا ضروری ہے اور وہ فطرت اور انسانی سماج میں توازن اور ہم آہنگی کی جستجو کرتا ہے۔

"ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی جس کی تخلیق کرتی ہے تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے۔ جہاں ان کا فقدان ہے وہاں افتراق، خود پروری ہے۔ نفرت اور دشمنی اور موت ہے..... ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے..... اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔"

آگے چل کر پریم چند جی نے اس بات کو صاف کر دیا کہ جب وہ ادب میں حسن اور محبت کی جستجو کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ حسن اور محبت محض ایک ذاتی اور انفرادی شے نہیں ہے۔ وہ اس مبہم خود پرستی کے نظریے "فن برائے فن" کی تلقین نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک اچھے فن کار کی خصوصیت ہی ان کے نزدیک یہ تھی کہ اپنے ارد گرد جہاں بھی وہ دیکھے کہ "ایک جماعت معاشرت و رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پا رہی ہے" اسے برداشت

نہ کرے اور اس جماعت کو غلامی اور عسرت سے نجات دلانے کے اسباب مہیا کرے اور اس کی آزادی کے لیے بے چین ہو۔

"وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب کے ساتھ ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے۔"

پریم چند نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ بات کہی کہ حُسن یا روحانی مسرت کوئی مطلق اور مادّی زندگی سے بے تعلق چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا انسانوں کی زندگی سے تعلق ہے اور اس کا ہمیشہ ایک افادی پہلو ہوتا ہے۔

"ایک ہی چیز ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی بخشتی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوش نما نظارہ ہے۔ لیکن کہیں اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔"

"اسی طرح چند امیروں اور رئیسوں کی مسرت اور خوشی دوسروں کے لیے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک سمجھ دار اور باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار ہو رہی ہو۔"

انھوں نے کہا کہ انسانیت کے بہترین مذہبی، اخلاقی اور روحانی پیشواؤں نے انسانیت کے سامنے ہمیشہ اخوت، مساوات، تہذیب کا آدرش پیش کیا اور اپنے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ انسانی آزادی، اخوت، مساوات کا یہ زرّیں خواب اسی صورت میں حقیقت میں بدل سکتا ہے، اور اس آئیڈیل کی تکمیل تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم ترقی کی قوتوں کا ساتھ دیں۔

"ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے جہاں مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے اور ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔"

پریم چند جی کی زبان سے سیاسی اور سماجی عوامی انقلاب کی ان لفظوں میں حمایت اور تلقین ثابت کرتی تھی کہ اب وہ عینیت پرستی اور اصلاح پسندی کے دائرے سے نکل گئے ہیں۔ ان کی انسان دوستی اور گاندھیائی سیاست کے ناکام تجربے نے انھیں اس حقیقت تک پہنچا دیا تھا کہ جو لوگ صرف بڑے بڑے مذہبی اور اخلاقی اصولوں کی تبلیغ کر کے انسان کی مادّی اور روحانی مشکلات کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ موجودہ زمانے میں انصاف اور اخلاق اور انسانیت کی تعمیر اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ایک ایسا نیا معاشی اور سیاسی نظام قائم کیا جائے جس میں انسانوں کی لوٹ انسانوں کے ذریعے ممکن ہی نہ ہو سکے۔

انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ عوام کی زندگی اور ان کی کش مکشِ حیات میں "حُسن کی معراج" دیکھنے کی کوشش کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ حُسن صرف رنگے ہونٹوں والی، معطّر عورتوں کے رخساروں اور ابروؤں میں ہے۔" انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ

"اگر تمھیں اس غریب عورت میں حُسن نظر نہیں آتا جو بچّے کو کھیت کی مینڈھ پر سُلائے پسینہ بہا رہی ہے تو یہ تمھاری تنگ نظری کا قصور ہے۔ اس لیے کہ ان مُرجھائے ہوئے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رُخساروں کی آڑ میں ایثار، عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ شباب سینے پر ہاتھ دھر کر شعر پڑھنے اور صنفِ نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دُھننے کا نام نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمّت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔"

انھوں نے کہا کہ جب ادیبوں میں اس طرح کی نئی "نگاہِ حُسن" پیدا ہوگی "تب ہم اس معاشرت کی جڑیں کھودنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ اور اسے برداشت نہ کریں گے جہاں ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خود دار انسانیت اس سرمایہ داری، عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گی اور ہم صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے، بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حُسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کے مُنافی نہیں ہے۔"

آخر میں پریم چند جی نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی شاخوں کو جگہ جگہ قائم کرنے کے لیے کہا۔ "جہاں ادب کے تعمیری رجحانات کے باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی ایسی فضا پیدا ہوگی جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور اس کی نشو و نما ہو سکے۔"

زبان کے مسئلہ پر انھوں نے کہا کہ "آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے...... جو ادیب امرا کا ہے وہ امرا کا طرزِ بیان اختیار کرتا ہے جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔" اور اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا۔

> "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکّر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سُلائے نہیں۔ کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

اس خطبے کو پڑھنے میں (جو بعد کو چھپا تو پندرہ صفحہ کا تھا) کوئی چالیس پینتالیس منٹ کے قریب لگے۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض و غایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ ہم پریم چند کے افسانے اور ناول سے تو واقف تھے لیکن اُردو میں ان کا کوئی ادبی مضمون کبھی نہیں پڑھا تھا۔ انھوں نے ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی لکھی ہیں۔ چونکہ یہ ہماری زبان کے عظیم ترین حقیقت پسند افسانہ نگار کے پُرخلوص خیالات کا اظہار تھا اس لیے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ درِاصل ہمارے نئے حقیقت پسند اور عوامی زندگی کے آئینہ دار ادب کا وہ کارواں جس کی راہ نمائی بیس سال سے خود پریم چند اپنی نگارشات سے کر رہے تھے، اب نئی اور زیادہ صاف اور اونچی سطح پر بڑھنے کے لیے تیار ہے۔ ہم نوجوان ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر اس وقت شاید صاف اور واضح نہیں تھا اور ہم اپنے جوش اور غصّے میں کبھی بائیں طرف کو جھک جاتے، تو کبھی احتیاط اور مصلحت کا تقاضا سمجھ کر داہنی طرف لڑھک پڑتے۔ لیکن اس موقع پر ہمارے صدر پریم چند کی روش میں کوئی ہیر پھیر اور ان کی فکر میں کوئی اُلجھاؤ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس کا سبب ظاہر ہے۔ پریم چند ایک محنتی، محبِ وطن اور بے لاگ ادیب تھے جو اپنے فن کو بہتر بنانے اور اپنے تجربے اور علم میں اضافہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ ہم نوجوانوں میں سے اکثر اپنے نظریاتی فلسفے اور تعلیم کی بنا پر ترقی پسندی کے راستے پر ابھی آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ پریم چند زندگی کی مشکل کش مکش اور نئی تخلیق کی کاوش، یعنی عمل اور تجربے کی بنا پر وہاں

تھے۔ اسی وجہ سے ان کے افکار میں توازن، تاریخی تسلسل، جامعیت اور بردباری تھی۔ ان کی بات سچی معلوم ہوتی تھی، وہ سمجھ میں آتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کا دل پر اثر ہوتا تھا۔

منشی پریم چند کے صدارتی خطبے کے بعد میں نے انجمن کی اس وقت تک کسی تنظیمی صورت حال کے متعلق ایک مختصر سی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ یہ رپورٹ انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ یہ ناگزیر حقیقت ہمارے سامنے تھی کہ اس وقت تک کسی بھی کل ہند کانفرنس میں انگریزی زبان ہی ایک ایسی زبان تھی جو ہر صوبے کے پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اس ملک کی کسی بھی زبان سے زیادہ مشترک تھی۔ ہماری حب الوطنی کو اس سے کراہت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں کہ ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے مختلف صوبوں کے پڑھے لکھے لوگ انگریزی استعمال کرنے پر مجبور تھے، بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنے ہی ملک کی دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت ہم کو انگریزی کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ مثلاً انگریزی جاننے والے اردو داں لوگوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیفات بیشتر انگریزی کے ترجموں میں ہی پڑھی تھیں۔ اور ہماری اپنی زبانوں میں ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کے ادب کے ترجمے انگریزی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا سیشن خاتمے کے قریب رہا ہوگا کہ ساغر نظامی افتاں و خیزاں وارد ہوئے۔ ہمیں اس کی پہلے سے اطلاع تھی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کے لیے آ رہے ہیں اور ان کے ابھی تک نہ آنے کے سبب سے ہمیں فکر لاحق تھی۔ ساغر نظامی اردو کے ان ممتاز شعرا میں ہیں جن کی شاعری میں حبِ وطن کی پرجوش آوازیں گونجتی ہیں۔ جیسے ان کے شعر سنانے کے دل کش انداز ہیں، اسی طرح ان کے کلام میں ایک جاذب ترنم اور نغمگی ہوتی ہے اور ان کی غنائیہ نظموں کے گلزار میں بھی جدید ہندوستان کی آزادی کی ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ایشیا اس وقت اردو کے بہترین، روشن خیال اور دیدہ زیب رسالوں میں سے تھا۔ ہماری تحریک سے ان کا ارتباط ہم سب کے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث تھا۔

ساغر صاحب چونکہ میرٹھ سے آنے والے تھے اس لیے ہم نے سوچا شاید ٹرین لیٹ ہو گئی ہو۔ لیکن مولانا نیاز فتح پوری بھی ابھی تک تشریف نہ لائے تھے۔ وہ تو لکھنؤ ہی میں تھے۔ انھوں نے ہمارے اعلان نامے پر دستخط بھی کیے تھے اور کانفرنس میں مدعو کیے جانے پر شرکت کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں آئے؟ مہینے ڈیڑھ مہینے پہلے نگار کے معزز مدیر کے پاس ڈاکٹر علیم کے ساتھ میں خود گیا تھا اور ترقی پسند تحریک کے متعلق گفتگو کی تھی۔ مولانا نیاز فتح پوری سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس عہد کے اکثر اردو داں نوجوانوں کی طرح میں بھی اپنے کو ان کی نثر نگاری کے نیاز مندوں میں شمار کرتا تھا۔ علاوہ بریں مولانا نیاز نے ایک محدود طریقے سے ہی سہی، لیکن کافی شد و مد کے ساتھ مسلمانوں میں مروّجہ مذہبی عقائد کی تنگ نظری کے خلاف کئی ملاؤں سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں رومانیت زیادہ مسرت انگیز اور بھرپور زندگی کی طرف اشارہ کرتی تھی، حالانکہ غیر حقیقی عناصر سے ملمع آرائی اور اس کے تصنع سے ذہن اور روح کو پوری طرح سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ بہرصورت مولانا نیاز کی ذات اس وقت تک ایک پورے ادارے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اور اردو ادب میں ان کی ایک خاص جگہ تھی۔ ہماری تحریک کے ساتھ ان کی ہمدردی قابلِ قدر تھی۔

ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز صاحب کے یہاں بیٹھے تھے اور مولانا نیاز اس کے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی ان کے لیے سواری لے کر ان کے مکان پر پہنچے تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے انتظار کے بعد ساغر صاحب تو تانگہ پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس

تک آ گئے، لیکن مولانا نیاز اس لیے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انھیں لانے کے لیے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ساغر صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ مولانا نے کانفرنس میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ بھی سپردِ قلم فرمایا تھا، اس وجہ سے وہ ہم سے اور بھی زیادہ ناخوش تھے۔

ان باتوں کو سن کر ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔ لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ممتاز ادیب پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے۔ اور ان کے علاوہ بہت سے اور نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے کرایہ کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجے میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے۔ اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کی انجمن کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس بس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگرٹ یا تانگہ کے کرائے تک کے لیے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یقینی ان لوگوں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا جو اپنے لکھنؤ کے مکان سے جو رفاہ عام سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ کانفرنس کے ہال تک سواری نہ پہنچنے کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔ ظاہر ہے کہ مولانا کا مزاج نئی ترقی پسند تحریک کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھا۔

بعد کے اجلاسوں میں جن لوگوں نے مقالے پڑھے ان میں احمد علی، محمود الظفر اور فراق تھے۔ بنگال کی انجمن کے سکریٹری نے جدید بنگالی ادب کے رجحانات اور بنگالی میں انجمن کی تنظیم پر لکھی ہوئی ایک اچھی رپورٹ پیش کی۔ گجرات، مہاراشٹر کے صوبہ مدراس کی زبانوں کے نمائندوں نے زبانی تقریریں کیں۔ یہ سب مقالے اور تقریریں انگریزی زبان میں تھیں۔ ساغر نظامی نے حبِ وطن اور آزادی کے موضوع پر اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ احمد علی نے ترقی پسند ادب پر جو مقالہ لکھا تھا اس میں نئی ادبی تحریک کے مقاصد اور اصول بتائے گئے تھے۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ادبی تنقید کے بعض فلسفیانہ نکات ریاضی کے فارمولوں کے ذریعے سمجھائے گئے تھے جو معمولی سمجھ اور تعلیم رکھنے والے لوگوں کی فہم سے باہر تھے۔ اقبال اور ٹیگور کا ضمنی تذکرہ تھا اور انھیں رجعت پرست قرار دیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ احمد علی کے مقالے کی اکثر خامیاں ان کی ذاتی کجرویاں نہ تھیں۔ بلکہ ہم میں سے اکثر کی تنقیدی کم نظری کا اظہار کرتی تھیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ ہم احمد علی کے مقالے پر اچھی طرح بحث کرتے، ان کی خوبیوں کو سراہتے اور خامیوں پر نکتہ چینی کرتے۔

لیکن ہم میں سے کئی جوان خامیوں کو کسی قدر محسوس بھی کرتے تھے ہنس کر چپ ہو گئے۔ مشکل یہ تھی کہ احمد علی تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ شخص ایسا حسد کی وجہ سے کر رہا ہے۔ اور اس کا مقصد ان کی ادبی حیثیت کو گرا کر انھیں بدنام کرنا ہے۔ اس ڈر سے احمد علی کے دوست بھی ان پر تنقید کرنے سے جھجکتے تھے۔ لیکن یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی۔ غالباً اس کا نتیجہ ہے کہ احمد علی رفتہ رفتہ خود پرستی کے خول میں گھس کر ادبی دنیا سے غائب ہو گئے۔ اور ان کی معتدبہ ادبی صلاحیتیں اتنا ترقی نہیں کر سکیں جتنا کہ ممکن تھا۔ خود پرستی اور رجعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کسی کو ہمچو من دیگرے نیست کا زعم ہو جائے تو پھر اس کے لیے اللہ کی باقی مخلوق سے انس کرنا ذرا مشکل ہے۔ اور جب تک باقی انسانوں سے محبت اور اپنے علاوہ دوسروں کا بھی دکھ درد محسوس کرنے اور اس کا مداوا ڈھونڈنے کی صلاحیت نہ ہوگی، ترقی پسندی کیسے ہو سکتی ہے؟

فراق کے مقالے میں ہمارے ملک کی انیسویں اور بیسویں صدی کی تہذیبی اور مذہبی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی تھی (برہمو سماج، آریہ سماج، وہابی اور سرسید احمد خاں وغیرہ کی تحریکیں) اور ساتھ ہی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف

زبانوں میں جدید ادب کا ارتقا بھی انھیں تحریکوں سے وابستہ تھا۔ آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ ترقی پسند ادب کی نئی تحریک دراصل ہمارے ملک کے تہذیبی ارتقا کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ بہت جلدی میں لکھا گیا تھا اور مکمل بھی نہ تھا لیکن فراق بہت اچھے اور دلچسپ مقرر بھی ہیں اس لیے انھوں نے صرف مقالہ پڑھا ہی نہیں بلکہ آخر میں ایک چھوٹی سی تقریر بھی کی۔

فراق کی شخصیت کے سلسلے میں اس زمانے میں جو بات عجیب معلوم ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ ان کی اپنی شاعری اور ان کے ترقی پسند نظریوں میں کوئی خاص تعلق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس وقت تک ان کی شاعرانہ فکر روایتی حدود کو توڑ نہیں سکی تھی۔ ان کا وہ مخصوص رنگ جس سے وہ محبت کی محرومیوں اور حسرت ناکیوں کو اندھیری رات کے جھلملاتے ہوئے تاروں کی طرح خوبصورت بنا کر انسانی روح کو زیادہ دردمندی بخشتے ہیں اور ان کا وہ دھیما لہجہ جو درباری راگ کے سُروں کی طرح اپنی سنجیدہ غمناکی سے جیسے زندگی کے وقار کو بیدار کرتا ہے، ابھی تک نہیں ابھرا تھا۔ ان کی ذہانت اور آزاد منشی نے انھیں ذہنی طور پر ترقی پسند تو بنا دیا تھا اور وہ ہماری تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن جہاں تک ان کے فن کا تعلق تھا وہ قدیم اُردو شاعری کی ان روایات سے معنوی طور سے وابستہ تھا جنھیں بعد کو فراق خود بڑی حد تک ترک کرنے والے تھے۔ فراق کے فن پر فراق کی ذہنی تبدیلی کا اثر جیسے نہیں کے برابر تھا۔ ہمارے اور کئی فن کاروں کی طرح فراق اُس وقت اپنی دوہری شخصیت کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش شروع کر رہے تھے اور ایک ایمان دار اور اچھے فن کار کے لیے یہ مرحلہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہاں صرف اتنی بات نہیں ہے کہ پُرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لی جائے یا رجعت پسندی کے لباس کو اُتار کر ترقی پسندی کا نیا جامہ زیب تن کر لیا جائے۔ ہمیں ماضی سے تہذیب، فن اور زبان کا ایک بیش قیمت ترکہ ورثے میں ملا ہے۔ اس میں ہم نے اپنی استعداد اور ضرورت کے مطابق دوسرے ملکوں اور قوموں کی تہذیب، علم اور فن کی آمیزش کی ہے۔ اگر ہماری موجودہ انفرادی اور اجتماعی حیات اس کی متقاضی ہے کہ مادی فلاح، ذہنی ترقی، اخلاقی اور روحانی عروج کے لیے ہم نئے اور انقلابی وسیلے اختراع اور اختیار کریں، تو عقل و ہوش اور تجربے کا یہ بیہم مطالبہ اور ناگزیر تقاضا ہے کہ تہذیب، علم اور اخلاق کی وہ سچی اقدار جو ہماری قدیم اور عظیم قوم کو ورثے میں ملی ہیں، ہماری نئی تہذیبی تعمیر کے ضمیر میں پیوست اور جذب ہوں۔ کوئی نئی عمارت جو دیرپا ہو، ہماری ضرورتوں کو اچھی طرح پوری کرتی ہو اور جس کا حُسن ہمارے لیے انبساط اور روحانی تسکین کا باعث ہو، آسانی سے نہیں بنتی۔ اس لیے اگر ہمارا کوئی فن کار، اس کام میں تفکّر اور تاخیر سے کام لیتا ہے، اگر اس کے تجربے ناکام ہوتے ہیں، اگر وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، اگر اسے ماضی کی ان تخیلی اور فنی روایتوں کو مسترد کرنے میں دیر لگتی ہے جو ہماری نئی سمجھ کے نزدیک مضر ہیں لیکن جن کی حُسن کاری ابھی تک ہم کو متاثر کرتی ہے تو ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ تہذیبی تجزیہ، تحلیل و تعمیر، بڑی عرق ریزی اور باریک بینی، پاکیزگیٔ نظر اور روحانی مجاہدہ کا کام ہے۔ ہم ادیبوں اور فن کاروں کی غلط نگاہی، ذہنی تساہل اور فکری جمود پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ ان کی معنوی سطحیت اور فنی ناپختگی پر انگلی رکھ سکتے ہیں۔ ان کی خود پرستی، بزدلی یا عوام سے غداری پر معترض ہو سکتے ہیں۔ اور ایسی صورتوں میں ترقی پسند نقاد کا چُپ رہ جانا ہی اپنے فرائض سے افسوس ناک کوتاہی ہے۔ لیکن اگر کسی فن کار میں انسانی درد اور آزادی خواہی کا جوہر موجود ہے تو پھر ہمارا سب سے بڑا مطالبہ اس سے یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کاوش کرے اور زندگی کی سچائیوں کا بہتر اور زیادہ مؤثر طریقے سے اظہار کرے۔

مولانا حسرت موہانی مصر تھے کہ انھیں پہلے ہی دن تقریر کا موقع دیا جائے۔ لیکن ہم کامیاب کانفرنس کرنے کے کچھ داؤ پیچ تو آخر جان ہی گئے تھے۔ پہلے ہی دن ہم اپنے بزرگ ترین اور بہترین مقررین کو بلوا کر محفل کی رونق ختم کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی تقریر دوسرے دن شام کے اجلاس میں ہوئی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں پہلے تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے

اعلان نامے اور اس کے مقاصد سے پورے اتفاق کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنا چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنا چاہیے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو، اور وہ متحد اور منظم ہوکر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔ مولانا اپنے خیالات کو چھپانے یا کسی مصلحت کی بنا پر اس پر پردہ ڈالنے کے قائل تو تھے ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ محض "ترقی پسندی" کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنا چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام اور کمیونزم میں قطعی کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان، اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے، اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انھیں خیالات کی ترویج کرنا چاہیے۔

آخر میں مولانا نے خود اپنی شاعری کا ذکر کیا اور ہنستے ہوئے کچھ اس قسم کی بات کہی کہ "آپ سوچتے ہوں گے جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کر رہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی، لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے...... آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرفداری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ نے اپنے اعلان نامے میں لکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے لیے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا......"

مولانا حسرت موہانی کی تقریر سے ہمارا بہت دل بڑھا اور مولانا اپنے قول کے پورے اترے۔ کان پور میں جب انجمن کی شاخ بنی تو مولانا حسرت اس کے صدر ہوئے۔ اور جب کبھی انجمن پر وہ حضرات حملہ کرتے تھے جن کے مکروہ رجعت پرست چہرے مذہب کی نقاب سے ڈھکے ہوئے تھے، تو مولانا حسرت موہانی تحریک کے لیے سینہ سپر ہوجاتے تھے اور انھیں منہ توڑ جواب دیتے تھے۔ لیکن مولانا سیاست کی طرح ادب میں بھی متحدہ محاذ کے تصور سے سخت متنفر تھے۔ ہمارے خیال میں ترقی پسند ادبی تحریک میں محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہیں بلکہ مختلف عقائد کے لوگوں کے لیے جگہ تھی۔ انجمن ان سے وطنی آزادی اور جمہوریت میں یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی، اشتراکیت میں نہیں۔ مولانا اس معاملے میں انتہاپسند تھے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند کے لیے اشتراکی ہونا ضروری تھا۔ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا۔

غنائیہ یا عاشقانہ شاعری کے متعلق، جسے مولانا فاسقانہ شاعری کہتے تھے، ہم میں اکثر کی رائے وہ نہیں تھی جو مولانا کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ جاگیرداری عہد کی ایسی عاشقانہ شاعری جس کے ذریعے سے پست ہمتی، اخلاقی ابتذال، تقدیرپرستی اور شکست خوردگی کی تلقین کی گئی تھی، ہمارے لیے ناقابل قبول تھی۔ لیکن ایسی شاعری جس میں سچی محبت کی کسک ہو یا جس میں انسان کی ناکامیوں اور محرومیوں کا اظہار کرکے اس کا تزکیۂ نفس کیا جائے، جو ہم میں دردمندی اور پاکیزگی پیدا کرے، جس میں انسانی خصائل کو بہتر بنانے کی غرض سے افراد اور معاشرت پر تنقید ہو، جس سے ہماری زندگی کی زینت بڑھے اور انسانی جذبات میں بلندی اور لطافت پیدا ہو، ہرگز ایسی نہیں ہے جسے رد کیا جائے۔ ایک ترقی پسند یا انقلابی کے لیے ایسی شاعری اتنا ہی ضروری اور مفید ہے جتنا کہ کسی دوسرے مہذب انسان کے لیے ایسی شاعری کا منتخب کلام۔

رخود حسرت کی بہترین شاعری اسی زمرے کی ہے۔ مولانا نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا کہ وہ ان کی انتہا پسندی اور کسر نفسی پر مبنی تھا۔

کانفرنس کے آخری دن کے شام کے اجلاس میں منجملہ اوروں کے سوشلسٹ لیڈروں جے پرکاش نارائن، یوسف مہر علی، اندولال یاجنک اور کملا دیوی چٹوپادھیا اور میاں افتخار الدین نے بھی شرکت کی۔ یہ لوگ اس زمانے میں ملک کے درمیانہ طبقے کے ان روشن خیال نوجوانوں کی نمایندگی کرتے تھے جو سامراج دشمن انقلاب چاہتے تھے۔ کملا دیوی نے کانفرنس میں ایک چھوٹی سی پرجوش تقریر میں نئی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو بلبلِ ہند بھی کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ موجود تھیں۔ انھوں نے ہماری کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے عین وقت پر وہ بیمار ہوگئیں۔ انھوں نے کانفرنس کو ایک پیام لکھ کر بھیجا جو پڑھ کر سنایا گیا۔

کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا اور اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ اس اعلان نامے میں اور اس میں جس کا مسودہ شروع میں لندن میں تیار ہوا تھا اور جس پر اس وقت تک ہم نے دستخط لیے تھے صرف چند لفظوں کا فرق تھا۔ یہ ترمیمیں مہاراشٹر کے نمایندوں نے پیش کی تھیں جن کو سب نے منظور کیا۔

انجمن کا ایک دستور بھی منظور ہوا۔ اس کا مسودہ ڈاکٹر عبدالعلیم، محمود الظفر اور میں نے مل کر تیار کیا تھا۔ مجھے انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا اور میرے سپرد انجمن کے مرکزی دفتر کو الہ آباد میں قائم کرنے اور چلانے کا کام ہوا۔ انجمن کی مجلس عاملہ کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اس کے ممبروں کو مختلف صوبوں یا لسانی علاقوں کی انجمنیں چنیں گی۔ یہ طے ہوا کہ اس کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی ہر بڑی زبان کے علاقے میں علاقائی انجمنیں ہوں اور تمام صوبائی انجمنوں کے منتخب نمایندوں کی ایک کل ہند کونسل ہو جس کا اجلاس کم از کم سال میں دو مرتبہ ہو۔

ان کے علاوہ کانفرنس میں چند اور تجویزیں بھی منظور ہوئیں۔ جن میں سے دو اس لحاظ سے اہم تھیں کہ ان سے نئی تحریک کی بعض خصوصیات کا پتہ چلتا تھا۔

ایک تجویز میں سولینی کے حبش پر جارحانہ حملے اور جاپان کے چین پر حملے کی مذمت کی گئی۔ اس تجویز میں شہنشاہیت اور سامراجی جنگوں کی مذمت کی گئی اور ہندوستانی ادیبوں کے آزادی خواہ جمہوری اور امن پسند جذبات کا اظہار کیا گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بادل اس وقت آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں نے کہا کہ ان کا فرض ہے کہ تمام دوسرے امن پسندوں کے ساتھ مل کر وہ اس جنگ کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اپنے قیام کی ابتدا سے ہی امن، آزادی اور جمہوریت کی طرفدار تھی۔ اور قوموں کی آزادی اور عالمی امن کو تہذیب کی بقا اور نشو و نما کے لیے ضروری خیال کرتی ہے۔

دوسری تجویز میں افراد، جماعتوں اور اداروں کی آزادیٔ رائے اور خیال کے جمہوری حق کی حمایت میں آواز بلند کی گئی۔ برطانوی حکومت نے پریس کے قوانین، بغیر مقدمہ چلائے گرفتاری اور دوسری پابندیاں عائد کر کے ان حقوق کو چھین لیا تھا۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۲۴ (حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے) کے ذریعے، اخباروں اور رسالوں کو بند کر کے اور ان کی اشاعت میں رکاوٹ ڈال کر، ترقی پسند کتابوں کو ضبط کر کے، اڈیٹروں اور مصنفوں کو گرفتار کر کے، ان انسانی حقوق کو بالکل سلب کر دیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین نے اس کی مذمت کی اور انجمن کو یہ ہدایت کی کہ ملک کی تمام دوسری جمہوری تحریکوں کے ساتھ تعاون کر کے وہ آزادیٔ رائے اور خیال کے بنیادی انسانی حق کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

تاریخ شاہد ہے کہ رجعت پرست حکمرانوں اور برخود غلط حکومتوں نے سچائی کی آواز کو ہمیشہ جبر اور تشدد کے ذریعے دبانے

کی کوشش کی ہے۔ آزاد ذہن، راست گو زبان اور بے باک قلم کو اگر وہ خرید نہیں سکے اور مرعوب نہیں کر سکے، تو انھوں نے آہنی زنجیر اور سلاخ، زہر کے پیالے اور جلاد کی تلوار سے کام لیا۔ لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کی آزاد روح کو کبھی مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی سچا مبلغ، شاعر، عالم یا فن کار جس کے کلام یا نظریے میں اس کے زمانے کی ارتقاء پذیر حقیقت کی جھلک اور چمک ہو دبایا نہیں جا سکتا۔ اگر بہ جبر اس کی زبان بند بھی کر دی جائے اور اس کا قلم توڑ بھی دیا جائے تو وہی حقیقت جس کے آزادانہ اظہار کی اجازت نہیں دی گئی، ہزاروں لاکھوں عوام کے دلوں سے صاف چشموں کی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ اخلاق، علم اور عمل کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں اور نئے اور پرانے کی کش مکش اور تصادم سے حرکت اور تیزی کرتا ہوا زندگی کا دھارا تاریک اور تنگ وادیوں سے نکل کر شاداب اور روشن مرغزاروں کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

ہماری یہ تجویزیں جنھیں حکومت اور اس کے نقارچیوں نے سیاسی قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہے اور اس لیے "خالص" اور "اصلی" ادیبوں کو اس سے علاحدہ رہنا چاہیے، فی الحقیقت ہماری تہذیبی زندگی میں ایک قدیم اور مستحسن تہذیبی روایات کا اعادہ کرتی تھیں اور اسے منظم شکل عطا کرتی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب سرزمینِ ہند کے ادیب باقاعدہ اور منظم طور پر اور اپنے عہد کی ضرورتوں اور حالات کے مطابق یہ تہیہ کر رہے تھے کہ وہ آزادی اور سچائی کی خدمت کریں گے، اور کسی کی نہیں۔ فرق یہ تھا کہ جمہور کی فتح کے اس نئے دور میں میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور بہت سے دوسرے عظیم فن کاروں کی طرح انھیں امیر حکمرانوں کی کورِ باطنی اور جوہرِ اصلی کی بے قدری پر خون کے آنسو بہانے کے بجائے آزادی خواہ عوام کی پشت پناہی سے الہام اور قوت حاصل ہو سکتی تھی۔ اب کی تنہائی اور بے چارگی کا روح فرسا احساس مٹ سکتا تھا اور مٹ رہا تھا۔ انجمن میں ان کے بے شمار راز داں پیدا ہو گئے تھے۔[1]

کانفرنس ختم ہوئی اور ہمیں اس کے خاتمے پر اتنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احساس اور نئی ذمہ داریوں سے پیدا ہونے والی فکر اور پریشانی، اس خوشی سے بہت زیادہ تھی جو کسی کام کے خیر و خوبی کے ساتھ خاتمے کے بعد ہوتی ہے۔ کانفرنس نے ہمارے نصب العین کو متعین کر دیا تھا اور اس نقشے کو بالآخر مکمل کر دیا تھا، جس کے مطابق ملک کے تمام ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم ہونا چاہیے۔

(روشنائی سے انتخاب)

[1] گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　چمن میں مرے راز داں اور بھی ہیں (اقبالؔ)

بامقصد ادب

سجّاد ظہیر

دوسرے پہلو سے ہم پر اعتراض کرنے والے جدید اور "نئے" خیالات کے لوگ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک، ادب میں افادیت اور مقصدیت داخل کرکے ادب کو اس کے اصلی منصب سے نیچے گرا رہی ہے۔ ان کے نزدیک ادیب کا یا فن کار کا مقصد ادبی یا فنی تخلیق سے صرف اپنے جمالیاتی حظ کی تسکین ہے۔ کسی بھی خیال، نظریہ یا مقصد کی پابندی سے فنکار کی تخلیقی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ فن کار کی اپنی ایک اندرونی دنیا ہوتی ہے، الفاظ ایک الہامی کیفیت رکھتے ہیں، کوئی پُراسرار قوت (خواہ وہ الوہی ہو یا فطرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ہو) فن کار کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ فن کار کی ذمّہ داری اسی قوت کو کام میں لانے کی ہے، وہ اپنے سامعین، قارئین، ناظرین، سماج یا عوام یا نوعِ انسانی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

ان کا ملک کے عام لوگوں میں بہت کم اثر اور رسوخ تھا۔ اس نظریے کا قائل مغربی یورپ کے رجعت پرست ادبی خیالات سے متاثر تھے۔ اس بات سے کسی کو تو انکار نہیں تھا کہ آرٹ اور ادب کا ایک مقصد انسان کو جمالیاتی حظ پہنچانا بھی ہے۔ اور یہ کہ فنونِ لطیفہ کا طریقہ سائنس یا علمی تحقیقات کے طریقے سے مختلف ہے۔ سائنس (یا علم) میں تجربہ اور تحقیق کے ذریعے ہمارے سامنے واقعات اور سچائیوں کا براہ راست انکشاف ہوتا ہے، جن کی بنیاد پر پھر ہم اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ بارآور بناتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ، تجربات، مشاہدات اور علمی حقائق اور معاشرت کے رشتوں اور اُن کے عمل اور ردِّعمل سے انسانوں کے ذہن میں جو جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کے کسی پہلو کا اظہار کرتے ہیں۔

اس اظہار سے، اگر وہ خوبی سے کیا گیا ہے، ہمیں حظ بھی ہوتا ہے اور ہماری روح اور نفس کا تزکیہ بھی۔ ہم بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ سوال اصل میں یہ ہے کہ اس طرح سے ہمارے ذہن میں جو روشنی آتی ہے اور جو روحانی حظ حاصل ہوتا ہے، اس طرح سے ہم جو سیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے؟

ترقی پسندوں کا کہنا یہ ہے کہ صرف وہی حظ، وہی جمالیاتی تسکین اور وہی سیکھنا اور سمجھنا انسانوں کے لیے اچھا اور صحت مند ہے جو ان میں پاکیزگی اور طہارت، زندگی کی اُمنگ اور حوصلہ، جہدِ حیات میں صلابت اور دانش مندی اور نوعِ انسانی سے ہمدردی پیدا کرنے میں معین اور مددگار ہو۔ اور اس طرح سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات ان کے ظاہر و باطن دونوں کو زیادہ حسین، زیادہ لطیف اور زیادہ بھرپور بنائے۔ ایسا حظ اور ایسی جمالیاتی تسکین جس سے ہمارے ذہن میں اُلجھنیں بڑھ جائیں، جو ہمیں اپنے عہد اور اپنے سماج کی سب سے اہم حقیقتوں کے انکشاف اور شعور سے دور لے جائے، جس سے ہماری طبیعتوں

میں کثافت پیدا ہو جو ہماری روح کو مکدّر اور بے حس کر کے ہمیں خود پرستی، جہالت، بزدلی یا مایوسی کا شکار بنا دے، جو ہماری انسانیت ہم سے چھین کر ہمیں نوعِ انسانی سے نفرت کرنا سکھائے اور جو ہمارے دلوں میں سوز و حرارت پیدا کرنے کے بجائے انھیں پتھر کا بنا دے، ہمیں قابلِ قبول نہیں، ہم اسے مسترد کرتے ہیں، ہم اس کے مخالف ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ فن کار اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لا کر جب بہترین ادب تخلیق کرتا ہے تو اس سے ہم میں کیف اور انبساط پیدا ہوتا ہے اور روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہم کیف و بدمستی میں فرق کرتے ہیں۔ لذّت اندوزی اسی حد تک ٹھیک ہے جب تک اس سے آسودگی اور سرور ہو۔ جب وہ بہیمیت میں بدل کر ہمارے بدن کو چور کر دے، ہمارے ذہن کو پراگندہ اور ہماری روح مُردہ تو پھر وہاں پر ہم حد کھینچ دیتے ہیں۔ فن برائے فن والوں سے ہمارا بنیادی اختلاف یہی تھا کہ وہ اس حد کو کھینچنے کے قائل نہ تھے۔

دنیا میں عام طور پر اور مشرق میں خاص طور پر اور ہمارے ملک میں بھی فنونِ لطیفہ اور ادب کے ارتقا کی تاریخ ہمارے اس نظریہ کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ فنونِ لطیفہ (رقص، موسیقی، شاعری، مصوری، سنگتراشی) کی ابتدا انسانوں کے اجتماعی تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ، زندگی کو برقرار رکھنے اور سامانِ معیشت کی پیداوار کو بڑھانے اور ان کی فراہمی کو بہتر اور زیادہ جوش اور حوصلہ مندی سے حاصل کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ زندگی میں انبساط اور حظ، کیف و سرور انسان کی بنیادی ضرورتوں اور بنیادی خواہشوں کی آسودگی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور جب انسان ان ضرورتوں اور خواہشوں کو کسی مجبوری کے سبب پورا نہیں کر سکتے تب اس لاچاری اور بے بسی کی حالت میں بھی انھیں پورا کرنے کی اُمید، آسودگی کا خواب اور تمنّا ان کے دلوں کو مسرور کرتی ہے لیکن اس مسرّت کے ساتھ محرومیوں کے غم کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔

اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے بالجبر لوٹے جانے والے اور محروم انسانوں کے نغموں اور شعروں میں درد اور دکھ کی المناک صدا ملی ہوئی ہے۔ لیکن ان رنج بھری آہوں کے پیچھے دراصل زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان ناجائز اور ناروا بندشوں کے خلاف شکوہ ہوتا ہے اور ظلم کی ان زنجیروں کو توڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے جن سے نوعِ انسان کی اکثریت آج بھی بندھی ہوئی ہے۔

ہمارے ملک میں رقص، موسیقی اور ڈرامے کے فنون نے عہدِ قدیم میں غیر معمولی ترقی کی تھی۔ اور ان کے بارے میں پہلی بنیادی علمی کتاب بھرت کی "نٹ شاستر" ہے، جو غالباً دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح میں مرتب ہوئی تھی۔ ہماری موسیقی اور رقص کی بنیاد اسی شاستر کے لکھے ہوئے اصولوں پر ہے۔ بعد کو رقص اور موسیقی ہمارے سماج کے اجتماعی تجربوں اور مشاہدوں اور ہمارے ماہرین اور عالموں کی تحقیق اور تفتیش کی بنیاد پر ایک زبردست علم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جہاں پر انسانی آواز کی تمام امکانی صورتوں اور ان کی مختلف ترتیب کو ریاضی کے فارمولوں کی طرح منظم کر لیا گیا ہے، جس کی مدد سے وہ ایک بچّے کو بھی حساب اور جیومٹری کی طرح سکھائی جا سکتی ہے۔

انسانی جذبات کے اظہار کو اس قدر علمی شکل میں مرتب کر لینا ہماری قوم کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ کیا فن برائے فن یا شُدھ کلا (خالص آرٹ) کے ماننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سب سے زیادہ لطیف اور بادی النظر میں "خالص" فن کی بنیاد اور اس کا مقصد جانے بوجھے ہوئے انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا؟ سنگیت اور راگ کا مقصد ہمارے شاستروں نے آوازوں کے تناسب کے ذریعے سننے والوں کو مسرور کرنا بتایا ہے۔ موسیقی کی تعریف "دلفریب آواز" کی گئی ہے اور اس دلفریبی کی بنیاد نو بنیادی انسانی جذبات پر رکھی گئی ہے:

۱۔ شرنگار رس ـــ یعنی جذبۂ محبت

۲ - ہاسیہ رس ـــ جذبۂ خندگی یا ہنسی
۳ - کرُنا رس ـــ جذبۂ ترحم
۴ - ویر رس ـــ جذبۂ شجاعت
۵ - رودر رس ـــ جذبۂ غضب
۶ - بھیانک رس ـــ جذبۂ خوف
۷ - بی بھتس رس ـــ جذبۂ نفرت یا تحقیر
۸ - اَدبھت رس ـــ جذبۂ حیرانگی
۹ - شانت رس ـــ جذبۂ امن وسکون

گویا ان جذبوں کا خوبصورتی کے ساتھ پیدا کرنا موسیقی اور رقص کے بنیادی مقاصد ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صاف طرح سے آرٹ کے مقاصد کا جو زندگی سے بالکل وابستہ ہو اظہار کیا جا سکتا ہے؟

ہماری مصوری کا نقطۂ عروج اجنتا کے غاروں کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ وہ سب کے سب گوتم بدھ کی زندگی، ہندوستان کے سماجی اور اخلاقی اصولوں کو زندگی اور تاریخ کے واقعات کی صوری شکل میں پیش کرکے، دیکھنے والوں کو ایک خاص مقصد کی طرف مائل کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

گاندھار اور گپت عہد کی بے مثال بُت تراشی ایک خاص پیغام، ایک خاص مقصد کے لیے کی گئی تھی اور یہ مقصد اس عہد کا سب سے بلند سب سے زیادہ انسانی مقصد تھا۔ اور چونکہ ان مقاصد کا حُسن اور اُن کی ستودگی، اور ان کی بلندی اور پاکیزگی آج بھی ہماری قوم اور نوعِ انسانی کے لیے ایک برگزیدہ پیام رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تاثر اور دل کشی اہلِ بصیرت کے لیے آج بھی باقی ہے گو ہمارے عقائد بدل گئے، ہمارا علم بڑھ گیا ہے، ہمارے سماج کی ترتیب دوسری ہے، ہمارے سماجی نصب العین کی منزل اور ہے لیکن ہمارے پرانے آرٹ کے بہترین نمونے، ہمارے تہذیبی خمیر، ہمارے تمدنی مزاج کا حصہ بن کر آج بھی ہمیں زیادہ اُونچی سماجی اور انسانی بلندیوں پر جانے کا پیغام دیتے ہیں۔

فن برائے فن کو ماننے والے فردوسی کے شاہنامے، مولانا روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستان اور بوستان، تلسی کی رامائن، انیس کے مرثیوں، وارث شاہ کی ہیر، حالی کے مسدس اور اقبال کے کلام کے بیشتر حصوں کو غالباً فن ہی نہیں مانیں گے۔ اس لیے کہ ان ادبی شہ پاروں میں صاف اور کھلے طریقے سے چند اخلاقی اور روحانی اصولوں کو ان عظیم شاعروں نے پیش کیا ہے، اور ان کا کھلا ہوا مقصد اپنے عہد کے انسانوں کو بہتر انسان بنانا ہے۔

تاہم اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقی پند و نصائح، سیاسی تبلیغ یا محض علمی (سائنسی) واقعہ نویسی میں کوئی فرق نہیں۔ ایک کامیاب فن کار حقائق و واقعات، مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور ردِّ عمل کی کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں (یعنی تعمیمات) کا مشاہدہ کرکے اور انھیں سمجھ کے اپنے دل و دماغ میں جذب کرتا ہے۔ یہ سچائیاں اس کے جذبات کا اسی قدر حصہ بن جاتی ہیں، جتنا کہ اس کے ذہن کا۔ پھر اپنے جوش، جذبے، تخیل، بصیرت اور فنی مہارت کو کام میں لاکر وہ اپنے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئی، خوشنما اور نشاط انگیز شے وجود میں آتی ہے ایک الہامی نغمہ جس سے دل کو سرور ہوتا ہے، دماغ میں روشنی آتی ہے اور جو ہماری روح میں اہتزاز پیدا کرکے اس میں نئی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا حوصلہ اور رجحان پیدا کرتا ہے، سچائیوں کی زمین تجربے، مشاہدے اور بصیرت کی آب پاشی، فنی مہارت کی ٹھنڈی ہواؤں اور گہرے جذبے کی گرم، تیز اور نورانی شعاعوں کے مجموعی عمل سے تخلیق کا دانہ ایک مہکتے ہوئے رنگین اور لطیف پھول کی طرح ہمارے سامنے برآمد ہوتا ہے، ان تمام عناصر پر مشتمل لیکن ان سے مختلف تخیل، تصور اور تجربے کا مظہر جو ہر اول ایک آدھ

ے افزا اور فلک سیر۔

بہرحال حقائق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے اس خیال کے مخالفین دراصل عظیم فن کاری کے میدان سے باہر نکل چکے ہیں۔ ہمارے ، اور دنیا کی قدیم فنی اور ادبی روایت ہمارے نظریوں کی تصدیق اور ان کے نظریوں کی تردید کرتی ہے اور خود ان حضرات کی اپنی ادبی ن یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ رجعت پرست طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر فن اور ادب کے بھی وفادار نہیں رہے ہیں جس کا وہ پہلے ی کرتے تھے۔ وہی لوگ جو ہماری تحریک کے شروع کے زمانے میں ہم پر طعنہ زن تھے کہ ہم ادب کو اشتراکی خیالات پھیلانے کے لیے استعمال رہے ہیں آج خود پاکستان میں "اسلامی ادب" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور ہندوستان میں "شدھ کلا" کے پجاری، ترقی پسند خیالات سے ہندو یب کو بچانے کے لیے بدترین رجعت پرستی کی طاقتوں کے ساتھ صف بستہ ہو گئے ہیں۔

اس طرح یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کی مخالفت ہم سے اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ "خالص" فن کے دلداد تھے اور ہم ان کے نزدیک فن س کے منصب سے گرا رہے تھے۔ ان کی مخالفت ہماری جمہوریت، محنت کشوں کی طرفداری، ہماری انسان دوستی اور آزادی خواہی سے ، ان کی اصلی جگہ رجعت پرست جاگیر داروں، بڑے بڑے سرمایہ داروں اور سامراجیوں کی صفوں میں تھی، جہاں پر آج وہ پہنچ گئے ۔ ان کے یورپی پیشوا آج کھلے بندوں فاشزم کے طرفدار اور سامراجی قوتوں کے ثنا خواں ہیں۔

اس نہج کا ادبی نظریہ ہمارے وطن اور ارضِ مشرق کی بہترین اور ادبی روایات کے بالکل برخلاف ہے اور چونکہ دنیا کے بلند ن فن کاروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ انسانی، اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ ن نصب العین سے ہی متاثر ہو کر اپنے فن کی تخلیق کی ہے، اس لیے اعلیٰ ترین ادبی اور فنی تخلیق کو اس عہد کی سب سے برگزیدہ انسانی وجہد اور نظریوں اور خیالات اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ عملی حقائق سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں انسانیت سچائی سے کوئی سروکار باقی نہ رہ گیا ہو۔ رجعت پرستوں کی بہت بڑی طاقت اور بہت زیادہ وسائل کے باوجود ان کا زوال اسی سبب سے ا ہے کہ انھوں نے انسانیت اور سچائی سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کمزور اور کم تعداد اور کم مایہ ہونے کے باوجود اگر ے کر رہے ہیں تو اسی سبب سے کہ ہم نے انسانیت اور سچائی کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہے۔ ہماری یہ گرفت جتنی ہی مضبوط ہو گی اسی تناسب ، ہماری طاقت، تعداد، مقبولیت اور فن کی تاثیر اور خوبصورتی میں اضافہ ہو گا۔

('روشنائی' سے انتخاب)



Let the English have our chips.

The money is jolly good. And you have your very own courier service that's quick and safe.

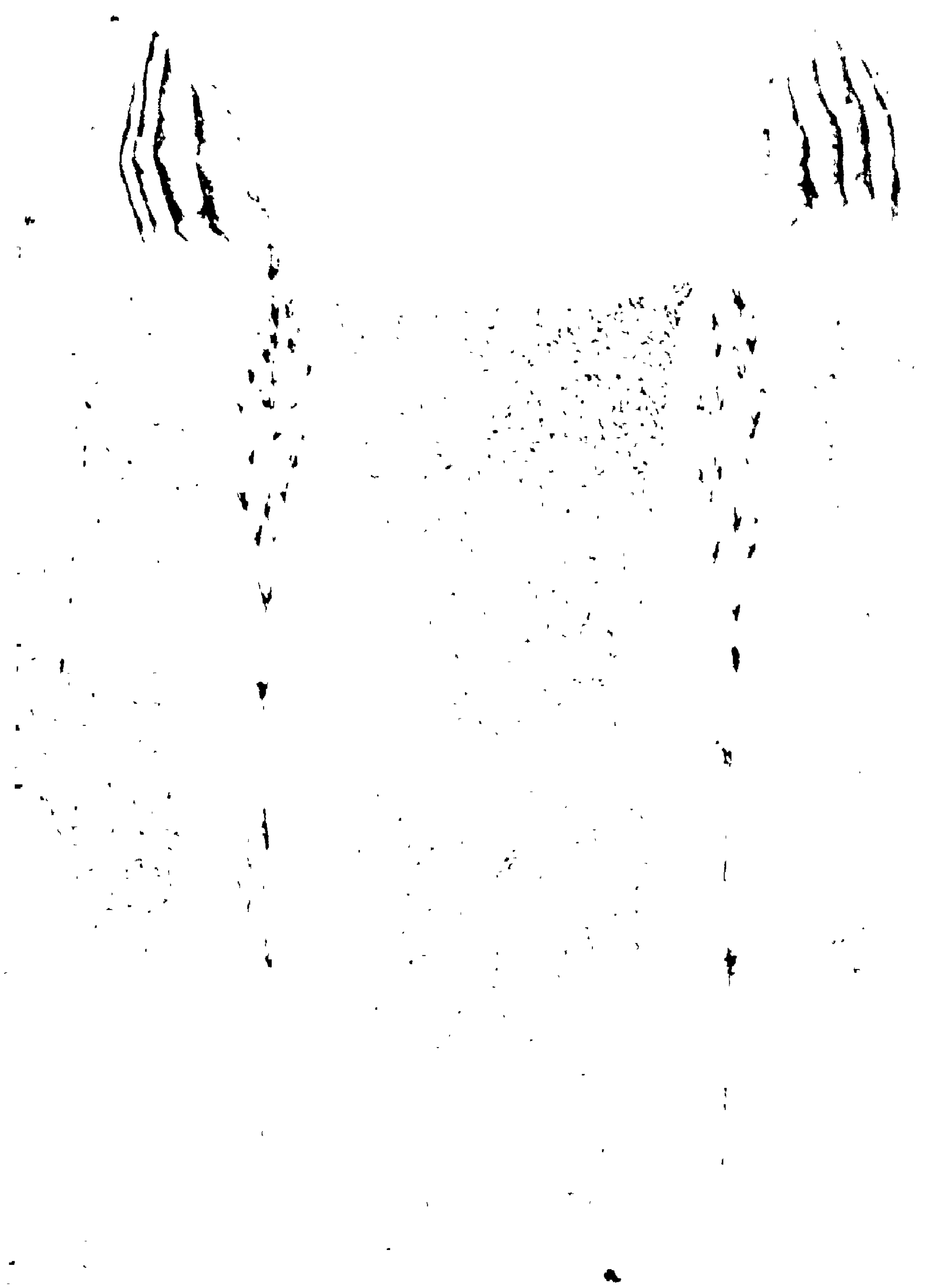
Airfreight. It really takes the worry out of such delicate transactions.

Our schedule: two all-cargo services to the U.K. via Europe. One each to U.S.A., Europe and Japan. All our regular passenger flights also carry cargo and cover 41 cities around the world. And if there's some place we don't go to, we'll arrange for your cargo to get there.

Get in touch with us and you can start counting your chips.

نقوشِ زنداں





نقوش زنداں

بیڑیاں پہنے ہوئے بیٹھی ہے زنداں میں بہار

سردار جعفری

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض احمد فیض

نوٹ: کوشش کے باوجود سبطِ حسن، حبیب جالب اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی جیل کی تخلیقات حاصل نہیں کی جاسکیں۔ سجاد ظہیر نے جیل میں دو اہم کتابیں لکھیں۔ "روشنائی" اور "ذکرِ حافظ"۔ روشنائی کے اقتباسات 'میرِ کارواں' کے باب میں شامل ہیں۔ فیض اور سردار جعفری کی جیل کی نظموں کی تعداد زیادہ ہے صرف چند منتخب نظمیں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

سجّاد ظہیر کے خطوط رضیہ کے نام

(اقتباسات)

سنٹرل جیل، لکھنؤ

(۱)

ارچ ۱۹۴۰ء

خط لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ کیوں کہ اب جب کہ تنہائی ہے بس تمھارا ہی خیال ہردم آتا ہے۔
ٹی سی کوٹھری جس میں اس وقت بند ہوں، شام کے سات بجے ہیں اور ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے سے مقفل ہوجاتے ہیں
ں خیالی معلوم ہوتی ہے۔ یقین نہیں ہوتا کہ اس میں بند ہوں اور اس وجہ سے تم تک نہیں پہنچ سکتا، بس ایک احساس
، ایک اصلیت ہے اور ایک حقیقت۔ اور وہ یہ کہ ایک دوسرے سے جدا ہیں، دور ہیں، مجبور ہیں اور پاس نہیں ہوسکتے۔
، وقت بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے اور میں گردن کھڑکی تک موڑتا ہوں تو آسمان پر وہ ستارہ چمکتا نظر آتا ہے
س نے ایک دفعہ تمھیں الہ آباد میں جمنا کے کنارے پر دکھایا تھا۔ یاد ہے؟ غالباً زہرہ —— خوب چمکتا ہوا (یا خوب چمکتی
ں) ابھی تھوڑی دیر میں چاندنی بھی یہاں سے دکھائی دینے لگے گی مگر چاند دکھائی نہیں دے گا۔ اچھا ہی ہے۔ اس
، اور کوفت ہوتی ہے اور اکیلے پن کا احساس اور تیز ہوتا ہے۔ تمھاری یاد، تمھاری صورت، تمھاری ہنسی کی آواز،
ری سب باتیں، ایک ایک چیز، ہمارے کمرے۔ وہ صبحیں، وہ شام اور راتیں، یہ سب اتنی صاف دل و دماغ پر اپنی پرچھائیں
رہی ہیں کہ میں دنیا کا نہیں بلکہ عالم خیال کا باشندہ ہوگیا ہوں۔ ان سب کے ساتھ ایک ایسا شدید روحانی درد ہے جیسے
ں دل کے نازک ترین احساسات کو بے دردی سے مسل دے۔ اس درد کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آئے اور درد بڑھتا
چلا جائے۔

آج مجھے قید ہوئے پانچواں دن ہے۔ ایک عجیب بات جو یہاں رہ کر معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ مشاہدے اور احساس
قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے، سب کو ہوتا ہے یا نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں یہ تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔
س کوٹھری کے باہر کا اندھیرا اور اس کا اندھیرا پن، چند ابابیلوں کا ادھر ادھر چکر کاٹنا، دوپہر میں ایک فاختہ کی آواز۔
ں کے باہر سے آس پاس کے دیہات سے آنے والا ہولی کے گانوں اور ڈھول کا شور، میرے ساتھی قیدیوں کی چھوٹی چھوٹی
ں، کسی کی ہنسی، کسی کے چہرے کی شکن وغیرہ۔ شاید اکیلے ہونے کی وجہ سے ایسا ہو لیکن یہ حالت ضرورت سے زیادہ ہو
تنی الجھن ہوتی ہے۔ یا شاید الجھن اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہاں کی دنیا اتنی چھوٹی ہے اور دل و دماغ کی دنیا بہت وسیع
ہردم ایک روحانی تضاد، کش مکش کا عالم طاری رہتا ہے مگر یہ سب پڑھ کر تو تم خواہ مخواہ پریشان ہوگی، لیکن ہونا مت، کیونکہ شاید
نو گرفتار" ہونے کی وجہ سے ہے۔ ابھی تو بس کتابیں پڑھتا ہوں۔ جب کچھ لکھنا شروع کروں گا تو دل بہل جائے گا۔ یہاں کوئی

علمی مضمون یا کتاب لکھنا تو مشکل ہوگا۔ ایک ناول شروع کرنے کی فکر ہے۔ بہت سے پلاٹ خیال میں آرہے ہیں۔ مگر طبیعت ابھی کسی پر جمی نہیں۔

اب میرا پروگرام سنو۔ صبح کو ساڑھے چھ بجے سے پہلے اٹھ جاتا ہوں۔ تھوڑی سی ورزش کے بعد دس منٹ باغیچے میں گھومتا ہوں۔ پھر چائے اور اخبار۔ ساڑھے آٹھ بجے تک نہا دھوکر تیار۔ نو ساڑھے نو بجے تک پھر اخبار یا کسی اور کتاب کی پڑھائی۔ اس بیچ میں اگر کوئی آیا اور اجازت ملی تو جیل کے دروازے پر گیا۔ پھر ساڑھے بارہ اور ایک کے درمیان جو گھر سے کھانا آتا ہے وہ کھایا۔ کھانے کے بعد ادھر اُدھر ٹہلا۔ پھر پلنگ پر لیٹ کے کوئی اچھی سی ہلکی سی کتاب پڑھی، ہندی کا سبق لیا اور اونگھا یا سویا۔ اتنے میں ساڑھے تین بج جاتے ہیں۔ پونے چار سے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا۔ ایک گھنٹہ کھیلنے کے بعد چائے پی ــــــ اب اس کے ذرا دیر بعد ہی ساڑھے پانچ اور جیل پر ایک وحشت اور خاموشی چھائی سب اپنی اپنی بارک یا کوٹھری میں بند: ساڑھے پانچ سے چھ تک پھر کچھ پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے کا وقت بڑی مشکل سے کٹتا ہے۔ نہ روشنی نہ اندھیرا، مچھر، بے ساختہ باہر نکلنے اور ٹہلنے کو جی چاہتا ہے، لیکن یہاں ساڑھے سات قدم سے زیادہ چہل قدمی بھی نہیں کر سکتے۔

سات بجے تک اندھیرا اچھی طرح ہو جاتا ہے، اور پھر سے پڑھائی شروع کر دیتا ہوں، اسی وقت ہی تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آٹھ بجے کھانا (جو دن ہی کو آجاتا ہے) نکال کر میز پر سجا دیتا ہوں اور اکیلے میں جیسے بھی کھانے بنتا ہے، کھاتا ہوں، نو سے دس تک پھر پڑھائی، ساڑھے دس بجے تک بستر پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں جب بھی نیند آئے۔

(۲)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

میری زندگی کی بہار! تمھاری شکایتیں سر آنکھوں پر۔ میں نے کب کہا کہ میں تمھارے لائق ہوں۔ آج تمھارا دوسرا خط ملا۔ جو شاید تم نے ۱۸ مارچ کو لکھا ہو۔ کیونکہ تم نے تاریخ نہیں لکھی ہے۔ لکھنؤ کی مہر ۱۹ مارچ کی تھی۔ اور آج مجھے وہ خط دیا گیا۔ اس سے پہلے تمھارا ایک خط ۱۷ کو مجھے اور ملا تھا۔ اسی دن صبح کو میں ایک خط تمھیں بھیج چکا تھا۔ تعجب ہے کہ تمھارے دوسرا خط لکھنے کے وقت تک نہ ملا۔ بات یہ ہے کہ ایک تو جیل کی سنسر شپ، اس کے بعد ڈاک خانے والوں کی خطوں میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن میں تمھیں ہر ہفتے سنیچر کی شام کو لکھا کروں گا جو تمھیں دوشنبہ کو مل جانا چاہیے۔ تم اسی دن یا دوسرے دن جواب بھیج دیا کرو۔

مجھے اس جیل میں اگر کوئی کوفت تکلیف اور پریشانی ہے تو اسی بات کی کہ میں تمھارے لیے کتنی پریشانیوں کی وجہ بن گیا ہوں۔

ایسی حالت میں اور ایسے وقت میں جب کہ تمھارے جسم کو آرام، دل کو مسرت اور دماغ کو سکون کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ تمھارا پہلا خط تو اتنا پریشان کن تھا کہ مجھے بہت ہی تشویش بڑھ گئی۔ لیکن میری جان! انسان کا امتحان تو مشکل وقت میں ہی ہوتا ہے۔ یہ مت بھولنا کہ تمھیں اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا خیال صرف اپنے اور میرے ہی لیے نہیں بلکہ اسی چھوٹی سی جان کے لیے بھی رکھنا ہے جس کی تم تمام حامل اور ضامن ہو۔ مجھے اگر یہ معلوم ہو کہ تمھاری صحت اچھی ہے

نم اس تکلیف دہ جدائی کے باوجود بھی اپنی نارمل زندگی بسر کرتی ہو، پڑھتی لکھتی ہو، سیتی پروتی ہو، ٹہلتی ہو، سینما جاتی ہو، ں سے ملتی جلتی ہو، تو اس اسیری کا بوجھ بہت ہلکا ہوجائے گا۔ اور یہاں کی یہ خاکی دیواریں، اکیلاپن، بےکاری، کم تکلیف دہ ں گے۔

میں نے تمھارے لیے "دیوانِ حسرت" خریدا تھا۔ وہ اس کمرے میں میز پر رکھا تھا جس میں میں لکھنؤ میں ٹھہرا تھا۔ معلوم ب تمھیں ملا یا نہیں۔ عطر اور صابن تو مل گئے ہوں گے۔

دو دن سے ہماری بیرک میں ایک نئے قیدی صاحب آئے ہیں جو اینگلو انڈین ہیں۔ لکھنؤ کے رہنے والے ایک ران صاحبزادے ہیں۔ کسی دکان میں نوکر تھے، کچھ روپیہ غبن کر گئے، اس پر چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ اس غریب کو سب نے د بنا رکھا ہے۔ اسے "صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ بےچارہ کافی سیاہ فام ہے اور ویسے بھی طرح طرح کی فقرے ی اس پر ہوتی رہتی ہے۔ دراصل یہاں کے رہنے والوں کی عجیب ذہنیت ہوجاتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں باتے ہیں اور پھر من جاتے ہیں جیسے کبھی لڑے ہی نہ تھے۔ ہر شخص اس امید میں رہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ایسی ہوجائے جس سے اس کو قبل از وقت رہائی مل جائے گی۔ ہمارے B کلاس میں اس وقت پانچ قیدی ہیں۔ ہر شخص اپنے کو اہم تر بڑا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب، جو پولیس کے داروغہ تھے "داروغہ جی" کہلاتے ہیں۔ دوسرے صاحب سی ریاست کے منیجر تھے "منیجر صاحب" کہلاتے ہیں۔ اور باوجود میری کوشش کے کہ مجھے ظہیر صاحب کہا جائے مجھے رسٹر صاحب" کہنا شروع کردیا گیا ہے! انسان کی خودستائی اور خودبینی کا مادہ یہاں کافی تیز ہوجاتا ہے۔ ان رسموں کو برت لوگ اپنی عزت کی منہدم عمارت کو پھر سے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن یہ جیل کا سسٹم ایک سرے سے بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی انسانیت کو توڑ کر برباد کردینے کے م سامان مہیا ہیں۔ جرم کا "علاج" نہیں ہوتا بلکہ احمقانہ سزا ہوتی ہے۔ کانگریسی وزارت نے کچھ تبدیلیاں کیں لیکن وہ بالکل ائی ثابت ہوئیں۔

مہربانی کرکے تم پنڈت جواہرلال نہرو سے مل کر ان کی وہ کتاب واپس کردینا جو میں اس دن اُن کے یہاں سے تھا (Light on Moscow) اس پر بادامی رنگ کا کاغذ میں نے چڑھا دیا تھا، اور وہ میری لکھنے کی میز پر رکھی ں۔ ان کی دوسری کتاب لکھنؤ میں پڑی ہے۔ کوئی جاتا ہوگا تو واپس ہوجائے گی۔ میرا آداب بھی کہنا۔

اور ہاں تم مسٹر آغا کوتوال کو ایک خط بھیج کر ان سے میری ان کتابوں کو فوراً واپس کرنے کا مطالبہ کرو جو وہ تلاشی کے ں اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ کتابیں سب قطعی جائز طور پر رکھی اور پڑھی جاسکتی ہیں، اور اگر اس میں ڈھیل ہوئی تو پولیس والے خواہ میری کتابیں غائب کردیں گے۔

وہ کتابیں جو منّے بھیا نے مجھے دی تھیں، اب ختم ہو رہی ہیں۔ تم دھون سے بھی میری چاروں کتابیں واپس منگوالینا۔ مجھے ں کی ضرورت ہے، کیوں کہ میں اسی فلسفے پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت جیل میں بند قیدی زور زور سے "ہولی" گا رہے ، اور چاروں طرف سے بھی گانے کی اور ڈھول کی آواز آرہی ہے۔

اب مجھے آٹھ بجے تک اپنی کوٹھری سے باہر صحن میں نکلنے کی بھی اجازت ہے۔ آج پورا چاند نکلا ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ ند نظر آرہی ہے۔ لیکن تم نہیں ہو تو یہ ٹھنڈی ہوا زہر معلوم ہوتی ہے۔

(۳)

۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء

پرسوں شام کو جب سورج ڈوب رہا تھا، اور پچھم کا آسمان گلابی تھا تو جیل کی اونچی دیوار پر ایک بارگی دو مینائیں آکر بیٹھ گئیں۔ آسمان کی سُرخی میں ان کے پروں کی سیاہی اُبھر آئی۔ اور یہ جوڑا نظروں کے سامنے بالکل نمایاں ہوگیا۔ پھر یکبارگی ان دونوں نے چلّانا شروع کیا، خوب پر پھڑپھڑائے، اور ہماری پچیس فٹ اونچی خاکی دیوار پر سے ہچکولے لیتی ہوئی پھر سَن سَن کرتی اُڑ گئیں۔ مجھے اس وقت تمھارا اور اپنا خیال آیا اور ان دو آزاد چڑیوں پر بڑا رشک ہوا۔

کیا تم بھی یہ محسوس کرتی ہو کہ ایسی چاندنی جیسی ادھر دو دن سے نکلتی ہے اور ہوا کی یہ گرمی ملی ہوئی رات کی خفیف سی خنکی اور فضا کا اس قدر سکون اور پیڑوں کے نیچے چاندنی اور چھاؤں کی گہرائی ہمیشہ ہی ایسے ہوتے تھے، ایسے خوش گوار اور دل خوش کن جیسے کہ آج بھی یہ ہو سکتے، اگر ہم یکجا ہو سکتے۔ اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمیں ستانے کو کسی نے آسمان پر ان تاروں کو بکھیر دیا ہے، اور زہرہ بھی دور سے ہم پر ہنستی ہے۔

لیکن خیر میری جان، شاید یہ سب اس لیے ہے کہ ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دور ہو کر جذباتی طور سے اور قریب آجائیں۔ کیا معلوم!

(۴)

۱۶ رجون ۱۹۴۰ء

کل شام کو جو آدمی کھانا لایا اُس نے بتایا کہ تم چلی گئیں۔ حالانکہ مجھے یہ بات معلوم تھی، لیکن اس کی تصدیق کے بعد دل جیسے سنسان سا ہوگیا۔ میری جان! تم کیوں گئیں! تم تھیں تو میرے لیے لکھنؤ میں روشنی تھی۔ اس قید خانے میں امید کی مہک آجاتی تھی، اور اب یہ لق ودق فاصلہ تمھارے اور ہمارے بیچ میں! لیکن دل جیسے اور قریب ہو گئے ہیں۔ کون سا لمحہ ہے جب تمھارا خیال نہیں آتا۔ رات بھر پڑا پڑا سوچتا رہا کہ اب تم اُناؤ پہنچی ہوگی۔ اب کان پور۔ اب وہاں سے چلی ہوں گی۔ اب اور آگے، اب اور آگے، اور آخر کار صبح کو دلی۔ اور اس وقت نو بج چکے ہیں۔ تم اپنے گھر ہوں گی۔ امید ہے کہ اچھی طرح ہوگی۔ بالتفصیل لکھو کہ کان پور میں کیا ہوا، پھر دلی میں ڈیڈی مل گئے، اور سفر کیسا کٹا، برتھ خالی مل گئی تھی، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ انجکشن لے لیا یا ابھی نہیں، ضرور لے لینا۔ ڈاکٹرنی کو دکھا لینا، اور اس زمانے کی خاص خاص ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرنا۔

اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ اجمیر میں اچھی خاصی بارش ہوگئی ہے۔ اس لیے وہاں کا موسم خوش گوار ہوگا۔ ٹمپریچر بھی سوسے کم ہے۔ یہاں بھی کل شام سے موسم بدل گیا ہے۔ پروائی چل رہی ہے۔ کچھ بارش بھی ہوئی ہے۔ آسمان پر بادل ہیں اور لو اب نام کو نہیں ہے۔ پنکھے سے ہوا ٹھنڈی نکلتی ہے۔ اس سے وہ تکالیف جو گرمی کی وجہ سے تھیں کافی کم ہو گئی ہیں۔ آج پڑھنے لکھنے میں بھی سہولت رہی۔ دیکھو یہ حالت کب تک رہتی ہے۔ گرمی پھر ہوتی ہے یا بارش اور ہوتی ہے۔

تمھارا بھیجا ہوا یورپ کا نقشہ مل گیا۔ بہت اچھا ہے۔ لڑائی کا سارا محاذ اس سے مل جاتا ہے۔ اسے میں نے اپنی لکھنے کی میز کے سامنے دیوار پر چسپاں کر دیا ہے۔

ہمارا جیل کا نیا ساتھی، جرمن یہودی عجب مُردہ دل انسان ہے۔ اس جرمن کی طرح بالکل نہیں ہے جسے تم نے بھی

دیکھا تھا اور جو ہر وقت اُبلا کرتا تھا! یہ بے چارا تو ایک دن کہنے لگا کہ میرے لیے اس وقت یورپ کے مقابلے میں ہندوستان کا یہ جیل غنیمت ہے۔ اسے اسی خیال سے تسکین ہو جاتی ہے۔

پیرس کے تباہ ہونے کا مجھے بڑا غم ہے! آج وہاں کیسی ویرانی ہوگی۔ تباہی سے تو خیر بچ گیا مگر وہ باغ وبہار شہر وادیٔ غریباں ہوگیا ہوگا۔ عجائب خانے، کافے، سڑکیں، دریا، پل سنسان پڑے ہوں گے۔ جرمن سپاہی ہوں گے اور بوڑھے فرانسیسی۔ کہیں یہ خونی تماشا جلد ختم ہو اور صلح ہو بھی چکے۔

آج تاریخ کی ایک موٹی سی کتاب ختم کی۔ اس کے ساتھ ساتھ دو کتابیں اور پڑھ رہا ہوں۔ ایک فرانسیسی ناول اور ایک اقتصادیات کی کتاب۔ اس فرانسیسی ناول کے مصنف کو میں جانتا تھا۔ یہ فرانس کا بہت بڑا جدید شاعر بھی ہے۔ اس امریکن اخبار ٹائمز میں پڑھا تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہوکر محاذ پر چلا گیا۔ معلوم نہیں بے چارے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ اسپین کی لڑائی میں میرے تین دوست مارے گئے جن میں رالف فاکس بھی اور اب اگر کبھی یورپ جانا ہوا تو شاید ایک ملاقاتی بھی نہ ملے۔

دیکھو آج کیسے غمگین خیالات بار بار ہجوم کر کے دل و دماغ کو گھیرے لیتے ہیں۔ یہ سب تمھارے جانے کی وجہ سے ہوا۔ جبھی تم جس کام کے لیے گئی ہو اسے جلد ختم کر کے واپس آؤ۔ یا کیا معلوم اس وقت تک میں ہی رہا ہو کر تمھیں لینے آجاؤں ....

(۵)

۸ر جولائی ۱۹۴۰ء

تمھارا ۲ر جولائی کا خط مجھے ۵ر کو ملا۔ چونکہ میں گذشتہ ہفتہ تمھیں دو خط بھیج چکا تھا، اس لیے اس ہفتے لکھ رہا ہوں۔
گورنمنٹ نے ہم ڈیٹنوز کے واسطے جو قواعد بنائے ہیں وہ تیار ہوکر آ گئے ہیں۔ جیل کے عہدے دار کہتے ہیں کہ وہ "خفیہ" ہیں لہٰذا ہم لوگوں کو دکھائے نہیں گئے۔ خوش عقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیٹنوز کی جیل کی زندگی میں ان قواعد کی رو سے کچھ نئی سہولتیں پیدا ہوں گی، اور ہم لوگوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جیسا پہلے نظربندوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ لیکن فی الحال تو ان قواعد کا اثر یہ ہے کہ جو سہولتیں اب تک تھیں، ان میں بھی اکثر میں کمی ہو گئی۔ مثلاً اب خطوں میں پہلے سے زیادہ دیر لگا کرے گی۔ کیوں کہ بجائے جیل کی سنسرشپ کے براہِ راست پولیس کی سنسرشپ ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ میرا National Herald اب بند کر دیا گیا ہے حالانکہ میں خود دام دے کر اسے منگواتا تھا۔ معلوم نہیں یہ گورنمنٹ کی منشا سے ہوا یا جیل کے عقلمند عہدے داروں کی "خیر خواہی" کا نتیجہ ہے۔ بہرحال ان کا تو یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی قیدی پر جتنی زیادہ پابندیاں عائد کریں گے، ان کی اتنی ہی زیادہ بھلائی ہوگی۔ کیا حرج ہے اگر کسی کی "ترقی" ان باتوں کی وجہ سے ہو جائے۔ نیشنل ہیرلڈ بند ہونے سے میری حب الوطنی کا چراغ بجھ نہ جائے گا۔

کل اور آج یہاں عجیب تکلیف دہ سی گرمی رہی۔ ٹمپریچر زیادہ نہ تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ مگر ہوا میں نمی ہونے کی وجہ سے گرمی کا اثر جسم پر ایسا ہوتا تھا جس سے طبیعت مضمحل سی تھی۔ میرے گلے میں کچھ درد بھی تھا (جو آج بالکل غائب ہے)۔ میں نے اپنی تمام بھاری قسم کی کتابیں بند کر دی ہیں اور شیلے اور بائرن پڑھتا رہا۔ شیلے کا مجموعۂ کلام بھی عجب انمول خزانہ ہے۔ انگلستان کا انقلابی شاعر اپنی زندگی کے دوران میں کتنا مظلوم رہا اور آج بھی کالجوں میں اس کے کلام کا وہی حصہ پڑھاتے ہیں جس

میں انقلابی عنصر ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔
پرسوں اخبار میں میاں شوکت کی تصویر پنڈت جواہر لال اور عبدالغفار خان کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن پر دیکھی۔ تم نے بھی دیکھی؟ اب تو شوکت کی شکل بالکل ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سی ہوتی جا رہی ہے۔ وہی مونچھیں اور اسی طرح گھڑی کا چین جیب میں ڈالے ہوئے۔ تم شوکت یا زہرہ کو کبھی خط لکھو تو میرا پیار ضرور لکھ دینا۔ نہیں معلوم امتیاز اور ان کی بیوی کیسے ہیں؟ دیویاں پر تو پیرس کی بربادی سے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہوگا۔

(۶)

۲۶ جولائی ۱۹۴۰ء
تمہارے خط ملے، اور پرسوں والے خط سے یہ معلوم کر کے کہ آخر کش میرے خط تم کو مل گئے، اگرچہ ایک ہفتہ بعد کس قدر اطمینان ہوا۔ حتی المقدور خط وقت سے پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن نامہ بر کو کیا کروں۔ کیا میرے خط اتنے لمبے یا دلچسپ ہوتے ہیں کہ سنسر کو پڑھتے پڑھتے کئی دن لگ جاتے ہیں۔ تمہاری تکلیف کا حال معلوم کر کے تشویش ہوتی ہے۔ مگر پھر یہ خیال آتا ہے کہ یہ تو ہر عورت کو برداشت ہی کرنا پڑتی ہے۔ ابھی تک عقلِ انسانی نے اس تکلیف پر قابو پانے کی صورت نہیں نکالی۔ یہ کافی تعجب کی بات ہے۔ بلکہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف غالباً بڑھ ہی گئی ہے۔ غیر مہذب اور وحشی قبائل کی عورتوں کو دردِ زہ بہت کم ہوتا ہے۔ تو بیگم! تم کو جو اتنی پریشانی ہو رہی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم گریجویٹ ہو اور آدھی ایم۔ اے ہو۔ یہی خیریت ہے کہ پوری ایم۔ اے نہیں ہو۔ ورنہ کیا معلوم شاید اور زیادہ تکلیف ہوتی۔ خیر جی تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ چند روز کی بات ہے پھر یہ تکلیف خوشی سے بدل جائے گی۔
تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ برسات میں بچہ پیدا ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کی ایک بڑی برگزیدہ اور دلچسپ ہستی کی ولادت اسی موسم میں ہوئی تھی۔ یاد کرو کہ جب کرشن جی پیدا ہوئے تھے تو رات کے بارہ بجے تھے اور پانی موسلا دھار برس رہا تھا، سخت طوفانی موسم تھا۔ اسی وجہ سے تو ان بے چارے کی جان بچ گئی ورنہ ان کی ماں پر تو پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ باقی قصہ تم جانتی ہی ہو۔ اور اگر نہ جانتی ہو تو اپنی اماں جان سے پوچھنا۔ تمہارا بچہ تو ایسے طوفان میں پیدا ہو رہا ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ساری دنیا کی عمارت ڈگمگا رہی ہے اور اس کی ماں نہیں بلکہ باپ قید ہے۔
کل یہاں ایک گھنٹہ اتنی سخت بارش ہوئی جیسی آج تک اس سال نہیں ہوئی۔ تمام جیل خانہ جل تھل ہو گیا۔ اور ہماری چھت خوب ٹپکی۔ خیریت ہوئی کہ دن تھا اور وہ گوشہ جس میں پلنگ تھا، محفوظ رہا۔ آج سنتے ہیں کہ چھتوں کی مرمت کی جائے گی۔

(۷)

۱۲ اگست ۱۹۴۰ء
آج شام کو ساڑھے چھ بجے ڈیڈی کا بھیجا ہوا تار مجھے ملا جس سے تمہاری خیریت اور بچی کی ولادت کی خبر معلوم

ہوئی۔ کچھ عجیب دل کی کیفیت ہے۔ ایسی حالت میں تم سے سیکڑوں میل دور ہونا حد سے زیادہ تکلیف دہ ہے اور جو خوشی اس سے ہوئی؛ کہ اب تمھارے اور ہمارے بیچ محبت کی ایک جیتی جاگتی ننھی سی نشانی موجود ہوگئی ہے، اور یہ کہ ان انتظار کے دنوں کا خاتمہ ہوا اور تم اس تکلیف دہ مرحلے سے بخیر و خوبی نجات پاگئیں۔ یہ تمام خوشی اس نا قابل برداشت فراق کی بدولت اضطراب میں بدل گئی ہے۔ اس وقت مجھے تمھارے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مہر درویش بجان درویش۔ سوائے برداشت کے چارہ ہی کیا ہے!

اُمید ہے کہ اس خط کے پہنچنے تک تم نسبتاً اچھی ہو چکی ہوگی۔ سب سے مشکل وقت گزر گیا۔ اب تو روز بروز حالت نارمل ہوتی جائے گی۔

بچی کیسی ہے؛ چھوٹی سی یا بڑی سی؟ اس کا وزن کیا ہے۔ ابھی تو وہ صرف رونا، سونا اور دودھ پینا ہی جانتی ہوگی۔ آنکھ بھی شاید مشکل ہی سے کھلتی ہو۔ بھئی مجھے تو لڑکی ہی کی خواہش زیادہ تھی۔ تمھیں البتہ لڑکا نہ ہونے سے شاید کچھ افسوس ہوا ہو۔

میں اچھا ہوں۔ یعنی میرا جسم، دل و دماغ اور روح تو سب وہیں تمھارے پاس اور تمھاری ننھی بچی کے پاس ہیں۔

(۸)

۱۵ راگست ۱۹۴۰ء

میں نے یوں تو بچی کے کئی نام سوچے ہیں اور آخری فیصلہ تو تم جب یہاں آؤگی تو تم سے مشورہ کر کے کیا جائے گا۔ لیکن ابھی جو نام مجھے سب سے زیادہ پسند آرہا ہے وہ "نجم السحر" یا اگر فارسی کی ترکیب پسند کرو تو نجم سحر ہے۔ صبح کے ستارے سے بڑھ کر دل کش کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ یہ بچی ایسے وقت پیدا ہوئی جب دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ ہماری محبت کی مشترک زندگی کا ستارہ ہے؛ بتاؤ تم کو اور ممی ڈیڈی کو یہ نام پسند ہے یا نہیں۔

(۹)

۱۳ رستمبر ۱۹۴۰ء

اب موسم بدل رہا ہے۔ صبح خنکی ہوتی ہے۔ دن کو خوش گوار ہوا چلتی ہے۔ اور رات کو شفاف چاندنی۔ ہمارے چھوٹے سے باغیچے میں گل مہندی کے پھول کھل آئے ہیں۔ کوٹھری کے سامنے ایک رات کی رانی ہے جو آج کل مہک اٹھی ہے۔ اور فاختہ کا ایک بہت خوب صورت جوڑا صبح اور دوپہر میرے قریب کی چھت پر نغمہ سرائی کرتا ہے۔ لیکن یہاں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ فطرت کی تمام دل آویزیاں، یہ نیلا آسمان، ہوا، پھول، چڑیاں، رات کی ٹھنڈک جتنی اچھی ہیں، اس سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ سکون سے بے چینی بڑھتی ہے۔

(۱۰)

۲۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء

میں اچھا ہوں۔ کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں ہے۔ اس ہفتے میں نے نیاز فتحپوری کی کتاب 'جمالستان' پڑھی اور ان کا رسالہ "نگار" بھی جیل کی طرف سے میرے پاس آتا ہے۔ ان کے مضامین اور کتاب پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص جس کی ادبی صلاحیت اتنی بلند ہو، محض اپنی نظر کے محدود ہونے کی وجہ سے بالکل ذہنی ترقی نہ کرسکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سوائے باتوں کو بار بار دُہرانے کے ان سے کچھ نہیں ہوتا۔

آج کے اخباروں میں بچوں کے جہاز کے ڈوبنے کی خبر پڑھی۔ بہت قلق ہوا۔ اور انسانوں کی بربریت اور وحشت ناکی پر افسوس۔ لندن پر گولہ باری کی خبریں بھی میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہیں۔ وہ جگہیں جہاں میں رہا ہوں، جہاں میں نے تحصیلِ علم کی ہے۔ جہاں سے میرے دل ودماغ کو وسعت وگہرائی نصیب ہوئی، آج ویران وبرباد پڑے ہوں گے۔ اور وہاں کے اکثر بے قصور باشندے آتش زدگی اور تباہی سے جان بچانے کے لیے افتاں وخیزاں!

بس اب تو جیسے دل میں صرف ایک ہی خواہش باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اس دنیا کے رہنے والے جلد سے جلد صلح کریں۔ دنیا میں پھر امن قائم ہو، اور ہم تم اس خوشی میں شریک ہوں۔

(۱۱)

۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

یہ معلوم کرکے کہ تم ۱۲ر تک الٰہ آباد پہنچ جاؤگی، بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ تم اور نجمی اچھی طرح ہوں گے۔ الٰہ آباد پہنچنے کے بعد تم جلد ہی دوچار دن کے لیے مجھ سے ملنے یہاں آجانا۔ مجھے اس بات کی ذرا گھبراہٹ یوں ہے کہ اخباروں میں ہم نظربندوں کو دیولی بھیجنے کی خبر پھر چھپی ہے۔ حالانکہ یہاں گھر سے درخواست بھیجی گئی ہے کہ مجھے لکھنؤ سے منتقل نہ کیا جائے لیکن اس سے پہلے بھیجی ہوئی درخواستوں کا جو حشر ہوا اس کو دیکھتے ہوئے مجھے منظوری کی امید کم ہی معلوم ہوتی ہے۔

تم دونوں کو دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ ماں بننے کے بعد اب تم نہ معلوم کیسی لگتی ہو؟ مجھ سے پیار تو تم نے یقینی طور پر کم کردیا، اس لیے کہ خط بہت کم لکھتی ہو اور وہ بھی بہت مختصر! کہیں ایسا نہ کرنا کہ ننھی نجمہ سے مجھے رشک ہونے لگے!

میں اچھا ہوں، آج کل کافی وقت اپنے چھوٹے سے احاطے میں باغبانی میں صرف کرتا ہوں۔ جاڑوں کی فصل کے پھول بوٹے جارہے ہیں۔ زمین تیار کرنا، کھاد ڈلوانا، کیاریاں درست کرنا، آبپاشی، تخم ریزی، قلمیں لگانا کافی دلچسپ مشغلہ ہے۔ ایک سوکھتے ہوئے پودے کو مرنے سے بچا لیا۔ زمین کو روز غور سے دیکھ رہے ہیں کہ بیج جم گیا کہ نہیں۔ اس کی پریشانی کہ کہیں دانہ نہ اُگے۔ اور اُگنے پر روز روز اس کی نشوونما کو دیکھنا، ایک ایسی دنیا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لیے اتنا مشغول ہوجاتا ہے کہ باقی باتیں پریشان نہیں کرتیں۔

(۱۲)

۱۶؍ نومبر ۱۹۴۰ء

دو دن ہوئے میرے لگائے ہوئے فصلی پھولوں میں سے پہلا پھول کھلا۔ ایک کونے میں کوئی ایک کونے میں کوئی ایک فٹ اونچے دُبلے پتلے پودے کی سب سے اونچی پھنگی پر ایک چھوٹا سا سُرخ آٹھ پتّیوں کا شرمایا ہوا سا پھول، جس کے بیچوں بیچ کا حصّہ زرد تھا۔ اس چھوٹے سے مغرور پودے کو دیکھ کر جو آس پاس کے خالی پودوں کے مقابلے میں تاج کلغی سے سجا ہوا تھا کیسی خوشی ہوئی۔ اس کی مہربانی تو دیکھو۔ ابھی اس کے پھولنے کی فصل کئی ہفتے بعد شروع ہوگی۔ لیکن یہ رحیم و کریم شاید اس خیال سے کہ جیل کی چہار دیواری میں ہونے کی وجہ سے اس کی ذمّے داری بڑھ گئی ہے۔ پہلے ہی سے ہم سے ملنے کے لیے نکل آیا۔ اور اس طرح اس غریب نے اپنی قدرتی زندگی کے دن کم کر لیے۔ اس احاطے میں ہمارا کام کرنے کے لیے جو پانچ چھ قیدی رہتے ہیں یہ بیچارے سیدھے سادے کسان ہیں جو زمین پر جھگڑا کر کے مصیبت میں پھنس گئے۔ وہ بھی سب باری باری سے اس اکیلے پھول سے ملنے کے لیے آئے اسے دیکھ کر سب خوشی سے ہنس دیے۔ معلوم نہیں وہ کون سی دل کشی تھی اس ذرا سی چیز میں کہ اتنے دُکھی دلوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا گئی!

(۱۳)

۲۵؍ نومبر ۱۹۴۰ء

کیا لکھوں؟ تحریری کام قریب قریب بند ہے، دماغ پر عجیب قسم کی افسردگی ہے۔ پڑھائی کا حال بھی بہت اچھا نہیں ہے۔ کبھی بہت سی کتابیں ایک ساتھ پڑھنے کو جی چاہتا ہے جس سے دماغ کا انتشار معلوم ہوتا ہے۔ پھر کوئی کتاب مل جاتی ہے جس کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ اور کام کا پروگرام بالکل گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ پھر کئی صبحیں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھنے کے خیال ہی سے دہشت ہوتی ہے۔ اس وقت پودے، باغ، پھول اور یہاں کی چڑیاں دل بہلاتی ہیں۔ کل صبح عجیب واقعہ ہوا۔ میں اپنی کوٹھری کے سامنے والے برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا (جیسا کہ روز کا دستور ہے) کہ یکبارگی سامنے والے جامن کے پیڑ سے کئی چڑیوں کے چہکنے کی آواز آئی۔ اس موسم میں پہلی مرتبہ بلبلوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ قید خانے کے اس غم کدے میں آپہنچا۔ کیسا آسمانی نغمہ تھا ان کا ـــــ یہاں موسیقی کی اجازت نہیں، نہ گانے کی، نہ کسی قسم کا کوئی باجہ رکھنے کی۔ اور تم یہ تو جانتی ہی ہو کہ باہر کا کوئی ملنے والا ہماری شان دار کوٹھریوں میں آکر ہم سے مل نہیں سکتا۔ مگر یہاں تو ایک نہیں کئی مہمان تھے، اور کتنے بے تکلّف، کبھی گیندے کے سنہرے پھول سے لپٹ گئے تو کبھی گلاب کی ڈال پر جھولنے لگے۔ غرض جتنی دیر رہے خوب خوش رہے، اچھلتے رہے، کودتے رہے، ہنستے بولتے رہے اور پھر تھوڑی دیر میں جس طرح آئے تھے، جیل کی اونچی اونچی دیوار پھاند کر ویسے ہی نکل گئے۔ اور جاتے جاتے بھی گاتے گئے! اس دیدہ دلیری سے انھوں نے جیل کے ہر قاعدے کو توڑا کہ تھوڑی دیر کے لیے معلوم ہونے لگا کہ ہم بھی قید نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ جس سے چاہیں ملیں اور بے کھٹکے اور بے رکاوٹ گانے سنیں۔ اپنے ان بن بُلائے مہمانوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟ بتاؤ!

(۱۴)

۲۵ جنوری ۱۹۴۱ء

میں آج سمترا نندن پنت (ہندی کے مشہور شاعر) کی نئی چھپی ہوئی نظموں کی کتاب "گرامیا" پڑھ رہا ہوں۔ اس میں ہندوستان کے دیہات کی زندگی کے بارے میں نظمیں چھپی ہیں اور بعض تو بہت ہی اچھی ہیں ـــــ اب جو ذرا ہندی سمجھ میں آنے لگی ہے تو ان میں بڑا لطف آتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ جب یہ پوری کتاب ختم کروں گا تو پھر ان میں سے دس پندرہ نظموں کا انتخاب ہندی سے اُردو نثر میں ترجمہ کروں گا، اور تمھارے پاس بھیجوں گا تاکہ تم اُردو اور ہندی کی جدید ترقی پسند شاعری کا مقابلہ کرسکو۔

کل "نگار" کا سالانہ نمبر ملا۔ اب کی اس میں جدید اُردو شاعری کے مختصر انتخابات ہیں۔ ابھی میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا ہے۔ نیاز صاحب نے اس بات کی خاص کوشش کی ہے کہ جدید مضامین پر اشعار اور نظمیں اس انتخاب میں نہ رکھیں جوش اور احسان دانش کے کلام کے انتخاب سے بھی "ڈنک" نکال کر انھیں بے ضرر بنا دیا ہے۔ "ادب لطیف" کا سالانہ نمبر اب کی بہت اچھا ہے۔ تمھیں مل سکے تو ضرور دیکھنا۔ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو کے افسانے بہت اچھے ہیں اور اس کے علاوہ بھی کئی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ فیض احمد فیض لاہوری کی ایک مختصر سی نظم بہت پسند آئی۔ اپنے حسب حال ہونے کی وجہ سے وہ تمھیں تحفۃً بھیجتا ہوں:

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل ہے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

(سجاد ظہیر پاکستان میں تقریباً چار سال روپوش اور تین سال قید رہے، لاہور کے قلعے، حیدرآباد سندھ، مچھ اور کوئٹہ بلوچستان وغیرہ کے قید خانوں کو اُن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ قید کے دوران جو خطوط انھوں نے مجھے لکھے ان سے کچھ اقتباسات یہ ہیں جو میرے خیال میں ادیبوں اور عام قارئین دونوں کے لیے دلچسپ ہوں گے ـــــ رضیہ سجاد ظہیر)

(۱)

حیدرآباد سندھ ۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۱ء

اگر اردو ڈیپارٹمنٹ کے برسرِ اقتدار لوگ اس موضوع کو مخربِ اخلاق سمجھتے ہیں تو ڈاکٹریٹ جانے دو، اچھا مصنف اور اچھا اُستاد بننا سب سے عمدہ بات ہے، آخر گورکی اور پریم چند کون سے ڈاکٹر تھے؟ اور پھر ڈاکٹر بننے کو تو تمھارے بے شمار شاگرد موجود ہیں!

(۲)

حیدرآباد سندھ ۔ جنوری ۱۹۵۲ء

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تم میرے محبوب اُستاد ڈی۔پی۔مکرجی سے ملیں اور وہ تم کو بہت اچھے لگے ۔ عام طور پر میرے ساتھ کے لڑکے کہتے تھے کہ وہ پڑھاتے کم ہیں اور اِدھر اُدھر کی 'باتیں' زیادہ کرتے ہیں مگر مجھے ان کی یہ 'باتیں' ہی زیادہ اچھی لگتی تھیں، وہ کبھی موسیقی کی بات کرتے کبھی مارکس کی، کبھی پینٹنگ کی تو کبھی فاشزم کی، کبھی لٹریچر کی تو کبھی اقتصادیات کی اور ان سب کے درمیان اُن کا وسیع علم اور اُن کی بڑی دل کش قسم کی حُب الوطنی اور انسان دوستی جھلکتی تھی ۔ وہ ہم میں علم حاصل کرنے کا بے اختیار جذبہ اور شوق پیدا کر دیتے تھے، پھر یہ تو اپنی توفیق اور صلاحیت پر مبنی تھا کہ کون اِس جذبے سے کتنا فائدہ اُٹھاتا ہے ۔

(۳)

سنٹرل جیل ۔ حیدرآباد سندھ ۔ ۱۰ فروری ۱۹۵۲ء

تم نے جگن ناتھ آزاد کی نظم کے متعلق میری رائے پوچھی ہے تو اس کا وہ حصّہ جو فیض کے بارے میں ہے وہ تو تقریباً سب کا سب فیض کا ہی ہے ۔ تم نے پڑھی ہے نا:

ٹھہر اے دل جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

اس کا وہ بند تو کافی مشہور ہے:

ذرا صیقل تو ہولے تشنگی بادہ گساروں کی
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے

یہ نظم فیض نے نومبر ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان کانفرنس میں پڑھی تھی، شام کو مشاعرہ تھا اور مشاعرے پر مخالف گروہ کے لوگوں نے باقاعدہ حملہ کر دیا تھا، اندر مشاعرہ ہو رہا تھا اور باہر لوگوں کے سر پھوٹ رہے تھے! جب فیض نے پڑھا،

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

تب لوگوں کو اتنا جوش آیا کہ حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے، انھوں نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی ۔ دوسرے دن سارا لاہور اس نظم کو گا رہا تھا ۔ ہم بھی یہاں کبھی کبھی اس کا وِرد کیا کرتے ہیں ۔

(۴)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ۔ یکم مارچ ۱۹۵۲ء

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ صدیوں سے نوعِ انسانی طرح طرح کے مظالم مصیبتوں اور صعوبتوں کی شکار ہے، خاص طور سے وہ لوگ جو محنت کرتے ہیں اور زندگی کی تمام مادّی اور ذہنی اور روحانی اقدار کے خالق ہیں اور جن کے کندھوں پر تمدّن اور تہذیب کی ساری عمارت کا بوجھ ہے۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ہم تاریخ کے ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جب بالآخر اس ہونا کی کے صرف ختم ہونے کے ہی آثار نہیں ہیں بلکہ جگہ جگہ انصاف اور سچائی کا پرچم، آزاد اور لامحدود انسانی تخلیق اور ترقی کی راہوں پر سایہ فگن ہے۔ اب سے سو دو سو سال بعد زندگی میں کتنا زیادہ اطمینان، خوشی اور سکون ہوگا لیکن تبدیلی کی جہد اور کاوش میں خود شریک ہونا اور نئی تعمیر کی نیو رکھنا اور اس کے ابتدائی نقوش کو ابھرتے ہوئے دیکھنا، ہماری روح کو کتنا زیادہ لطیف بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، بہ نسبت اس کے جو انسان کو دورِ مستقبل میں حاصل ہوگی۔ اسی خاص قسم کی "درد انگیز" خوشی کی طرف سعدی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

زخم خونیم، اگر بہ نہ شود، بہ باشد
خرّم آں درد کہ ہر لحظہ مرا مرہم از دست

(۵)

حیدرآباد سندھ، ۷ مارچ ۱۹۵۲ء

میں نے تمھاری کہانی "ٹیپو" پڑھی۔ مجھے تمھارا یہ اسکیچ یا کہانی بہت اچھی لگی۔ البتہ اس کے خاتمے کے بارے میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ شاید افسانے کے "مورال" کو بیان کرنے کے لیے اس کی افسانویت کو کس قدر چوٹ پہنچائی گئی، کیا بہتر صورت یہ نہ ہوتی کہ ٹیپو کے متعلق جو چھوٹے بڑے واقعات ہیں، بس اُن کا ہی ذکر کر کے بات ختم کر دی جاتی؟ تاکہ اُن ہی سے مطلب و مقصد ظاہر ہو جاتا اور تشریح کی ضرورت نہ پڑتی ـــــ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ افسانوں یا خاکوں میں ہم مقصد نہ رکھیں یا مقصد کو گول کر دیں لیکن آرٹ زیادہ مؤثر اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ ہم زندگی، جذبات اور احساسات کا اصلی اور حقیقی نقشہ یوں کھینچیں کہ سچائی کی تصویر آپ سے آپ ابھر آئے اور پڑھنے والے کے لیے وہی نتیجہ نکالنا ناگزیر ہو جو آرٹسٹ چاہتا ہے، وہ اسی طرح متاثر ہو جو کہ آرٹسٹ کا مقصد ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر آرٹسٹ جس بات کو کہنا چاہتا ہے اس کے مختلف پہلوؤں اور خارجی و داخلی رشتوں سے آرٹسٹ گہری طور پر واقف نہیں یا اُن سے مفاہمت نہیں رکھتا تو وہ مندرجہ بالا نتیجہ حاصل نہیں کر سکے گا۔

(۶)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ۔ ۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء

تم نے تاباںؔ کا مجموعہ "سازِ لرزاں" جو بھیجا تھا اور اُس پر جو میں نے تنقید کی تھی، اُس تنقید کا جو سخت جواب تم نے

ہے، اُسے میں نے اور فیض نے ساتھ بیٹھ کر پڑھا اور کئی بار اس پر بحث کی۔ ہم دونوں اس مسئلے پر پہلے بھی بحث کرتے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے تمھارا کہنا کہ دانش وروں اور ادیبوں کی اہمیت کے مقابلے میں ہماری طرف سے بے توجہی ہوئی ہے اور "روحِ انسانی کے معماروں" کی مدد کرنا تو درکنار، بہت مرتبہ تو اُن سے ویسا سلوک بھی نہیں کیا گیا جیسا کہ ں سے کیا جاتا ہے۔ ہم اپنے ان معماروں سے جب یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی تعمیریں صحت بخش، روح افزا اور حسین ، ایسی ہوں کہ جن سے زندگی روشن تر اور تابناک تر ہو تو پھر ضرور ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کے لیے وہ تمام ب، وجوہ، زمین اور ماحول مہیا کریں جس سے وہ اپنی قوتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ بات صرف یہ ہے کہ جہاں ذمّے دار ں کے فرائض ہیں وہاں فن کاروں پر بھی ہیں کہ وہ بھی مسلسل اپنے اوپر تنقید کریں، اپنی خامیوں کا جائزہ لیتے رہیں اور نش کریں کہ حتی الامکان یہ خامیاں دور ہوں، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنے علم اور فن اور زندگی کے ات میں اضافے کی کوششیں کرتے رہیں، آخر ادیبوں نے تلواروں کے سائے اور قید کی زنجیروں کے ساتھ بھی بہترین ب پیدا کیا ہے۔

(۷)

ٹرل جیل، حیدرآباد سندھ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

کل رات ہمارے قید خانے میں اچھی خاصی کلچرل کانفرنس ہوئی۔ اس لیے کہ ریڈیو پر اُستاد ولایت حسین، نرائن راؤ ویاس ر استاد علاؤالدین خاں کی موسیقی سُنی۔ ولایت حسین خاں نے تو ایسا لاجواب ستار بجایا جس کی یاد اور لذّت کا احساس غالباً رہے گا۔ انھوں نے بیلو کی ٹھمری سُنائی اور اُس میں ایسے ایسے لطیف گوشے نکالے اور ایسی دل کشی پیدا کی کہ جیسے اروں طرف چاندنی ہی چاندنی کھِلی ہے، بیلے اور جوہی کے پھول کھلے ہیں اور اُن میں سے جو خوشبو آرہی ہے اُس ہی یں سے یہ نغمے پھوٹ رہے ہیں، ایسے میں تم بہت یاد آئیں اور یہ سوچا کہ اگر ہم تمھارے ساتھ اِسے سنتے تو ہماری خوشی دو بالا ہو جاتی۔

(۸)

حیدرآباد سندھ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۵۲ء

کتنی خوشی کی بات ہے کہ تم لکھنؤ یونی ورسٹی کی اکاڈمک کونسل کی ممبر منتخب ہوگئی ہو، اور تم نے پہلی میٹنگ کے تاثرات میں جو اُستادوں کی "علم دوستی" کا افسوس ناک حال لکھا ہے اُسے پڑھ کر مجھے اپنی بیرسٹری کا وہ مختصر سا زمانہ یاد آ گیا جب میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے جھنڈ میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا تھا، وہاں مشکل سے کوئی ایسا نظر آتا تھا جو علم، سیاست، تہذیب کے کسی بھی شعبے سے تھوڑا سا بھی لگاؤ رکھتا ہو ــــ عام طور پر ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے بُرائی، اپنی تعریف اور تعلّی، روپے کی لالچ، پھیکے اور گھٹیا قسم کے مذاق ــــ غرضیکہ بہرصورت اپنی جہالت کا اظہار۔ میں حیران ہوتا تھا کہ ملک

کے یہ سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا گروہ آخر کیوں اس قدر غیر دلچسپ اور اس کی حالت کیوں اتنی افسوسناک ہے۔

(۹)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ - ۲۷ اپریل ۱۹۵۲ء

بھئی کل کی شام ہمارے لیے بہت پُرلطف رہی ـــــ اتفاق سے ریڈیو پر لکھنؤ مل گیا۔ فراق، مُلّا صاحب، آزاد، عرش، بسمل، وامق، جذبی، روش، یگانہ اور نوح صاحب۔ مُلّا صاحب کے اس شعر پر تو طبیعت پھڑک گئی:

خدائے ہر دو جہاں خوب ہے تری تقسیم
زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ میخانے

وامق کا یہ شعر بہت اچھا لگا:

اُمید ہی پر جیتے رہنا، توہین ہے جینے والوں کی
اس علم و یقیں کی دُنیا میں جینے کے سہارے اور بھی ہیں

فراق کی یہ بات بہت عمدہ ہے نا:

حیاتِ نو بہ نو ہے عشق، تجدیدِ مسلسل ہے
ہوس والو محبت کی کہیں عادت نہ ہو جائے

دیکھو عرش کا یہ طنز

رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی
رہرووں کا نشاں نہیں ملتا

اور جذبی کا یہ جوشِ یقیں:

شکست و فتح نصیبوں سے اب نہیں جذبی
کہ آج ہے دلِ ہر ناتواں میں عزم و یقیں

جوش صاحب اس مشاعرے میں کیوں نہیں تھے؟ تم نے تو خط میں بھی لکھا تھا کہ وہ لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔

(۱۰)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ - ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء

ہاں، میں مہادیوی ورما سے مل چکا ہوں بلکہ ۳۶ اور ۳۷ میں جب میں الٰہ آباد میں جواہر لال جی کے ساتھ کام کرتا تھا تو اکثر مہادیوی جی سے ملاقات ہوتی تھی، وہ اُس زمانے میں کہیں پڑھاتی تھیں اور شاعری بھی کرتی تھیں، ساتھ ساتھ کچھ سیاسی کام بھی کرتی تھیں، اُن سے بڑی بحثیں رہا کرتی تھیں لیکن اب اُن بحثوں کی تفصیلات یاد نہیں، شاید دماغ پر زور

دلوں تو یاد آئیں۔ البتہ اُن کی بے ساختہ ہنسی اور اُن کی سادگی اور اُن کی انسانیت اور اخلاق کا نقش اب تک ہمارے دل پر ہے۔ اُن کی شاعری البتہ ہمارے پلّے نہیں پڑی لیکن وہ تو ہماری ہی جہالت تھی کیوں کہ اتنی ہندی ہم کو آتی ہی نہیں تھی۔

(۱۱)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ۔ ۹؍جون ۱۹۵۲ء

ادیبوں کی تنظیم کا سوال ہمیشہ سے ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ ادیبوں کے لیے وہ کون سا ماحول سب سے زیادہ سازگار ہے جس میں رہ کر وہ بہترین تخلیق کرسکیں (روٹی کا سوال ان دونوں سے الگ اور سب سوالوں کی بنیاد ہے)، وہ کون سی باتیں ہیں جن کے ذریعے ادیبوں کی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اور بہترین طریقے سے اُبھارا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ اُنھیں اپنے اردگرد کی زندگی، وطن، قوم اور اُس کے افراد اور گروہوں کی زندگی کا، زندگی کے رشتوں اور اس کے اُلجھاؤ اور تناؤ کا اندازہ اور علم ہو لیکن یہ علم بھی اُسی صورت میں صحیح اور مفید ہو سکتا ہے جب کہ ادیبوں کو نوعِ انسانی سے گہری دل چسپی اور محبت ہو اور اپنے طبقے کے غرور اور جہالت اور خود پرستی کی جگہ اُن میں یہ صلاحیت ہو کہ اُن طبقات سے عقل اور آدمیت اور تجربہ حاصل کرسکیں جو تمام اقدار کے خالق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے اکثر ادیب اُن دیواروں کو نہیں توڑ سکے ہیں جو اُن کے اور معمولی محنت کش انسانوں کے درمیان حائل ہیں۔ بہرحال اُمید کی جا سکتی ہے کہ زمانے کی گردش اور سماجی تبدیلیوں اور اپنی خامیوں کا ایماندارانہ جائزہ انھیں لامحالہ اس طرف لے جائے گا.....البتہ ہمارے یہاں بعض ایسے سخت گیر لوگ بھی ہیں (جنھیں جدید کٹھ مُلا کہہ سکتے ہیں) جو اس پر بھی ناراض ہوتے ہیں کہ ادیب اور شاعر ریستورانوں اور کافی ہاؤسوں میں "وقت ضائع" کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے چارے ادیب سے اس کا چائے کا پیالہ اور سگرٹ بھی چھین لینا چاہتے ہیں (اچھے کھانے، کپڑے اور مکان سے تو وہ ویسے بھی محروم ہی رہتا ہے) ــــ لیکن جب تک ادیب اکٹھا ہو کر باتیں نہ کریں گے، بحثیں نہ کریں گے، اعتراضات نہ کریں گے اور اس طرح وہ تھوڑا بہت "وقت ضائع" نہ کریں گے اُن کے دماغوں میں جولانی کیسے پیدا ہوگی؟ ان ہی حالات میں پڑھنے اور پھر لکھنے کا بھی مزہ آتا ہے، البتہ ایسے چالاک (میرا مطلب ہے مکّار) ادیب بھی موجود ہوتے ہیں جو اپنی ذہانت سے اپنی کم علمی کو چھپانا چاہتے ہیں اور جنھوں نے افسانہ یا شعر لکھنا اس لیے اختیار کیا ہے کہ اُن کے نزدیک ادیب کے لیے کچھ بھی پڑھنا غیر ضروری ہے مگر ادیب میں علم کی کمی کو کوئی دوسری چیز پورا نہیں کرسکتی۔ بلکہ ادیب کی تو دراصل سب سے بڑی مشکل ہی یہ ہے کہ اُسے تو تاریخ، سیاست، ادب، معاشیات، نفسیات، غرضیکہ ہر چیز کا کچھ نہ کچھ علم ہونا ضروری ہے۔

(۱۲)

سنٹرل جیل، حیدرآباد سندھ۔ ۱۵؍اگست ۱۹۵۲ء

گذشتہ ہفتے ہمارے یہاں ایک مشاعرہ ہوا، اس میں مصرع طرح تھا، میں نے بھی تفریحاً کچھ شعر کہے، تمھیں نذر

کرتے ہیں :

جب وہ اُٹھتے ہیں مٹانے خُم کا، میخانے کا نام
شورشِ مے سے چمک جاتا ہے پیمانے کا نام
کچھ تو بدنامی کا کھٹکا، کچھ گرفتاری کا ڈر
آج کل لیتے نہیں وہ اپنے دیوانے کا نام
شیخ صاحب بھی لگے آتے ہیں اُن کے ساتھ ساتھ
اور پھر حضرت کبھی لیتے نہیں جانے کا نام
انقلابِ دہر کے قدموں کی آہٹ جو سُنے
وہ ہے زندہ، ہم اُسے دیتے ہیں فرزانے کا نام
سازِ آزادی کے نغمے تیز ہوتے ہیں یہاں
کون کہتا ہے کہ یہ زنداں ہے غم خانے کا نام

(۱۳)

حیدرآباد سندھ ۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۵۲ء

بہت سے نئے لکھنے والے تو اب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کو میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ ایک حیدر آباد کی کوئی جیلانی بانو ہیں جن کے افسانے میں نے حال ہی میں پاکستان اور ہندستان دونوں جگہوں کے رسالوں میں پڑھے۔ میرے خیال میں وہ بڑی ہونہار افسانہ نگار ہیں اور جیسے افسانے وہ لکھ رہی ہیں اُن سے بھی بہت اچھے لکھ سکتی ہیں۔ اگر وہ حقیقت نگاری کے "رموز و اسرار" کو اور زیادہ اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور زیادہ محنت کریں تو صفِ اوّل میں آجائیں گی۔ یورپین ادب میں ہمارے افسانہ نگاروں کے لیے بالزاک، ٹالسٹائے اور گورکی کا بہت گہرا مطالعہ کرنا بڑا مددگار ہو سکتا ہے۔

(۱۴)

حیدرآباد سندھ ۔ ۲ر مئی ۱۹۵۳ء

فیض کو تمھارا خط مل گیا اور اب وہ مجھے اپنے شعر دینے سے انکار کر رہے ہیں، کہتے ہیں، میں براہِ راست بھیجوں گا، معرفت آپ کے کیوں بھیجوں؟" ادھر ان کی طبیعت خراب تھی، مگر اب بہتر ہو رہی تھی کہ پرسوں سے داڑھ میں درد شروع ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ بہت مضمحل ہو گئے ہیں اور ہم سے پوچھنے لگے کہ "اگر وینس یا ہیلن یکایک آپ سے ملنے آئے اور اُس وقت آپ کی داڑھ میں درد ہو تو آپ اُس صورت میں کیا کریں گے؟" —— ہم نے کہا کہ "ایسی مشکل صورت میں ہماری ساری کوشش یہ ہوگی کہ اُس کو، کم از کم ایک بار، اور کسی دوسری تاریخ پر، جب دانت میں درد نہ ہو، آنے کے لیے راضی کیا جائے" —— خیر، انھوں نے دو غزلیں شروع کر رکھی ہیں اور دو دو شعر کے دو قطعے بھی کہے ہیں —— ان ہی میں سے غالباً تم کو خود کچھ بھیجیں گے۔

(۱۵)

ڈسٹرکٹ جیل، مچھ، بلوچستان۔ ۷ جون ۱۹۵۴ء

نجمہ نے اب کے مجھے جو خط لکھا ہے اُس میں اپنی پوزیشن نہیں لکھی۔ شاید زیادہ اونچی نہیں آئی ہے اسی لیے۔ تم اُس سے کہنا کہ مجھے پوزیشن وغیرہ کی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ پاس البتہ ہو جانا چاہیے تاکہ سال خراب نہ ہو۔ ورنہ تو وہ ہو نہی ہیں۔ ہم دونوں یونیورسٹیوں سے (لکھنؤ اور آکسفورڈ) ڈگریاں لینے اور بیرسٹری پاس کر لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سکولوں اور کالجوں میں جو پڑھائی ہوتی ہے وہ فی الحقیقت زیادہ تر تضیعِ اوقات ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ کے لوگوں اور استادوں وغیرہ سے ملنا جلنا اور سوشل طور طریقے و آداب البتہ آجاتے ہیں، ورنہ اصل علم تو وہ ہوتا ہے جو انسان "مدرسوں" سے باہر، اپنے طور سے پڑھتا لکھتا ہے اور زندگی سے سیکھتا ہے۔

(۱۶)

مچھ۔ بلوچستان۔ ۱۹۵۴ء

ارے لو، وہ سب سے خوشی کی بات تو کہنا بھول ہی گئے، یعنی وہ حافظ والا "مضمون" ایک چھوٹی سی "کتاب" بن گیا! تو اب گویا میرے جیل کے پروگرام کے مطابق جو میں نے اُس دن بنایا تھا جس دن مجھے چار سال کی سزا کا حکم سُنایا گیا تھا، کہ تین کتابیں لکھوں گا، دو کتابیں مکمل ہو گئی ہیں۔ اِس کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ خامیاں نہ ہوں جو مجھے خود اکثر نقادوں کی تحریروں میں نظر آتی ہیں ـــ اوّل تو یہ کہ تنقید میں ادب کی چاشنی ہو، جسے پڑھ کر لوگوں کو حظ آئے، وہ محض تشریح نہ ہو بلکہ بجائے خود ایک تحریرِ لطیف بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ اُس میں زیرِ نظر شاعر کا محض "سماجی پس منظر" نہ ہو جیسے کہ "فلاں شاعر جاگیرداری دور کے انحطاط کی پیداوار تھا" (یہ "پیداوار" بھی کیسا بھونڈا لفظ ہے جب کہ اسے ادبی تخلیق کے سلسلے میں استعمال کیا جائے!) ـــ تیسرے یہ بات دکھائی جائے کہ اس کے کلام میں خوبی یا تاثر (یا خرابی اور بے کیفی اور سپاٹ پن) کیوں ہے، اس میں حسن و لطافت کے کون سے پہلو ہیں وغیرہ ـــ چوتھے یہ کہ ماضی کے ادبِ عالیہ کا جائزہ لیتے وقت محض چند عام فقروں کا لگے بندھے جملوں کا استعمال کر کے بات ختم نہ کی جائے۔ مثلاً یہ کہ اُس میں "انسان دوستی" کے عناصر پائے جاتے ہیں، بلکہ یہ دکھایا جائے (ٹھوس طریقے سے) کہ اس کے کلام کا وہ کون سا حصہ ہے اور کون سی باتیں ہیں جن کے ذریعے اُس شاعر نے انسان کی انسانیت، اس کی تہذیبِ نفس اور اُس کے انبساطِ حیات میں اضافہ کیا ہے اور جو اب بھی ہمیشہ کے لیے قابلِ قدر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

(۱۷)

کوئٹہ، بلوچستان، ۱ نومبر ۱۹۵۴ء

کل شُبِ اتفاق سے ریڈیو پر ایک مشاعرہ سُنا۔۔۔ جوش صاحب اور ہمارے بعض قدیم شعرا آخر جوانی اور اُس کی والہانہ

سرخوشیوں کے گزرنے کا اتنا ماتم کیوں کرتے ہیں ؟ ہر چیز گزراں ہے اور بدلتی ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ ایک خاص عمراور ایک خاص حالت کے گزر جانے کے بعد انسان کی زندگی "خالی" ہو جائے ـــــ نئی قسم اور نئے طور کی مسرتیں اور آسودگیاں پہلی، کسی قدر ناتراشیدہ اور جبلی آسودگیوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔ کلیوں کی شگفتگی اور پھولوں کی بے ساختہ ہنسی دل آویز ہے تو ثمر بار شاخوں کی لچک اور رسیدہ میووں کی چاشنی، رس اور اُن کی مہک بھی دلنواز اور حیات آفریں ہے، گزشتہ سرور کی یاد اپنے ساتھ غمگینی بھی لاتی ہے لیکن اگر یہ غمگینی موجودہ کیفیتوں کو کجلا دے تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی روانی اور دوانی کی رفتار دھیمی ہے اور اگر اس کا دھیما ہونا فطرت کا تقاضا ہے تو تشنہ بھی، اور تہی جامی تو اس کا تقاضا نہیں ـــــ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ اشجار ایسے ہیں جن میں کلیاں اور پھول تو لگے تھے مگر پھل نہیں لگے اور اُن کی خزاں محروم ثمر رہ گئی۔

فیض احمد فیض کے خطوط ایلس کے نام

(اقتباسات)

حیدرآباد جیل، کراچی جیل اور منٹگمری جیل

(۱)

جون ۱۹۵۲ء

گرمی کی ایک لہر گزر چکی ہے اور پچھلے تین چار دن سے موسم خاصا گوارا ہے۔ آج کل رات کو چاند نکلتا ہے جب جیل کی دیواریں دھو جاتی ہیں میرے برآمدے کے فرش پر چاندنی کی لہروں میں ریشمی سائے لہراتے ہیں اور درختوں اور ہوا کی سرسراہٹ سے کوہساروں میں بہتے ہوئے ندی نالوں کا نغمہ ذہن میں آتا ہے۔ کل کافی رات گئے میں اپنے بستر پر بیٹھا کشمیر اور شملے کی باتیں یاد کر رہا تھا اور دل کسی صورت یہ ماننے پر راضی نہ تھا کہ جیل خانہ ہے اور جوانی کے دن نہ جانے کب کے بیت چکے۔ غالباً کوئی ایسا ہی خیال اکبر خاں[1] کے دل سے گزرا اور وہ میرے پلنگ پہ آ کے بیٹھ گئے۔

"کیا اس پل زندگی بہت خوبصورت نہیں ہے؟" اکبر خاں نے پوچھا۔

"ہاں ہے" میں نے جواب دیا۔

پھر دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ یہ حسن جسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طرازی اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکارا کرنے کے لیے کیسے عجیب و غریب لمحے اور کیسے عجیب و غریب مقامات انتخاب کرتی ہے۔ بعینہ ہمارے قدیمی محلوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔ اور شاید اسی وجہ سے اس حسن سے لَو لگائے رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گذشتہ بار اپنی نظمیں تمھیں براہِ راست نہیں بھیجیں، آیندہ ایسا ہی کروں گا...... [2] کے بارے میں تمھاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں جنھیں پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ان پر فوری طور سے سفید و سیاہ کا حکم لگا دینا ٹھیک نہیں۔ ان ہی صاحب کی مثال لے لو۔ وہ جیسے ہیں، ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک زمانے میں بہت سے اچھے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کروانے اور انھیں روزی بہم پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا اور جب ان سے بہتر لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ گئے تھے تو یہ اپنے ساتھ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں ان کا تجارتی مفاد بھی تھا اور بعض اوقات انھوں نے لوگوں کی احتیاج سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے اور اس سے تصویر کے دوسرے رُخ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے حق و ناحق کے Down Right فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن تمھیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو

---

[1] سابق میجر جنرل [2] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

بھی برداشت کر لینا چاہیے جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکی۔

(۲)

۸ رفروری ۱۹۵۳ء

ایک اور ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور یہاں ہوا کے بوجھل پن میں اور دھوپ کی تیزی میں موسمِ گرما کی تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔ گرما کو انگریزی میں summer کہتے ہیں اور بہار کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری گرمیوں کو بہار کا موسم کہنا بالکل مضحکہ خیز بات ہے اور اس موسم کے خاتمے کو خزاں کہنا بھی بے تکا پن ہے۔ اصل میں بہار اور خزاں تو جذباتی اور رمزیہ الفاظ ہیں جن کا گرمی سردی سے بہت کم تعلق ہے۔ ان کا مفہوم تو ہے ستمِ روزگار اور اس سے نجات، دردوغم کی ابتدا اور اس کا خاتمہ، دل جلانے کے دن اور پیار کرنے کے دن، سختی برداشت کرنے کا عزم اور سکھ کا سانس، آسایش، خوش حالی اور افلاس و محرومی۔ ہمارے ہاں تو بہار کا ایسا کوئی موسم نہیں آتا۔ صرف گرمی سردی کا موسم آتا ہے۔ پھر مختلف لوگوں کے لیے موسمِ گرما کا پیغام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ موسم قریب آئے گا تو تم اس کی آمد پر ہراساں ہوگی لیکن میں اس کا خوشنودی خاطر سے انتظار کر رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں موسم کی ہر تبدیلی خوش آئند ہوتی ہے۔ کبھی کبھار کسی عزیز چہرے کے دیدار کے سوا یہاں کی زندگی میں یہی واحد تبدیلی ہے جسے ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ موسم تبدیل ہوتا ہے تو اور بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ زمین اور آسمان اور پیڑوں کی رنگت بدل جاتی ہے، رات کو سونے کی جگہ، پڑھنے، گپ کرنے اور سونے جاگنے کے اوقات، زندگی کا روز مرّہ معمول اور سوچ اور احساس کا پیرایہ سب کچھ بدل جاتا ہے اور اگر کسبِ لطف اور حیرتِ نگاہ کی حس باقی ہو تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور بہت اچھا لگتا ہے، دل کو فرحت ہوتی ہے۔

جیل خانے میں آدمی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے، میں ان لذتوں کا ذکر کیے جا رہا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تنہا محنت کش عورتوں کے لیے اور ہم ایسے تنگ دستوں کے بچوں کے لیے اس موسم کے کیا معنی ہیں اور ان لوگوں کے لیے کیا معنی ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تنہا اور محتاج ہیں؟ اپنی مصیبت میں ان کی مصیبت شامل ہے۔ اپنی تنہائی کے ساتھ ان کی تنہائی بھی لگی رہتی ہے اور دنیا بھر کی دکھی ماؤں کا دکھ اور سب فرقت زدہ بیویوں اور محبوباؤں کا درد اور سب بچوں کے آنسو جنھیں ظالم ہاتھ ان کے اپنوں کے پاس جانے سے روکتے ہیں۔ لیکن ان کے درد کے ساتھ ان کی ہمت اور ان کا تحمل بھی اپنے ساتھ لگا رہتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی تلافی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے دل ٹھوکر نہیں کھاتا۔

تم اس بات سے رنجیدہ ہو کہ کسی نے تمھیں لارڈ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے جرائم کا طعنہ دیا، یہ واقعی بہت تکلیف دہ اور دل دکھانے والی بات ہے لیکن قومی منافرت کا خاصا ہے کہ وہ ہر شے پر محیط ہوتی ہے اور کوئی بھی شکار ہاتھ آجائے خواہ وہ کیسا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو، اسے ایذا پہنچانے سے نہیں چوکتی۔ اسی لیے ایسی منافرت اور تعصبات سے جنگ و پیکار ضروری ہے۔ اسی سبب سے ہم نفرت اور تنگ نظری کے خلاف انسان دوستی اور اخوت کی عالمگیر جدوجہد میں شامل ہیں۔ جہاں تک طعنہ زنی اور تہمت تراشی کا سوال ہے میرے اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو گذشتہ واقعات کے بعد مجھے ایک خونخوار طالع آزما سمجھتے ہوں گے۔ ایسے الزامات پر مجھے اکثر ہنسی آتی ہے۔ یہ

ے ہوئے کہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں ان کی نظر میں یہ تہمتیں بالکل بے معنی ہیں اور جو ناواقف ہیں ان کی رائے بالکل بے وقعت
یہی بات تمھارے بارے میں بھی صحیح ہے۔ "جو لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں[1]" ان کے بارے میں وہی رویہ اختیار
چاہیے جو حضرت مسیح کا تھا۔ صرف اخلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عملی مصلحت کی خاطر۔ یوں نہ کرو تو اپنا سکون و اطمینان
، بہتان طرازوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور دنیا میں ایسے افراد کبھی کم نہیں ہوتے۔"

تمھارے خط میں یہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی کہ کسی نے ہمیں ہیرو کہا ہے۔ جیسا تم جانتی ہو "ہیروپن" بالکل ہماری
ن نہیں ہے۔ اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو بہادری کا ایک بھی ایسا کارنامہ نظر نہیں آتا جو ہم نے سر انجام دیا
۔ بلکہ ہم نے تو کبھی اس کی کوشش ہی نہیں کی اور آج کل جو یہ شہرت یا عظمت مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے اس میں
ی اپنا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو یقیناً یہ نہیں چاہا تھا۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی بات کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ
پنے مسلک پر ثابت قدم رہیں۔ اپنی ذاتی نیک نیتی برقرار رکھیں اور کسی لالچ میں آکر اپنی دیانت کا سودا نہ کریں۔ لیکن یہ ایک
صفت تو ان گنت ہزاروں لاکھوں میں ہم سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ اس لیے کہ عوام کی اکثریت دیانت دار ہے۔ چنانچہ یہ
وئی ایسی خوبی نہیں جسے کوئی اپنے سے مخصوص کر سکے۔

(۳)

۱۲ر فروری ۱۹۵۴ء

معلوم ہوتا ہے یہ مہینہ بہت جلد گزر گیا۔ شاید موسم کی وجہ سے یا تمھارے آنے کی وجہ سے یا کتابوں کی وجہ سے۔
میں نے ساری کتابیں کھول کر نہیں دیکھی ہیں تاکہ لطف باقی رہے۔ ٹرنر کی ہسٹری آف کورٹ شپ پہلے شروع کی ہے، یہ چٹخارے
کی چیز ہے کہ اسے آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں تاکہ جلد ختم نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ میں نے فلسفے کا مطالعہ بھی شروع کر دیا
ہے اور اگر ذہن مصفّا اور تیار ہو تو فلسفہ بھی ایسے ہی مزے کی چیز ہے۔ لیکن جیل میں دماغ زیادہ دیر تک حاضر نہیں رہتا۔
لاہور کے بجلی گھر کی طرح روشنی کبھی جلتی ہے کبھی گل ہو جاتی ہے لیکن جب تک جلتی ہے زندگی یکایک پُرلطف معلوم
ہوتی ہے۔

موسم وقت سے پہلے گرم ہو چلا ہے اور دھوپ میں بیٹھا نہیں جاتا لیکن اب سائے میں بیٹھ کر یا بستر پر لیٹ کر
پڑھ سکتے ہیں جو اچھا لگتا ہے۔ پھر بہت سے پھول بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پھول انسانوں کا بدل تو نہیں لیکن پھر
بھی حسین چیز ہیں جو کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ البتہ ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی اُن سے بیزار ہونے لگتا ہے جیسے ہر
بے مقصد حسن سے اُکتاہٹ ہونے لگتی ہے (شاعر کیٹس[2] کچھ ہی کہے) حُسن سے صحیح راحت بھی بہم پہنچتی ہے جب وہ خلاق ہو
یعنی وہ اپنے وجود سے دیکھنے والے کے جذبے یا خیال یا عمل میں مزید حُسن کا اضافہ کرے۔ ایک یونانی گلدان[3] جو کسی نظم کا موضوع
پیدا نہ کرے اپنے حسن کے باوجود ایک ٹھیکرا ہے مٹی کا، خیر یہ اتنی سیدھی بات تو نہیں ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں لیکن

۱؎ انجیل مقدس کا اقتباس۔
۲؎ کیٹس کا مشہور مصرع ہے: "حقیقت حُسن ہے اور حُسن حقیقت"۔
۳؎ کیٹس کی شہرہ آفاق نظم Ode To A Grecian urn یونانی گلدان پر ہے۔

بنیادی طور پر ایسا ہی ہے۔

(۴)

۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء[1]

تو ایک طرح سے ہم دوبارہ گھر لوٹ آئے۔ دراصل یہ جگہ واقعی کچھ کچھ گھر معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ہر چیز سے پرانی جان پہچان، دلجمعی اور سکونِ خاطر بہم پہنچتی ہے چنانچہ ہماری واپسی پر باورچی، دھوبی، خدمت گار، سب لوگ خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیل کے اندر باہر سب چیزیں، برتن، دیواریں اور دریچے کی سلاخوں میں بنے ہوئے پھول پتے بطریق آشنائی سلام کہہ رہے ہیں اور اب ہم دوبارہ چین سے بیٹھ کر غالب کے ہم زبان ہو کر کہہ سکتے ہیں:

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہاں تک کا سفر بھی کافی خوش گوار تھا۔ یعنی پولیس کی بند گاڑی میں جس حد تک کوئی سفر خوش گوار ہو سکتا ہے۔ آہنی جالی کی باریک درازوں سے کبھی لدے پھندے کھیتوں کا منظر دیکھنے میں آتا کبھی کوئی رواں رواں کرتا ہوا رہٹ نظر پڑتا اور کبھی کسی شوخ رنگ لال نیلی دیہاتی قبا کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ لیکن یہ نظارہ کرنا ایسا محنت طلب تھا کہ گردن اینٹھ جانے کا ڈر ہوتا تھا۔

لاہور کا قیام کافی بدمزہ تھا۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بہرحال ایک مہینہ اور کٹ گیا اور ہم چند بار مل بھی لیے اس لیے کوئی محل شکایت نہیں۔

(۵)

۲۲ مئی ۱۹۵۴ء

یہاں اب اتنی گرمی ہے کہ خدا کی پناہ۔ لیکن میں کچھ زیادہ بے آرام نہیں ہوں، ناشتہ کرتے ہی میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں جو خان عبدالغفار خاں کی مہربانی سے کافی ٹھنڈا ہے۔ (ہمارے یہاں آنے سے پہلے خان عبدالغفار خاں نظربند تھے) اور جب ہمارے صحن میں سائے ڈھلنے لگتے ہیں تو باہر نکلتا ہوں۔ اس دوران میں کچھ پڑھتا لکھتا رہتا ہوں۔ اگرچہ اب بینائی ویسی اچھی نہیں۔ نظر تھک جاتی ہے تو رکنا پڑتا ہے جس سے مزے میں فرق آتا ہے لیکن خیر کام چل جاتا ہے۔ میں نے روزن برگ[2] جوڑے کے خطوط ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ اگرچہ بار بار دل زیادہ بھر آیا تو کتاب ہاتھ سے رکھنی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے الفاظ کا سوز اور ان کی عظمت اسی ادیب کو نصیب ہو سکتی ہے جس کی مرگ و حیات ایسی ہی

---

[1] مارچ میں طبی معائنے کی غرض سے فیض کو لاہور لے جایا گیا تھا۔ منٹگمری واپس آنے کے بعد یہ خط لکھا۔

[2] امریکن انقلابی کارکن جنھیں صدر ٹرومین کے عہد میں جاسوسی کے جھوٹے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔

دردانگیز ہو۔ ان کا اور ان کے بچوں کا خیال آتا ہے تو اپنی مصیبت کی بات کرنا (اگرچہ یہ مصیبت بھی کچھ کم نہیں) پن معلوم ہوتا ہے۔

آج کل میں فریزر کی کتاب زرّیں شاخ (Golden Bough) پڑھ رہا ہوں۔ طالب علمی کے دنوں میں سرسری نظر بھی تھی اور کبھی فراغت سے پڑھنے کو ایک زمانے سے جی چاہتا تھا۔ (اس نوع کی فہرست میں ابھی یہ کتابیں باقی پولاک ایلس اور رچرڈ برٹن کی تصنیفات۔ رادھا کرشنن کی تاریخ فلسفۂ ہند اور کنفیوشس۔ دوستوں کے کتب خانوں میں ان کی تلاش رکھو) میں ختم کرلوں تو فریزر کی کتاب تمہیں بھی پڑھنی چاہیئے۔ یہ کتاب ذہنی تعلیم کے لوازمات میں سے ہے۔ خاص طور سے ہمارے ملک میں۔

شاعری کا یہ حال ہے کہ دل میں بہت کچھ ہے، کاغذ پہ بہت کم۔ جیل کے موضوعات ختم ہو چکے ہیں اور جیل خانے سے کسی نئی کی توقع بیکار ہے۔ جیل سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اشاعت کے لیے کچھ لکھ نہیں سکتے۔ لیکن یہ ثابت نے کے لیے کہ ہم بالکل بیکار بھی نہیں بیٹھے ہیں، دو مختصر نظمیں بھیجتا ہوں۔ ایک لاہور جیل کا تاثر ہے¹ اور دوسری روزن برگ کے سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے²۔ ان میں کوئی ایسی کمال کی بات نہیں لیکن شاید ڈیگر کو ترجمے کے لیے پسند آئیں۔ مقامی اخبارات میں کی صورت نظر آئی³ دل خوش ہوا۔ نہ جانے شہرت حاصل کرنے کے لیے میزی کیا کرے گی لیکن کچھ نہ کچھ تو وہ بھی کرے گی ہی اور بس پتہ بھی نہیں چلے گا کہ خانۂ ہمہ آفتاب کس دن سے ہوگیا۔

(۶)

۱۷ مئی ۱۹۵۳ء

ایک مہینہ اور بیت گیا اور مدّتِ فراق اتنے دن اور مختصر ہوگئی۔ مدّتِ عمر میں اتنے ہی دن کم ہوگئے لیکن اس کی پروا کون رتا ہے۔ دنوں اور لمحوں کا حساب تو صرف رنج و محرومی کے زمانے میں کیا جاتا ہے۔ خوشی اور آسودگی کے لمحات کا شمار کون کرتا ہے۔ بھی تو ہر لمحہ دیروز و فردا سے بے نیاز اور اپنی جگہ سالم اور ثابت ہوتا ہے۔ جب یہ بھیانک خواب ختم ہوگا اور زندگی نئے سرے سے شروع ہوگی تو اپنے ساتھ بھی یوں ہی ہوگا، جب تن و جاں کے کٹے ہوئے رگ و ریشے دوبارہ جڑ جائیں گے اور زخم بھر جائیں گے تو ن کا داغ بھی باقی نہیں رہے گا۔

لکھنے کی کوئی خاص بات نہیں سوائے ان باتوں کے جو لکھ نہیں سکتے۔ گرمی کی وجہ سے انسان، حیوان، دل و دماغ ہر چیز ساکن اور بے حرکت ہے۔ صرف راتوں کا سونا اور صبح کا جاگنا ہے اور باقی اللہ ہو۔ خیر بالکل ایسا بھی نہیں۔ اب بھی کوئی نہ کوئی پھول کھلتا ہے اور سورج کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ صبح چند لمحوں کے لیے کوئی پرندہ چہچہاتا ہے اور دل میں کہیں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے جیسے کوئی خواب میں کروٹ لے رہا ہو۔ تھوڑے دنوں کے بعد جادو ٹوٹ جائے گا۔ سب نفستے کے ماتے چہروں پر برسات کا پانی برسے گا اور جذبہ و خیال گرما کی بے ہوشی سے دوبارہ بیدار ہوں گے۔ چند روز یا چند ہفتے اور پھر ہم گرمی کے اس آخری اور منحوس موسم سے گزر چکے ہوں گے اور پھر یہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

---

¹ اے روشنیوں کے شہر۔ ² ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ³ جھیبی کو بچوں کے ایک بین الاقوامی تصویری مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔

اور تمھیں معلوم ہے کل ہم نے روزہ رکھا تھا یعنی سچ مچ کا روزہ شروع سے آخر تک۔ اگلے خط کی باری آنے تک عید آکر گزر چکی ہوگی۔ اس لیے تمھیں اور بچّوں کو اس دن کے لیے پیار۔

(۷)

۲۱ر جولائی ۱۹۵۴ء

تمھارے شاعر نے لکھا تھا "نومبر کے مہینے میں جون کا سا کچھ سماں ہوگا جیسے تم کہیں قریب سے گزرے ہو" اور یہاں جولائی کے مہینے میں نومبر کا سا سماں ہے۔ ہر چیز کی صورت بدل گئی ہے۔ آسمان دُھلا دُھلایا اور شفاف نظر آتا ہے۔ گھاس سر سبز اور کچھ سیاہی مائل نظر آتی ہے۔ ہوا اور دھوپ میں پیار کی سی نرمی اور غروبِ آفتاب کا منظر زرق برق دکھائی دیتا ہے۔ ایسے موسم میں عمرِ عزیز کے زیاں پر دل اُداس ہونے لگتا ہے لیکن اس کا شکر ادا کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ہم اسے ضائع ہوتے ہوئے دیکھنے کو زندہ موجود ہیں۔ میں ایلیٹ کی نظم پڑھ رہا ہوں۔ وقت جو قاتل ہے، وقت جو پالنہار ہے۔ بہت خوبصورت نظم ہے۔ اگرچہ اس سے ایلیٹ جو نتائج اخذ کرتے ہیں بالکل بے سر و پا ہیں۔ مثلاً یہ عمدہ مصرعے سنو:۔

Between Midnight And Dawn,
Whem The past is All Deception,
The Future, Futureless,
Before Morning Watch,
When The Time Stops,
And Time is Never Ending.......

شاید یہ بات بھی کچھ بوگس ہے لیکن اس قدر اثر آفریں۔

گذشتہ ہفتے اسحاق کے لیے آموں کا ایک پارسل آیا تھا جو اتنا بڑا تھا کہ ہم آج صبح تک ختم نہیں کر سکے اور آج صبح کچھ اور آم پہنچ گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ میاں اپنے نیک بندوں سے غافل نہیں ہیں اور زندگی کی نعمتیں یہاں بھی میسّر آجاتی ہیں۔

میں یہ لکھنا بھول گیا تھا کہ تمھاری اماں کا ایک خط آیا تھا۔ جب تم انھیں جواب دو تو میرا پیار لکھ بھیجنا۔ اور یہ فرمایش کر دینا کہ جب کرسمس کے تحفے کا وقت آئے تو مجھے کچھ بڑھیا قسم کے سگریٹ بھجوا دیں۔ ہم یہاں اچھے سگریٹ کا ذائقہ بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ جیل میں دل کتنا حریص ہوجاتا ہے۔

(۸)

۲۷ر جولائی ۱۹۵۴ء

کچھ انتظار کے بعد گذشتہ ہفتے تمھارے تین خط یکبارگی آگئے۔ چنانچہ دل خوش اور مطمئن ہے۔ خاص طور سے تمھارے آخری خط سے گھر کی بہت یاد آئی لیکن افسردگی سے نہیں بلکہ خوش دلی سے۔ وہ اس خیال سے کہ اس سفر کے خاتمے پر کتنی خوش آئند چیزیں اپنی منتظر ہیں۔ جب وہ وقت آئے گا ہم ایک بھرپور محفل نہیں بلکہ کئی محفلیں سجائیں گے۔ البتہ گانے والیوں کے متعلق شاید ہم میں اختلاف رائے ہو۔ اس سے آسکر وائلڈ کا مشہور مقولہ یاد آگیا کہ لالچ (Temptation) پر قابو پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ آدمی لالچ میں آجائے۔ یہ مقولہ دراصل آسکر وائلڈ کا نہیں ہے بلکہ چاسر کا ہے اور آسکر وائلڈ صاحب نے اعتراف کے بغیر اُڑا لیا ہے۔ اگر پھر کوئی تمھارے سامنے دہرائے تو اس تصحیح سے تم اپنی علمیت جتا سکتی ہو۔ آم اور تمباکو کا ایک ٹن مل گیا ہے۔ آم اتنے میٹھے تھے کہ ہم ایک ہی دن میں چٹ کر گئے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ ایک دردناک واقعے کے سبب شاید انھیں حلق سے اتارنا مشکل ہو جاتا۔ جیل میں آنے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ اسیری کوئی شجاعانہ اور بلند مرتبہ بات ہے۔ اب پتہ چلا کہ اس میں نہ شجاعت کا کوئی مضمون ہے نہ عالی حوصلگی کا۔ اس میں صرف درد ہے اور ناقابلِ بیان درد۔ اس درد کا صحیح احساس مجھے ایک گرفتار شکاری پرندے سے ہوا جس کی کچھ دنوں سے ہم دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا ایک شکرہ ہے جو کچھ دن پہلے ہمارے غسل خانے میں آپہنچا اور ہمارے خدمت گار قیدی نے پکڑ لیا۔ سدھانے کے خیال سے اس قیدی نے اس کی ٹانگ میں رسی باندھ کے ایک ٹوکرے کے اندر بند کر دیا۔ لیکن اسی شام وہ کسی طرح اس ٹوکرے سے نکل گیا اور اُڑ کر ہمارے صحن کے ایک درخت پر جا بیٹھا۔ اس کی رسی شاخوں میں اُلجھ گئی۔ وہ بے چارہ تمام رات پھڑپھڑاتا رہا۔ اور ہم اس کی گلوگیر فریاد سنتے رہے۔ اگلی صبح ہم نے اسے نیچے اتار لیا لیکن اس کی ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھیں۔ اب نہ وہ لڑ سکتا ہے، نہ شکار کر سکتا ہے۔ بے کسی کے عالم میں صحن میں دبکا بیٹھا تھا۔ ایک دن پہلے اس کی آواز سے جن کوؤں چڑیوں اور میناؤں کی جان خطا ہوتی تھی، اب وہی پرے باندھ کر اس کے آس پاس جمع ہوتے ہیں اور بیک آواز اس کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تذلیل پر شکرے کی مغرور چمک دار آنکھیں درد سے دُھندلا جاتی ہیں۔ پرندے رو تو نہیں سکتے لیکن اس بیچارے کی بے بسی دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ ہم اسے اچھی طرح کھلاتے پلاتے ہیں۔ لیکن غالباً دو چار دن میں وہ مر جائے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نظامِ فطرت میں بے زبان مخلوق کی بے بسی کا علاج یہی ہے۔ فطرت میں ان کے درد کا دار و مدار موت ہے۔ یہ صرف انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنا درد اور اپنے زخم دل میں لیے جیے جائے۔ سالہا سال، نسل در نسل، قرن در قرن۔ کیوں کہ اس کے درد کا علاج مرنے سے نہیں جینے ہی سے ہوتا ہے۔ اس کے مسائل موت سے نہیں زندگی سے حل ہوتے ہیں۔ اسی خاطر اسے وہ ایمان اور نظر بخشی گئی ہے جو اس کی ذات سے پرے اور اس کے عہد سے آگے دیکھ سکتی ہے اسی سہارے پر وہ دُکھ اٹھائے جاتا ہے اور امید کیے جاتا ہے۔ اس دن کی امید جو شاید اسے کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ دن جب سارے غم مٹ جائیں گے، سب درد تھم جائے گا۔ جب رونے کے بجائے ہنسنا ہوگا۔ اور سب آنسو خشک ہو جائیں گے۔ ان گنت صدیوں کے بعد انسان نے ہاتھ پاؤں سے کام لینا سیکھا۔ انگلی صدیوں میں بولنا اور سوچنا سیکھا اور شاید اب وہ وقت قریب آرہا ہے جب وہ خوش رہنا بھی سیکھ لے گا۔ لو یہ تو تقریباً لکچر ہو گیا۔ ہماری اسکول ماسٹری کی رگ کبھی کبھی یونہی پھڑکنے لگتی ہے۔

(۹)

۲۰ اگست ۱۹۵۴ء

ایک مہینہ اور گزر چکا اور اس کے بعد جو بھی مہینہ گزرے گا اپنی وضع کا آخری مہینہ ہوگا اور جب لوٹ کر آئے گا تو مختلف برکہیں گوارا صورت میں آئے گا۔ چنانچہ اب ہر ماہ اپنے آپ سے یہ کہنا کیسا اچھا لگے گا کہ اگست گیا، ستمبر گیا، اکتوبر۔۔۔۔۔ اور س دن میں جب تمہاری چھٹی شروع ہو جائے گی تو یہ گرمیوں کا موسم بھی بدل چکا ہوگا اور پھر سردیوں میں دن چھوٹے ہو جائیں گے اور جلد گزرنے لگیں گے۔

خرگوش کے لیے یزو کی فرمائش سن کر ہنسی بھی آئی، دل بھی خوش ہوا۔ جب تک دنیا میں ایسی باتیں موجود ہیں، اپنی حاضری ہی میں سہی، کوئی ناخوش کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن تم لوگ خرگوشوں کا خاندان کیسے سنبھالو گے۔ شاید بہتر ہوگا کہ ان کا ہن طوطوں سے تبادلہ کر لو جو تم نے لکھا ہے کہ کوئی دوست مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ پرندے پسند ہیں لیکن میں قیدخانے ں مزید قیدیوں کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس بارے میں مجھے قاعدہ قانون بھی نہیں معلوم۔

مرزا ادیب نے لکھا ہے کہ انھیں کسی زیر طبع کتاب کے سلسلے میں میری تصویر اور سوانح عمری درکار ہے۔ اگر پہلے سے م ہوتا کہ ہمیں شہرت ملنے والی ہے تو بہت سی تصویریں اتروا کر رکھ لیتے۔ افسوس! اور سوانح عمری یہ ہے۔ پیدائش سیالکوٹ ۱۹۱۱ء اور عربی میں ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر اور شمس العلماء سید میر حسن صاحب کی مساجد میں حاصل کی۔ اس کے مد گورنمنٹ کالج لاہور (ایم۔اے انگریزی ۱۹۳۳ء) اور اورنٹیل کالج (ایم۔اے عربی ۱۹۳۴ء) ملازمت ایم۔اے۔او کالج رت سر ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء۔ ہیلی کالج، لاہور، ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء (اسی زمانے میں ادب لطیف کی ادارت کی) فوج (مئی ۴۲ء دسمبر ۱۹۴۷ء مستعفی ہو کر پاکستان ٹائمز کی ادارت شروع کی۔ مزدور تنظیموں اور صحافی تنظیموں میں کام کیا۔ تصنیفات دو مجموعے[1] ۱۹۴۱ء نقشِ فریادی۔ ۱۹۵۳ء دستِ صبا) متفرق تنقیدی مضامین، نشری تقاریر، ریڈیو ڈرامے وغیرہ۔ شادی شدہ۔ بہت ریٹ پیتے ہیں۔ (آج کل نہیں) اور اس سے بھی زیادہ تضیع اوقات کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ ہے۔

آج کل ہر طرف سے آموں کی بارش ہو رہی ہے، کاش کہ کسی بہتر شے کے لیے دعا کی ہوتی۔

(۱۰)

اگست ۱۹۵۴ء

جیل میں جو بہت سی عیدیں آئیں اور گزر گئیں، ان میں یہ عید غالباً سب سے زیادہ ویران تھی۔ بالکل بے رنگ اڑ دن تھا جس نے کوئی یاد یا آرزو بھی بیدار نہ کی۔ میں نے قیدیوں کی جماعت کے ساتھ نماز ضرور ادا کی (اور یہ کیسا دلدوز ر ہوتا ہے)۔ لیکن اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف ڈان کو لکز وٹ پڑھتا رہا اور اب کے[2] نخو یا نتزا پر بھی ہنسی نہیں ۔ خیر ہٹاؤ۔ اگلے ہفتے تم آؤ گی تو ہم جھوٹ موٹ تہوار کا کچھ سماں پیدا کر لیں گے۔

---

(۱) اب کلام کے مجموعوں کی تعداد پانچ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ "میزان" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۲) ناول کا مزاحیہ کردار۔

تمھاری تکالیف کا بہت رنج ہے۔ لیکن اب تھوڑی دیر اور صبر کرو۔ اگلے ہفتے تمھاری چھٹی شروع ہو جائے گی اور پھر اگلے سال تک تمھیں یومِ آزادی منانے کا دردِ سر نہ ہوگا۔ نہ گرمیوں کے بُرے دن گزارنے پڑیں گے۔ اگلے سال جب گرمیوں کا موسم آئے گا تو "چمگادڑ رات" پرواز کر چکی ہوگی۔ ٹینی سن یاد ہے؟

Come into the Garden, Maud
For the Black Bat Night has flown

لیکن آخر ماڈ کیوں؟ بہت فضول اور نیم شاعرانہ نام ہے۔

فلم کے بارے میں کتابیں نہیں مل سکیں تو کوئی بات نہیں لیکن اب کے فیروز سنز کی دکان پر جاؤ تو دیکھنا کہ ڈرائنگ اور مصوری پر کوئی کتابیں آئی ہیں کہ نہیں۔ اور ہومیوپیتھک طب پر کوئی ابتدائی کتاب ہے کہ نہیں۔ دراصل یہ محض ہوس کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ خواہ ہم یہ کتابیں پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

(۱۱)

۲۵ اگست ۱۹۵۵ء

آج خنک ہوادار دن ہے۔ رات ٹھنڈی تھی۔ ہوا میں پھر بہار کی سی کیفیت ہے۔ شاید تم کہو گی کہ بہار کے بجائے خزاں کہنا چاہیے لیکن ہمارے ہاں تو صحیح معنوں میں خزاں ہوتی ہے نہ بہار۔ یہ تصورات تو اصل میں سرد ملکوں کے ہیں جو بہار اور خزاں کے الفاظ بھی ہمارے دیس کے نہیں۔ پٹھانوں اور مغلوں کے وسیلے سے افغانستان اور وسطِ ایشیا سے آئے ہیں۔ ان حضرات کے وارد ہونے سے پہلے ہمارے شعرا تو صرف برکھا رُت جانتے تھے۔ جب کوئل کوکتی ہے، آم کے پیڑوں پر بجلی کڑکتی ہے اور کوندا لپکتا ہے، پھر اس زمانے میں ہمارے ہاں نہ گلاب تھا نہ نرگس نہ بلبل نہ خوبانی نہ انار، صرف کوئل تھی اور تلسی اور مولسری اور صندل۔ اس اعتبار سے ہمارے شعرا کو اب تک کارنیشن اور کوکا کولا اور ٹنسیل کا تذکرہ شروع کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اب ہمارے شاعر کو وہ مراعات حاصل نہیں جو پہلے تھیں اور تعیش کا نیا ساز و سامان اسے شاید ہی کبھی میسّر آتا ہے۔

میں یہ سننے کے لیے منتظر ہوں کہ چھوٹی والی[1] کی سال گرہ کیسے گزری اور اسے میرا تار ملا یا نہیں۔ ایسے دنوں پر اپنی غیر حاضری کا رنج ہے لیکن اگر ایسے دن میں بچوں کا دل کچھ خوش ہو گیا تو اپنی خوشی یا ناخوشی کوئی ایسی بات نہیں۔ مستقبل میں کافی وقت رکھا ہے۔ جب ماضی میں جو کچھ کھویا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ یہ شاید کچھ احمقانہ سی بات ہے اس لیے کہ مستقبل کو ماضی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا لیکن کہنے سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں شاید ذہنی راحت اور طمانیت نصیب ہو تاکہ ماضی کی محرومیوں کا درد تاسف دل سے محو ہو جائے۔ اگر آدمی اپنے حال سے خوش ہو تو وہ ماضی کی جانب بہت کم نظر کرتا ہے اور ماضی میں جو کچھ بھی جھیلا ہو اسے فراموش کر دیتا ہے۔ نوازش[2] کی وفات کا سُن کر قلق ہوا۔ صرف اتنی خبر سننے میں آئی کہ موٹر کا حادثہ ہو گیا تھا۔ تفصیلات کا پتہ نہیں چلا۔ ان کے بھائی کو میری دلی تعزیت

---

[1] میزی۔ [2] صاحبزادہ نوازش علی جنھوں نے فیض کی طرف سے وکالت کی۔

ہنچا دینا - میں نے خبر سنتے ہی ان کے گھر زبانی پیغام بھجوایا تھا لیکن ممکن ہے انھیں نہ مل سکا ہو۔

اب موسم ذرا بہتر ہوا ہے تو میں نے دوبارہ کام شروع کر دیا ہے۔ ابسن کے ڈرامے Pillars of The Comm-unity کا نصف کے قریب ترجمہ کر چکا ہوں - لیکن یہ اُردو زبان ہے بہت دردِ سر۔ پہلے ہی لفظ کیمونٹی پر بات اٹکی ہوئی ہے۔ یعنی ہی شہر یا محلے میں رہنے والے لوگوں کا گروہ - مہربانی سے حسرت[1] یا امتیاز[2] یا خواجہ منظور[3] سے پوچھ کر لکھو کہ کون سا لفظ زوں ہے - مجھے عربی فارسی کا کوئی عالمانہ لفظ نہیں چاہیے - وہ تو میں خود بھی تلاش کر سکتا ہوں - کوئی روزمرہ عام بول چال لفظ چاہیئے - چند الفاظ اور بھی پوچھنے کے ہیں لیکن وہ پھر کبھی سہی۔

(۱۲)

۱ دسمبر ۱۹۵۴ء

نئے سال کی شام

ابھی شام نہیں ہوئی ہے صرف نصف صبح گزری ہے - چند گھنٹے اور باقی ہیں اور پھر یہ برس بھی ہمارے گرد آلود روز میں مل کر خاک ہو جائے گا۔ شاید اسی وجہ سے اس دن کے لیے کوئی جذبہ دل میں محسوس نہیں ہوتا' نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جادۂ وقت میں یہ دن کوئی اہم سنگِ میل ہے' یہ دن ویسا ہی ہے جیسے جیل خانے کے باقی دن ہیں جس سے صرف نا اندازہ ہوتا ہے کہ پیمانۂ عمر میں بے رونقی کی ایک درجہ اور نیچے اتر آئی ہے' جب سائے ڈھلنے لگیں گے تو شاید تاثر بدل جائے اور اس دن کی کچھ اس طرح شناخت ہو سکے کہ یہ آخری درد کے آخری سال کا آخری دن ہے (آخری اس لیے کہ ہر خوشی کی طرح ہر درد بھی اپنی جگہ آخری ہوتا ہے جو گزر جائے تو کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔ پھر یہ درد صرف میں واپس آ سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر درد کی یاد سے کچھ محسوس ہو جیسے یہ ضروری نہیں کہ جو بھی خوشی کی جائے اس سے راحت پہنچے) اور پھر دل اس یقین سے خورسند ہوگا کہ کل بیدار ہوں گے تو ایک نئے سال کا نیا طلوع ہو چکا ہوگا۔ جس سال کے دوران میں امید ہے کہ زندگی جدوجہد کی جانب اور دل و دماغ کسی بامقصد عمل کی طرف ع کر سکیں گے۔

تو آؤ دعا کریں کہ یہ نیا سال اور اس کے بعد آنے والا ہر سال ہمارے لیے ہمارے بچوں کے لیے اور ساری نیت کے لیے امن و مسرت کا پیغام لائے اور عہدِ ماضی کا بھی شکر ادا کریں، ان سب نعمتوں کے لیے جو ہمارے حصے ئیں اور جو کچھ چھن گیا یا جس سے محروم رہے اس سے درگزر کریں اس لیے کہ یہ درد و محرومی برداشت کرنے کی سکت ہمیں میسر تھی۔

کیا میں کسی پادری صاحب کی سی گفتگو کر رہا ہوں ؟ لیکن اس دن کچھ دین دار اور کچھ جذباتی محسوس کرنا قدرتی ہے۔

کتابوں کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جو کتاب آسانی سے دستیاب نہ ہو سکے یا بہت قیمتی ہو اس کے لیے تردد

---

[1] چراغ حسن حسرت [2] امتیاز علی تاج [3] سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور۔

کی ضرورت نہیں، میں تو یونہی بے قاعدگی سے پڑھتا رہتا ہوں اور جو کتاب بھی ہاتھ آجائے غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ دراصل بے کار لوگوں کا دماغ تو کچھ الٹا چھوکری کا سا ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے لالچ لپکے بھرے رہتے ہیں اور ہر چیز جو ہاتھ آسکے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے زیادہ بگاڑنا نہیں چاہیے۔ آسکر وائلڈ کی کتاب کا وہی نام ہے جو تم نے لکھا ہے یعنی House of Promegranates۔ لندن یونیورسٹی کا کوئی پرانا کیلنڈر مل سکے تو اس سے بھی کام چل جائے گا اور عربی لغت کی کچھ ایسی جلدی نہیں۔

(۱۴)

۸ جنوری ۱۹۵۵ء

کل صبح جب میں اپنی سالگرہ[1] کے دن بیدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ یہ بے رنگ ابر آلود دن بھی ایسے ہی کسی ہنگامے یا قابلِ ذکر بات کے بغیر گزر جائے گا۔

لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ بسم اللہ یوں ہوئی کہ ابھی میں بستر ہی میں تھا کہ اسحاق نے بہت سے گلاب کے پھول لا کر ڈھیر کر دیے۔ بستر سے اٹھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سورج چمک رہا ہے اور آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہیں ہے پھر ہم ناشتے پر بیٹھے تو تمہارا تار آ گیا۔ گیارہ بجے کے قریب کافی کے لیے صحن میں گئے تو تمہارا تحفہ موصول ہوا (لیکن ہم اسے کریں گے کیا؟ ایسے خوبصورت کاغذ پر کچھ لکھنا تو ظلم ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اسے دیکھ کر عروسِ سخن جو بہت دن سے غائب ہے، لوٹ آئے) کوئی ایک گھنٹے کے بعد دفتر سے پیغام آیا کہ کچھ کھانے کی چیزیں آئی ہیں۔ دیکھا تو ایک پوری فوج کا پیٹ بھرنے کو کافی تھا۔ جیل میں ایک خرابی یہ ہے کہ نہ کوئی ضیافت کر سکتے ہیں نہ مہمان بلا سکتے ہیں اور ہم تین نفر اس دسترخوانِ نعمت سے کیسے نپٹ سکتے تھے۔ خیر جتنا کھا سکے کھایا۔ میرے دونوں ساتھیوں کا شکریہ قبول کرو۔ خوب سیر ہو کر ہم دھوپ میں گھاس پر لیٹ گئے اب کچھ ہونے کا نہیں۔ اتنے میں جمپا کا بہت دوستانہ تار آ گیا۔ اسے میرا پیار پہنچا دینا۔ ہم خود تو لکھ نہیں سکتے۔ غرض کہ بہت بھرا اور مسرت بھرا دن تھا جس میں کبھی کبھی یاد اور اداسی کا سایہ بھی دل پر پڑتا رہا ہے لیکن بس یوں ہی تھوڑی سی دیر کے لیے

میں آج کل گوگل کے افسانوں سے دل بہلا رہا ہوں۔ پرانے زمانے کے عربوں سے بھی تجدیدِ ملاقات ہو گئی ہے اور اس میں کافی لطف آ رہا ہے۔ مثلاً یہ قصہ سنو۔

ایک بار اموی سپہ سالار مہلب نے خارجی باغیوں کے خلاف لشکر کشی کی۔ ان دنوں عرب میں دو شاعروں کا چرچا تھا اور ان کی ہجویں اور قصیدے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ ایک کا نام جریر تھا دوسرے کا فرزدق۔ دونوں میں سخت رقابت تھی اور دونوں کے بہت سے طرفدار تھے۔ ایک شام مہلب نے دیکھا کہ اس کی چھاؤنی میں بہت شور شرابہ ہو رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں بغاوت ہونے والی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ ان دو شعرا کے دو قصائد پر بحث ہو رہی ہے۔ فریقین نے مہلب سے کہا کہ آپ فیصلہ دیجیے ان میں کون بہتر ہے اور ہمیں آپ کا کہا تسلیم۔ مہلب نے کہا میں ان دو کتوں کے بارے میں ہرگز کوئی فیصلہ نہیں دوں گا۔ جس کے خا

---

[1] میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں تاریخ پیدائش ۷ جنوری ۱۹۱۱ء لکھی ہے اور جب تک صحیح تاریخ کا علم نہیں ہوا تھا اس وقت تک فیض کی سالگرہ ۷ جنوری منائی جاتی تھی۔ بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ صحیح تاریخ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء ہے۔

فیصلہ ہوگا وہ اپنی بجوؤں میں مجھے نوچ کر کھا جائے گا۔ یہ بات تم ان جنونی لوگوں سے پوچھو جن سے تم لڑنے جا رہے ہو۔ کیونکہ ان کو دونوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔ خیر صبح ہوئی اور دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ اموی فوج سے ایک بہادر نکلا اور جیسا کہ دستور تھا اس نے صفِ اعدا میں سے کسی کو مقابلے کے لیے للکارا۔ ادھر سے ایک خارجی جوان نکلا۔ اموی نے کہا۔ دیکھو ہمیں لڑنا تو بہرحال ہے لیکن لڑائی سے پہلے ایک سوال کا جواب دو۔ خارجی نے کہا سوال کرو۔ لیکن شتابی کرو۔ اُموی نے کہا اچھا تو بتاؤ ان دو قصائد میں کون سا بہتر ہے۔ خارجی بولا لعنت ہے تمھاری صورت پر۔ تم لڑنے آئے ہو یا مشاعرہ کرنے؟ ہم لوگ صرف قرآن اور احکامِ رسولؐ جانتے ہیں۔ ہمیں ان جہنمی قصیدوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن پہلا عرب ضد کرتا رہا کہ بھئی بتا دو نا۔ آخر خارجی نے کہا اچھا تو پھر میری رائے میں جریر کا قصیدہ بہتر ہے۔ اُموی سپاہی بھی اتفاق سے جریر کا طرفدار تھا۔ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا بھئی ذرا دم لو، میں اپنے ساتھیوں کو بتا آؤں اگر میں مارا گیا تو انھیں کیسے پتہ چلے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے لشکر کی طرف بھاگا انھیں خارجی کا فیصلہ سنایا اور واپس آکر لڑنے لگا۔

اچھی کہانی ہے کہ نہیں؟

(۱۴)

۲۷ جنوری ۱۹۵۵ء

منٹو کی وفات کا سُن کر بہت دُکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آئے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف، فرائڈ اور موپاساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مُباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفا جنھیں دورِ حاضر کے فن کار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی، غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ایسے ہی کیٹس نے اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی۔ موزارٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتے بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فن کار وں کا حصہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانت دار، بہت ہُنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمھارے راستے ہی میں ہے۔ گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا دینا۔

(۱۵)

۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء

آج پیر ہے۔ دو دن پہلے جو خط لکھا تھا نہ جانے تم تک پہنچا کہ نہیں۔ کاش میں تمھاری پریشانی کا بوجھ کم کرنے کے

لیے کچھ کر سکتا لیکن سوائے پیار بھیجنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا اور پیار میں شب و روز ارسال کرتا رہتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ انصاف اور نیکی دنیا میں پلٹ آئیں اور دکھی دلوں کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچائیں۔ جب تک صبر کرو میری جان اور زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل لیکن تمھارے وکلا بہت اچھے ہیں اور جو وہ مشورے دیں اس پر عمل کرو۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نظمیں

نثار میں تری گلیوں پہ

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کہ دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہیں
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انھیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دُنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی، بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمھاری عزت کا
وہ جس سے تمھارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو

پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن میں بلاوے آتے ہیں

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو ودع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا دردِ فراقِ رخِ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بے زار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جناتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن،
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو مری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سُلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے

یہیں پہ غم کے شرار کِھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دُکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اُس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو سب سے عظیم تر ہے

(منٹگمری جیل، ۱۰ر اکتوبر ـ ۳ر نومبر ۱۹۵۲ء)

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(منٹگمری جیل - ۱۵ مئی ۱۹۵۴ء)

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

(منٹگمری جیل - دسمبر ۱۹۵۴ء)

سردار جعفری کے خطوط سُلطانہ کے نام

(اقتباسات)

آرتھر روڈ جیل بمبئی ــــــــ سنٹرل جیل ناسک

۱۲ راپریل ۱۹۴۹ء

(۱)

جیل کے بھیانک اور بدصورت ماحول میں صرف تمہاری یاد ہی ایک حسین چیز ہے جو میرے پاس ہے ۔ تمہاری یاد اور اُس آنے والے بچے کا خوبصورت تصور جو ہماری محبت کی یادگار ہوگا جسے زندگی دینے کے لیے ہم نے اپنی بہترین تمنائیں صرف کی ہیں ۔ میں تو اسے دیکھنے کے لیے آنے والا تھا لیکن مجھے اس خوشی سے محروم کر دیا گیا ہے اور اب میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کی شکل کیسی ہوگی ۔ اس کی مسکراہٹ کیسی ہوگی ۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کس طرح جنبش کریں گے ۔ اس کی نرم و نازک آنکھوں میں کیسی چمک ہوگی اور جب تم اسے جھک کر پیار کروگی تو تم کتنی حسین معلوم ہوگی ۔ یہاں میں آزاد نہیں ہوں لیکن میرا تخیل آزاد ہے اور وہ جیل کے باہر چلا جاتا ہے اور تمھارے گرد منڈلاتا رہتا ہے ۔ اس وقت میری روح ، میرا دل تمہارے پاس ہے اور ہمیشہ تمہارے ہی پاس رہے گا۔

اب تک ہم نے پیار اور محبت کی جتنی باتیں کی ہیں ، میرے اور تمہارے سوا اُن کا سننے والا اور کوئی نہیں تھا کیوں کہ یہ لمحے صرف اپنے ہوتے ہیں ۔ ان میں کوئی اور شریک ہی نہیں ہو سکتا لیکن آج میرے اور تمہارے درمیان صرف جیل کی دیواریں اور سیکڑوں میل کا فاصلہ ہی نہیں ہے بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو میرے اور تمہارے خطوں کو پڑھیں گے ۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ ہے اور اس خیال کے آتے ہی قلم رُک جاتا ہے اور دل اپنی باتیں چھپا لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ محبت کی پاکیزگی اور پیار کی نزاکت اور لطافت اسے برداشت نہیں کر سکتی ۔ میاں اور بیوی کے خطوط انتہائی معصوم ہوتے ہیں ۔ ان کی معصومیت ذرا سے میں زخمی ہو جاتی ہے لیکن آج جب ساری انسانیت کے روح اور دل زخمی ہیں ہماری محبت بھی زخمی ہو گئی ہے اور ہمیں یہ زخم کسی نہ کسی طرح برداشت کرنا پڑیں گے خواہ اس میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو ۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کس جُرم میں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا ہے لیکن اب سوچتا ہوں کہ یہ جرم ہی کیا کم ہے کہ میں محبت کو پاکیزہ اور پیار کو لطیف چیز سمجھتا ہوں اور انسانیت کے روح اور دل کے زخمی ہونے پر ماتم کر رہا ہوں ۔ اس سماج میں جس میں ہم رہ رہے ہیں انسانیت کے بارے میں کچھ سوچنا بھی گناہ ہے اور اس گناہ کی سزا یہی ہے کہ ہماری زندگی قید خانے کی نذر کر دی جاتے ۔ ہم سے پہلے دنیا کے ہزاروں ادیبوں اور شاعروں کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں ۔ اس لیے ہم اس سے کیسے بچ سکتے ہیں ۔ سی آئی ڈی کے جس انسپکٹر نے مجھے گرفتار کیا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ حکومت آپ کو خطرناک سمجھتی ہے والٹیر اور روسو کی طرح ' اور میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی حکومت مجھے اور دوسرے ترقی پسند مصنفین کو اتنا بڑا درجہ دینا چاہتی ہے کہ ہمیں

والٹیر اور روسو کی صف میں کھڑا کر دے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری شاعری اور مضامین کا وہ اثر ہو سکتا ہے جو والٹیر اور روسو کی تحریروں کا ہوا تھا۔ میں تو کبھی اتنی بڑی بات اپنے لیے سوچ نہیں سکتا۔ اگر حکومت مجھے اتنا بڑا ادیب اور شاعر سمجھتی ہے تو مجھے اور تمہیں اس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

ہمیں اس لیے بھی حکومت کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ وہ مجھے آرام پہنچا رہی ہے تاکہ تھکے ہوئے دل و دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے دنیا کے کئی شاہکار جیلوں میں لکھے گئے ہیں۔ میں اگر یہاں زیادہ دن رہا تو میں بھی بہت کچھ لکھوں گا جو بہت دنوں سے لکھنا چاہتا ہوں لیکن باہر اتنی فرصت نہیں تھی جتنی یہاں ہے اس لیے باوجود اس کے کہ جیل میں وقت ضائع ہونے کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے میں حکومت اور پولس کا بے انتہا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے جیل کی تنہائی اور فرصت عطا کی ہے۔ حکومت کی ادب نوازی اور تہذیب نوازی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ساغر نظامی کے ایشیا میں ہماری حکومتوں کے وزیروں کے پیغامات شائع ہوتے ہیں جن میں وہ ادب اور تہذیب کی ترقی کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تلقین صرف زبانی نہیں ہوتی بلکہ عمل بھی اس پر کیا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ شاعروں اور ادیبوں کو جیلوں میں آرام اور فرصت مہیا کر دو تاکہ وہ اپنے شاہکار لکھیں تاکہ وہ ایسے ادب کو جنم دیں جس سے ہندوستان مالا مال ہو جائے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اپنی نئی کتاب کانگریسی حکومت کے نام Dedicate کروں گا کیوں کہ یہ کتاب ان کی عنایتوں کا نتیجہ ہوگی۔

مَیں پرسوں یہاں آیا ہوں اور دو ہی دن میں جیل مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگی ہے۔ میرے پاس ایک الگ کمرہ ہے جہاں رات کے آٹھ بجے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ یہاں کوئی مجھے پریشان کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی میرا وقت ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ مَیں ہوں، میری میز اور کرسی ہے، میری کتابیں ہیں اور میری دوست سیمنٹ کی دیواریں اور لوہے کی سلاخیں ہیں جو چوبیس گھنٹے میری حفاظت کرتی رہتی ہیں۔

مَیں بہت اطمینان اور آرام سے ہوں صرف تمہاری طرف سے فکرمند اور پریشان ہوں۔ ویسے تو میرا خیال تھا کہ میں تمہیں علی گڑھ سے جا کر لے آؤں گا لیکن اب مَیں سمجھتا ہوں کہ تمہیں بچہ ہونے کے بعد ایک مہینے تک وہاں آرام کرنا چاہیے۔ اس کے بعد آخر مئی تک بمبئی آنا۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہوگی اس کے لیے مَیں انتظام کر رہا ہوں۔ مَیں نے پچھلے مہینے اپنی نئی کتاب کا تین سو روپیہ لے کر ڈھائی سو روپیہ تمہیں بھیجا تھا۔ مَیں اپنے پبلشر کو لکھ رہا ہوں کہ وہ تمہیں مئی کے مہینے میں دو ڈھائی سو روپیہ اور بھیج دیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری ملازمت باقی رہے گی یا نہیں۔ اس صورت میں مَیں اپنے کسی دوست سے کہوں گا کہ وہ تمہارے لیے روپیہ کا انتظام کر دے۔

مجھے یقین ہے کہ تم میری طرف سے بالکل پریشان نہیں ہوگی۔ مَیں تمہیں ہر ہفتے دو خط لکھتا رہوں گا تم بھی مجھے ہفتے میں دو خط لکھا کرو تاکہ مَیں تمہیں اپنے قریب محسوس کر سکوں۔ جیل کی زندگی میں خطوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان سے یہاں کی بے کیفی دور ہو جاتی ہے۔ خط پا کر اتنی خوشی کبھی نہیں ہوتی جتنی جیل میں۔ میری طرف سے اپنے آپ کو پیار کر لو۔

۱۰ر جولائی ۱۹۴۹ء

(۲)

پچھلے ہفتے ایک تو میں تمہارا خط نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھا۔ اتنے میں بلرام پور سے آپا کے انتقال کی خبر آگئی۔ آپا سے مجھے بے حد محبت تھی کیونکہ انھوں نے مجھے پالا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس کا ہے کہ میں آپا کو آخر وقت دیکھ نہیں سکا۔ ــــــــــــــــ ــــــــــــــــ اگر مَیں باہر ہوتا اور آپا کو دیکھ لیتا تب بھی اتنا ہی غم ہوتا لیکن وہ کڑھن اور گھٹن نہ پیدا ہوتی جو جیل میں رہنے کی وجہ سے مجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔ آج کل مجھے ہر وقت آپا یاد آتی رہتی ہیں۔ میری نظروں میں ان کی وہ تصویر پھرا کرتی ہے جب میں نے

[illegible]

فلسفے کے باوجود میں اپنے آپ کو زندگی کے اس پہلو سے مانوس نہیں کرسکا ہوں جسے موت کہتے ہیں لیکن موت کے سامنے انسان اتنا بے بس ہے کہ مجبوراً اسے یہ تلخی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ وقت آہستہ آہستہ اس غم کو دھو دیتا ہے۔ پھر یاد باقی رہ جاتی ہے۔ تلخی ختم ہو جاتی ہے بہرحال میں پریشان نہیں ہوں تھوڑا سا غمگین اور افسردہ ہوں۔ اس غم اور افسردگی کو دور کرنے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔

تم میرے پاس ہوتیں تو میں جلد اپنے آپ کو Adjust کر لیتا۔ اچھا ——— اب تم کب آرہی ہو۔ ریزرویشن ہوا یا نہیں میں اب تمہارے آنے کا ایک ایک دن گن رہا ہوں۔ جب سے پپو کی تصویر آئی ہے وہ میری میز پر رکھی رہتی ہے اور دلچسپ چیز یہ ہے کہ اب پپو بھی تمہارے ساتھ میرے خوابوں میں آنے لگے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ پپو نے مسکرانا شروع کیا یا نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب تم آؤگی تو ایک گھنٹے میں میں تم سے باتیں کروں گا یا پپو سے کھیلوں گا۔ اس کا فیصلہ اسی وقت ہوگا۔

(۳)

پہلی اگست ۱۹۴۹ء

تمہارا عید کے دن کا لکھا ہوا خط کل ملا۔ حافظے پر بہت زور ڈالا لیکن یاد ہی نہیں آتا کہ پچھلے سال عید کے دن ہم نے کیا کیا تھا۔ شاید سیدین صاحب کے گھر گئے تھے یا عصمت کے گھر۔ بالکل یاد نہیں آرہا ہے لیکن عید کے دن میں یہاں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ تم کیا کر رہی ہوگی۔ تم دن بھر گھر پر پڑی رہیں یہ بہت برا کیا۔ تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ اس سے وقت آسانی کے ساتھ اور اچھا کٹ جاتا ہے۔ پھر تمہارے پاس تو ایک کھلونا بھی موجود ہے۔ پپو کی پرورش اور تربیت سے تمہیں اداس ہونے کی فرصت نہیں ملنی چاہیے۔ وہ تمہیں خوش رکھنے کے لیے روز نئی نئی ادائیں سیکھیں گے۔ نئی نئی حرکتیں کریں گے ؎

اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی باہیں اٹھا کر
ڈال دے گا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم بوسے
گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں
اور جب اپنے ہونٹوں سے وہ پوپلے پوپلے پیے گا تیرا دودھ، تو نو مہینے کی
کاری مشقت کی ساری تھکن تری رگ رگ سے
کھنچ آئے گی، اور تجھے اپنی بھرپور اٹھتی جوانی کا
احساس ہوگا
جب وہ سوتے میں دیکھے گا پریوں کے خواب اور آہستہ سے زیرِ لب
مسکرائے گا تو تجھ کو معلوم ہوگا کہ ان ننھے معصوم
ہونٹوں میں دُنیا کے سارے خزانے سمٹ آئے ہیں
پھر وہ جب گھٹنیوں چلنا سیکھے گا، اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے لفظ تتلا کے بولے گا
تو تجھ کو محسوس ہوگا کہ تخلیق کا رقص و نغمہ سمٹ کر تری
گود میں آگیا ہے ———

میں ماں نہیں ہوں پھر بھی ان مسرتوں میں کھو جاتا ہوں۔ تم تو ماں ہو۔ اب تم پر ایک پابندی یہ عائد کی جائے گی کہ ہر خط میں تمہیں یہ لکھنا پڑے گا کہ میں خوش ہوں۔ تم یہ نہیں لکھوگی تو مجھے شکایت پیدا ہوگی اور اس کا مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولوگی۔

(۴)

۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء

کل شام کو تمہارا خط ملا۔ جب سے اخبار میں بمبئی کی طوفانی بارش کی خبر پڑھی تھی تمہارے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ ناسک میں بھی خوب بارش ہوئی۔ یہاں کی تتلیاں اور پروانے بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ ان کے پروں کے رنگ اور نقش و نگار بہت ہی نازک ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی میں دیواروں اور میز پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے ریشمی جسم اور پَر چاندی اور سونے کی طرح جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ مَیں نے کئی تتلیاں تمہارے لیے پکڑ کر رکھی ہیں۔ دیکھنا وہ کتنی حسین ہیں۔ ایک تتلی کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ مَیں رات کو بستر پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی آئی اور بجلی کے قمقمے کے گرد چکر لگانے لگی۔ اس کا بدن سُرخ تھا اور پَر کالے جن پر سنہری نقش تھے۔ وہ اڑتے وقت زیادہ خوب صورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر ایک سگریٹ کی ڈبیا میں بند کر لیا۔ صبح اسے دیکھنے کے لیے ڈبیا کھولی تو وہ پھر سے اُڑ گئی۔ لیکن جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی بہت سی چڑیاں اس کی طرف لپکیں۔ وہ چڑیوں کو کئی غوطے دے کر زمین پر بیٹھ گئی اتنے میں ایک کوّا آیا اور اسے اپنی چونچ میں دبا کر اُڑ گیا۔ میں کئی رات سے انتظار کر رہا ہوں لیکن ویسی تتلی پھر نہیں آئی۔

یہاں اب بارش بند ہو گئی ہے لیکن فضا ابھی ابر آلود ہے۔ بمبئی کا کیا حال ہے۔ اب تو نارمل ہو گیا ہوگا۔

مَیں نے تمہیں پچھلے دونوں خطوں میں بہت سی چیزیں لانے کے لیے لکھا ہے۔ وہ خط تمہیں نہیں ملے ہیں تو تم وہ چیزیں نہیں لا سکو گی۔ میں نے تمہیں کرشن، عصمت، اشک، بیدی، منٹو اور قاسمی کے افسانوں کی کتابیں لانے کے لیے لکھا تھا۔ کچھ تو میرے گھر پر ہیں کچھ عصمت کے یہاں مل جائیں گی۔ کچھ کیفی تلاش کر کے لا دیں گے۔ مستری سے دریافت کر کے Aeschylus + Athena بھی لیتی آنا۔ لاہوتی کا فارسی دیوان بھی گھر پر ہے۔ باقی فہرست اگر خط مل جائیں تو ان میں دیکھ لینا۔ ورنہ جب آؤ گی تو بتا دوں گا۔ کتابوں کے علاوہ بستر کی ایک چادر، میرا ایک اُوَر، اور ایک چھوٹی قینچی (بال کاٹنے کی) لیتی آنا۔ اور ایک فروٹ سالٹ کی شیشی اور ایک خالی بکس اور میری رضائی اگر تم اسے استعمال نہ کر رہی ہو۔

(۵)

۶ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

تم ہوا کے جھونکے کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ ملاقات خواب کی طرح ختم ہو جاتی ہے اور صرف اس کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا اور کچھ نہیں کر سکا۔ سب بھول گیا۔ تم نے بھی باتیں بہت کم کیں۔ تم نے مجھے گڈو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اپنے کام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کافی پریشان اور کھوئی ہوئی رہتی ہو۔ اس کا اندازہ تمہاری خاموشی سے بھی ہوا اور ان چیزوں سے بھی جو تم میرے لیے لے کے آئی تھیں۔ میرا پل اُوَر کیڑے نے کاٹ دیا ہے اور اس کا ایک ٹانکا بھی کھُل گیا ہے۔ اسے تم نے دیکھا نہیں ورنہ ٹھیک کر دیتیں۔ جو اہم کتابیں مَیں نے مانگی تھیں وہ تم نہیں لائیں اور جو کتابیں لائی ہو ان میں ایک کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ ایک رسالے کی دو کاپیاں ہیں۔ دو رسالے ۱۹۶۸ء کے ہیں۔ اب کی بار تمہارے چہرے پر بھی ایک پیلا پن تھا۔ تم اتنی کھوئی کھوئی رہو گی تو تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ افسردگی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ تمہارے کام کی زیادتی ایسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ اس کے بارے میں تو تم مجھے لکھ بھی چکی ہو کہ تمہیں بالکل فرصت نہیں ملتی اور شام کو جب دفتر سے واپس آتی ہو تو بہت تھک جاتی ہو۔ پھر بھی تمہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔

ہم پرسوں جو یونانی آرٹ کی بات کر رہے تھے اس سلسلہ میں اقتباس یہ ہے :

A man can not become a child again unless he becomes childish. But does he not enjoy theartless ways of the child and must he not strive to reproduce its truth on a higher plane? Is not the character of every epoch revived perfectly true to nature in child nature? Why should the social childhood of mankind, where it had obtained its most beautiful development not exert on eternal charm as an age that will never return.

یونانی آرٹ میں انسان کے بچپن کی سادگی اور حسن ہے - اس حسن کو اس کے بچپن سے الگ نہیں کیا جا سکتا - اس سے یہ نتیجہ نہیں بالکل سکتا کہ اس کا مفہوم " ابدی حسن[1] " ہے - یہ تصور سائنٹیفک تعلیم کے برعکس ہے - اگر ابدی حسن کوئی چیز ہے تو " ابدی حقیقت " اور " ابدی صداقت " بھی لازم آتی ہے اور ابدی صداقت اور ابدی حقیقت کا تصور سیدھی سادی Idealism ہے اور کچھ بھی نہیں - اس Idealism کی بنیاد یہ ہے کہ یونانی آرٹ کے موضوع (Content) اور ہیئت (Form) کو الگ الگ کر دیا گیا ہے - حالانکہ Content اور Form الگ الگ نہیں کیے جا سکتے - Form بغیر Content کے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا اور Content بغیر Form کے ظاہر نہیں ہو سکتا - بغیر لفظوں کے ہم سوچ نہیں سکتے " اور معنی کے بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا نہیں ہو سکتا - پھر وہ جانور کی آواز ہوگا - انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہوگا -

آج ہم یونانی آرٹ ، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے مجسموں یا یونانی شاعری سے اس لیے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ان میں انسانی شعور کے بچپن کے حسن کا اظہار ہے - یہ حسن آج پیدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس حسن کے پیدا کرنے کے لیے وہی موضوع (Content) ضروری ہے جو یونان کے آرٹ میں ہے - اس Content کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطرت کے عمل کو نہیں سمجھتا اس لیے ہر چیز کو انسانی خصوصیات عطا کر کے دیوتا اور دیوی بنا دیتا ہے - بچے بھی یہی کرتے ہیں - وہ اپنی گڑیوں کو کھانا کھلاتے ہیں ، نہلاتے ہیں ، کپڑے پہنانے ہیں اور سلاتے ہیں اور گڑیوں کی ابتدا یونان کے اسی دور میں جادو سے ہوئی ہے - آج اگر کوئی بڑا آدمی (مثلاً تم یا ہیں) گڑیوں سے بچوں کی طرح کھیلنے لگے تو لوگ اسے بے وقوف کہیں گے - حالانکہ جب بچے گڑیوں سے کھیلتے ہیں تو وہ ہمیں بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہم بھی ان کی طرح گڑیوں سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کھیل سکتے کیونکہ ہم اب بچے نہیں ہیں - یونان میں جس زمانے میں اس کا کلاسیکی آرٹ پیدا ہوا تو بچوں کے بجائے بوڑھی عورتیں گڑیوں سے کھیلتی تھیں - یہ گڑیاں بھی دیویوں اور دیوتاؤں کی شکلیں تھیں جن کے ذریعے جوان ہونے والی لڑکیوں کو زندگی کے اسرار و رموز سمجھائے جاتے تھے اور پھر وہ ان گڑیوں کے گرد ناچتی تھیں اور بڑے خوب صورت گیت گاتی تھیں - یہ ایک طرح کا جادو کا عمل تھا جسے انسان کے ذہنی بچپن نے ایجاد کیا تھا - آج ہم اس ذہنی بچپن کی طرف واپس نہیں جا سکتے - آج جادو کی جگہ سائنس نے لے لی ہے اور اس لیے وہ حسن بھی نہیں پیدا کر سکتے جو یونان کے آرٹ میں ہے ، جو ہندوستان کے ویدوں اور اجنتا کی تصویروں اور ایلورا کے پتھر کے بتوں میں ہے - اجنتا کی تصویروں میں صرف تین چار رنگ استعمال کیے گئے ہیں - آج ہم درجنوں رنگوں سے واقف ہیں - اجنتا کی تصویروں کے لیے نیلا رنگ پہاڑوں کے پتھروں سے نکالا جاتا تھا اور زرد رنگ ہارسنگھار کے پھولوں سے - گوتم بدھ کے پرستار بھکشو ان رنگوں کے نکالنے میں کتنی محنت کرتے تھے - آج

---

[1] ابد کا تصور ازل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا اور ازلی اور ابدی وہ ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا - اور یونانی آرٹ کو ادنیٰ ابدی صداقت اور حقیقت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا -

بھی اجنتا میں ہارسنگھار کے بے شمار درخت ہیں - ہمارے گھروں کی لڑکیاں ہارسنگھار کے پھولوں سے دوپٹے رنگتی ہیں - یہ سب بڑی حسین چیزیں ہیں لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ بمبئی کے آرٹ اسکول کے طالب علم بھی ہارسنگھار کے پھولوں سے رنگ حاصل کرکے تصویریں بنائیں تو وہ آدمی یا تو بے وقوف ہوگا یا پاگل -

پپو کو بہت سا پیار ——— اور تمہارے لیے ہزاروں بوسے -

(۶)

۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۹ء

ادھر ایک رسالے میں اُردو ادب پر ایک طویل مضمون پڑھا جو بانی کا لکھا ہوا ہے - اس میں سرسید احمد خاں اور حالی کے لٹریچر کے تجزیے میں بڑی فاش غلطیاں ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کی تحریک اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے کردار کو سمجھنے میں غلطیاں ہوئی ہیں - پام دت نے بھی غدر کے کردار کو رجعت پرست بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے اور یہ مسئلہ بحث طلب ہے - سو برس پہلے کے اُردو ادب کو اس وقت تک صحیح طور سے سمجھا نہیں جا سکتا جب تک ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء کے غدر تک کی تمام تحریکوں کا اصلی کردار متعین نہ کیا جائے -

مَیں نے ادھر ایک نظم اور کہی ہے - جب تم ملوگی تو سناؤں گا - اب مَیں کچھ عرصے کے لیے لکھنا بالکل ترک کر دینا چاہتا ہوں اور سارا وقت پڑھنے میں صرف کروں گا - معاشی، تاریخی اور مادی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں - انہیں پر زور دے رہا ہوں - یہ زمین مضبوط ہو جائے تو پھر ہندوستان کی پرانی تاریخ اور ہندو اور اسلامی فلسفہ اٹھاؤں گا - کبھی کبھی یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور علوم کے بارے میں میری معلومات کتنی کم ہیں -

مَیں اچھی طرح ہوں اور کافی خوش ہوں - صرف ابّا جان اور اماں کی بیماری کی وجہ سے تھوڑی سی پریشانی ہے - میری پیرول کی درخواست کا ابھی تک جواب نہیں آیا ہے - پچھلے ہفتے پھر یاد دہانی کی ہے - اماں کی حالت کافی خراب ہے - اس عمر میں ٹی بی بہت خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے - یہ اطمینان ہے کہ گھر کی مالی حالت پھر کچھ سدھر گئی ہے -

(۷)

۲۴ر اکتوبر ۴۹ء

یہ معلوم کرکے بہت اطمینان ہوا کہ تمہیں ڈاکٹر کے علاج سے فائدہ ہے - لیکن تم نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری پیچش اب کیسی ہے - یہ بڑا موذی اور تکلیف دہ مرض ہے - پیچش کا علاج ہمیشہ احتیاط سے اور جی لگا کر کرانا چاہیے تاکہ جڑ ہی نہ باقی رہ جائے - یہ بُری بات ہے کہ پپو کا پیٹ ٹھیک نہیں ہوتا - صحت اور بیماری کی ساری جڑ پیٹ ہے - اس کا پیٹ ٹھیک ہو جائے تو صحت اچھی ہو جائے گی اور وہ موٹا ہو جائے گا - بچوں کے دانت کب سے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں - میرا خیال تھا کہ دانت آٹھ نو مہینے بعد نکلتے ہیں - ابھی تو پپو صرف ساڑھے پانچ مہینے کا ہے - مَیں نے ستارہ کو لکھا تھا کہ پپو نے میری گود میں آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ میرے کان پکڑ لیے - اس کے جواب میں اماں نے لکھوایا ہے کہ جب مَیں چھ مہینے کا تھا تو مَیں نے بھی ابّا جان کے کان پکڑے تھے - پپو نے مجھ سے بدلہ لیا ہے - ستارہ نے پپو کے لیے دو صدریاں بُنی ہیں - وہ اور کپڑے ابھی تک تیار نہیں کر سکی ہے - گھر کی بیماریوں کی وجہ سے پریشان ہے - گھر

کا خرچ بہت بڑھا ہوا ہے۔ صرف اماں کے علاج پر ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ صرف ہو رہا ہے۔ کوئی سو روپیہ مہینہ ابا جان کے علاج پر صرف ہوتا ہے۔ اس کے اوپر گھر کا خرچ الگ ہے۔ گیہوں کی پچھلی فصل خراب ہو گئی تھی اس لیے پیداوار کم ہوئی۔ وہ سارا گیہوں حکومت نے لے لیا۔ اب گھر کے خرچ کے لیے گیہوں خریدنا پڑتا ہے اور اس کے دام روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ آج کل وہاں بیس روپے من گیہوں مل رہا ہے۔ اب دھان اور گنے کی فصل تیار ہو گئی ہے۔ اس سے کچھ بار ہلکا ہو جائے گا۔

تم نے یہ اچھا کیا کہ مجید کو الگ کر کے پپو کے لیے آیا رکھ لی۔ بچوں کی پرورش عورتوں سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ ان میں جو ایک فطری نرمی ہوتی ہے وہ بہت ضروری ہے۔ اس آیا کی شکل صورت کیسی ہے۔ بچوں کی ذہنیت پر اپنی ماں اور آیا کی صورت شکل کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بچوں کو پالنے کے لیے جو آیا رکھی جاتے وہ خوب صورت ہونی چاہیے۔ اس کا مزاج بھی اچھا ہونا چاہیے تاکہ بچے سے محبت کر سکے۔

آیا کی تنخواہ میں جو دس روپے کا اضافہ ہو گیا ہے وہ میرے روپے میں سے کاٹ لیا کرو۔ میرا کام بیس روپے میں چل جاتا ہے۔ اس بار جو تم بیس روپے دے گئی تھیں وہ پورے پڑ گئے۔ اب دس روپے اور نہیں چاہئیں۔ جب سے چار مینار سگریٹ شروع کیا ہے سگریٹ کا خرچ بہت کم ہو گیا ہے۔ مہینے بھر کے لیے دس روپے کے سگریٹ بہت کافی ہوتے ہیں۔ باقی دس روپے دوسری ضروریات کے لیے بہت ہیں۔

صرف جدیدیت کافی نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی ذہنی دل چسپی بن کر رہ جاتی ہے اور گاڑی کے پٹری سے اتر جانے یا پٹری بدل لینے کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ تاریخی مادیت، معاشیات اور سیاسیات پر زور دینا چاہیے۔ تم عصمت کی ناول کے علاوہ ان کی کہانیوں کے تینوں مجموعے —— کلیاں، چوٹیں اور ایک بات —— لیتی آنا۔ اوپندر ناتھ اشک کی کہانیوں کا مجموعہ "چٹان"، تم مجھے پہلے دے گئی ہو۔ وہ مت لانا۔ اگر راجندر سنگھ بیدی کی کہانیوں کے مجموعے —— گرہن اور دانہ و دام —— مل سکیں تو وہ بھی لیتی آنا۔ کیفی سے پوچھنا کہ احمد ندیم قاسمی کی نظموں کا مجموعہ "جلال و جمال" آیا ہے یا نہیں اگر تبصرہ کے لیے آیا ہو تو لیتی آنا۔ بازار سے مت خریدنا۔ کیونکہ اس کے دام چھ سات روپے ہوں گے۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے مل جائے گا البتہ رسالے جو بھی مل سکیں وہ لیتی آنا —— اکتوبر کا محاذ بھی —— محاذ کافی اچھا نکل رہا ہے۔

ہمارے جیل میں سنیچر کو چھٹی نہیں ہوتی۔ تم سنیچر کو آ سکتی ہو۔ بس اتنا کرنا کہ مجھے پہلے سے لکھ دینا۔

آنند سے مجھے ہمدردی ہے۔ اگر تمہیں ملیں تو ان سے کہنا کہ اب اس درد کو گیت بنا کے اپنے ناول میں ڈھال لیں۔ زخم بنا کے پالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ "اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے" آنند تنہا نہیں ہیں .... سبھی ان کے ہم سفر ہیں۔ ان کی ایک اتنی بڑی یادگار "انجمن عاشقاں" ہے جواب کتابیں چھاپتی ہے۔ یہ سب ناول کا پورا مسالہ ہے۔ بوڑھے مارکس نے کہیں لکھا ہے کہ کسی سماج کی سماجی پوزیشن کا اندازہ اس کی عورتوں کی پوزیشن سے کیا جا سکتا ہے جس میں بدصورت عورتیں بھی شامل ہیں۔ آنند سے کہو کہ ناول لکھیں اور اس سماج کی کھال ادھیڑ کے رکھ دیں۔ یہی سب سے اچھا طریقہ ہے Sublimate کرنے کا۔

میں اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ حسب معمول دس گھنٹے سوتا ہوں۔ کھاتا ہوں اور پڑھتا ہوں اور تمہیں اور تمہاری محبت کو یاد کر کے جی بہلاتا ہوں۔ اور اس خوبصورت دن کا تصور کرتا ہوں جب تمہیں پھر پیار کر سکوں گا۔

ایسے ہی جسم سے یونان کے فن کاروں نے
اپنی وینس کے تصور کو تراشا ہوگا
ایسے ہی حسن کے چہرے سے تخیل لے کر

عہدِ پارینہ کے نقاشوں نے
اپنے خوابوں کی اجنتا کو سنوارا ہوگا

(۸)

پہلی نومبر ۱۹۴۳ء

آج تمہارا خط ملا۔ میں تمہیں کل خط لکھنا چاہتا تھا لیکن سوچا کہ تمہارا خط آجائے تو لکھوں ورنہ پھر تمہارے خط کے جواب کے لیے ایک ہفتے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تمہارے خط نے لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانے کی یاد دلا دی اور مجھے وینس کا وہ خوبصورت بُت یاد آگیا جو تم نے مجھے دیا تھا اور میں نے تم سے ہنس کر کہا تھا ——— "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" ——— لیکن وہ کھلونا ہماری محبت کی تمہید تھی۔ میں تمہیں وینس اور خدیجہ کو مونو لیسزا کہا کرتا تھا[1] ۔ پچھلا زمانہ تنہائی میں بہت یاد آتا ہے اور بڑا حسین معلوم ہوتا ہے اس کی یاد جتنی دھندلی ہوتی جاتی ہے حسن اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڑے خوب صورت منظر پر دھند چھائی ہوئی ہے اور انگلیاں اس پردے کو اٹھا دینے کے لیے تڑپ اٹھتی ہیں۔ تنہائی اور افسردگی کے عالم میں انسان خوشی کی تلاش اسی طرح کرتا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا زمانہ میرے لیے تمہاری ذات کا ایک حصّہ بن گیا ہے اور میں ان دنوں کو تم سے الگ کرکے یاد نہیں کر سکتا۔ ہم صرف پچھلے دو برس سے ساتھ رہے ہیں لیکن اب ایسا لگتا ہے جیسے تم لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانے سے میرے ساتھ ہو۔ بیچ کے وہ سارے سال جب تم میرے ساتھ نہیں تھیں جیسے کہیں غائب ہو گئے ہیں اور جب ہم پھر ملیں گے تو جیل کا یہ زمانہ بھی، جدائی کے یہ دن بھی ہماری یاد کی دنیا سے کھو جائیں گے اور ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو یہ افسردگی اور تنہائی کے ریگستان نظر نہیں آئیں گے۔ انسانی دماغ ہمیشہ تکلیفوں اور غموں کو بھلاتا رہتا ہے۔ میں الکسی طالسطائی کا ناول پڑھ رہا تھا اس کا ایک جملہ بہت پسند آیا جسے میں نے الگ لکھ لیا ہے۔

Sorrow is the portion of millions of women in our time. Sorrow and suffering should be converted into a social force .... May your sorrow lend you strength.

میں جو کچھ پڑھتا ہوں اس کے لطف میں تمہیں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں لیکن خطوں کے ذریعے سے یہ کام ممکن نہیں ہے۔ میں نے معاشیات ختم کرلی ہے۔ آج کل فلسفہ پڑھ رہا ہوں۔ آج پلیخنوف کی ایک کتاب اٹھائی ہے In defence of materialism. بہت اچھی کتاب ہے۔ ابھی صرف دو باب پڑھے ہیں۔ مجھے کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں ہے ——— جن کتابوں کے نام پہلے لکھ چکا ہوں ان میں سے جو مل جائیں وہ لیتی آنا۔ خاص طور سے حافظ کا دیوان' لاہوتی کا دیوان اور ڈیالکٹکس میگزین کی جلد یاد رکھنا۔ میں تمہیں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ سیاہ رنگ کی جلد ہے جو میری کتابوں کی الماری میں رکھی ہے۔

پپو کو اپنے ساتھ ضرور لانا۔ صرف اس کا خیال رکھنا کہ اب ناسک میں شام کے وقت ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ ابھی تو ہلکی ہلکی ہے ممکن ہے ایک ہفتے میں اور بڑھ جائے۔ اس لیے پپو کو گرم کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔ پپو نے پیٹ کے بل چلنا شروع

---

[1] اُس زمانے کی ایک نظم کا شعر ہے ؎
سُنا کرتے تھے حسن وینس و ہیلن کے افسانے جمالِ وینس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا

کر دیا ہے لیکن آخر وہ بیٹھنا کب شروع کریں گے۔اس زمانے میں بچے بہت دلچسپ ہو جاتے ہیں۔مجھے آپا کی تصویر کی ضرورت نہیں ہے۔تم اس چکر میں مت پڑو۔میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہے۔اچھی شکل کی ہے۔پپو خوش رہے گا پپو کی نئی تصویر ضرور تیار کرا لینا۔اظہر سے کہو کہ جلدی سے تیار کر دیں۔

میرا وزن بڑھا نہیں ہے۔یہ ضرور ہے کہ اس مہینے میں کم نہیں ہوا۔پچھلے چھ مہینوں میں میرا بارہ پونڈ وزن کم ہو چکا ہے۔ایک سو تیس سے صرف ایک سو اٹھارہ رہ گیا ہے۔اب اور کم ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔پچھلے مہینے سے میں نے انڈا کھانا شروع کر دیا ہے۔ایک انڈا روز منگا لیتا ہوں۔اس طرح چار روپے مہینے میں کام چل جاتا ہے۔اس سے شاید وزن بڑھ جائے۔ویسے ناسک کی آب و ہوا اچھی ہے اور میری صحت ٹھیک ہے۔کبھی کبھی یہاں کی راتیں بڑی خوب صورت ہو جاتی ہیں۔آج کی رات خاص طور سے بہت خوب صورت ہے۔چاند بادلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔بمبئی میں تو آنکھیں ایسے منظر کے لیے ترس جاتی ہیں۔پچھلے ہفتے مجھے زکام ہو گیا تھا لیکن دو دن میں اچھا ہو گیا۔

دو مہینے بعد حکومت نے میری پیرول کی درخواست کا جواب دیا ہے اور اسے نامنظور کر دیا۔کیا کیا جا سکتا ہے۔مجبوری۔صبر۔قہرِ درویش بجانِ درویش۔ ابا جان اور اماں کی بیماری نے سب کو گھر میں پریشان کر رکھا ہے۔ستارہ اور ربو کی زندگی کیا ہے۔میں نے کئی بار سوچا کہ انہیں اپنے ساتھ بمبئی لے آؤں لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔اس نظام میں کتنی زندگیاں گھٹ گھٹ کر برباد ہو جاتی ہیں۔ستارہ اور ربو دونوں بہت ذہین ہیں لیکن ان کی ذہانت گھر کی چہار دیواری میں گھٹ کر رہ گئی ہے۔جاگیر داری قسم کے خاندانوں کی یہ زندگی کتنی عبرت ناک ہے۔

اب تو لکھنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔سوائے اس کے کہ دیواریں سفید اور سلاخیں کالی ہیں۔باہر چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور بادلوں کی پرچھائیاں کھپریلوں پر دوڑ رہی ہیں۔کہیں بہت دور سے شہنائی کی آواز آ رہی ہے۔مضطرب اور رومان انگیز۔

(۹)

۸ دسمبر ۱۹۴۹ء

تمہارا خط مل گیا جسے تم نے کئی دن ڈاک میں نہیں ڈالا اور روز اس میں اضافہ کرتی رہیں۔تم نے اپنے پچھلے خط میں نہ جانے کیا لکھ دیا تھا کہ سنسر نے موٹی موٹی کالی لکیریں کھینچ دیں اور پھر اس کی وجہ سے مجھے خط دیر میں ملا۔تم بھی مجھے کبھی کبھی بہت یاد آتی ہو۔یوں تو تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں تمہارے لیے تڑپ اٹھتا ہوں اور اپنی تنہائی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔انسان کی زندگی میں محبت کتنی بڑی چیز ہے۔جب ہم پاس رہتے ہیں تو اس کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی لیکن جب الگ ہوتے ہیں تو محبت کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور زندگی سونی سونی معلوم ہونے لگتی ہے۔ہر بات پھیکی اور ہر چیز ادھوری معلوم ہوتی ہے۔اس کو جگر مراد آبادی نے بڑے حسین شعر میں ڈھال دیا ہے ؎

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

فراق گورکھپوری نے بھی ایک بڑا پیارا شعر کہا ہے ؎

یہ زندگی کے کڑے کوس ۔۔۔ یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

پھر فراق کا ایک دوسرا شعر یاد آجاتا ہے جو میری اس کیفیت پر طنز کرنے لگتا ہے اور میں مسکرا دیتا ہوں ؎

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دُنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں؟

اُردو کی پُرانی شاعری میں اور اس زمانے کی بھی غزل کی شاعری میں ایسی نفسیاتی کیفیت کا بڑا نازک اور قیمتی ذخیرہ ہے۔ ایک شعر اور یاد آگیا۔ ایک فارسی شاعر نے بڑے مزے کی بات بتائی ہے کہ محبوب کی یاد اس طرح آتی ہے جیسے سمندر کی موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ شعر یہ ہے ؎

با من آویزشِ او الفتِ موج است و کنار
دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

اس طرح میں خط میں تمہیں نہ معلوم کتنے شعر لکھتا چلا جاؤں گا اس لیے بس ——— !

تمہارے خط میں یہ پڑھ کے پپو پر بڑا پیار آیا کہ وہ سمندر میں چاند کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے بیٹے میں جمالیاتی ذوق اور شاعرانہ صلاحیتیں ہیں۔ وہ بڑا ہو کر مجھ سے اچھا شاعر ہوگا۔ اسے تربیت بھی مجھ سے اچھی ملے گی۔ وہ اب سات مہینے کا ہو گیا ہے اور گھٹنوں چلنے لگا ہے۔ میں اکثر آنکھیں بند کر کے اسے اپنی گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ پھر آنکھیں کھول دیتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت دُور ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اگر کئی سال تک جیل میں رہنا پڑا تو مَیں بہت دنوں تک پپو کے لیے اجنبی رہوں گا۔

بلرام پور سے ستارہ کا خط آیا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ دسمبر میں تم جاؤ تو تمہیں ایک طرف کا کرایہ مل جائے گا۔ دھان کی فصل اچھی ہوئی ہے اور اب گنا بھی بکنا شروع ہو گیا ہے لیکن تمہیں دسمبر میں چھٹی نہیں ہے۔ اماں پپو کو دیکھنے کے لیے بہت بیتاب ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہیں۔ میں یہاں جیل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اگر تمہیں چھٹی ہوتی اور تم جا سکتیں تو میرے دل سے ایک بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

تمہاری نانی کے انتقال کی خبر معلوم کر کے افسوس ہوا۔ وہ مجھے یاد ہیں اور مجھے اچھی لگتی تھیں۔ مجھے تمام بوڑھے آدمی اچھے لگتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کا بھولا پن آجاتا ہے جو بچوں کے بھولے پن سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔

(۱۰)

۱۳ مارچ ۱۹۵۰ء

امید ہے کہ تم خیریت سے بمبئی پہنچ گئی ہوں گی اور مجھے خط لکھ دیا ہوگا۔ تمہارا آنا بالکل خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد ایک گھنٹے کی ملاقات اتنی مختصر ہوتی ہے۔ کل میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں الگ ہوئے سال بھر ہو گیا اس سال بھر میں مَیں نے تمہیں چھ سات گھنٹے سے زیادہ نہیں دیکھا ہے۔ پھر بھی پبلو نرودا کے الفاظ میں:

You are inside me like the moon or a lant of air through a grove.

شاعری بڑی اچھی ساتھی ہے۔ مَیں اس زمانے میں شیلی، کیٹس والٹ وِھٹ مین اور پبلو نرودا کی نظمیں پڑھتا رہا ہوں۔ تم ڈان وسٹ کی نظموں کا مجموعہ جو دے گئی تھیں وہ میں نے پرسوں رات کو پڑھ ڈالا۔ مَیں تمہاری اس رائے سے متفق نہیں

ہوں کہ ڈان وسٹ کی نظمیں پبلو نرودا سے بھی اچھی ہیں۔ پبلو نرودا بہت بڑا شاعر ہے اور بے حد خوب صورت ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ دونوں نے مل کر اب تک صرف دو بڑے شاعر پیدا کیے ہیں۔ انیسویں صدی میں والٹ وھٹ مین اور بیسویں صدی میں پبلو نرودا۔ ڈان وسٹ کی شاعری صرف دلچسپ ہے۔ ابھی اس کا شمار بڑی شاعری میں نہیں ہوسکتا۔ ابھی اس کے جذبات اور تخیل کے چشمے صرف پھوٹ رہے ہیں۔ ابھی وہ پہاڑوں سے نیچے اتر کر آبشار اور دریا نہیں بنے ہیں۔ صرف چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں جن میں تڑپ اور پاکیزگی ہے۔ کہیں کہیں اس کی شاعری میں بہت اچھے ٹکڑے ملتے ہیں جو اس کے مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔

ہمارے بہت سے دوستوں نے ابھی آزاد نظم کی تکنیک کو سمجھا نہیں ہے۔ مشق اور تجربے سے یہ تکنیک سمجھ میں آجائے گی آزاد نظم سے قافیہ اور ردیف نکل جاتا ہے، مصرعے بھی نپے تلے برابر کے مصرعے نہیں رہ جاتے، شعر کی جگہ بند لے لیتا ہے۔ اس لیے نئے آہنگ اور ترنم نئی تال اور نئے سُر کی ضرورت ہوتی ہے جو قافیے کی جھنکار کا بدل بن سکے۔ بند (Stanza) چونکہ شعر سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے اس لیے معنوی وسعت اور تخیل کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ معنوی وسعت اور تخیل کے اس پھیلاؤ کو شاعر بہت اچھی اور بھرپور امیجری (Imagery) کے بغیر نہیں سنبھال سکتا ورنہ پورا بند غارت ہو جاتے گا۔ اس طرح آزاد نظم کا ہر بند ایک مکمل تصویر ہوتا ہے۔ (اور آزاد نظم ان تصویروں کا البم) جس کے خط وخال ہر مصرعے کے ساتھ زیادہ واضح اور روشن ہوتے جاتے ہیں اور آخری مصرعہ اسے مکمل کر کے Climax پر پہنچا دیتا ہے۔ پابند نظم کی طرح ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کی علیحدگی آزاد نظم برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک مصرعے اور دوسرے مصرعے کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑا ہونا چاہیے جہاں ہر کڑی الگ ہونے کے بعد بھی دوسری کڑی سے الگ نہیں ہوتی ہے۔ میں تمہیں اس کی چند مثالیں دو تین شاعروں کے یہاں سے دوں گا۔

Plum trees blessom from sweet scented earth,
And sorrow climbs up through the leaves,
To scent the flowers on the blooming tree.
West of the Colorado river is a place I love.
I turn toward it with everything that lives in me,
with all that I was, and am, and believe.
There are tall red rocks, made structures by the savage
air with its thousand hands, and the scarlet
sky arose from the abyss into them, becoming
copper, fire and strength.
America, stretched like a baffolo hide, ariel, clear
night of gallop.
There toward the starred submits
I drink your cup of green dew.

ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں

کتنے دیوار و در، کتنے مینار، جو سنگ مرمر کے سینے میں سوئے ہوئے ہیں
جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صناع و معمار انھیں ان کے خواب گراں سے جگا دیں
سنگ اور خشت کے ڈھیر کو
قصر دیواں بنا دیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر ایلورا کے، معمار ہیں تاج اور سیکری کے
ہم وہ صناع ہیں
انگلیاں جن کی پتھر کو بھی موم کر کے سبک اور حسین شکل میں ڈھالتی ہیں
لیکن ان انگلیوں کو
تین سو سال کی مفلسی اور غلامی
تین سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے

یہ مرا شہر ہے
گو مرا جسم اس خاکداں سے نہیں
میری مٹی یہاں سے بہت دور گنگا کے پانی سے گوندھی گئی ہے
میرے دل میں ہمالہ کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
پھر بھی اے بمبئی، تو مرا شہر ہے
تیرے باغات میں میری یادوں کے کتنے ہی رم خوردہ آہو
میں نے تیرے پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کھائی ہے
تیری شفاف جھیلوں کا پانی پیا ہے
تیرے ساحل کی ہنستی ہوئی سیپیاں مجھ کو پہچانتی ہیں
ناریل کے درختوں کی لمبی قطاریں
تیرے نیلے سمندر کے طوفان اور قہقہے
تیرے دلکش مضافات کے سبزہ زاروں کی خاموشیاں
رنگتیں، نکہتیں، سب مجھے جانتی ہیں
اس جگہ میرے خوابوں کو آنکھیں ملیں
اور میری محبت کے بوسوں نے اپنے حسیں ہونٹ حاصل کیے۔

Camerado, this is no book,
Who touches this touches a man,

(Is it night? are we here together alone?)
It is I you hold and who holds you,
I spring from the pages into your arms - decease calls me forth.
O how your fingers drowse me,
Your breath falls around me like dew, your pulse lulls the
tympans of my ears,
I feel immerged from head to foot,
Delicious, enough.

(۱۱)

۵؍اپریل سنہ ۵۰ء

۶؍مئی کو پیو کی سالگرہ ہوگی - میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ میں اس وقت بمبئی میں ہوتا - چلو کوئی ہرج نہیں ہے - تم سالگرہ کی تفصیل مجھے لکھ دینا - میں جیل سے اپنے پیار کے سوا اور کیا بھیج سکتا ہوں - اپنا پیار اس کے لیے نظم کرکے بھیجوں گا - ابھی تو وہ نہیں پڑھ سکے گا لیکن بڑا ہوکر پڑھ لے گا اور اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی پہلی سالگرہ پر میں اُس کے ساتھ نہیں تھا لیکن میرا پیار اس کے ساتھ تھا اور میرا پیار تو تمہاری شکل میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے -

اب کی بار جب تم مجھ سے ملنے آئی تھیں تو تمہارے گالوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے ہوئے تھے - یہ بات مجھے پسند نہیں ہے - اصل میں تم اپنے آپ کو کڑھا رہی ہو اور جن باتوں کے لیے کڑھا رہی ہو وہ ٹھیک نہیں ہیں - کڑھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے - حالات ٹھیک ہو جائیں گے .... اب مجھے پیو کی نئی تصویر کی ضرورت ہے - مَیں نے تم سے جنوری میں کہا تھا - پیو کی کوئی ہنستی ہوئی تصویر نہیں ہے اور مجھے ہنستی ہوئی تصویر چاہیے جس میں تم بھی پیو کے ساتھ ہنس رہی ہو -

(۱۲)

۱۷؍مئی سنہ ۵۰ء

احتشام نے جو تبصرہ کیا ہے وہ اچھا ہے لیکن شعروں کا انتخاب مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ وہ انتخاب میرے بہترین مضمون میں سے نہیں دیا گیا ہے اس لیے میری شاعری کی اصل خصوصیات کا پتہ نہیں چلتا - میری شاعری میں جو انسانیت کا تصور ہے اس پر بھی ان کی نظر نہیں پڑی اور وہ تصور بہت اہم ہے - رومانیت کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے وہ بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا ہے - اسی وجہ سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ میرے سر یہ الزام آ گیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ سال کی ساری شاعری کو رومانی شاعری کہہ کر نظر انداز کر رہا ہوں - میں رومانیت کے خلاف نہیں ہوں - حقیقت یہ ہے کہ بغیر رومانیت کے شاعری ممکن نہیں ہے - خود میری شاعری میں بہت کافی رومانیت ہے - میں دراصل *Obscure Romanticism* کے خلاف ہوں اسی لیے میں نے اپنی نظم میں یہ لکھا تھا ؎

اپنے تاریک اندیش رومان کے ساز کو توڑ دو

اپنی مضراب کو پھینک دو
اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے

لوگ میری نظم کے نام سے دھوکا کھا گئے اور اس "تاریک اندیش" لفظ کو بھول گئے..... انھی معنوں میں آج سے ستر اسی برس پہلے حالی نے "تاریک اندیش" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

(۱۲)

۲۲ مئی ۱۹۵۰ء

تم ایک گھنٹے کی ملاقات کے لیے آتی ہو اور اپنے پیچھے ایک سناٹا چھوڑ جاتی ہو۔ تین چار دن تک ہر چیز سونی سونی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے تو اب عادت پڑ گئی ہے اور جیل اپنا گھر معلوم ہونے لگی ہے اور اس گھر میں مہینے بھر کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے بہار آتی ہے جو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب آئی اور کب چلی گئی۔ خیر یہ بھی بہت ہے۔

یہاں کئی ایسے بھی ساتھی ہیں جن سے ملنے کوئی نہیں آتا اور وہ کبھی شکایت نہیں کرتے اور ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ ان کی اس خوشی کی آڑ سے نئی انسانیت کا حسن جھانک رہا ہے۔ یہ لوگ کبھی کبھی بڑی خوبصورت حرکت کرتے ہیں۔ ایک ساتھی ہیں، ان کا مستقل کام یہ ہے کہ جب کسی کی ملاقات آتی ہے تو اس کے لیے گلاب کے پھول بھیجتے ہیں۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ وہ اُسے جانتے ہیں یا نہیں، وہ سب کی ملاقات کی خبر رکھتے ہیں اور اس کے لیے گلاب کے پھولوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی لوگ اُن سے مذاق کیا کرتے ہیں لیکن ان کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

پرسوں ایک دوست نے سگریٹ کی پنی سے چمبیلی کے بہت سارے پھول بنا کر اُن کا ایک ہار گوندھا اور اُسے لا کر پپو کی تصویر پر ڈال دیا۔ اُن کا حکم ہے کہ یہ ہار اتارا نہیں جائے گا۔ اب پپو پرسوں سے یہ ہار پہنے ہوئے میرے سامنے میز پر بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ جیلوں میں سیاسی قیدی نہیں بلکہ انسانیت کی بہاریں قید ہیں ؎

ہم سفر یہ ہوں تو پھر عزمِ سفر کیا کہنا
رنگِ شب یہ ہو تو پھر رنگِ سحر کیا کہنا

(۱۳)

۲۸ مئی ۱۹۵۰ء

کل بالکل اچانک تمہارے بھیجے ہوئے آم آگئے اور تمہارا دوسرا خط بھی مل گیا۔ آم بہت اچھے تھے۔ ابھی تک ان کا مزہ منہ میں باقی ہے۔ میں نے دو تین آم بچا کر رکھ لیے تھے وہ آج کھاؤں گا۔ ان آموں کے ذائقے میں تمہاری محبت کی بھی مٹھاس ہے۔

میں آج سوچ رہا تھا کہ سال بھر میں میں نے تمہیں کتنی دیر دیکھا ہے۔ تم اب تک گیارہ بار ملنے آچکی ہو۔ ان ملاقاتوں کے مجموعی گھنٹوں کی تعداد ایک دن کے گھنٹوں کے برابر ہوتی ہے۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے تم صرف ایک دن میرے پاس رہی ہو اور وہ بھی اس طرح کہ بقول تمہارے "ہمارے درمیان بہت سی آنکھیں اور نگاہیں حائل ہوتی ہیں" ان ملاقاتوں سے جی نہیں

پھر تا بلکہ دل کی آگ اور تیز ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد جب ہم تم ساتھ رہیں گے تو ہماری محبت کتنی گہری، کتنی بھرپور ہوگی۔ پرانے زمانے میں محبت کرنے والوں کے درمیان رسم و رواج حائل ہوا کرتے تھے۔ اب بھی بہت سے بدنصیب نوجوان اس قسم کے رسم و رواج کا شکار ہیں۔ ہمارے درمیان ایسی کوئی چیز حائل نہیں ہوئی تو اب پبلک سکیورٹی ایکٹ حائل ہو گیا ہے۔ کئی برس ہوئے میں نے ایک عشقیہ نظم لکھی تھی۔ آج یہ سطریں لکھتے وقت اسد کے چند مصرعے یاد آ رہے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مصرعے کہتے وقت میرے دل نے غیر شعوری طور سے مستقبل کو جھانک کر دیکھ لیا تھا اور آج کل کے دنوں کو ——— جدائی کے دنوں کو محسوس کر لیا تھا ؎

ہمارے بیچ میں حائل وہ آگ ہے کہ جسے
ہماری آنکھ کے آنسو بجھا نہیں سکتے
برہنہ پا ہمیں اس آگ پر گزرنا ہے
اسی میں تپ کے ہمیں ایک دن نکھرنا ہے

(۱۵)

۱۵ ر جون ۱۹۵۰ء

میں تمہارے گھر کے قصے سے بہت پریشان ہوں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جتنے آدمی رہ سکتے ہیں انھیں کو رہنے کا حق ہے۔ یہ صرف انارکی ہے اور کچھ نہیں۔ پھر جتنے لوگ رہتے ہیں انھیں گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ یہ کس نے بتا دیا ہے کہ بورچی خانہ اور کھانے کا انتظام کرنا صرف عورت کا کام ہے۔ یہ عورت کا پرانا اور انتہائی بے ہودہ تصور ہے۔ یہاں ہم لوگ اپنے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ ہر ہفتے تین چار آدمیوں میں کام بانٹ لیتے ہیں۔ تم گھر کے باہر بھی اتنا ہی کام کرتی ہو جتنا اور لوگ۔ تمہیں اپنی روزی کمانی پڑتی ہے اور سارا دن اس میں نکل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بچے کی پرورش بھی تمہارے ذمے ہے۔ پھر اس لیے کہ تم عورت ہو، گھر کا سارا کام تمہارے سر پر ڈال دینا بالکل غلط ہے۔ اپنے گھر کے ساتھیوں سے کہو کہ ایک ایک ہفتے باری باری سے بورچی خانہ سنبھالیں۔ اگر وہ اس کام کو سنبھالنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان سے کہو کہ اپنے کھانے کا الگ انتظام کر لیں۔ عورت اور مرد کی برابری کو زبانی سب تسلیم کرتے ہیں لیکن عمل میں وہی دقیانوسی رویہ رکھتے ہیں جو ہزاروں برس سے عورت کو باربرداری کا جانور بنائے ہوئے ہے۔

(۱۶)

ایک اور خط

(سنٹرل جیل ناسک سے لکھے ہوئے اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہ جن حالات میں لکھا گیا تھا ان میں تاریخ کا خیال نہ رہ جانا معمولی بات ہے۔ یہ خط کئی ہفتے بعد کسی قیدی کے ہاتھ بمبئی بھیجا گیا تھا۔ جیل کی ڈاک سے اس کا جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ واقعہ وسط ۱۹۴۹ء کا ہے جب انقلابی قیدیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ایک جیل سے دوسری جیل میں ٹرانسفر ہونے سے انکار

کریں گے)۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتے ہیں ہم کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

کل شام کو سیاسی قیدیوں پر فائرنگ ہوئی - ہماری پشت پر بارک کی پتھریلی دیوار تھی اور دس گز کے فاصلے پر سامنے مسلح پولس کی رائفلیں - تم نے اخبار میں خبر پڑھ لی ہوگی - سرکاری بیان شائع ہوا ہوگا۔

کل تیسرے پہر پولس کی دو سیاہ رنگ کی گاڑیاں ہماری بارک کے سامنے آکر رکیں - عام طور سے قیدی جیل کے گیٹ پر اتار لیے جاتے ہیں لیکن ان قیدیوں نے اترنے سے انکار کر دیا تھا - یہ سب سیاسی قیدی ہیں - انھیں دھوکا دے کر بمبئی سے ناسک لایا گیا ہے - ان کے لیڈر مراٹھا زبان کے مشہور اور مقبول گانے والے اور عوامی شاعر گوانا کر ہیں جن کے دوسرے ساتھی امر شیخ ہمارے ساتھ قید ہیں - انھوں نے نیچے اتر کر ڈانگے سے بات کی - اُن کے لہجے میں تندی اور تیزی تھی - انھوں نے نہ صرف ایک سوال کیا —— "آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے یا جیل ادھیکاریوں کا؟" ظاہر ہے جیل ادھیکاریوں کا ساتھ دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا - ڈانگے نے ہم سب کی طرف سے جیلر کو الٹی میٹم دیا کہ اگر آپ ان قیدیوں کو بمبئی واپس نہیں لے جائیں گے تو ہم اپنی بارک کے اندر واپس نہیں جائیں گے - ہمارے پاس احتجاج کا یہی طریقہ تھا رات کے وقت لاک اپ (lock up) سے انکار کر دیں - جیلر نے نہایت متانت سے کہا کہ جیل کی ڈسپلن نہیں توڑی جاسکتی - آپ بارک میں بند ہونے سے انکار کریں گے تو کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا - ان معصوم لفظوں کا مطلب ہم کو معلوم تھا کیونکہ اطلاع مل چکی تھی کہ گیٹ پر مسلح پولس آئی ہے - ڈانگے مسکرا دیے - یہ ہم سب کی طرف سے جواب تھا - ہم دو ڈھائی سو قیدی بارک کی چہار دیواری سے باہر نکل آئے اور دیوار کے پاس کھڑے ہو گئے - باقی کام منٹوں میں پورا ہو گیا - پولس کی سیاہ گاڑیاں ہمارے سامنے سے ہٹائی گئیں اور ان کی جگہ مسلح پولس آکر کھڑی ہو گئی انھیں دیکھ کر قیدیوں کو جلال آگیا - بہت سے قیدی ایک ساتھ پولس کی طرف جھپٹے اور پولس نے گولی چلادی - ہمیں اب تک یہ علم نہیں ہے کہ وہاں کوئی مجسٹریٹ تھا یا نہیں - گولی چلانے کا حکم کس نے دیا - ایک قیدی جان سے مارا گیا اور کئی قیدی زخمی ہو گئے - اس کے بعد ہم بارک میں واپس آگئے - ہر طرف اندھیرا تھا - بجلی غائب تھی

اب اس واقعے کو چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں - جیل کا کوئی افسر اب تک ہمارے پاس نہیں آیا ہے - صرف یہ خبر ہے کہ پولس کی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے قیدیوں کو بڑے بڑے ربر کے پائپوں سے پانی کی دھار مار کر چوہوں کی طرح باہر نکالا گیا ہے اور کسی بارک میں بند کر دیا گیا ہے۔

رات بھر امر شیخ اپنی خوب صورت اور طاقت ور آواز میں مراٹھی کے انقلابی گیت گاتے رہے - میں نے ڈانگے کو غالب کے دو شعر لکھ کر دیے ہیں ؎

عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہم لوگ صبح سے آپس میں باتیں کر رہے ہیں کہ فائرنگ کے وقت کس کی کیا کیفیت تھی؟ مجھے اپنا حال صرف اتنا معلوم ہے کہ بارک سے نکلتے وقت ایک عجیب قسم کا جوش تھا۔ لیکن جب میں دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور سامنے مسلح پولس اور اس کی رائفلیں دکھائی دیں تو میں نے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنی۔ چند لمحوں میں یہ آواز گولی چلنے کی کرخت آوازوں میں ڈوب گئی۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے میرا دل سینے سے نکل کر نیچے گر گیا ہے۔ اس کے بعد دل پھر واپس آگیا اور دھڑکنے لگا۔ اس لمحے میں مجھے کوئی خیال نہیں آیا۔ موت کا لفظ گولی چلنے کے بعد یاد آیا۔

اب سکون ہے اور سناٹا۔ نئے نئے شعری پیکر ڈھل رہے ہیں جن سے ہماری شعری روایت بالکل بیگانہ ہے۔ شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر —— رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام —— گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں —— بارود کا کاجل، فولاد کے ہونٹ، سیسے کی زبان۔ اُردو کی نازک مزاجی اس اندازِ بیان کو کیسے برداشت کر سکے گی یہ خمِ شمشیر، بیزہ گاہ اور پیکان یار سے کس قدر مختلف ہے۔ اُردو والوں کو میری شاعری سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ لکھنؤ والوں نے تو اب تک اقبال کو بھی قبول نہیں کیا ہے جس کی ساری شعری روایت کلاسیکی ہے۔ دراصل ہمیں قبول عام کی سند کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ دل پر جو گزرتی ہے اس کے لیے دل ہی زبان تلاش کرتا ہے اور "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔"

بہر حال بیس اس خط سے تمہیں یہ اطمینان ہو جائے گا کہ ناسک جیل میں سب خیریت ہے۔ ہم زندگی کے ایک ہولناک مگر دلچسپ تجربے سے گزرے ہیں ؎

راہ میں فوجوں کا پہرا سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی با شوکتِ شاہانہ ہم
جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

نظمیں

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی

آدمی بھی، محبت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
رُوح و دل کی تنہائی
ایک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں

جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گذر جاتے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریکیاں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقش پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جاتے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سینکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی یہ دیواریں

بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی دیواریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جاں قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں

ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہروں پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں، تمنائیں
آرزوئیں، امیدیں
اشک، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں

صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں
اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے میں
سرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
اُنگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک، آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں

عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقشِ پا بغاوت کے
جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
ظالموں کی شدّت پر
ظلم چیخ اٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
انقلاب زندہ باد

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کی کوروں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری

نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عام جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بےکسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے

(سنٹرل جیل ناسک)

تمہاری آنکھیں

تمہاری آنکھیں
حسین، شفاف، مسکراتی، جواں آنکھیں
لرزتی پلکوں کی چلمنوں میں
تمہارے چہرے پہ ابرووں کی کمان کے نیچے
تمہاری آنکھیں
وہ جن کی نظروں کے ٹھنڈے سائے میں میری الفت
مری جوانی کی رات پروان چڑھ رہی تھی

تمہاری آنکھیں
اندھیری راتوں میں جو ستاروں کی روشنی سے
فضائے زنداں میں جھانکتی ہیں

میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پر اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
میں پڑھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں
تمہاری آنکھیں تمہاری پلکیں کہانیاں سی سنا رہی ہیں
میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
مسرّتوں کے گلاب ہر سمت کھِل رہے ہیں
تمہاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں

مجھے گرفتار کر کے جب جیل لا رہے تھے پولیس والے
تم اپنے بستر سے اپنے دل کے
ادھورے خوابوں کو لے کے بیدار ہو گئی تھیں
تمہاری پلکوں سے نیند اب بھی ٹپک رہی تھی
مگر نگاہوں میں نفرتوں کے عظیم شعلے بھڑک اُٹھے تھے
تمہاری آنکھیں حقارتوں کے جہنموں کو جگا رہی تھیں
نظامِ ظلم و ستم پہ بجلی گرا رہی تھیں
مری محبت نے اپنی جنّت کا حسن دیکھا
تمہاری آنکھوں پہ میری نظروں کے پیار برسے
مری اُمیدوں مری تمنّاؤں نے صدا دی
یہ نفرتوں کی عظیم مشعل جلائے رکھنا
کہ یہ محبت کے دل کا شعلہ ہے جس کی رنگین روشنی میں
ہمارے خوابوں کے راستے جگمگا رہے ہیں

تمہاری آنکھیں
جو میرے سینے میں تیرتی ہیں
کنول کی کلیاں جو میرے دل میں کھِلی ہوئی ہیں
انھیں سے دو اور آنکھیں بیدار ہو گئی ہیں
وہ ننھے ننھے چمکتے ہیروں کی ننھی کنیاں
جو میری آنکھوں کا نور لے کر تمہارے آنچل سے جھانکتی ہیں
پھر اور آنکھیں پھر اور آنکھیں پھر اور آنکھیں
یہ سلسلہ تا ابد چلے گا
زمانے کی گود میں ستاروں کے حُسن کی ندیاں بہیں گی
وہ سب تمہاری
وہ سب ہماری ہی آنکھیں ہوں گی
ہماری آنکھیں کہ جن سے شعلے برس رہے ہیں
مگر وہ کل کا حسین دن دیکھو کتنا نزدیک آ گیا ہے
ہماری آنکھوں سے جب بہاریں چھلک پڑیں گی

(سنٹرل جیل ناسک)

جیل کی رات

پہاڑ سی رات
اداس تارے، تھکے مسافر
گھنا اندھیرا، سیاہ جنگل
جہاں سلاخیں اُگی ہوئی ہیں
اذیتوں کے پرانے عفریت قیدیوں کو نگل رہے ہیں
خموشی سہمی ہوئی کھڑی ہے
سیاہی اپنے سیاہ دانتوں سے روشنی کو چبا رہی ہے
اچاٹ نیندوں کے ناگ آنکھوں کو ڈس رہے ہیں
میں چھد رہا ہوں ہزار کانٹوں سے اپنی بے چین کروٹوں میں
یہ رات بھی کل کی رات کی طرح اپنی سفاکیتوں کو لے کر
افق کے اس پار جا چھپے گی
مگر مجھے ڈس نہیں سکے گی
مری نگاہوں میں میری محبوب تیری صورت رچی ہوئی ہے
یہ چاند میری حسین یادوں کے آسمان پر کھلا ہوا ہے
ترے تصور سے میرے سینے میں چاندنی ہے

جنوری ۵۰ء

شادی کا دن

سفید بادل
لرزتے آنچل
بلند و بالا حسین نیلاہٹوں کے سر سے ڈھلک گئے تھے
فضا کے چہرے پہ مست ہو کر
ہزاروں کرنیں بکھر گئی تھیں
ہرے بھرے پیڑ،
روشنی،
روشنی کے جھونکے

ہوا کی پینگیں
شریر بچوں کی طرح سے پتیوں کی معصوم کھلکھلاہٹ
زمین کو نرم گھاس کی ننھی انگلیاں گدگدا رہی تھیں
یہ دن بہت ہی حسین دن تھا
جسے تمہارے حسین اقرارِ عشق نے اور خوب صورت بنا دیا تھا
یہ دن اس طرح سج کے پھر آج آگیا ہے
سفید ہاتھوں سے کوٹھری کی سیہ سلاخوں کو چھو رہا ہے
وہی تبسم، وہی تمہارا سا شوخ اندازِ دل ربائی
مگر نگاہوں میں وہ پرانی چمک نہیں ہے
کہ اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے
سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں

سنٹرل جیل۔ ناسک
۲۰ر جنوری ۱۹۵۱ء

نیند

(اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

دن کی خشمگیں نظریں
کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور
بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی
تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری
گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی
خامشی کی فریادیں
تہہ نشیں اندھیرے میں

شب کی شوخ دوشیزہ
خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے آنچل میں
جنگلوں کی خوشبوئیں
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں باہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر

خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمین کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں سے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے ہیں
آسمان پر تارے
ننھے ننھے ہاتھوں سے
بُن رہے ہیں جادو سا
جھینگروں کی آوازیں
کہہ رہی ہیں افسانہ
دُور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سناتی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

روز رات کو یونہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
اِک حسیں پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

(سنٹرل جیل ناسک)

اَوَدھ کی خاکِ حسیں

گزرتی برسات، آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بُوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصوّر کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسمان سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں
میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دل نواز باہیں
وہ شاخ صندل
کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسین نشیمن بنا لیے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں

پپیہے رخصت نہیں ہوتے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں [illegible] سے ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیجِ بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمین کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے آپ بجا رہی ہیں
ہمالہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسمان بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سُرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

مرے تصوّر میں
ساقیوں کا خرام رنگین
نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں
نہ میکدے ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچّے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
وہ گاؤں جو سینکڑوں برس سے بسے ہوتے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں

قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگ ڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

(نا تمام) ——— (سنٹرل جیل ناسک)

مخدوم محی الدین

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لَو
جاگ اٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردد کے نقوش
ان کی آنکھوں میں غم دوست اور اندازۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دھن سے دھماکا ہو جائیں
سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

غلام ربانی تاباں

(۱)

سلاخوں کے پیچھے

یہ کیڑے
یہ گندے سے کیڑے
جو زنداں میں ہر گام پر رینگتے پھر رہے ہیں
یہ بھی انساں ہیں
جیسے میں ــــ
جیسے تو ــــ
جیسے شفاف کھدر میں ملبوس کرسی نشین ـــ اپنے آقا
مگر آج بیڑی کی جھنکار میں
نیم مردہ خودی کی صدا کھوگئی ہے
جبر کی چھاؤں میں
تھک کے انسانیت سوگئی ہے
جس طرح خاک کے ڈھیر میں کوئی زندہ شرارہ
مگر میرے ہمدم
شرارے سے شعلے کی منزل
بہت دور بھی تو نہیں ہے
کون جانے ـــ یہ ننھا شرارہ
بھڑک اٹھے شعلوں کا طوفان بن کر
جو زنداں کے ہمراہ صیاد کو بھی جلا دے

(۲)

جیل میں کسی کا خط پا کر

فصلِ بہار میں بھی اسیرِ قفس ہوں میں
گلزار کی فضا کو مرا انتظار ہے
رنگِ فریب کوش کو ہے میری جستجو
بوئے گریز پا کو مرا انتظار ہے
تکتے ہیں میری راہ خیابانِ کیف خیز
دشتِ جنوں فزا کو مرا انتظار ہے
جیسے فسردہ ہوگئی بزمِ صدا و ساز
یارانِ خوش نوا کو مرا انتظار ہے
سونے پڑے ہیں منبر و محرابِ میکدہ
رندانِ باصفا کو مرا انتظار ہے
اے دوست غم کے گہرے اندھیرے میں آج بھی
اک اخترِ وفا کو مرا انتظار ہے
یہ اور بات ہے کہ وہ منہ سے نہ کہہ سکے
اُس پیکرِ حیا کو مرا انتظار ہے
ہیں میرے انتظار میں گیسوئے شام خیز
چشمِ سحر نما کو مرا انتظار ہے
اب بھی کھُلا ہے بابِ ارم میرے واسطے
اب بھی مرے خدا کو مرا انتظار ہے

ترے پا زمیں پہ رُکے رُکے، ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

(بائیکلہ جیل، بمبئی ۱۹۵۱ء)

(۵)

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں، ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعائیں دے رہے ہیں راستے مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

(آرتھر روڈ جیل، بمبئی ۱۹۵۱ء)

احمد ندیم قاسمی

مارچ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء کے آخر تک انھوں نے کس طرح گزر بسر کی، اس کی تفصیل اس مضمون میں نہیں سما سکتی۔ یہ تو ایک الگ داستان ہے۔ مختصراً یہ کہ اب ندیم بھائی نہ صرف شادی شدہ تھے بلکہ دو بیٹیوں کے باپ بھی تھے۔ ایسی حالت میں کوئی باقاعدہ روزگار نہ ہونے کی صورت میں عزت مندانہ طریقے پر زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی دوران چھ مہینے کے لیے سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھی ہو آئے۔ دو ماہ کا عرصہ سی کلاس قیدی کی حیثیت سے گزارا۔ کیونکہ حکام کا کہنا تھا کہ نظربند کو اس کی مالی حیثیت کے مطابق کلاس دی جاتی ہے۔ مگر یہاں تو گرفتاری کے وقت آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ندیم بھیا جیل میں تھے تو ان کے ایک عزیز نے انھیں رہا کرانے کے لیے ان کی امّی کی طرف سے درخواست لکھی اور دستخط کرانے آگئے۔ امّی نے درخواست کا مضمون سن کر صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ندیم نے کب کسی سے معافی مانگی جو میں اس کی طرف سے معافی مانگتی پھروں۔

مارشل لا کے آغاز میں ایک بار پھر سیفٹی ایکٹ کے گونگے بہرے بھوت نے ندیم بھیا کو دبوچ لیا۔ اور ایک بار پھر ندیم بحیثیت اڈیٹر "امروز" ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے، لاہور جیل، راولپنڈی جیل اور وہاں سے شاہی قلعے لاہور کا چکر لگاتے رہے۔ اور اس طرح انھوں نے اپنی قید کے سو دن پورے کیے۔ مگر یہ عجیب بات ہے صاحبِ حیثیت اور برسرِ روزگار ہونے کے باوجود اس بار بھی ندیم کو ایک مہینے تک سی کلاس میں رکھا گیا۔ سی کلاس کا حال شاید سب کو نہ معلوم ہو۔ ایسے قیدیوں کو ریت ملی روٹیاں اور تیل سے بگھاری ہوئی دال کھانے کو ملتی ہے۔ یہ دال اللہ جانے کس نسخے کو سامنے رکھ کر سیاہ رنگ کی تیار کی جاتی ہے۔ اب نظربند چاہے اس کو شبِ دیجور سمجھے، یا بختِ سیاہ یا دال، بہرحال اسے کھانی پڑتی ہے۔ اور پھر نظربند کو غروبِ آفتاب سے قبل کوٹھری کی سلاخوں کے پیچھے غروب ہونا پڑتا ہے اور پھر ساری رات زمین پر سو کر زمین سے عملی محبت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس اثنا میں قیدی باہر نکل نہیں سکتا۔ مگر حشرات الارض کو کوٹھری میں آنے جانے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

(ہاجرہ مسرور)

ظہیر کاشمیری

میں ۲۴ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا۔ شروع میں مجھے امرت سر جیل میں رکھا گیا۔ وہاں میں نے حکام جیل کے تشدد کے خلاف قیدیوں سے بھوک ہڑتال کروادی۔ جس کی پاداش میں مجھے تین ماہ کے لیے قیدِ تنہائی میں پھینک دیا گیا۔ قیدِ تنہائی ختم ہوئی تو مجھے ایک دو جیلوں میں تبدیل کرنے کے بعد بورسٹل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔ بورسٹل جیل میرے لیے بہت بڑی سیاسی درس گاہ ثابت ہوئی۔

ان دنوں بورسٹل جیل میں تقریباً چار سو سیاسی قیدی تھے، جنگِ آزادی کے بوڑھے جرنیل، تازہ دم انقلابی، کانگریسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، انارکسٹ، ...... یہاں سارے شمالی ہند کی "خطرناکیاں" جمع تھیں۔ یہاں مجھے ہر جماعت کی عملی سیاست سمجھنے کا موقع ملا۔

یہاں میں نے پونا اور ستارا کے دہشت پسندوں کی داستانیں سنیں۔ میرٹھ سازش کیس کے واقعات سنے۔ چندر شیکھر آزاد اور اس کے گروپ کے کارناموں سے متعارف ہوا۔ راولپنڈی کے پرانے بم بازوں سے ملا۔ یہاں میں نے مختلف انقلابی تحریکوں کے ان گم نام بہادروں کے تذکرے سنے جو سماج کی داد و دہش سے بے نیاز، انقلابی مشن پورا کرتے ہوئے خوشی سے شہید ہو گئے اور جن کا ذکر شاید کوئی سیاسی تاریخ نہ کر سکے گی۔ بورسٹل جیل کے ایک پرانے محافظ نے مجھے وہ کوٹھری دکھائی، جہاں داس نے مسلسل فاقہ کشی کر کے شہادت خریدی تھی۔ جیل کا وہ محافظ اگرچہ پیشہ ور جلاد تھا اور ان گنت مجرموں کو اپنے ہاتھ سے شکنجوں میں کس چکا تھا اس کے باوجود جب وہ داس کی قربانی کے چشم دید واقعات سنا رہا تھا تو اس کی خشخشی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

بورسٹل جیل میں ہم نے کرتی، کمیونسٹ اور سوشلسٹ کارکنوں پر مشتمل، انتہا پسند بلاک کی بنیاد رکھی۔ اپنے وارڈ کے سب سے اونچے درخت پر سرخ جھنڈا نصب کیا۔ کھلے میدان میں قلعی چونے سے بہت بڑا درانتی ہتھوڑا بنایا اور ہر صبح "سارا اسنسار ہمارا ہے" کے جذبات آفریں کورس نے جیل بھر کو لرزانا شروع کر دیا۔ 'انتہا پسند بلاک' کی نوعیت زیادہ تر دائرۂ مطالعہ ہی کی تھی۔ یہاں میں نے دوسرے رفیقوں کی مدد سے مارکسیت کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ جدلی مادیت، مارکس کا فلسفۂ تاریخ اور نظریۂ اقتصادیات بغور پڑھا۔ اور اس پر بحثیں کیں۔ مختلف ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کی لافانی جدوجہد سے واقفیت حاصل کی۔ پیرس، جرمنی اور بلغاریہ کے انقلابیوں کی ناکامی کو سائنٹیفک طور پر سمجھا۔ چین کی صبر آزما عوامی سرگرمیوں پر لیکچر سنے، دوسری عالمگیر جنگ سے پیدا ہونے والے ناگزیر واقعات کا شعور حاصل کیا۔ جدید

علوم کی اس باقاعدہ تحصیل نے میری ساری شخصیت اور میرے نظریۂ علم کو یکسر بدل دیا۔ مجھے کالج میں حاصل کیے ہوئے نظری علوم کھوکھلے اور گھٹیا معلوم ہونے لگے۔ جرمن مادیت کے مقابلے میں یونانی فلسفہ مجھے اپنی بے پناہ افادیت کے باوجو گھٹیا معلوم ہونے لگا۔ لاک، بینتھم، ہیوم اور دیگر انگلستانی مفکر نیم پختہ عقلیت پسند نظر آئے، فرانس کے مادہ پرست میکانکی معلوم ہوئے، کانٹ کے اخلاقی کلیے اور ہیگل کا فلسفۂ تاریخ بالترتیب بے معنی عمومیت اور روحانیت کے ڈھنڈورچی نظر آئے جرمن مادیت سے مجھے کائنات کے بنیادی اصولوں کا شعور ہی نہیں ملا بلکہ اس سے مجھے مادی طاقتوں کے عمل اور ردِّ عمل کا بھی پتہ چلا۔ معاشرتی ارتقا کے متعلق سائنٹیفک اور تفصیلی علم ملا۔ مجھے پتہ چلا کہ مارکسیت محض فن ہی نہیں، بہت بڑی سائنس ہے۔ نظریہ نہیں، عمل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا مٹ جانا اتنا ہی یقینی ہے، جتنا تمازتِ آفتاب سے شبنم کا ناپید ہوجانا اور عالمگیر اشتراکی انقلاب کا کامیاب ہونا اتنا ہی یقینی ہے، جتنا بہار کے موسم میں رنگ برنگ پھولوں کا اجتماعی شان سے لہرانا۔

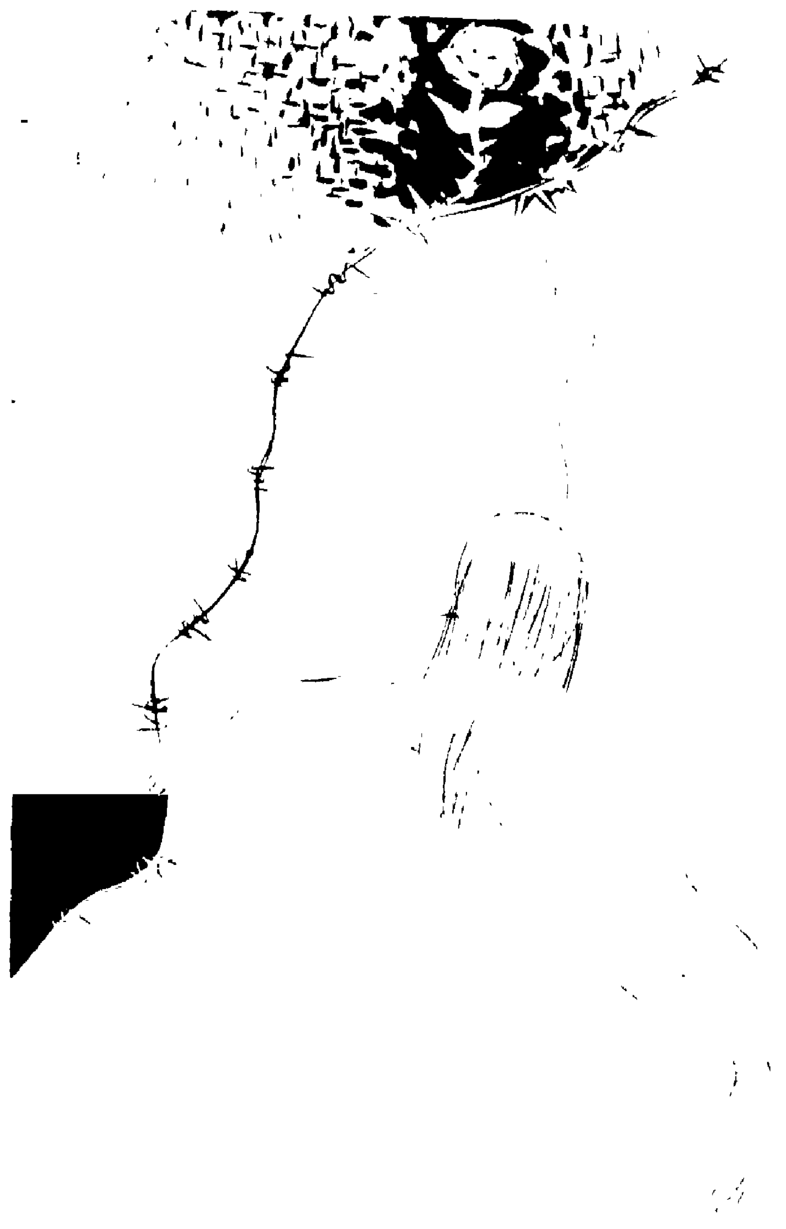
ان علوم نے میرے نظریۂ ادب اور موضوعات پر فیصلہ کن اثرات چھوڑے۔ یہی وہ روشنی تھی جس سے میں آج تک اپنی ہیئتوں کو روشن کرتا رہا۔ تاریخ کا مادّی تجزیہ کرنے سے مجھے کئی ایسی سماجی روایتیں نظر آئیں جو ہزارہا سال سے انسان کو گھن کی طرح کھائے جارہی تھیں لیکن جنھیں بزدل اور توہم پرست انسان مضر اور غیر افادی سمجھنے کے باوجود اپنانے پر مصر تھے۔ میری تمام نظمیں، جن میں متروک سماجی قدروں پر نکتہ چینی کی گئی ہے، اسی دور کے مطالعے سے پیدا ہوئیں اور آج بھی یہ مطالعہ میرا سب سے بڑا محافظ ہے۔ میں نے غلط قومی تصورات کی مخالفت کی اور سچی بین الاقوامیت کی حمایت کی۔ میں نے الوہیت کے جامد تصور اور منظم مذہب کو حکومتی اداروں کا استحصالی آلہ سمجھ کر جھٹلایا۔ زندگی کے مادی تصور کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ آمرانہ اور سرمایہ پرستانہ قانون کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا۔ تقدیر کی جبریہ تشریحوں کی مذمت کی۔ فطرت اور انسان کے باہمی رشتوں پر جدید اور صحت مند زاویوں سے روشنی ڈالی اور طبقوں کی انمٹ جد و جہد کو اُجاگر کیا۔

میں ۱۹۴۲ء کے وسط میں رہا ہوا۔

(اقتباس ۔ دیباچہ عظمتِ آدم)



افسانے



اماوس کی رات

پریم چند

— ۱ —

دیوالی کی شام تھی۔ سری نگر کے گھوروں اور کھنڈروں کے بھی نصیب جاگ گئے تھے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے چمکتی ہوئی تھالیوں میں غ لیے ہوئے مندروں کو جاتے تھے۔ چراغوں سے زیادہ ان کے چہرے روشن تھے۔ ہر در و دیوار روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ صرف پنڈت دیودت کا ہفت لہ محل تاریکی میں کالی گھٹا کی طرح خاموش اور خوف ناک کھڑا تھا۔ خاموش اس لیے کہ ایام رفتہ کی یاد سے دل بھرا ہوا تھا۔ اور خوفناک اس لیے کہ گاہٹ گویا اسے چڑا رہی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ حسد بھی اسے دیکھ دیکھ کر ہاتھ ملتا تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ حقارت بھی اس پر مسکراتی ہے —— ازے پر وردی پوش دربانوں کے بجائے اب مدار اور ارنڈ کے درخت کھڑے تھے۔ دیوان خانہ میں اب ایک عاشق تن سانڈ ایڈا کرتا تھا۔ اور غانوں پر ماہرین فن کے نغمۂ دلاویز کے بجائے اب جنگلی کبوتروں کی مستانہ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی انگریزی مدرسے کے طالب علم کے اخلاق کی طرح اس یادیں ہل گئی تھیں اور اس کی دیواریں کسی بیوہ کے جگر کی طرح چاک تھیں۔ بیدادِ زمانہ کا شکوہ کرنا فضول ہے۔ یہ کج فہمی اور کم اندیشی کی عبرت ناک نان تھی۔

اماوس کی رات تھی۔ روشنی کے مقابلے کی تاب نہ لا کر تاریکی نے اسی عالی شان محل میں پناہ لی تھی۔ پنڈت دیودت اپنے نیم تاریک کمرے میں خاموش نفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ایک مہینے سے ان کی بیوی گرجا کی زندگی بے رحم موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ غربت افلاس کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لیے تیار۔ فلسفۂ تقدیر انھیں تشفی دیتا تھا لیکن یہ نئی مصیبت قوت برداشت سے باہر تھی۔ بے چارے دن کے دن گرجا کے سرہانے بیٹھے اس کے مرجھاتے ہوئے کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے اور رونے تھے۔ گرجا جب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روتی تو وہ اسے سمجھاتے —— "گرجا نہ رو۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤگی۔"

پنڈت دیودت کے بزرگوں کا کاروبار بہت فروغ پر تھا۔ وہ لین دین کیا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کے بیوپار بڑے بڑے تعلقہ داروں اور راجاؤں ساتھ تھے۔ اس زمانے میں ایمان اتنا ارزاں نہیں بکتا تھا۔ سادے رقعوں اور پرزوں پر لاکھوں کی باتیں ہو جاتیں مگر ۱۸۵۷ء کی شورش نے کتنے ملاقوں اور ریاستوں کو مٹا دیا اور ان کے ساتھ دیواریوں کا یہ متمول گھرانہ بھی خاک میں مل گیا۔ اثاثہ لٹ گیا۔ بہی کھاتے پنساریوں کے کام آئے۔ جب من و امان ہوا، ریاستیں پھر سنبھلیں تو زمانہ پلٹ چکا تھا۔ قول تحریر کا محتاج ہو چکا تھا اور تحریر میں سادہ اور رنگین کی تمیز پیدا ہو گئی تھی۔ جب دیودت ہوش سنبھالا تو اس کے پاس ایک کھنڈر کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی۔ اب گزران کی صورت مفقود تھی۔ کاشت کاری میں محنت اور پریشانی تھی۔ رت کے لیے سرمایہ نہ تھا، نہ دماغ۔ علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ کوئی ملازمت کرتے۔ خاندانی وقار خیرات لینے میں مارج تھا۔ بس سال میں دو تین پنے بیوپاریوں کے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح جاتے اور جو کچھ رخصتانہ اور زاد راہ ملتا، اسی پر گزران کرتے۔ خاندانی حشمت کی یادگار کچھ باقی تو وہ ان رقعوں اور ہنڈیوں کا ایک پلندہ تھا۔ جن کی سیاہی بھی حرف باطل کی طرح مٹ چکی تھی۔ پنڈت دیودت انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

دوج کے دن جب گھر گھر لکشمی کی پوجا ہوتی ہے ۔ پنڈت جی اس پلندے کی بہت اہتمام کے ساتھ پرستش کرتے ۔ لکشمی نہ سہی لکشمی کی یادگار تو تھی ۔ دوج کا دن ان کی ثروت کے شرادھ کا دن تھا ۔ اسے چاہے بوالہوسی کہو، چاہے کمزوری ۔ مگر پنڈت ممدوح کو ان پرزوں پر بڑا ناز تھا ۔ آئے دن کی مناقشات میں یہ بوسیدہ کاغذی فوج بڑا کام کرتی اور فریق مخالف کو اپنی ہار ماننی پڑتی ۔ اگر سترپشتوں سے ہتھیار کی صورت نہ دیکھنے پر لوگ چھتری ہونے کا فخر کر سکتے ہیں تو پنڈت دیودت کو ان نوشتوں پر فخر کرنا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا، جن میں ۷ لاکھ کی رقم چھپی ہوئی تھی ۔

— ۲ —

وہی اماوس کی رات تھی مگر چراغ اپنی مختصر زندگیاں ختم کر چکے تھے اور رات کی تاریکی میں زیادہ اخلاقی تاریکی کا غلبہ تھا ۔ چوروں اور جواریوں کے لیے شگون کی رات تھی کیونکہ آج کی ہار سال بھر کی ہار ہوتی ہے ۔ لکشمی کی آمد آمد تھی اس لیے ان کا پیش خیمہ آ چکا تھا ۔ جابجا کوڑیوں پر اشرفیاں لٹ رہی تھیں ۔ پیر مغاں بھی آج نخرے کر رہا تھا ۔ میخانے میں شراب کے بدلے پانی بک رہا تھا ۔ پنڈت دیودت کے سوا قصبے میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو دوسروں کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں نہ ہو ۔ آج صبح ہی سے گرجا کی حالت خراب تھی اور سرشام سے اس پر غشی طاری تھی ۔ یکایک اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بہت مدھم آواز سے بولی ——" آج تو دیوالی ہے ۔"

دیودت ایسا بے دل اور نراس ہو رہا تھا کہ گرجا کو ہوش میں بھی دیکھ کر اسے خوشی نہ ہوئی ——" ہاں آج دیوالی ہے ۔" گرجا نے آرزومند نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا " ہمارے گھر میں کیا دیے نہ جلیں گے ؟"

دیودت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ گرجا نے پھر اسی لہجے میں کہا ——" دیکھو آج برس برس کے دن گھر اندھیرا رہ گیا ۔ مجھے اٹھا دو ۔ میں اپنے گھر میں دیے جلاؤں گی ۔"

یہ باتیں دیودت کے دل میں چبھی جاتی تھیں ۔ انسان کے آخری لمحے خوشیوں اور آرزوؤں کے خیال میں کٹتے ہیں ۔ گرجا موت کے منہ میں تھی مگر آرزوؤں کا خواب دیکھ رہی تھی ۔

اس قصبہ میں لالہ شنکر داس مشہور وید تھے ۔ ضلع کی آیورویدک سوسائٹی کی روح رواں ۔ اوشدھالیے میں ادویہ کے بجائے چھاپنے کی پریس رکھے ہوئے تھے ۔ دوائیں کم بنتی تھیں مگر اشتہار زیادہ چھپتے تھے ۔ چرک اور سسشرت پر قانع نہ ہو کر انھوں نے نئے طبی اصولوں کی تلقین شروع کی تھی ۔ تندرستی انسان کا طبعی حق ہے ۔ بیماری صرف ایک رئیسانہ تکلف ہے اور پولیٹیکل اکانومی کے مسئلہ کے مطابق تکلفات سے جس قدر زیادہ ممکن ہو ٹیکس لینا چاہیے ۔ اسی اصول پر وہ مریضوں کے ساتھ مطلق رُو رعایت نہیں کرتے تھے ۔ اگر کوئی غریب ہو تو ہو ۔ اگر کوئی مرتا ہے تو مرے ۔ اسے کیا حق ہے کہ وہ بیمار پڑے اور مفت میں علاج کرائے ۔ ہندوستان کی یہ حالت بہت کچھ مفت علاج کے ہاتھوں ہوتی ہے ۔ اس نے آدمیوں کو بے احتیاط اور کمزور بنا دیا ہے ۔ دیودت مہینہ بھر سے روز ان کے یہاں دوا لینے آیا کرتا تھا ۔ لیکن ویدجی کبھی ایسی ہمدردی سے مخاطب نہ ہوئے کہ اسے عرض حال کا حوصلہ ہوتا ۔ ان کے دل کے کمزور حصے تک پہنچنے کے لیے اس نے بہت ہاتھ پیر چلائے ۔ آنکھوں میں آنسو بھر بھرے آتا مگر ویدجی کا دل مضبوط تھا اس میں کمزور حصہ تھا ہی نہیں ۔

وہی اماوس کی ڈراؤنی رات تھی ۔ آسمانی شمعیں آدھی رات گزرنے پر اب اور بھی زیادہ روشن ہو گئی تھیں ۔ گویا وہ سری نگر کے بجھے ہوتے چراغوں پر فاتحانہ مسرت کے ساتھ مسکرا رہی تھی ۔ دیودت ایک عالم اضطراب میں گرجا کے سرہانے سے اُٹھے اور ویدجی کے مکان کی طرف چلے ۔ وہ جانتے تھے کہ لالہ اتنی رات گئے بلا اپنا حق خدمت لیے ہرگز نہ آئیں گے لیکن مایوسی میں بھی امید پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ دیودت قدم آگے بڑھاتا چلا جاتا تھا ۔

— ۳ —

حکیم جی اس وقت اپنی مجرب تیر بہدف "امرت بندو" شتہار لکھنے میں محو تھے اور اس اشتہار کی پرتاثیر عبارت ۔ مصورانہ رنگینی اور

پرزور کشش کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ حکیم حاذق تھے۔ یا ناشر جادو طراز۔

"ناظرین! آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ کا زرد چہرہ آپ کا تنِ لاغر۔ آپ کا ذرا سی محنت میں بے دم ہو جانا۔ آپ کا لذّات دنیا سے بے فیض رہنا۔ آپ کی خانہ تاریکی۔ یہ سب اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔ سنئے میں کون ہوں۔ میں وہ شخص ہوں جس نے امراضِ انسانی کو پردۂ دنیا سے معدوم کر دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے جس نے اشتہار باز جَو فروش گندم نما۔ نام نہاد حکیموں کو بیخ و بُن سے کھود کر دنیا کو پاک کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ میں وہ حیرت انگیز انسان ضعیف البیان ہوں جو ناشاد کو دلشاد۔ نامراد کو بامراد بھگوڑے کو دلیر۔ گیدڑ کو شیر بناتا ہوں اور یہ کسی جادو سے نہیں۔ منتر سے نہیں۔ یہ میری ایجاد کردہ "امرت بندو" کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ امرت بندو کیا ہے اسے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ مہرشی اگست نے دھنونتری کے کان میں اس کا نسخہ بتلایا تھا۔ جس وقت آپ وی۔پی۔ پارسل کھولیں گے آپ پر اس کی حقیقت روشن ہو جائے گی۔ وہ آبِ حیات ہے۔ وہ مردانگی کا جوہر۔ فرزانگی کی اکسیر۔ عقل کا منبع اور ذہن کا صیقل ہے۔ اگر برسوں کی سخن بازی نے بھی آپ کو شاعر نہیں بنایا۔ اگر شبانہ روز کی رٹنت پر بھی آپ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اگر دلالوں کی خوشامد اور موکلوں کی نازبرداری کے باوجود آپ احاطہ عدالت میں بھوکے کتے کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ گلا پھاڑ پھاڑ چیخنے اور میز پر ہاتھ پیر پٹکنے پر بھی اپنی تقریر میں کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتے تو آپ امرت بندو کا استعمال کیجیے۔ اس کا سب بڑا فائدہ جو پہلے ہی دن معلوم ہو جائے گا، یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ پھر کبھی اشتہار باز حکیموں کے دامِ فریب میں نہ پھنسیں گے۔"

ویدجی اس اشتہار کو ختم کرکے اسے باآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غرور کا جائزہ اور آنے والی کامیابی کی امید جھلک رہی تھی کہ اتنے میں دیودت نے باہر سے آواز دی۔ ویدجی بہت خوش ہوئے۔ رات کے وقت ان کی فیس دوگنی تھی۔ لالٹین لیے ہوئے باہر نکلے تو دیودت روتا ہوا ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا۔ ویدجی! اس وقت مجھ پر رحم کیجیے۔ گرجا اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ یوں تو میرے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا مگر اس وقت آپ چل کر ذرا اسے دیکھ لیں تو میرے آنسو پچھ جائیں گے۔ مجھے تسکین ہو جائے گی کہ اس کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ ایشور جانتا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں لیکن جب تک جیوں گا آپ کا جس گاؤں گا اور آپ کے اشاروں کا غلام بنا رہوں گا۔

حکیم جی کو پہلے تو ترس آیا مگر یہ جگنو کی چمک تھی جو بہت جلد خود غرضی کی تاریک وسعت میں غائب ہو گئی۔

—— ۴ ——

وہی اماوس کی رات تھی۔ جھڑوں پر بھی سناٹا چھا گیا۔ جیتنے والے اپنے بچوں کو نیند سے جگا جگا کر انعام دے رہے تھے۔ ہارنے والے اپنی ناہمدرد اور پُرغضب بیویوں سے عذرِ گناہ کرتے تھے کہ اتنے میں گھنٹوں کی گونجتی ہوئی مبہم آوازیں۔ ہوا اور تاریکی کو چیرتی ہوئی کان میں آنے لگیں۔ ان کا مستانہ انداز اس عالم خموشی میں بہت ہی سہانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ آوازیں قریب ہوتی گئیں اور بالآخر پنڈت دیودت کے مکان کے پاس آکر اس کی وسعت پریشان میں غائب ہو گئیں۔ پنڈت جی اس وقت یاس کے بحرِ بے پایاں میں غوطے کھا رہے تھے۔ افسوس! میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی جان سے عزیز گرجا کی دوا درپن کر سکوں۔ کیا کروں! اس بے درد حکیم کو یہاں کیسے لاؤں۔ ظالم! میں ساری عمر تیری غلامی کرتا۔ تیرے اشتہار چھاپتا۔ تیری دوائیں کوٹتا۔ آج پنڈت جی کو یہ ناگوار اور ہمت شکن تجربہ ہوا کہ ستر لاکھ کے رقعے اور کاغذ اتنی کوڑیوں کے مول بھی نہیں۔ خاندانی وقار کا سراب آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گیا۔ انھوں نے اس مخملی جزدان کو صندوق سے باہر نکالا اور ان رقعات کو جو خاندانی ثروت کے باقیات صالح تھے اور جن کی عزت کی طرح نگہداشت کی جاتی تھی ایک ایک کرکے چراغ کی نذر کرنے لگے۔ جس طرح ناز و نعمت میں پلا ہوا جسم چتا کی بھینٹ ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کاغذی ہستیاں اس شمع کے دہن آتشیں کا لقمہ ہو جاتی تھیں۔ اتنے میں کسی نے باہر سے پنڈت جی کو پکارا۔ انھوں نے چونک کر سر اٹھایا، خواب سے بیدار ہوئے۔ اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دروازہ پر آئے تو دیکھا کہ کئی آدمی مشعلیں لیے ہوئے کھڑے ہیں اور

ایک ہاتھی اپنی سونڈ سے ان ارنڈ کے درختوں کو اکھاڑ رہا ہے جو دروازے پر دربانوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہاتھی پر ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر زعفرانی رنگ کی ریشمی پاگ ہے۔ ماتھے پر چندن کا ہلالی ٹیکہ۔ بھالے کی طرح تنی ہوئی نوک دار مونچھیں۔ چہرے سے رعب اور جلال نمایاں۔ کوئی سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلی دار انگرکھا اور چناؤ دار پائجامہ۔ کمر میں لٹکتی ہوئی تلوار اور گردن میں طلائی کنٹھے اور زنجیر اس کے مردانہ جسم پر بہت زیب دے رہے تھے۔ پنڈت جی کو دیکھ کر اس نے رکاب پر پاؤں رکھا اور نیچے اتر کر ان کی تعظیم کی۔ اس کے مودبانہ اخلاق سے کچھ نادم ہو کر پنڈت جی بولے۔ آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟

نوجوان نے بہت منت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بشرہ سے شرافت برستی تھی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔ غریب خانہ راج نگر میں ہے۔ وہاں کا جاگیردار ہوں۔ میرے بزرگوں پر آپ کے خاندان نے بہت احسان کیے ہیں۔ میری اس وقت جو کچھ عزت اور جاہ ہے وہ سب آپ کے بزرگوں کی شفقت اور کرم کا طفیل ہے۔ میں نے اپنے چند رشتہ داروں سے آپ کا نام سنا تھا اور مجھے عرصے سے آپ کے درشنوں کی آرزو تھی۔ آج وہ مبارک موقع مل گیا اور میرا جنم سپھل ہوا۔

پنڈت دیودت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خاندانی حشمت کا غرور ان کے دل کا نازک ترین حصہ تھا۔ وہ بے لبسی جوان کے چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ ذرا دیر کے لیے رخصت ہو گئی۔ فاخرانہ انداز سے بولے —— "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے۔ جو ایسا فرماتے ہیں ورنہ میں تو ننگ خاندان ہوں اس قابل بھی نہیں کہ اپنے آپ کو ان بزرگوں کی اولاد کہہ سکوں۔" اتنے میں خادموں نے صحن میں فرش بچھا دیا۔ دونوں آدمی اس پر بیٹھے اور باتیں ہونے لگیں۔ وہ باتیں جن کا ہر جملہ پنڈت دیودت کے چہرہ کو اس طرح شگفتہ کر رہا تھا جس طرح نسیم سحر پھولوں کو کھلا دیتی ہے۔ پنڈت جی کے جد بزرگوار نے نوجوان ٹھاکر کے دادا کو پچیس[۲۵] ہزار روپے قرض دیے تھے۔ ٹھاکر اب گیا میں جا کر اپنے بزرگوں کا شرادھ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کے ذمہ جو کچھ قرض ہو اس کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے۔ ٹھاکر کو پرانے کاغذات میں یہ واجب الادا رقم نظر آئی۔ پچیس[۲۵] ہزار کے اب پچھتر[۷۵] ہزار ہو چکے تھے وہی قرض چکانے کے لیے ٹھاکر دو سو میل کی منزل طے کر کے آیا تھا۔ مذہب ہی وہ قوت ہے جو دل میں ارادت کا جوش پیدا کر دیتی ہے۔ ہاں اس جوش سے متاثر ہونے کے لیے ایک پاکیزہ بے لوث دل کی ضرورت ہے ورنہ وہی ارادت سیہ کاری اور شقاوت پر اتر آتی ہے۔ آخر ٹھاکر نے پوچھا —— "آپ کے یہاں تو وہ رقعہ ہوگا؟"

دیودت کا دل بیٹھ گیا۔ سنبھل کر بولے —— "غالباً ہوگا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا —— "اسے تلاش کیجیے اگر مل جائے تو میں لیتا جاؤں گا۔"

پنڈت دیودت اُٹھے مگر دل سرد۔ کیا یہ تقدیر کی ستم ظریفیاں ہیں۔ جو یوں سبز باغ دکھا رہی ہیں۔ کون جانے وہ پرزہ جل کر خاک ہو گیا ہے یہ بھی تو نہیں معلوم وہ پہلے بھی تھا۔ یا نہیں لیکن نہ ملا تو روپے کون دیتا ہے۔ افسوس! دودھ کا پیالہ سامنے آ کر ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ اے ایشور! وہ پرزہ مل جائے میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اب مجھ پر دیا کرو۔ اس طرح امید و بیم کی حالت میں دیودت اندر گئے اور چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بچے ہوئے نوشتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دفعتاً وہ اچھل پڑے اور ایک اضطراری جوش بلکہ دیوانگی مسرت کے عالم میں دو تین بار کودے تب دوڑ کر گرجا کو گلے سے لگایا اور بولے: پیاری ایشور نے چاہا تو اب تم بچ جاؤ گی۔ اس مدہوشی میں انھیں مطلق نہ معلوم ہوا کہ گرجا اب وہاں نہیں ہے۔ صرف اس کی لاش ہے۔ اس نے رقعے کو اٹھا لیا اور دہلیز تک ایسی تیزی سے آیا گویا پاؤں میں پر لگ گئے ہیں مگر یہاں اس نے اپنے آپ کو روکا اور مسرت قلب کی امڈتی ہوئی لہروں کو روکتے ہوئے ٹھاکر سے بولا: یہ لیجیے وہ رقعہ مل گیا اتفاق کی بات ہے ورنہ ستر لاکھ کے کاغذ دیمکوں کی خوراک بن گئے۔

غیر متوقع کامیابی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے جب ٹھاکر نے اس رقعہ کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دیودت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اسے چاک نہ کر ڈالے۔ حالانکہ یہ اندیشہ بالکل بے معنی تھا مگر انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ ٹھاکر نے اس کے سوءِ ظن کو تاڑ لیا۔ ایک ترحم آمیز تبسم کے ساتھ اس نے رقعہ کو لیا اور مشعل کی روشنی میں دیکھ کر بولا: اب مجھے کامل اطمینان ہو گیا یہ لیجیے آپ کی امانت آپ کی نذر ہے۔ دعا کیجیے کہ میرے بزرگوں

کی مکتی ہو جاتے۔
یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر سے ایک خریطہ نکالا اور اس میں سے ایک ایک ہزار کے پچھتر نوٹ نکال کر دیودت کو دے دیے۔ پنڈت جی کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا اور نبض اچھلی پڑتی تھی۔ انھوں نے اِدھر چوکنی نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں کوئی غیر تو نہیں کھڑا ہے اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو لے لیا۔ اظہار عالی ظرفی کی بے سود کوشش میں ان کاغذوں کو گنا بھی نہیں۔ صرف اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر انھیں سمیٹا اور جیب میں ڈال لیا۔

—— ۵ ——

وہی اماوس کی رات تھی۔ آسمانی شمعیں بھی دھندلی ہو چلی تھیں۔ ان کی فنا حرارت و حیات کے دیوتا کے آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ستارۂ صبح سفیدۂ نور کے ساتھ یہ بشارت دینے کے لیے نمودار ہو چکا تھا۔ مسلط نیلگوں سیاہی نئے رنگوں اور اثروں کے مقابلہ میں سرحدی افقوں سے وسط آسمان میں ہٹی جاتی تھی۔ اُفق مشرق فیروزہ بانا پہن چکا تھا اور افق مغرب ہلکے اودے رنگ کی طرف مائل تھا۔ پنڈت دیودت ٹھاکر کو رخصت کرکے گھر میں چلے۔ اس وقت اس کا دل فیاضی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ خوش اعتقادی کی لہر اٹھی ہوئی تھی۔ کوئی سائل اس وقت ان کے دروازے سے بے فیض نہ جا سکتا۔ ست نارائن کی کتھا سننے کا اور دھوم دھام کے ساتھ سننے کا فیصلہ ہو چکا۔ گرجا کے لیے گہنے اور کپڑے کے منصوبے بندھ چکے اندر پہنچتے ہی انھوں نے سالگرام کے سامنے سچے دل سے سر جھکایا اور تب باقی ماندہ رقعوں کو سمیٹ کر بہ حفاظت تمام اسی مخملی جزدان میں رکھ دیا۔ اس لیے نہیں کہ شاید ان مردوں سے پھر کوئی زندہ ہو بلکہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ خاندانی شوکت و ثروت پر فخر کر سکتے تھے۔ وہ صابرؔ قناعت کے جوش میں مست تھے۔ بس اب مجھے زندگی میں مال و دولت کی ضرورت نہیں۔ ایشور نے مجھے اتنا دے دیا ہے۔ اس میں میری اور گرجا کی زندگی پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال گدگدا رہا تھا کہ جس وقت گرجا یہ خوش خبری سنے گی، اس وقت ضرور اٹھ بیٹھے گی۔ فکر اور تکلیف نے اس کی یہ گت بنادی ہے جسے کبھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوئی۔ جو بیکسانہ قناعت اور مایوسانہ صبر کی دل فگاریوں سے کبھی آزاد نہ ہوئی۔ اس کی حالت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گرجا کے پاس گئے اور اسے آہستہ سے ہلا کر کہا —— "گرجا آنکھیں کھولو۔ دیکھو ایشور نے تمھاری بنتی سن لی اور ہمارے اوپر دَیا کی۔ کیسی طبیعت ہے؟"
مگر جب گرجا ذرا بھی نہ سنکی تو انھوں نے چادر ہٹادی اور اس کے منھ کی طرف دیکھا۔ سینہ سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے خون کے قطرے نکل آئے۔ آہ! کیا یہ دولت اتنی گراں قیمت پر ملی ہے! کیا ایشور کے دربار سے مجھے اس پیاری جان کی قیمت دی گئی ہے۔ ایشور تم خوب انصاف کرتے ہو۔ مجھے گرجا کی ضرورت ہے۔ روپیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سودا بہت گراں ہے!

—— ۶ ——

اماوس کی اندھیری رات گرجا کی تاریک زندگی کی طرح ختم ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے کسانوں کے گانے کی بلند اور سہانی آوازیں آرہی تھیں۔ سردی سے کانپتے ہوئے بچے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے۔ پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لیے نہیں بلکہ ہنسنے کے لیے کوئی گھڑے کو کنوئیں میں ڈالے اپنی پوپلی ساس کی نقل کر رہی تھی۔ کوئی ستون سے چمٹی ہوئی اپنی سہیلی سے راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی۔ بوڑھی عورتیں روتے ہوئے پوتوں کو گود میں لیے اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں، جو گھنٹہ بھر ہوئے اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹی تھیں مگر راج وید لالہ شنکر داس ابھی تک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ کھانستے ہوئے بچے اور کراہتے ہوئے بوڑھے ان کے دواخانہ کے دروازہ پر جمع ہو چکے تھے۔ اس مجمع بے تمیزی سے کچھ دور ہٹ کر دو تین خوش وضع مگر زرد رو نوجوان سر جھکائے ٹہلتے نظر آتے تھے اور ویدجی سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے بدن، سرخ آنکھیں۔ چہرہ سے وحشت برستی ہوئی۔ کاغذ کا ایک پلندہ لیے دوڑے ہوئے آئے اور دواخانہ

کے دروازے پر اتنی زور سے ہانک لگائی کہ ویدجی چونک پڑے اور کہار کو آواز دی کہ جاکر دروازہ کھول دے۔ یہ حضرت بڑی رات گئے کسی برادری کی پنچایت سے لوٹے تھے۔ انھیں گراں خوابی کا مرض تھا۔ جو باوجود حکیم جی کے مسلسل زبانی طبّی نسخوں کے کم نہ ہوتا تھا بارے آپ اینڈتے ہوتے اُٹھے۔ اور دروازہ کھول کر اپنے حقہ چلم کی فکر میں آگ ڈھونڈنے چلے گئے۔ حکیم جی چلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یکایک دیودت ان کے روبرو جاکر کھڑے ہوگئے اور نوٹوں کا پلندہ ان کے آگے پٹک کر بولے۔ ویدجی! یہ پچھتر ہزار کے نوٹ ہیں۔ یہ آپ کا شکرانہ اور آپ کی فیس ہے۔ آپ چل کر گرجا کو دیکھ لیجیے اور ایسا کچھ کیجیے کہ وہ صرف ایک بار آنکھ کھول دے۔ یہ اس کی ایک نگاہ کا صدقہ ہے صرف ایک نگاہ کا۔ آپ کو روپے انسان کی جان سے زیادہ پیارے ہیں۔ وہ آپ کی نذر ہیں۔ مجھے گرجا کی ایک ایک نگاہ ان روپیوں سے کئی گنی پیاری ہے۔"

ویدجی نے ندامت آمیز ہمدردی سے دیودت کی طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ مجھے افسوس ہے میں ہمیشہ کے لیے تمہارا گنہ گار ہوں مگر تم نے مجھے سبق دے دیا۔ ایشور نے چاہا تو اب ایسی غلطی نہ ہوگی مجھے افسوس ہے۔ واقعی سخت افسوس ہے!

یہ باتیں ویدجی کے دل سے نکلی تھیں۔

کفن

پریم چند

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہوگیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ "مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اس کے ساتھ اتنی بیوپھائی۔"

"مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹے بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اس لیے اسے کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ کر لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا، اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشت کاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں دو چار مٹی کے برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے

اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ میں مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے؟ اس کی چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا، یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تمہیں جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہ تھا۔ اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اگھڑا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہوگیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو، جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرپنچ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کر رہا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھے۔ اس لیے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اسی کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوریاں کھلائی تھیں۔ سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوریاں

کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ۔ ایک رس دار ترکاری، دہی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی، جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی ہوئی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ اِئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جاکر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا؟ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کِپھایت سوجھتی ہے۔ ساری بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے۔ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کِپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوریاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں۔" آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا۔ اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جاکر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غمزدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں، وعدے پر کام نہ کرنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھروالی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مدا وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک۔ تباہ ہو گئے۔ گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔"

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش"۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہوگئی۔ کسی نے غلہ دے دیا کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے اور لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔
گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آآکر لاش کو دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کی مل گئی ہے۔ کیوں مادھو؟"
مادھو بولا۔ "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کفن چاہیے"۔
"تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں"۔
"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کفن کون دیکھتا ہے"۔
"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کفن چاہیے"۔
"کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے"۔
"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے"۔

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے۔ اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک لی اور پھر دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔
کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔
گھیسو بولا۔ "کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"
مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ باہمنوں کو ہزاروں روپے کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں"۔
"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"
"لیکن لوگوں کو کیا جواب دوگے؟ لوگ پوچھیں گے کفن کہاں ہے؟"
گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا پر ملے نہیں"۔
مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا "بڑی اچھی تھی بے چاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر"۔
آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹپٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں

شراب خانے کے سامنے دکان تھی۔ مادھولپک کر دونوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہوگئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جوابدہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز میں بولا " ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔" ضرور سے ضرور ہوگا۔ بھگوان تم انترجامی ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحے کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔" کیوں دادا ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہ دیا تو کیا کہو گے ؟"

"کہیں گے تمھارا سر۔"

" پوچھے گی تو ضرور۔"

" تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا ؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے، میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیں گے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا" کون دے گا ؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیے۔"

گھیسو تیز ہوگیا۔" میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں ؟"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں ؟"

" وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اس طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا جاتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، میخانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا کوئی بہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سُرور تھا ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلو ہی میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزا لینے کے لیے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مُردہ ہیں یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں —— کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے دینے کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔ گھیسو نے کہا" لے جا کھوب کھا اور آشیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مرگئی مگر تیرا آشیرباد اسے ضرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے آشیرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔" مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔" وہ بیکنٹھ میں جائے گی دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔" گھیسو

کھڑا ہوگیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا ۔" ہاں بیٹا بیکنٹھ بن جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کے دھونے کے لیے گنگا نہاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں"۔

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا — نشے کی خاصیت سے یاس اور غم کا دورہ ہوا ۔ مادھو بولا ۔" مگر دادا بے چاری نے جندگی میں بڑا دُکھ بھوگا ۔ مری بھی کتنا دُکھ جھیل کر"۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا ! کُھس ہو کہ وہ مایا جال سے مُکت ہوگئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی ۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے"۔

اور دونوں وہیں کھڑے ہوکر گانے لگے۔

"ٹھگنی کیوں نیناجھمکاوے ٹھگنی"۔

سارا میخانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمورِ محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے ۔ پھر دونوں ناچنے لگے ۔ اُچھلے بھی ۔ کودے بھی ۔ گرے بھی ۔ مٹکے بھی ۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشے سے بدمست ہوکر وہیں گر پڑے ۔

میلہ گھومنی

علی عباس حسینی

کانوں کی سنی نہیں کہتا۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعے کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے، رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا:

دو بھائی تھے۔ چنو اور منو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا۔ اور دادیہال سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے۔ اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت کو سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انھوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیے۔ وہ دونوں پلے بڑھے۔ اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا۔ اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انھوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باندھ دیا۔ مگر منو منہ چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی، ہر سمت اور ہر محلّے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انھوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی، سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا "اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔"

اس نے آہستہ سے کہا "تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجیے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی توم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا، ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انھیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل و صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ

ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں. پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی ہوئی ہے۔ سیدانی بی اس درزی کی حرکات سُن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی، اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا—

"اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمھارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جیسوں نے نو وارد کی خبر دی۔ ایک صاحب جو ذرا ظریف بھی تھے، اس کی تاریخ یوں بیان کی۔

"راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی۔ ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اُٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں! وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے! ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بُلوا کر انھوں نے اسے نادر شاہی حکم دیدیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا۔"

بے چاری جولاہن کو چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کر ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی۔ اس لیے بہت کھُل کر باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی کہ میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انھیں کا دیا ہوا ہے۔ چنو کی نوکری انھیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی انھیں کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اُٹھائیں گے۔ غرض وہ گھر آئی اور رات کو اس نے منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بُلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دُلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیے اور دُلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے، مہینے ہوئے، پھر سال ہونے کو آیا۔ مگر منو اور اس کی دُلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے۔

اچانک ایک دن بی جولاہن روتی، بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھُلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہوا اور جس طرح نشہ وہ بیوی پر اتارتا ہے۔ اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے صرف مارا ہی نہیں بلکہ اسے کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ

فوری تدارک سے شاید بُری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے "ماما" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انھوں نے حکم دیا: "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منّو کی فکر ہوگئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سفید ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے بُلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سُنا کہ تونے تاڑی پی ہے تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا اُدھڑ جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منّو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض کہ منّو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ——— اور تاڑی بند ہوگئی۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا ———

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ——— اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عبادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگی ہیں ——— اور منّو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیے ہیں تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھُری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے کلّہ بہ کلّہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا کیا مقابلہ تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہوگئی۔ منّو جھپٹ کر پلنگ سے اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ وہ ہائے کہہ کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول ہو گئیں لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا سا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتے بعد گھر سے اُٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے۔ اور ساس بہو میں اس پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تک تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی۔ دفعتاً چنّو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچّہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منّو کی بیوہ کو عدّت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقعے سے چنّو غم بُھلانے اور جی بہلانے کے لیے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دردِ دل بیان ہوئے۔ تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سُرخروئی سے ہوئی تو چنّو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فوراً فتویٰ صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحث کرتی رہیں۔ پھر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل اسے گھر چل! مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، بس خوش میرا خدا خوش!" ——— چنّو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دی اور اپنے چار دل بچّے سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو مہینے بیتے، تین مہینے بیتے۔ مگر چوتھے مہینے چنّو کی کمر میں چک آگئی۔ اکڑنا، برنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ میر صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب طبیب تھے۔ ان کو دکھایا۔ انھوں نے

معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دنوں اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہوکر چلے گئے۔ بس جتو کی کمر پکی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا، مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی جینیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی۔ اور یہ چیزیں چار روپے کی کمائی میں کہاں نصیب۔ وہ لگا کیسے بکال کے ہاتھ پھیلانے اور بٹیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاوجیں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی۔ وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل وجگر کو چھلنی کیا اور جتو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے، اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ جتو کو اختلاج شروع ہوگیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ دیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ پھر سنبھل کر اٹھا۔ مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں، ارے ماں" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر، بہری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا۔ اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔

بیوی "ارے کیا ہوگیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ جتو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

جتو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ، گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔

دُلاری

سیّد سجاد ظہیر

گو کہ بچپن سے وہ اس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولہویں سترہویں برس میں تھی کہ آخرکار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوش حال آدمی تھے۔ گھرانے میں ماشاءاللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحب بھی، بقیدِ حیات تھیں اور زنانے میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں اور مامائیں آتیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں، اس کے بعد ذرا سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں اور چلی جاتیں۔ مگر دلاری کے لیے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانہ تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیوں کے مقابلے میں اس کی حالت اچھی ہی تھی۔ مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی..... "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں"۔ اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بیبیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجے میں ہوئی تھی۔ یہ تو سب خدا کا کیا دھرا ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی، حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کیونکہ شریف تھیں ان کا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے میں صرف ہونے لگا، دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی، وہ خوبصورت، کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے چکیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں میں البتہ وہ اپنے رکھاؤں کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی۔ یا اگر کبھی شاذونادر اسے بیگم صاحبہ یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی۔ دلاری گڑیا بنی ہوئی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے نوکر چاکر کھڑے تماشا

دیکھتے۔ بچے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے۔ جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحب انھیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انھیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ اکثر پرانی رسموں کے خلاف تھے۔ مگر اظہار ناراضگی کرکے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

انھیں پیاس لگی اور انھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کہا "امی جان پیاس لگی ہے"۔ بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "بیٹا شربت پیو۔ میں ابھی بنواتی ہوں" اور یہ کہہ کر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے: "جی نہیں امی جان۔ اسے تماشا دیکھنے دیجیے۔ میں خود اندر جا کر پانی پی لوں گا"۔ مگر دلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل دی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چن رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہنچ کر رکے۔

دلاری نے مڑ کر پوچھا: "آپ کے لیے کون سا شربت تیار کر دوں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دلاری کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے، جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آ گئے۔ اور اصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جا رہے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ پھر شادی کے دن آ گئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آ جائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک رات کو غائب ہو گئی۔ بہت چھان بین ہوئی۔ پولیس کو اطلاع دی گئی مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی ہے اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی ایک غریب رنڈیوں کے محلے میں دیکھا۔ بڈھا بے چارہ بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہو گئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچے گی۔

دلاری کی واپسی نے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے، سر سے پیر تک ایک سفید چادر اوڑھے، پریشان صورت، اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑی اس کو دیکھتیں اور افسوس کرکے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانے میں تشریف لائے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آ گئی ہے تو وہ باہر نکلے، جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے۔ گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا: "بے وقوف، اب ایسی حرکت نہ کرنا"۔ اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہنچیں، مگر بہت قریب نہیں، اس وقت وہاں کوئی اور نہ تھا۔ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر بہت ترس آ رہا تھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو، باہر قدم رکھ سکتی ہے۔

اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلّت، یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی؟ دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا، جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اس کی اسے کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہگاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لیے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لیے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کردی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا۔ "دلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے اپنی بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا۔

حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آگئیں۔ ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ دلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ دلاری اسی طرح چُپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا:

"بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ، مگر منہ کالا کرکے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے......" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام کاج اُتنی اچھی طرح سے نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشا دیکھنے، سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھ کر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مردار خور گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بے کس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں بے جان ہونے کے باوجود بھی ان کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

یکایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دُلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصّہ نمایاں تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا "امّی خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔"

لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے۔ جب اس کے کان پیار کے الفاظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اس کے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش اسی بے دلی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے۔ اس روحانی کوفت نے دلاری کو اس وقت نسوانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پُرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔

اسی دن، رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

مجرم کون؟

ڈاکٹر رشید جہاں

شام کا وقت ہے، انگلش کلب میں آج بہت رونق ہے۔ سڑک پر دور دور تک موٹریں کھڑی ہیں۔ دیواروں پر ٹینس کے نیلے پردے کسے ہوئے ہیں جو اندر کی کارروائی غلیظ اور گندی ہندوستانی آنکھوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی صاحب یا میم صاحب یا کسی ہندوستانی افسر پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ کلب کے سامنے ہاکی کھیلنے کا ایک بڑا میدان ہے جس پر اپنے کئی ہندوستانی بھائی جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ چل پھر رہے ہیں لیکن منہ سب کے کلب کی طرف ہیں۔ نہ معلوم وہ کیوں جمع ہیں؛ غالباً پردوں اور موٹروں کی چہل پہل نے ان میں ایک خواہش، ایک جستجو پیدا کر دی ہے اور وہ تماشا دیکھنے کے انتظار میں جمع ہیں۔

"یار دیکھو وہ بجلی والے صاحب ہیں۔"

"اور میم کس کی بغل میں دبائے ہیں۔"

قہقہہ پڑتا ہے۔

"اجی یہ لوگ بھی خوب ہیں، چاہے کوئی میم ہو......"

"تیرا دل بھی صاحب بہادر بننے کو چاہتا ہے۔ نکال نہ اپنی جورو کو۔ ہم بھی ذرا بھابی کے درشن کر لیں۔"

"تم نے سنا نہیں یار، وہ تو کانی بھی ہے اور نکٹی بھی۔"

سب ہنسنے لگے۔

"ارے یہ کون ہیں۔ یہ تو کالے ہیں ان کا یہاں کیسے گزر ہو گیا؟"

"کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔"

اس پر بہت زور کا قہقہہ پڑا۔

"دیکھو، دیکھو! وہ پھانسی والا آ گیا۔"

"اجی وہ دیکھو موٹر سے۔ وہ جج صاحب اترے۔"

"ارے یار بڑا انصاف کرتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ خدا قسم! ادھر جب میں فتو والی مار پیٹ میں پھنس گیا تھا تو جج صاحب نے صاف چھوڑ دیا۔"

"ابے سالے چپ بھی رہ، نہیں تو کھینچ دوں گا ایک ہاتھ۔ فتو سے تو پوچھ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔"

"چلو یار چھوڑو اس مردود کو یہاں، وہ جنٹ صاحب کی لڑکی تو آتی نظر نہیں آتی۔"

آج صبح رابنسن صاحب کی الوداعی پارٹی ہے۔ وہ آٹھ مہینے کی چھٹی پر ولایت شادی کرنے جارہے ہیں۔ اپنے زمانے کے صحیح جج ثابت ہوئے ہیں۔ کلب میں بہت ہردلعزیز تھے۔ شہر کے انگریزوں کی تو گویا وہ جان تھے۔ ہندوستانی اعلیٰ افسروں کی پیٹھ بھی کافی تھپک دیتے تھے۔ کبھی کبھار ان کو کھانے یا چائے پر بھی بلالیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ باقی "نیٹو" آبادی پر صاحب کا کافی رعب داب تھا۔ بعض لوگ کلکٹر صاحب سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا کہ ان سے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ ان چند انگریز ججوں میں سے ہیں جو رشوت نہیں لیتے، تو لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ قانون کو ایسا سمجھتے تھے کہ صوبہ میں کم جج ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ بس یہ کہو کہ اس انگریزی قانون کی جو انھوں نے غلاموں کے لیے بنایا تھا ان سے اچھی ترجمانی کوئی نہ کرسکتا تھا۔ ان کو اپنی ایمان داری اور انصاف پر ناز تھا۔

کالے آدمیوں سے صاحب لوگ اپنی زندگی کے بارے میں ہزار چھپائیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ خبر باہر نکل ہی آتی ہے۔ تین سال ہوئے جج رابنسن چھٹی کا کچھ حصہ شملے میں گزار رہے تھے کہ وہ ایک مسز بلیک سے ملے۔ مسز بلیک بیس اکیس سال کی خوب صورت لڑکی تھی۔ چند مہینے پہلے کرنل بلیک سے شادی کرکے ہندوستان آئی تھی۔ کرنل صاحب فیروز پور میں تھے اور وہ جلدی جلدی شملے آتے جاتے رہتے تھے۔ لیکن جب رابنسن صاحب وہاں پہنچے تو سلویا سے بھی ملے۔ دو تین دن ہی میں دونوں میں اتنی بے تکلفی ہوگئی کہ اچھے خاصے دوست ہوگئے اور بہت جلدی دوستی عشق کی حد تک پہنچ گئی۔ رابنسن ان خوش قسمت انگریزوں میں تھا جس پر کئی عورتوں کی آنکھ تھی اور رابنسن جہاں کہیں جاتا ان کی آنکھوں کا تارا بنا رہتا تھا۔ عشق ایک نہیں کئی ہوتے تھے۔ شادی شدہ، غیر شادی شدہ، ہر قسم کی عورتوں سے۔ لیکن یہ بھوت ہی کچھ اور تھا۔ مسز بلیک تو بس دنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا سوسائٹی میں خیال رکھا جاتا ہے کہ پردہ فاش نہ ہو۔ اس کو تو یہ کھیل جیسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کا جی چاہے پڑھ لے۔ ہر طرف جارج رابنسن لکھا ہوا تھا۔ رابنسن نے اس کو سمجھایا بھی۔ اس کا جواب یہی ملا۔ "مجھے تو کوئی ڈر نہیں۔ تمھیں ڈر ہو تو مجھ سے نہ ملو۔"

آخر کو اور بھی عورتیں ہوٹل میں تھیں، جن میں سے اکثر رابنسن پر ریجھی ہوئی تھیں۔ کئی سلویا بلیک کے حسن سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔ عشق برابر ہوٹل میں چلا ہی کرتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق، چھپ کے ملنا، راتیں ساتھ گزارنا بھی کچھ برا نہ تھا۔ اس کے خاص سلیقے اور قاعدے بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کھلم کھلا عشق وہ بھی ایک شادی شدہ عورت کا، سوسائٹی کیسے برداشت کرلیتی۔ پہلے چہ میگوئیاں ہوئیں، پھر باتیں ہوئیں۔ آوازے کسے گئے، کرنل صاحب بھی آئے۔ بیوی کا رنگ ہی اور دیکھا۔ بات کو پی گئے۔ لیکن آخر کہاں تک۔ ایک روز مسز بلیک شملہ سے غائب ہوگئیں۔ تین دن سہارن پور جاکر رہیں۔ پتہ لگانے والوں نے لگا ہی لیا۔ رابنسن ہندوستان میں دس سال سے تھا۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن کرتا کیا۔ مجبور تھا۔ محبت اختیار میں نہ تھی۔ معاملہ طشت ازبام ہوگیا۔ کرنل دیوانہ ہوکر انتقام لینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کو بھی ضد پڑگئی کہ وہ ضرور رابنسن پر اپنی بیوی بھگائے جانے کا دعویٰ کرے گا۔ بلکہ اس نے وکیلوں سے کوئی نہ کوئی مطلب کا قانون نکالنے کی باتیں بھی شروع کردیں۔ رابنسن بہت گھبرایا۔ لیکن کرتا تو کیا۔ معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ خود کرنل سے ملا۔ دوستوں سے کہلوایا۔ لیکن بلیک اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس طرح دو انگریزوں میں کھلم کھلا مقدمہ بازی کرنا انگریزی رعب داب میں فرق ڈالتا تھا۔ لہٰذا ادھر گورنر تک اور ادھر کمانڈر انچیف کے کانوں تک خبر پہنچائی گئی۔ ایک زبردست دباؤ کے بعد کرنل صاحب راضی ہوئے کہ وہ بجائے رابنسن پر دفعہ ۴۹۶ کا مقدمہ چلانے کے اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا اور مسز بلیک کو فوراً ولایت روانہ کیا گیا کہ جب تک طلاق کی کارروائی پوری نہ ہو وہ وہیں رہیں۔

اس عرصے میں طلاق کی کارروائی جاری تھی، رابنسن ولایت ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے اپنی معشوقہ سے مل آئے تھے۔ اب وہ آٹھ ماہ کے لیے جارہے تھے۔ ایک ایک لمحہ ہندوستان میں کاٹنا مشکل تھا۔ چلنے سے پہلے سلویا کا ایک تار ملا تھا کہ "میں تم کو وینس میں مل جاؤں گی"۔ اس تار نے رابنسن کو بالکل ہلادیا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے سلویا کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا غضب کی عورت ہے۔ پہاڑوں

کی چاندنی راتیں، ہوٹل میں چھپ چھپ کر ملنا۔ ہزاروں نگاہوں سے چھپ کر راتوں کو اس کے پاس آنا، بلیک کی نگہداشت کے باوجود بھی آنا، اور پھر اس کی گود میں سر رکھ کر آہستہ سے کہنا۔ "کیا کروں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن جارج تم سے محبت نہیں جاتی۔" اس کا خیال ہی چکرا دیتا تھا اور پھر وہ ہاتھ وہ گردن وہ جسم! جب وہ پہلی دفعہ اس کے ساتھ آئی تھی تو کیا سین ہوٹل میں نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے کیا کیا ناک بھوں نہ چڑھائے تھے۔ لیکن اس نے آکر نہایت سادگی سے اتنا کہا۔ "جارج میں آگئی۔" گو رابنسن پارٹی میں گھوم رہا تھا، لوگوں سے باتیں کر رہا تھا، لیکن اس کا دل وہاں نہ تھا۔ اس کو تشویش تھی تو یہ کہ وہ سلویا سی لاجواب عورت کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں!

"بھولا! تمھارے کھلاف گجریا کو دُوسری دفعہ بھگانے کا جو جُرم لگایا ہے وہ ثابت ہے۔ تُم کو تین سال کی سکت سزا کا حکم سنایا جاتا ہے۔ مٹرو تُم کو عورت گجریا واپس دی جاتی ہے۔"

یہ حکم سُنا کر رابنسن صاحب کانسٹبل کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "لے جاؤ مولزم کو۔" اُن کا یہ کہنا تھا کہ ایک گندمی رنگ درمیانہ قد کی سولہ سترہ سال کی لڑکی چند مردوں کو چیرتی ہوئی جاکر بھولا سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے چیخنے لگی۔ کچہری میں عورتوں کی چیخ و پکار روز ہی سنی جاتی ہے لیکن اس کی تڑپن میں کچھ جادو تھا کہ راہ چلتوں کے پیر روک لیتا تھا۔ کچہری کا کمرہ بھر گیا۔

بھولا بیس سال کا ایک چھوٹے قد کا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ کالے چہرے پر کالی آنکھیں ناگ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ گجریا کے بین اور رونے کا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ "اے بھولا میں تو کو نہ جانے دوں گی........ اے جج صاحب ایسا جُلم نہ کرو، مو کو بھی سنگ ہی بھیج دو۔ اے سپیّا میں ہا ہا کھاؤں مو کو بھی لے چل، پیا کے سنگ مو کو بھی بند کر دیجیو!"

"ہٹ ہٹ، چھوڑتی نہیں سسری۔"

"مٹرو، پکڑو نہ اس...... کو........ نے گجب اٹھا رکھا ہے۔"

اِدھر اس کے بھائی نے اور تین سپاہیوں نے پکڑا، اُدھر کانسٹبلوں نے بھولا کو دھکّا دیا"..... چل بے..... کھڑا کیا دیکھتا ہے۔" اُس کو گھسیٹ کر کمرے سے لے گئے۔

"بھولا....... او بھولا....... کہاں چھوڑ چلا۔" پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ چار مردوں کی آہنی گرفت سے کہاں جا سکتی تھی، زمین پر مچل گئی۔ ایڑیاں رگڑنے لگی۔ "بھولا.... اے بھولا.... بھولا..... بھولا....."

"کورٹ صاحب اس عورت کو باہر نکالو، شور نہیں مانگتا...."

"پیش کار! سرکار بنام بندو کو آواز لگاؤ۔"

بھولا قوم کا گڈریہ تھا۔ کانسرو کے جنگل میں گائے بیل چرایا کرتا تھا۔ پتلا سا مست آدمی تھا۔ اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں پھاندو والے میں رہتا تھا۔ بچپن سے اسی جنگل میں رہا، پلا، بڑھا۔ جنگل میں اس کا من لگتا تھا۔ سونگ ندی میں گاؤں کے اور جوانوں کے ساتھ مل کر نہاتا اور پھر اس کی آواز بھی کیا غضب کی تھی۔ اس کا پتوں کے ڈھیر پر لیٹ کر اور لہک لہک کر گانا:

"نینوں سے نینا ملاؤ میری جان۔" گاؤں کی لڑکیوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا۔

کانسرو کا جنگل فروخت ہوا اور کئی بڑھئی درختوں کو کاٹنے اور گرانے لگے۔ ان میں سے ایک مٹرو بھی تھا۔ وہ مع اپنی جوان گجریا کے وہاں آیا۔ بڑھئی اپنی عورتوں کو جنگل میں کام پر نہیں لے جاتے ہیں۔ لیکن مٹرو کا چچا پھاندو والے میں رہتا تھا۔

لہٰذا وہ گجریا کو بھی ساتھ ہی لے آیا۔ گجریا سولہ سترہ سال کی گندمی رنگ کی بھرے بھرے جسم کی ایک گرما گرم لڑکی تھی، گاؤں کی اور عورتوں کے ساتھ ندی پر پانی بھرنے جاتی تھی۔ راستے بھر ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چہلیں کرتی، بھاگ دوڑ مچاتی ہوئی جاتی تھی۔ راستہ ادھر سے نکلتا تھا جہاں گاؤں کا ایک آدھ گڈریہ گایوں اور بیلوں کے واسطے پڑا رہتا تھا۔ اکثر ان مردوں اور عورتوں میں چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ کوئی لڑکی کہتی "اے بھولا! ذرا وہ ہولی تو سنا دے۔"

"کیا دے گی؟" بھولا آنکھ مار کر پوچھتا۔

لڑکی اٹھا کر پتھر مارتی۔ "دیکھو بھابی یہ بھولا گاری دیتا ہے۔"

"تو بڑا جلی ہے رے بھولا۔" اس کی بھاوج جو بھولا کے مذاق کو پسند کرتی تھی، بن کر جواب دیتی۔

گجریا کے آنے سے بھولا کی زندگی میں بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اب پہلے سے بھی زیادہ گانے لگا۔ اس کے مذاق بھی زیادہ تیکھے ہو گئے تھے۔ وہ گجریا کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ ایک آدھ دفعہ گاؤں کی گلی میں گجریا اس کو اکیلی بھی ملی لیکن گجریا کو دیکھ کر اس کے پیر بندھ جاتے تھے اور منہ تو جیسے کسی نے کیل دیا ہو۔ جب گجریا سامنے نہ ہوتی تو بڑی بڑی باتیں سوچتا لیکن اسے دیکھ کر سب بھول جاتا۔ ایک دن جب وہ جنگل میں گا رہا تھا، گجری اور عورتوں کے ساتھ ادھر سے گزری۔ اس کو دیکھ کر بہت عورتیں رکیں۔ وہ اسی طرح لیٹا گاتا رہا۔ پھر گجریا کی طرف دیکھا۔ اس نے نیچی نگاہ کر کے مسکرا دیا۔ بھولا گانا وانا سب بھول گیا۔ گجریا اور دوسری عورتیں چلی گئیں لیکن اس دن سے گجریا اور وہ آنکھوں اور مسکراہٹ میں باتیں کرنے لگے۔

ایک دوپہر کو گجریا کا پانی جلدی ختم ہو گیا اور اس کو اکیلے جنگل پانی لینے جانا ہوا، راستے میں بھولا مل گیا۔ ہمت کر کے بولا۔ "گوری آج اکیلی اکیلی کہاں؟" گجریا بگڑ گئی۔ یہ ڈر گیا لیکن ہمت کر کے چھیڑتا ہی گیا۔ گجری بھی ہنس دی۔ بھولا نے اٹھ کر اس کی کولی بھر لی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی، لیکن وقت اور جگہ مقرر ہو گئی۔

بھولا کی بے چینی کا عجیب حال تھا۔ تین رات سے اسی جگہ گجریا کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ آئی نہ تھی۔ آخر کو چوڑیاں بچھوے اتار کر دبے پاؤں گاؤں کے باہر لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی اور چپکے سے بھولا کو بتایا کہ اس کا میاں مٹرو پورے وقت اس کے ساتھ سوتا رہا۔ وہ کوئی بہانہ نہ لگا سکی۔ اب پیٹ میں درد اور جنگل کا بہانہ کر کے آئی ہے اور بہت جلدی جانا ہے۔ اب یہی قصہ چلنے لگا کہ بھولا رات رات بھر گجریا کے انتظار میں جاگا کرتا اور وہ اگر موقع لگ جاتا تو آ جاتی۔

بھولا اپنی اور سب آشنا عورتوں کو بھول گیا۔ جہاں سگائی ہوئی اس کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ بھائی کے بہت بگڑنے پر کہہ دیتا "ابھی میں نا کرتا۔" پریم کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ دونوں انجام سے بے خبر تب تک زندہ رہتے جب تک ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے۔

گاؤں کے آس پاس لکڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک رات کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ گجریا نکلی اور جنگل کی طرف چلی۔

"کون گئی؟" ایک نے شک کے لہجے میں آہستہ سے پوچھا۔

دوسرے نے کہا "مٹرو کی معلوم ہوتی ہے۔"

"بے وقت وہاں اس کا کیا کام ہے؟"

اتنے میں آہستہ آہستہ بھولا بھی اسی راستے سے جاتا دکھائی دیا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے!!"

"لو، کو اور بھی کوئی نہ ملا۔ یہ گڈریا کا ہی رہ گیا تھا؟"

گاؤں میں ایسی بات آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ دوسرے روز آہستہ آہستہ ہرطرف اُس کا چرچا تھا۔ لیکن مٹرو کے منہ پر کون کہے۔ آخر کو کاشی بڑھئی نے حقّہ پیتے پیتے مٹرو کی طرف دیکھا اور کہا "مٹرو تیری عورت ہے تو بڑی سندری۔"

مٹرو نے غضب ناک آنکھیں نکال کر کاشی کی طرف دیکھا۔

"تجھ سے کا؟"

"نا بھیّا میں تو کہتا تھا کسی سندری کا قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیوں ٹھیک بات ہے نا بلدیوا۔"

بلدیوا نے بھی سر ہلا دیا۔

مٹرو نے بگڑ کر پوچھا "کون کا بات ہے؟"

"کچھ نا بھیّا۔ کل رات تیری عورت ادھر ندی کے جنگل میں جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بھولا بھی اُدھر ہی گیا۔"

"کون بھولا؟"

"وہی گڈریا کا!"

"ہوں۔"

"نا بھیّا کچھ دیکھا وکھا ناہیں، بس جو بات تھی کہہ دی۔"

مٹرو کے دل میں تو جیسے چھری بھونک دی ہو، گھر میں آکر گجریا کو خوب پیٹا تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن اب ہر وقت وہ گجریا کو آنکھوں میں رکھنے لگا۔ اور ادھر اپنی چاچی سے بھی کہہ دیا۔ "چاچی اس کا دھیان رکھنا، اِدھر اُدھر اکیلی نہ ڈولے۔"

گجریا پر اب بہت سختی ہونے لگی۔ مٹرو بات بے بات مارنے لگا۔ لیکن اس نے بھولا سے ملنا نہ چھوڑا۔ دو ہی منٹ کو مل لیتی۔ گلے ہی لگ آتی۔ ہاتھ ہی چھو لیتی۔ رفتہ رفتہ چاچی بھی بات کو بھولنے لگی اور مٹرو بھی ذرا غافل ہو گیا۔

ایک رات مٹرو کی آنکھ کھلی گجریا غائب تھی۔ چپکے چپکے جھونپڑے میں ڈھونڈھا۔ باہر نکل کر ڈھونڈھا کہیں نہ ملی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ گجریا دبے پاؤں گھر کی طرف جا رہی ہے اور کچھ فاصلے پر بھولا بھی ہے۔

بات صاف تھی۔ گجریا کے پیچھے پیچھے گھر چلا اور اس سے پہلے کہ وہ گھر میں گھسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گجریا کا دَم ہی تو نکل گیا لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی رہی۔ چھ مہینے کی متواتر محبت نے اس کو تھوڑا نڈر بھی کر دیا تھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"جنگل۔"

"ساتھ کون تھا؟"

گجریا چُپ تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ....؟" ایک طمانچہ زور کا منہ پر پڑا۔ پھر گھونسہ لات اور گھونسہ لات اور گھونسہ لات! ویسے جب گجریا پٹتی تھی تو گاؤں کی اور عورتوں کی طرح وہ بھی واویلا مچاتی تھی۔ لیکن آج وہ مار کھاتی رہی اور چُپ رہی۔ گھونسوں کی آواز سُن کر چاچی نکل آئی۔ مٹرو کو اندر لے گئی۔ گھر والوں میں صلاح ہوئی کہ اپنی عزّت کی بات ہے۔ بات دبا دینی چاہیے اور اس کو اس کے باپ کے گھر پہنچا دینا چاہیے۔

دوسرے روز سوج نکلتے گجریا وہاں سے آٹھ میل پر برکوٹ پہنچا دی گئی۔ اور ساتھ ہی مٹرو اُس کی ساری بات بھی کھول آیا۔ وہاں پر باپ اور سوتیلی ماں، بھائی اور بھاوج نے ہر وقت کی چوکیداری شروع کر دی۔ لیکن ایک گڈریے کے لیے آٹھ میل کیا ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں پیچھے پھر دونوں آٹھویں اور دسویں چھُپ کر ملنے لگے۔ ایک روز بھتیجے نے دیکھ لیا۔ آکر گجریا کے بھائی سے کہا۔ بھائی نے

مٹرو سے بھی زیادہ بہن کی مرمت کی۔ اور اب گھر والے رات کو اسے کوٹھری میں بند کر دیتے تھے۔ جون کا مہینہ، چھوٹی سی کوٹھری۔ گجریا تھی کہ وہاں سے ادھ مری ہو کے نکلتی تھی۔

ایک شام کو وہ گھر سے غائب تھی۔ سارا گاؤں، جنگل ڈھونڈھ ڈالا، پتہ نہ لگا۔ مٹرو کے پاس آدمی راتوں رات گیا۔ معلوم ہوا کہ دو دن سے بھولا بھی غائب ہے۔ دوسرے دن پولیس میں اطلاع ہوئی۔ وارنٹ کٹوایا کہ بھولا نابالغ لڑکی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ آٹھ روز بعد دونوں پکڑے ہوئے لائے گئے۔ عدالت میں گجریا نے گواہی دی۔ اپنی محبت اور خود اپنی مرضی سے بھولا کے ساتھ جانے کا اقبال کیا۔

بھولا نے بہت کہا کہ مجھ کو اس کی عمر کی کیا خبر تھی۔ کیا اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی تھی۔ مجھ کو اس سے محبت ہے۔ یہ خود میرے ساتھ چلی آئی۔ لیکن قانون تو قانون ہی ہے۔ اس میں چوں کی کیا مجال!

اور پھر رابنسن جیسا قابل جج قانون کی ترجمانی کرے تو بھولا کو تین سال کی سزا سے کیا کم مل سکتی تھی؟

کلب میں آج شام ہر طرف چہل پہل تھی۔ چالیس کے قریب انگریز مرد اور عورت تھے اور تین چار ہندوستانی مع اپنی بیویوں کے رونق افروز تھے۔ آج رابنسن کی بہت قدر تھی۔ ہر طرف ان کی پوچھ تھی۔ ہر انگریز ان کے "ہوم" جانے پر افسوس کر رہا تھا۔ انگریز یہاں خواہ کتنے ہی آرام و آسایش میں رہیں لیکن "ہوم" چھٹی پر جانا ایسا ہی محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی چڑیا پنجرے سے چھٹ کر خوش ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قدر تو وہ اکٹھا ہی کرتے ہیں یعنی جب پنشن پا کر عمر بھر کے لیے "ہوم" جا کر ہوم بساتے ہیں۔ آج تو رابنسن اور بھی غیر معمولی طور پر خوش تھا کہ وہ اب شادی کرنے جا رہا تھا۔ ایک میز پر وہ، ٹم راجرس، ایک اور انگریز اور مس نوکس بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ یہ لوگ ہوتے تو "ایموشنل" ہیں۔ بالکل جانوروں کی طرح۔"

"اب دیکھو چھ آنے پر لڑ کر کیپٹن مارٹن کے بیرا نے چوکیدار کے چھرا بھونک دیا۔" مس نوکس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"روگ (ROGUE)! مجھ کو وہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔ نہ معلوم مارٹن نے اس کو کیوں رکھا ہوا تھا۔"

"مجھے تو بہت خوشی ہے کہ میں جا رہا ہوں ورنہ اس کو پھانسی کی سزا بھی مجھ کو دینی پڑتی۔" رابنسن نے کہا۔

"پھانسی کی سزا مجھ کو بالکل پسند نہیں۔" ٹم راجرس نے کہا جو ابھی تین مہینے پہلے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کو ایک عجوبہ معلوم ہوتی تھی۔

"پھانسی کی سزا پسند نہیں۔" مس نوکس زور سے چیخیں۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو یہاں کے وحشی "نیٹو" ہم میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں۔"

"ارے چلیے بھی مس نوکس آپ کتنی عجیب باتیں کرتی ہیں۔" ٹم راجرس نے جس پر ابھی تک کیمبرج کا رنگ چڑھا ہوا تھا ہنس کر مس نوکس کو چھیڑا۔

"لیکن مارٹن کے بیرا کو تو ضرور پھانسی ملنی چاہیے۔ رات بھر اس چوکیدار کی عورت اتنی زور زور سے روتی رہی ہے کہ مارٹن کے کمپاؤنڈ اور ہمارے کمپاؤنڈ میں کسی کو سونے ہی نہ دیا۔"

"تو بیرا کے پھانسی لگنے سے کیا چوکیدار کی بیوی کا رونا رک جائے گا۔" ٹم نے پھر پوچھا۔

"سنو راجرس تم ابھی ابھی ہندوستان آئے ہو تم جوش میں بہت سی باتیں بھولتے ہو۔ لیکن مس نوکس نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔

سی کا ڈر نہ ہو تو اس وحشی ملک میں ہر وقت قتل وخون ہوا کرے ۔ ہمارے قانون کی برکت سے اتنا ہوا ہے کہ امن و
ائم ہے "۔ جج نے کہا۔

"ہاں چلتے چلو ......" ٹم راجرس نے کہا۔

"یہ ہمارا ہی بنایا ہوا قانون ہے جس کے سامنے ہر چھوٹا بڑا بلا بغیر کسی قوم وملت کے برابر سمجھا جاتا ہے اور جبھی ہر
ستانی کہتا ہے کہ اس انگریزی راج میں شیر اور بکری ایک جگہ پانی پی سکتے ہیں"۔

"سچ مچ تو کیا یہاں کا قانون اپنے "ہوم" کے قانون سے مختلف ہے؟" ٹم راجرس نے مسکرا کر سوال کیا۔

اس پر تینوں انگریز جو کئی سالوں سے ہندوستان میں تھے، ہنس پڑے۔

ٹم بالکل سرخ ہوگیا۔

مس فوکس نے کہا "ٹم تمھارا مطلب کیا ہے۔ تمھارے خیال میں ہم میں اور "نیٹو" میں کچھ فرق ہے؟"

"میرا مطلب یہی ہے کہ قانون ہندوستان میں چھوٹا بڑا یا اونچا نیچا نہیں دیکھتا۔ میں اپنی طرف سے بلکہ سب انگریزوں کی
ف سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دل میں کبھی ایسے خیالات نہیں آئے۔ ہم تو قانون سب کے لیے برابر سمجھتے ہیں"۔ رابنسن نے کہا۔

اتنے میں سوشیل کمار گپتا ایک ہندوستانی آئی۔سی۔ایس بھی اس گروپ کے قریب آنکلے اور "ہیلو رابنسن" کہہ کر میز کی
ت بڑھے۔

"دیکھو گپتا، آپ نے مجھے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور خود جلدی چلے گئے"۔ راجرس نے شکایت کی۔

"میں بہت سویرے گیا تھا اور پھر میری فیملی بھی ساتھ تھی۔ افسوس کہ آپ کو ساتھ نہ لے جا سکا۔ لیکن مجھ کو دو تین
ر بعد پھر جانا ہے"۔

"آپ کہاں گئے تھے؟" رابنسن نے پوچھا۔

"کانسراؤ کی طرف۔ ہاں وہاں ایک گاؤں ہے پھاندو والا۔ وہاں پر کل ایک عجیب واقعہ ہوا۔ (ہنس کر) اس کے ذمہ دار
بنسن تم بھی ہو"۔

"میں" رابنسن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا؟" مس فوکس نے سوال کیا۔

"ایک جوان لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر کو آگ لگادی اور پھر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ میں گھس گئی۔

"تو میں کس طرح ذمے دار ہوا؟" رابنسن نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم نے دو عاشق ومعشوق کو جدا کر دیا۔ آدمی کو جیل بھجوا دیا۔ لڑکی خود جل مری۔ گھر بھی ساتھ پھونک گئی"۔

"کون سا کیس؟" رابنسن نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"کہانی مجھ کو معلوم ہے، کیس کی مجھ کو خبر نہیں"۔ گپتا نے کہا۔

"مسٹر گپتا ضرور ساری بات سنائیے" مس فوکس نے اشتیاق سے کہا۔

گپتا نے کہا کہ

"مس فوکس کہانی دلچسپ ہے۔ ایک بڑھئی کی عورت کا ایک گڈریے سے عشق تھا۔ جب بڑھئی کو خبر ملی تو اس نے مارا پیٹا،
کچھ نہ ہوا۔ دونوں ملتے رہے۔ لوگ تو کہہ رہے تھے وہ دونوں نہ چیتے سے ڈرتے تھے، نہ شیر سے اور چھپ چھپ کر راتوں کو
جنگل میں ملتے تھے۔ پھر بڑھئی نے اس کو اس کے باپ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں اس کے رشتے داروں نے مارا پیٹا، بند کیا۔ لیکن پھر بھی

کوئی اثر نہ ہوا، اور وہ برابر چھپ چھپ کر راتوں کو جنگل میں ملتے رہے۔

آخر وہ ایک دن اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر دوار سے دونوں پکڑے گئے۔ نمبر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ رابنسن صاحب کے ہاں لڑکا ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ ان دونوں نے پھر چھپ کر ملنا شروع کیا اور پھر بھاگ گئے۔ اب کے بمبئی جا رہے تھے کہ دہلی میں پکڑے گئے۔ اب دو مقدمے قائم ہوگئے۔ ہمارے رابنسن نے لڑکے کو تین سال کی قید کردی۔"

"اچھا ہندوستان میں بھی لوگ محبت کرتے ہیں؟" مس نوکس نے نہایت تعجب سے پوچھا۔

گپتا اور ٹم قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"قانون ہے جناب میں کیا کروں۔" رابنسن نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا۔

"اوہ جارج!" مس نوکس نے تین سال کی ناامیدی کا بدلہ اپنی آواز میں بھر دیا۔

رابنسن مطلب سمجھ کر سرخ ہوگیا۔

"میری بات ٹھیک ہے نا، رابنسن اگر گپتا کی عورت کو لے کر بھاگ جائے تو تم یہی سزا دیتے؟"

"میرا نام کیوں لیتے ہو میری بیوی تو قریب ہی بیٹھی ہے۔ اپنا ذکر کرو۔"

"اچھا میرا ہی سہی، اچھا سچ بتاؤ رابنسن اگر میں اس مرد کی جگہ ہوتا تو تم یہی سزا دیتے؟ (ٹھہر کر) اور جو فرض کرو تم اس کی جگہ ہوتے تو تم کیا مجھ سے یہ امید کرتے کہ میں تم کو یہی سزا دوں؟"

ٹم راجرس نے جو رابنسن کی عشقیہ ہسٹری سے بالکل ناواقف تھا یہ سوال کیا۔

"تمھارے سوال کا جواب ......"

مس نوکس نے بات کاٹ کر اس کو ایک "نیٹو" کے سامنے بڑھنے نہ دیا۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

زندگی کے موڑ پر

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"
(اقبال)

ـــــــــــــــــــ کرشن چندر

مُسافر

پرکاشں وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں، جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ، نینون کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ آنکھ کے نشے کی قمیص اور امرت متھن کی شلواریں، عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چائے دانی کو ڈھانپنے کے کام آ سکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انھیں پہن لیں تو گول گول قطع کیے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاشں چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت، اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت۔ لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لیے تھے۔ اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لیے تھے، اور ہر روز انھیں پالش کیا کرتی، اور سوچتی کہ جب سری پور جائیں گے تو سوشیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا۔ ہاں، اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی۔ اری یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے کیا تجھے خبر نہیں، سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے، ہاں کالج میں۔ اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی، خوب لطف آئے گا ان کی باتیں سن کر، اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے، اس کا دل للچا رہا تھا۔ اب پرکاشں وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی، اور یہ سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے، اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے، لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد حتیٰ کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید بلوری گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مدورا کے مندر لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے

وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی، تو اس کا ہنسنا اور طلائی گندوں کا جھومنا اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں اور وہ سوچتی، کیا سوشیلا اور اس کے ناخن، اونہہ! یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی، بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی، تو لیلا نے جواب دیا "میں کیا کرتی بھائی جان، میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدّے سے ہیں۔ کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟"

اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ "بھائی جان آپ ہماری استانی مس ہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں، بالکل سپید بے داغ، سچّے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں۔ اور بھاپاجی[1] پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟"

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے، پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے، پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لیے پچیس روپے دیے۔ پرکاش وتی کے لیے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی "دیکھونا، جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو، تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولہا کو، اور ـــــ بس کافی ہے!"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے، تو پرکاش کی ماں نے کہا "دیکھنا، بیٹا، ڈولی کے وقت، میرا خیال ہے کہ بس دولہا دولہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا، آخر جب تمھارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیے تھے۔ یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا۔" اور کہا "بس کافی ہے۔ اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

لیکن جب تانگہ بالکل چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا۔ اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا اور لیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پُرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے اور پھر انھیں نینون کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہیے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہوگی، اسی لیے کہتی ہوں بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکّی مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اُٹھا دی، اور سر اُٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور......"

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا!"

ریل جا چکی تھی، اس لیے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا۔ دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انھیں بٹالہ پہنچا دیا۔ بٹالہ پہنچ کر انھوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انھوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی، پرکاش چند سو فی صد خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکّر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گزری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو بھاپاجی کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لیے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

تھا ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا۔ اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں۔ دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، اور آک پر اودے اودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پنے لب کھولے ہوئے آسمان کی طرف تک رہے ہیں، کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے۔ واقعی ایک عجیب دُنیا تھی۔ پرکاشں نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں لیٹے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ——— "ہاں جناب، کیا کہا جناب آپ نے؟"

میں نے کہا ———

"سری پور؟"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب یہیں سے"

فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیے۔ ایک روپیہ کرایہ"

"کس وقت چلنا ہوگا؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب؟"

"اڑھائی"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب! ابھی بہت وقت باقی ہے"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاشں نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ ——— سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں ——— !"

"کس کے ہاں؟"

"لالہ خودی رام کے ہاں!"

"لالہ خودی رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاکے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند ہوئے چین سے واپس آیا ہے۔ سنا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے۔ جو......"

"ہاں، ہاں، وہی"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے"

"نہیں"

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ خودی رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ بڑے نیک آدمی ہیں۔ کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان۔ ہمارے

سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی تگڑا پہلوان ہے۔ مگر ہار گیا جی، کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا۔ ضلعداری کا امیدوار تھا۔ لیکن دو ہفتے ہوئے بیچارے کو کسی نے راتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلع میں قتل ہوتے ہیں۔ قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں۔ بابو جی سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بری حالت میں ہے —— او فضل، او فضل، ابے حرامی، اُٹھ! دیکھتا کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے، سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے، سواری ملے نہ ملے، دعوت پر پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا، اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لیے بھونچکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجنے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا، پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں بٹالے میں دھکے کھانے کے لیے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی، درمیانی درجے میں جو عورتوں کے لیے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں، اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی۔ ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا

"آؤ جی شاہ!"

"کہاں بیٹھوں؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا۔ "یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجبے۔" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "بس تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا ہوں، امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا، ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں۔ "بھاپا جی!"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "بی بی جی، ابھی لاری زور سے چلے گی، تو خوب ہوا آئے گی۔"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پر ڈالی اور ایک سوشیلا اور بیلا پر، پھر بولا۔
"آپ لالہ خودی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش وتی کی شادی ہے نا۔"
"جی۔" پرکاش بولا۔
تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ایک بولا۔
"میں نے موجو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے۔"
دوسرا بولا۔ "موجو خود کہاں کا شریف ٹھہرا۔"
تیسرا کہنے لگا۔ "موجو پھر جاٹ بھائی ہے۔ لیکن وہ مہاجن ہے۔ کھتری بھی نہیں۔"
لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن۔ اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا۔ ابھی میں راستہ میں سیٹھ رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو۔ سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو اُدھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے ہیں۔ اِدھر ادھار دیا اُدھر وصولی کے لیے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"
رجب علی آہستہ سے بولا۔ "کمبخت پسٹن کام نہیں کرتا۔"
درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ودھوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی، بے چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیے تھے۔ لیکن کرموں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروّت نکلی۔"
ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچّے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی عورت تنگ آ کر بولی۔ "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں؟"
"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں، شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔ اررر۔ آ۔ آ۔ آ۔ اس۔ ای۔ ای۔ سو جا میرے لال۔ سو جا ——— ہائے مر جا تو، جان کھائے جاتا ہے۔"
رجب علی گھسیٹا مل کی طرف اُٹھ کر بولا "پسٹن کام نہیں کرتا شاید۔" لیکن گھسیٹا مل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔
پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپراسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا۔ "مالیہ پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے۔ چوکیدار بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے؟"
جاٹ بولا۔ "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"
"تم سکھا شاہی چاہتے ہو؟"
"نہیں جٹا شاہی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔
ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی۔ "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سنا؟"
"اب بچن کا باپ ٹکوا لیے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"
پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دل کش اور پُر لطف ہوتی ہے۔ سادہ اور معصوم۔ پرکاش نے سوچا، کاش مجھے اُردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے، تو ٹکوے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور بیلا نے پکارا "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جاتا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "آگے نہر آئے گی۔ اس کے قریب ہی ایک کنواں ہے۔ اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"

گھسیٹا رام چونک پڑا۔ "ہاں جی، یکی ہیشی، کیا کہتے ہو، اوہ رجب کیا میں سوگیا تھا۔"

"ہم کہاں آپہنچے ہیں؟"

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور بیلا کو دیے۔

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "اوہ بہت پیاس لگی ہے، کنوئیں پر پانی پئیں گے۔"

رجب علی کہنے لگا۔ "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔"

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حدنظر تک خشک سے کھیت کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم رتیلے میدان میں چل رہی تھی۔ کچی سڑک پر گرد کا طوفان اُٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی۔ اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ آگ کے پھول دھوپ میں بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں، لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک گاؤں تھا سڑک کے اس طرف لاری جوہڑ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی۔ ایک عورت خاکی رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی۔ ایک لڑکی سڈول اور سانولی باہوں والی نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھیگے ہوئے کپڑے کوٹ رہی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آرہا تھا، جس پر ڈاک کے لیے سرخ ڈبّہ لٹکا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا جھلنگا پڑا تھا، اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد میلی تاش کھیل رہے تھے، پھر وہی میدان تھا، وہی رتیلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی"۔ کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا، ایک چھوٹا سا خوبصورت بچّہ! اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا۔ اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سوگئی تھی۔ وہ اس کا ایک رُخ دیکھ سکتا تھا۔ ایک جوان جاٹ عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچّہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے حیران ہوگیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا، اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا۔ "اوتو — تو — لی"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا، اور بچّے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا۔ اور گنگنایا۔ "اوتو — تو — لی — اور"

جاٹ عورت بیدار ہوگئی، اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا۔ گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہوگئے ہیں، جب ماں نے اپنے بچّے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم تبسم لب، پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے، اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لیے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ بولی "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "اماں جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی۔ "بیٹا میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی" ہاں مگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے ــــ"
رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لیے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا۔ جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انھوں نے گانا شروع کیا۔

او بنتو
بنتو دا سر بن ورگا
بنتو دا منہ چن ورگا
بنتو دا لک چترا
او بنتو

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی، بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے۔ اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل، اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی۔ جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کو دیکھا، بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے، اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پل پر سے گزر گئی، آگے جا کر ایک کنواں آیا۔ وہاں لاری ٹھہر گئی۔ اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور سوشیلا اور ریلا کو پانی پلانے لگا۔ جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے۔ دیہاتی عورتوں میں۔ لیکن بچہ بڑا شریر تھا، اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا۔ اور پھر محجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے چل کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی، اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور بچے کو کمر کے خم میں۔ اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی، گویا کہہ رہی تھی، مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے، میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں جہاں میرا خاوند، اپنی بنتو کا انتظار کر رہا ہے۔ میں کماد کی فصل کاٹوں گی، گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی ٹھلیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی۔ یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمھارا راستہ ہمیشہ کے لیے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا اپنے دل میں کہنے لگا۔ ٹھیک ہے بنتو، اس میں میرا یا تمھارا کوئی قصور نہیں، یہ سماج کا قصور ہے، اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں، بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجے، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی، اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔
پرکاش نے دل میں کہا۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ اس لیے کہ ہم انسان ہیں لیکن اگر انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا ...... تو ....
اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے، اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر، بے باک، نوشش، نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے۔ اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکروں پر پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق

کی سُرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند، کیکر کی پتلی، گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک زرّیں گھونسلا بُن دیا تھا۔

بلتو اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی، پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی۔ "چ۔ چ۔ چوں۔ چوں۔" پرکاش نے اس کی چونچ اپنی چونچ سے ملا دی اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا۔

"یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے، یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گرو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا لیکن ان اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں، پھر گیہوں کی درآمد کم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں۔ وقت مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتدادِ زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا۔ یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور ادھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے، بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر، جہاں لاری کا اڈہ تھا، لالہ خودی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا۔ یہ جھیل کسی زمانے میں ایک اونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا، اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے دریائے بیاس کے پانی کی طرح۔ یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے چاہے چرخہ چلائے۔ بہرصورت چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اُسے گھور کر دیکھا، سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذب نظر تھے کتنوں ہی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دکان پر سے ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اُتار کر رکھ رہا تھا، وہ انھیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اُتارنا بھول گیا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی اُلجھن سے فوراً صاف ہو گیا۔ جب سوشیلا، لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گزرے تو گاڑی بان بڑے مزے سے گنگنایا۔

اک بنگلہ بنے نیارا.......

ادھر پھر بنولے کی بوریاں دکان پر پھینکنے لگا۔ سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے ہمیں بزدل، غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے، بیوی، بچے اور بنگلہ۔ لالہ خودی رام کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خودی رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خودی رام کا لڑکا بیر اندر سے بھاگتا آیا اور پرکاش چند کے گلے لگ گیا۔ وہ چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ بیر

نشیب و فراز دیکھ لیے تھے، اس ب پہلے سے لمبا اور مضبوط اور جوان ہوگیا تھا، چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا۔ چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا کے لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی اور خود اعتمادی، اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصہ تک لاہور اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اب ..... کے کنویں کا مینڈک بنا رہا، ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری۔ لالہ خودی رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا، انھوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں کی سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ باتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی میمیں ہیں، سٹریم لائن (streamline) سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنائی رنگت ماند ہوگئی تھی۔ اری ...... بہن یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، لکھ دو پتہ۔ لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مردار بلیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا .... آنگن میں چارپائی پر پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیر کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس نے ریشمی اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی۔ زعفرانی قمیص اور سر پر سنہری کنارے والا سرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش وتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہوسکتا ہے، وہاں منگل ہونے والے جنگل میں بھی آگ لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہوگی۔ اور ایک باہر اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی لیکن بیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی۔ اس لیے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر پیچھے گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا تو وہ سن کر اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے۔ اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رک گیا۔ کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی ان کی طرف جھجکتے ہوئے قدموں سے بڑھی چلی آرہی تھی۔ اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے، اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنے آنکھوں کو پلکوں کے پردے میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے۔ وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہوگئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو، اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لیے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لیے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ آہ۔ یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ رکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں۔ دفتر کی میز نے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا۔ "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا۔ "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا۔ "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لیے لائی تھی۔"

بیر نے کہا۔ "چین کے لوگ افیون کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی...."

پرکاش چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے۔ اور یہاں چینیوں کا داؤ ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا۔ یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے، چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں۔ ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔"

بیر نے کہا۔ "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمھیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا۔ "سنتی ہو بہن! تمھارا بھائی تمھیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو رو کے بیٹھی ہو!"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو رو کے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا۔ "تو کہتی تھی کہ میں بی۔اے پاس کرکے نوکری یا کہانیاں لکھوں گی۔ اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارہویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا۔ اور تو تو شاید فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی۔ اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے مہاودیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کیے تھے اب کہاں ہیں؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ "اسی لیے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں؟"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان دو ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لیے جا رہی تھیں اسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ شاید بہنوں سے زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو۔ اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ بُرا کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرحدار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حُسن کی قدر کر سکے، پڑھا لکھا ہو، کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے، غرض ایسا آدمی جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انھوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اوّل کا نہیں لگایا تھا۔ نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں اسکولوں میں ناچ اور گانا نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ یوگ باشششٹ اور اُستتی باچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی لڑکی کو گیارہ جماعت تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا۔ لیکن شادی کے معاملے میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے سوچ بچار کر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے باپ نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنائی تھی۔ انھوں نے لڑکی کے لیے نہایت اچھا بر ڈھونڈا تھا کیوں کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں، بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ اس وقت پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔ "لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو۔ اور اب

شرم نہیں آتی تمھیں۔"
ں فسوسے بہار ہی ہو۔ کہنے لگی۔ "مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمھیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو۔"
پرکاشس وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہاکر ہم پر رعب جمایا جارہا ہے۔ اے ہلدی
پرکاشس نے کہا۔ "ہم نہیں ہٹیں گے۔
بیچنے والے کی ہونے والی بیوی! ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں جواب دوگی؟"
پرکاشس نے سنجیدہ ہوکر کہا۔ "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو، اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ۔ یہ زمین تمھیں اڑنے نہ دے گی۔"
پرکاشس وتی نے کہا۔ "کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑکر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے!"
اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔
اور پرکاشس چپ ہوگیا۔ لاجواب ہوگیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاشس وتی کے دل کے درد کو پالیا تھا۔ اسے ہمدردی
بھی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاشس وتی چاہتی ہے تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کرسکتی تھی
لیکن پرکاشس وتی کے دوبے ساختہ فقروں نے اسے یہ احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن، اندھے سماج
کے قفس میں پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن
صاف کرے۔ اس نے پرکاشس وتی کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور پرکاشس وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں
مرہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلھن کی طرح گزر جاؤں،
اب تمھارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائے گی۔
پرکاشس نے کہا۔ "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "آخر ایک دوکاندار کی
بیوی ہونا!"
پرکاشس وتی نے بھویں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا "پرکاشس
جی کو سائیں کے پتاجی بلاتے ہیں۔"
پرکاشس نے پوچھا۔ "سائیں جی کون ہیں؟"
پرکاشس وتی بولی۔ "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے۔ پاگل ہے۔ اس کا باپ پٹواری ہے۔"
پرکاشس نے پوچھا۔ "سائیں جی کے پتاجی کہاں ہیں؟"
لڑکے نے کہا۔ "باہر بیٹھک میں بیر کے پاس بیٹھے ہیں۔"
پرکاشس نے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمھاری۔"
پرکاشس وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور بیر نے پرکاشس کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال، قصبے بھر میں ہاکی کا
زبردست کھلاڑی اور بیر کا بچپن کا دوست، لالہ سیتارام پٹواری، لمبا، دبلا پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے دو اُداس سی
آنکھیں، ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو، متین، برجیندر، بیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز
عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا بوٹا سنگھ، قصبے کے سیٹھ کا لڑکا۔ دھن سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا
منیم تھا۔ اور رام لال، منگت رائے بھیرو، رامو، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہوسکتی

جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں سے بھگا دیتے ہیں۔ اور جب گھی میں پوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقے کی مدد کے تلتے ہی رہتے ہیں، اور جب کڑاہیاں مانجھنے پر آتے ہیں تو بڑے بڑے جفادری چوروں کو مات کر دیتے ہیں یہ آدمی غریب ہوتے ہیں۔ لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا کے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولھا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہیے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک دم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہوگئی انھیں باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجندر نے جس سے بیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا۔

"آپ بھاپا جی لاہور میں کیا کرتے ہیں؟"

بھاپا جی؟ پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مُصر ہیں اور ایک انھیں پر کیا موقوف ہے اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آگئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے واقعات کی یاد بہت تلخ تھی۔ جس نے اسے قبل از وقت معمر کر دیا تھا لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا۔ او اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مُردہ کر دیا تھا ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چہار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفانی ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی۔ اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک ٹھٹھری ہوئی لاش۔ اس لیے اب جب کوئی اسے بھاپا جی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اُداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا۔ جس نے ایک لمحے میں اس کو بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا۔ "میں کوآپریٹو بنک میں کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتّر روپے۔"

"پچھتّر روپے؟" پٹواری نے کہا "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب۔"

"جی۔ آپ کی عنایت ہے۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت بُرا لگا۔ لیکن اس ہنسنے میں کوئی بُرائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا، جس میں پرکاش کی برفانی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پٹواری جی کوئی گیت سنائیے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا "کیوں کیا تمھیں گیت بھی یاد ہیں۔"

پٹواری نے بڈھا سنگھ سے کہا۔ "بھئی اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں کی اداسی کو دیکھ کر کہا۔ "بے شک تمھیں گانا آتا ہے۔ تمھیں کئی گیت یاد ہوں گے۔ کئی گیت، جو تمھاری اداسی نے خود بنائے۔ جو تمھارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمھاری روح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے لیکن کیا ہوا تمھیں؟ یہ اداسی تم نے کہاں سے پائی؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سُن لی۔ کہنے لگا۔ "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

چاچا بھیرو نے حقّہ آگے کر کے کہا۔ "حقّہ پیجیے۔ لالہ جی۔ ذرا دیکھیے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "لالہ جی۔ سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو پاگل ہے۔ جی۔ کیا بتاؤں۔ اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اور اول جلول بکنے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چٹکی اُٹھا کر دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ؟"

چونی لال نے کہا۔ "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا۔ حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے بُلا لایا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بھائی اچھا ہو جائے گا' بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا کوئی فکر نہیں۔ اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"کمال ہے۔" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا۔ "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا اس نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے!" پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا۔ "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے۔ وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچّہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا، لیکن بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا بھائی آئے گا' پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا' اسے باہر لے کر نہ پھرنا۔ اور نہ اسے کوٹھے پر لے جانا۔ اس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔

وطن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں' اسی دن دو چھوٹے چھوٹے بچّے کوٹھوں پر سے گر کر مر گئے۔"

پٹواری نے کہا۔ "اور وہ چھوٹا بچّہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کمبخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات' وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچّہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

ہزار دگیندا لاچا.....

مٹی نہ پھرول جوگیا۔

تیرا لبھنا نہیں لعل گواچا
مٹی نہ پھرو جوگیا۔

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا۔ "لے گئے، لے گئے، میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے، میرا بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یمراج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے۔

شام کے وقت بیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے گئے۔ ریتیلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اگے ہوئے تھے اور ان سے نیچے اتر کر کھیت تھے۔ لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی، اس لیے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگ رہے تھے اور کہیں کہیں کڑوے کسیلے بیروں کی جھاڑیاں۔ مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھوے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا۔ اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیروں میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا پرکاش نے برجندر کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و نواح سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے داتن کیے جا رہا تھا۔ داتن کرتے کرتے کہنے لگا۔ "بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو تو سمجھائیں نا!"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھ دار ہے۔ کماؤ ہے۔ لیکن روپے کی قدر نہیں جانتا۔"

"وہ کس طرح میرے خیال میں۔۔۔۔۔"

برجندر نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے۔ وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے۔ وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ یہ بات اچھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ سو پچاس روپیہ مہینہ کما لیتا ہے آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انھیں کا کہا نہ مانے تو اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا؟"

"بے شک! بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجلاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجیے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی دے لیکن اسے دیکھو یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بساکھا مل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے۔ گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل، سمجھ دار، سینا پرونا جانتی ہے۔ خط پڑھ لیتی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں، شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے اور پرانا خاندان ہے، امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے۔ لڑکی بھنگی ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ آواز بھاری ہے اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے

ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا۔ جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مَس رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کرسکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہوگیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاشش وتی کو دیکھو گیارہویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بیکار گریجویٹ کے پلے باندھ دیتے تو بیچاری کی زندگی تلخ ہوجاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاشش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے۔ وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جاسکتی لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا۔ بیر آپ کا کہا مانتا ہے۔ آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔"

اور پرکاشش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہوگی کیوں کہ شادی کا محور ہے، اور پھر بیر تو شنگھائی کے کابرے (cabret) بھی دیکھ چکا ہے۔ اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے لیکن برجندر نے کہا۔ "نہیں آپ ضرور کوشش کریں۔ میری خاطر سے۔" اور پرکاشش نے کہا "اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔" برجندر نے کہا۔ "جی نہیں یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر داتن کرتے کرتے کبھی کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے پر آگئی تھی اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاشش نے سوچا، یہ میرا خیال ہی ہے۔ میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں۔ عام کسانوں کے۔ ان کے دلوں میں طمانیت ہے۔ صبر ہے۔ یقین ہے۔ شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے روح کا پرتو ہے۔ شام کے سناٹے پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ ملاح اونچی اونچی آواز میں گالیاں دینے لگے۔ پرکاشش اور برجندر اُٹھ کر اس گروہ کے قریب چلے گئے۔ برجندر نے پوچھا۔ "کیوں جھگڑتے ہو بھئی! کیا بات ہے؟"

ایک ملاح نے کہا۔ "شاہ جی۔ بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ دوسرے کنارے پر صبح کے بیٹھے تھے اور کوئی انھیں پار نہیں اتارتا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہماری کھیتیاں اُجڑ گئی ہیں۔ ہم پر رحم کرو۔ ہمیں بیاس پار کرادو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمھیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آکر یہ کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس —— آپ خود گن لیجیے۔"

کسانوں نے کہا۔ "ہم غریب ہیں۔ ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔" بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملاح نے کہا۔ "اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اُترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمھیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دیے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ "بھگوان تمھارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں۔ آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے ایسی بپتا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھررہے۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں —— ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

برجندر نے کہا۔ "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمھیں آٹا دال اور نون سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا۔ "پرماتما تمھارا بھلا کرے!"

ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اری لڑیا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کرلے۔ اری بنو! لحاف اور چٹائیاں اور برتن چھکڑے سے اتار کر ادھر لے آ۔ ارے سادھوا کمبخت کدھر بھاگ گیا تو......

لڑیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی......

دریا سے واپس آکر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا۔ اور اب وہ ایک بڑی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا دیا۔ برات آئے گی۔ یہ بھی سب جانتے تھے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب واہمہ دور ہوگیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بےچینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیر دجو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گزرجانے پر بھی مجرد تھے، دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تاکہ کل کے لیے بٹالے سے برف منگانے کا انتظام کریں۔ منگت رائے اور برجندر کو برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر سجانے، اور براتیوں کے لیے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ بیر اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر اُدھر گھومنے اور مجبوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا۔

بیٹھک میں اب صرف پرکاش اور چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ گئے، پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آرہی تھیں یا باہر جارہی تھیں۔ ریشمی لباس سرسراتے ہوئے، قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے، چنریاں جن پر مقیش کے لہریے تھے۔ پھر بھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آجاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن، جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جارہی تھیں۔ نیلوں کے بادامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مدورا کے مندر لٹکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آرہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے پھر بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دو نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی، جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔

پرکاش نے پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور....."

چونی لال نے کہا "وہ!...... وہ مس اورسیر ہے"۔ اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اورسیر؟"

"ہاں۔ ہاں"۔ بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اورسیر ہے نا"۔

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اورسیر کی تبدیلی جالندھر ہوگئی ہے۔ اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے"۔

"سچ مچ؟"

"ہاں مجھے آج ہی پتہ چلا ہے" ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بےچارے پر قیامت گزر جائے گی"۔

اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی ہنسی میں شامل ہوگیا۔ پرکاش نے سوچا "نہیں۔ نہیں...... آہ بے چارہ"۔ یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں۔ بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر چلا گیا۔ گھر کے آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا اور کمسن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کردی تھی۔

کتھے گیوں! پردیسیا وے!

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس کے گیت سنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے نیلی نیلی آنکھوں والی چرواہیوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنوں پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اداسی میں گائے گئے، جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت...... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لیے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سُروں میں لرزنے لگتا اور کبھی اس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہوجاتی کہ وہ نغمہ کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لیے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنادیا تھا جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کردیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بے قرار کردیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا رازدار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا۔ یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے۔ وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے۔ اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اُٹھ گئی، انسانیت بھی فنا ہوجائے گی۔

..... ٹھک ٹھک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کیا تھا۔

اوتھوں لکھنا
اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لیے ایک حسّاس اور دردمند دل چاہیے، جوانی کی بے قرار روح، نسائیت اور شباب اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا۔

ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک، پرکاشں کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لیے مُڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے بیر اور مس اور سیر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اور سیر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاشں جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان میں بھی اوپر آرہا ہوں۔ ابھی ...... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاشں وتی کو دولھا بھائی کی آمد کے قصے سُنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاشں چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہوگئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرأت سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاج کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیر آگیا اور آکر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چُپ چاپ لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ سفید اور اُترا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاشں چند اور پرکاشں وتی دونوں جلد جلد بیر کے پاس گئے۔ پرکاشں وتی نے اپنا ہاتھ بیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی۔ "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاشں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیر؟"

بیر نے رُکتے رُکتے کہا۔ "اُف ..... کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پرکاشں نے کہا۔ "پانی۔ پانی۔"

پرکاشں وتی نے گھبرا کر کہا۔ "پانی۔ پانی۔"

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا۔ "پانی۔ پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی۔ پانی۔ بیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیر نے تھوڑا پانی پیا اور کہا۔ میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لیے۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو۔ ہوا لگ جائے گی۔ کسی نے کہا کھڑکی کھول دو۔ ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں۔ "اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ۔" دوسری پھوپھی جان بولیں۔ "اے ہے۔ کہاں ہے بیر کی ماں؟ بیر کی ماں؟"

بیر کی ماں بولیں۔ "میں تمھارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا اچھا جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

بیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگونتی اس کے پیچھے دوڑیں "..... اری ...... میں کہتی ہوں بیر کی ماں۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھنک رہے ہیں۔ بازار سے کانسی پھل منگواؤ۔ تاکہ پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔" بیر نے لاکھ انکار کیا کہ اسے آرام تھا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے آرام سے لیٹے رہنے کو کہا۔ ناچار بیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹے شور و غل کرنے، بیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کانسی کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی۔ اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً بیر نے آنکھیں کھول کر کہا ـــــ

"ہائے بھاپا جی۔"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا۔ "چین کیسا ملک ہے؟"

بیر نے کہا۔ "ہائے میں مر جاؤں گا۔ اب کیا ہوگا؟ ان کی تبدیلی ہوگئی۔"

پرکاش چند نے کہا۔ "سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کابرے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں۔۔۔۔"

بیر نے کہا۔ "میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

بیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہائے بھابا جی۔ ہائے بھابا جی۔ اگر تمھیں پتہ ہوتا۔ اگر تمھیں پتہ ہوتا!"

پرکاش نے کہا "مجھے سب پتہ ہے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگ لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لیے بھی نہ سو سکا۔ اس نے بیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل پر رکھوالی تھی تاکہ آرام سے سو سکے۔ بیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا۔ "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے بیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے، اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آگئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا۔ "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا۔ آج رات کے لیے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھیے۔"

پرکاش نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ "سونے کے لیے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا۔ "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔ "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟۔۔۔۔۔ ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نووارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟۔۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہیے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دبلے پتلے، لمبے تڑنگے آدمی، وہ جو اس دن بیٹھک میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی رخساروں پر چھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں، تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرد تھے ابھی تک۔

عمر چالیس برس سے اوپر ہوگئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انھیں رشتہ نہیں دیتا"

"یہ تو بہت اچھی خبر سُنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔"ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارکباد دے کر آرہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انھوں نے داڑھی منڈوادی ہے اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انھوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا۔"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا" ہم دریا پر گئے تھے۔ جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شوروغل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا۔ میری جوان اور سندر لڑیا۔ پتہ چلا کہ بوڑھے کسان کی وہ بے وقوف عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے گویا حصار کے قحط کا ذمّے دار اسکا خاوند ہے۔"

بوٹا سنگھ بولا۔" چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انھوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے"۔

دھن سیال نے کہا۔" دیکھیے بھائی صاحب، اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے، چاچا پھیرو ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے۔ اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوگئے۔" آؤ تھوڑی دیر کے لیے قیام وطعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں۔ بچارے کل یہاں سے رخصت ہوجائیں گے ...... کہیں انھیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی"۔

باراتیوں کو کھانا کھلاکر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہوگیا۔ لیکن نیند کہاں۔ آج شادی کی رات تھی۔ ابھی ابھی ان لوگوں نے دولھا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں۔ "سردارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولھا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا۔ بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کی زرّیں تاریں اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ وروپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی۔ ہونٹ موٹے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے لے کر وہ اِدھر اُدھر اس طرح گھوم رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے رشتے دار تھے جن کے حلیے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے۔ گانٹھیں چاہے جتنی بنتی چلی جائیں...... "ملنی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھنچ بھنچ کر گلے ملے تھے۔ بھیوروں، بھانڈوں اور میراثیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کرلی تھی، تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کیے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر ہیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انھیں لوٹا جاسکے۔ نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتیوں سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور

میراثی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی، اور اب وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا...... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آکر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے لگائے گئے تھے اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ جھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر ردم کے قطعے اور گائتری کے دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آرپار جھنڈیاں لٹکائی گئی تھیں اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے۔ دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آجائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیو داسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لیے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو۔ کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤں گی..... خبر نہیں، پڑھا کر، سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ہمیں ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔ لیکن میں سوچتی ہوں، کیا مجھے اسی لیے مہاودیالے میں داخل کرایا گیا تھا...... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر رو دوں...... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی؟"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیوگی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک موٹر کار۔ یہ لکیر یہ تمہاری شاعری کی تھی۔ لیکن یہاں آکر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہوگی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے، لیکن ان کے علاوہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمی کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔ اور......"

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ہٹو بھی ہر وقت بیہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کرکے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رت جگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جانی تھیں۔ اس لیے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے۔ نائنیں شربت

بلائی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتے دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر رت جگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنھوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی، کیونکہ حس مر چکی تھی۔ لیکن حرص تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ تھی ـــــ شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا ـــــ لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر، جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے جنھوں نے اپنی اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا۔ اور اب اس چھوٹے شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے۔ پرکاش نے سوچا، کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دیے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گزرتی ہے اور پھر دہی روتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا "لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے"۔ اور رت جگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انھیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش، لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں، باپ، بہنوں، بھائیوں، بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنھیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا، اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں لیکن ایسے موقع تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے۔ ورنہ کئی سال گزر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھے سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گزر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا:

ہائے برجندر دے تیری ماسی
او نہوں لے گیا اک سنیاسی

ہائے دے اک سنیاسی
ہائے دے اِک سنیاسی

دھپ، دھپ، دھپ، دھپ

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں۔ اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ بتلائی۔ تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے ـــــ؟ اگر گیت سننے ہی کا شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے اور پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لے جائے اک

سنیاسی آخر ایک سنیاسی کیوں؟ ایک سنار یا چمار کیوں نہیں اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دل کش بناتے ہیں۔ کایا کلپ کرتے ہیں۔ مکتی دلاتے ہیں۔ اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں اس لیے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا۔ آج وہی گناہ ابل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لے میں ظاہر ہو رہا تھا' اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے' جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انھوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لیے تو ایک معصوم شاعرہ ہلدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑتا ماسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی۔ غیر محدود تھی عشق تازہ اور شباب زندہ تھا۔ لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے۔ آنکھیں موند لے' اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے اب گیت ہلکے ہو رہے تھے .... دولھا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ..... پرکاش وتی اور دولھا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزہ چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے ...... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا —— پرکاش وتی اور دولھا خوشنما اور سبک بیدی کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ایک ...... دو ... تین .... چار ... پانچ ... چھ ..... سات .....

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی اُفق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آگئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے اردگرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے اردگرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ سوشیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے ہوئے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک پچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا ہاتھ پر سرخ بندی۔ اسے اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے —— پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں اب تک وہ مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی۔ اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس

مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لاسکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گزرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے کسی کی چھاتیاں۔ کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہونٹوں کے کناروں پر۔ کسی کی آنکھیں نیم وا۔ . . . . . ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب وہ خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازہ کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی۔ اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے جینے ابھی تک بیں بیں کیے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کو ہو کو ہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول ہیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدورا کے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دے۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اس کے پاجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا۔ ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے کو چھو چھو کر گزرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا۔ اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنے پر سے ٹلے اور گلہریوں کی دمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے۔ دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دل کش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ اس دل کش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید . . . . . مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی . . . . . آسمانی . . . . . دھانی خوشیاں . . . . . غم . . . . . زندگیاں . . . . . . پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائے گی۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی، اس کی تہذیب، تمدن، اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور منجمد ہو جائے گی۔ لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی . . . . . . ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیر کے پتوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح . . . . . یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اجالا ہی اجالا ہو گیا۔ زمین کا رقص رک گیا۔ جینے کی بیں بیں بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رک گیا اور کہنے لگا، ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟ . . . . . . وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی

آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہوگئی۔ ...... ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر نہاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہوگئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں! آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں۔ اور بڑے بڑے طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے .... روں .... روں .... روں روں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے .... روں .... روں .... روں۔ اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور سنتا گیا.... روں... روں بے مطلب، بے معنی۔ منبع نامعلوم۔ منزل ناپید .... اب وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے ...... روں ...... روں ...... روں ......

کالو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مُسکرا کے پوچھتا ہے: "چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ ـــــ کتنے سال ہو گئے تمھیں لکھتے ہوئے۔"

"آٹھ سال"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا بُرائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمھارے ذہن کے ایک کونے میں مدّت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمھارا پُرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا، دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدّت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لیے آج تک کالو بھنگی اپنی پُرانی جھاڑو لیے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لیے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لیے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لیے، اپنے کولہوں کی اُبھری اُبھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لیے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھرّیوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا اُبھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک، کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈراماٹیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے، اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے۔ اس کی چار دیواری میں اپنے دیے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے، اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر منزل میں دیکھا ہے، بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو، اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے دیکھ کر اس کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے، وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے، حتّٰی کہ داستان شروع ہو کر ختم ہو

گئی ہے، حتّٰی کہ کردار اور تماشائی دونوں رُخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اُسے دیکھ رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے ماننے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا۔ جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مَرا، مَیں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصّہ معلوم ہوتی تھی، وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا، کمپونڈر صاحب کی بکری، اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لیے جنگل لے جاتا، اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا، بیس سال سے اُسے مَیں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلاناغہ۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اُسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ بھی۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ پر اس لیے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لیے اس کے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے، مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاہش ہے، اک ایسی مجبور بے زبانی ہے، اک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نجانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان سجاتے تھے اور برقانیت کے رومانی نظریے سے دُنیا کو دیکھا تھا اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔ جب مَیں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب مَیں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی، اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صمٌ بکمٌ، مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا، اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للّٰہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، سیٹھی کہانی بھی سُن لیجیے تاکہ یہ یہاں سے دُور دفان ہو جائے، اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا، اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دُور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اُسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے، اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار۔ اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے، اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت

ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حُسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دُنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حُسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کُسر کُسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا، وہ پیٹا، اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مَر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لیے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے، لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی، ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی ——— اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں، جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں، راستے میں وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں، راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منھ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منھ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کیے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر، کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے، کیونکہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دُعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں اک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئیٹر بُن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا کالو بھنگی اکثر اس کی تیمار داری اور خاطر و تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اُسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو۔ اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور، چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو وہ اسے اُٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رسنگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ مکھی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرتاین سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ

سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا، ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا! اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچّے بدذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ، کہ انھیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شئے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہات کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا، اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بُری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لیے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دل چسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لیے اب وہ کم دل چسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دل چسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے فاؤنٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کیسی چھوٹے صاحب؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی۔"

"نہیں چھوٹے صاحب" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلیے، ممکن ہے.....!)

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" ——— وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے ——— "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں، .... ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"

"ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا، کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے!"

اب بولیے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور چمک دار ہونے لگیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"

"کیوں ؟"

"اس علاقے میں مَیں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب - پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!"

(لیجیے یہ راستہ بھی بند ہوا) -

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی ؟" مَیں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا -

"کیا صاحب ؟"

"عشق کرنے کے لیے جی چاہتا ہے تمہارا ؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی -"

"عشق کیا ہوتا ہے - چھوٹے صاحب ؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ -"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب ؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سُنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں - رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتا دی - شادی کیوں نہیں کی مَیں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے ؟" ..... (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمھیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی ؟"

"کِس بات کا افسوس ؟ چھوٹے صاحب !"

مَیں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا -

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا - وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا - اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا - وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا - کمپونڈر دُور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپراسی اس کے لیے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا، وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لیے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی - کیونکہ کوئی اس کا وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی - روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کیے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے - پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سُنا - اور لحاف اوڑھ کر سو گئے - صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی - اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے بیکار چلّاتی رہیں - جانوروں کی ذات ہے نا آخر -

"ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا ! آخر کیا چاہتا ہے ؟ بتا دے -"

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے -

کیوں بھئی، اب تو مَیں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمھاری بابت جانتا ہوں - اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للّٰہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے ؟ کوئی بھول ہو گئی ہے ؟ تمہارا نام - کالو بھنگی - کام - بھنگی - اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی - عشق نہیں لڑایا - زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی - کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا - جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچّے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے - کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں - پھر مَیں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں ؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ

بلیہ کا، آٹھ روپے ہوگئے مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سَو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا، وہ جوان ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے، وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کرسکتا ہے، سرکار نے اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کرلیتا ہے، وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھتیا سے آئی تھی، سولہ سترہ برس کی الھڑ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی وہ اپنے گاؤں کے دو نوجوانوں کا عشق قبول کیے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کرسکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں درآنحالیکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لیے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کرپاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لیے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں، اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے، اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے، اور سانس رُکتے رُکتے رُک سی جائے، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں، اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں، اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی باہوں میں کھینچ لے۔ ہائے ——— پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی ——— نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کرچکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہوگئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا، اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھُری سے اُسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی، اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہوگیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں ——— خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے، انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں، ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا، بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کرسکتا تھا، مجبور ہوکے رہ جاتا، اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا، جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی، وہ ہر روز صبح اُٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دیے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی

وار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، سی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا، لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد راں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بہ روز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی، ں کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی ان تھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی اور جب روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار اک اظہار شکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھو بں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی اس نے خلجی سے شادی وعدہ کرلیا تھا، نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے، اس سے معافی مانگنے کے لیے، اس سے شادی کا یمان کرنے کے لیے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی، اور اس وقت تک اسے چین نہ تا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہات میں نہ لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں سے دیکھنے کے لیے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی۔ اور وہ دونوں خر دماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کیے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا، اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی —— سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سیکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گذر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پرکیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ:

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکّی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں، اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا، تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا، پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا۔ جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم رہے ہو۔ تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس رہا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔

اب تمہارے آٹھ روپے میں مَیں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنیے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے، کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے ہات جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں، شاید اب تیرے لیے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا وکیسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الّین اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے، بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا، اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لیے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کیے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوتے جاتے تھے، اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہو گئی، پھر کریری پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

"امّاں" ——— بخت یار کی بیوی زور سے چلّائی۔

"اماں" ——— بخت یار چلّایا۔

"اماں" ——— کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا ——— "میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی، تمہارے ماموں کے پاس۔"

نکر کے دو کوس اِدھر انھیں بخت یار کی امّاں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی۔ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لیے مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے، بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا، اور اپنا سر کھجانے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے، خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ، بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔
اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ سن، تو چاہتا ہے تاکہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے، وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ 'دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا'—— یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ۔ آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، اک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر، اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکان دار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھوئے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے
یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لیے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

نیا قانون

سعادت حسن منٹو

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صِفر کے برابر تھی اور نہ کبھی اس نے اسکول کا منہ ہی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی ——— "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔" اور جب گاما چودھری نے اس سے پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا ——— "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور ایک شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقّہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈّے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ حُقّے کا دَور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور بغل میں داب کر بڑے متفکرانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی پیر کی بددُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ مَیں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی ——— جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ——— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حُقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی ——— "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا، یا وہ روس والا۔ جس کی بابت مَیں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددُعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے، وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتّا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے

متلی سی آجاتی تھی۔ نہ معلوم کیوں؟ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھرّیاں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی اور وہ شام کو اڈّے میں آکر بل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کے سُنایا کرتا۔

"........" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا ——— "آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن گئے، ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں ......"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی .... جیسے کوڑھ ہو رہا ہو۔ بالکل مردار۔ ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ پہلے پہل جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پُرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے ......"

یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق دونوں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ——— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا ——— "چل بیٹا۔ چل بیٹا۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو اُن کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا ——— "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر۔ اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو اپریل کو

میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی "....... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــــ نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ـــــ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر ...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ـــــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے .... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا ـــــ "تو دیکھتا رہ! کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں اس لیے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ انھیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک سُنا نہ دیکھا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیش تر الفاظ انگریزی کے تھے اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ـــــ "ٹوڈی بچے۔"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا ـــــ "نئے آئین نے میری اُمیدیں بڑھا دی ہیں اگر .... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ......!" وہ دن میں کئی بار سوچتا ـــــ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو

اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آ رہی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی . . . . . . ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا ———

"ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نیا قانون کیا نظر آئے گا"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ، ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر کہا کرتی تھی ——— "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو، نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ ذہن کے اس ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ——— "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال سے چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے تھوڑی دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا کہ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بُلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ——— "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور پلک جھپکنے کی دیر میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی کے گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا —— "جانا مانگتا ہے یا پھر گڑبڑ کرے گا"

"وہی ہے" یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی — اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پُرزے اڑا دیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا —— "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں اس کے چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا —— "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران رہ گیا۔ وہ چلّایا —— "پانچ روپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں ہاں، پانچ روپے" —— یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا —— "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے اور اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیّر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں .... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں .... اب ہمارا راج ہے بچّہ"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ

مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا :

" وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ـــــــ اب نیا قانون ہے میاں ـــــــ نیا قانون "

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے، راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ " نیا قانون، نیا قانون " چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

" نیا قانون، نیا قانون، ـــــــ کیا بک رہے ہو ـــــــ ؟ قانون وہی ہے پرانا " اور اس کو حوالات میں بند کردیا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

سعادت حسن منٹو

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بورڈر پر پہنچا دیے گئے تھے۔

اُدھر کا حال معلوم نہیں لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دل چسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا۔ اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا ——— "مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا ——— "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں۔"

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا ——— "سردار جی، ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ——— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔"

دوسرا مسکرایا ——— "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ——— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائدِ اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے یہ کہاں ہے۔ اس کا محلِ وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا ——— اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں

تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان اور پاکستان اور ہندوستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا۔ جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا ——— "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی' پاس ریڈیو انجینئر' جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا' یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا۔ یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا' جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے ——— اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے "اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان' پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا ——— "اوپڑدی گڑگڑدی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ"

لیکن بعد میں "آف دی پاکستان گورنمنٹ" کی جگہ "آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ" نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا' پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان

ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے سر اور داڑھی کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پُرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اُسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اُسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی، اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینہ ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی وہ اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اُس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اُسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اُسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے، یا ہندوستان میں، تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا ——— "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں، اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اُسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا ——— "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گورجی دا خالصہ اینڈ واہے گورجی کی فتح ——— جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔ تبادلہ سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اُسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اُسے روکا ——— "یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ——— "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد

ہو سکی میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا ——— "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رک رک کر کہا ——— "ہاں ...... وہ ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا ——— "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ——— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کور سے بھی۔ بھائی بلبیر سے کہنا، فضل دین راضی خوشی ہے ——— دو بھوری بھینسیں، جو وہ چھوڑ گئے ہیں، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ...... اور ...... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا۔ میں ہر وقت تیار ہوں..... اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا ——— "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا ——— "کہاں ہے! ——— وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا ——— "پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ...... نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ——— "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ۔"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور اُن کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ وہ اِدھر اُدھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے، کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں۔ بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا ——— "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ——— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا ——— "پاکستان میں۔"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا ——— "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔" اور زور زور سے چلانے لگا ——— "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس

دی بے دھیانادی مونگ دی وال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان !"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اُسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ——— اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

گیندا

عصمت چغتائی

"جیسے یہ جھونپڑی ہے نا!" مَیں نے اور گیندا نے بالکمیری کی گھن دار جھاڑی کے نیچے رینگتے ہوئے تصوّر کیا اور ہم دونوں جھکے جھکے دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں پیلی پیلی مٹی کے صاف اور چکنے فرش پر ہم نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا سوچ بچار کے بعد ہم اپنا مرغوب ترین کھیل 'دُلہن دُلہن' کھیلنے لگے۔ گیندا نے اپنی بدبودار سُرخ اوڑھنی کا لمبا سا گھونگھٹ مار لیا اور گڑی مڑی ہوکر بیٹھ گئی۔ میں نے آہستہ سے گھونگھٹ اٹھا کر "دُلہن" کا مُنھ دیکھا۔ گیندا کا گول مٹول چہرہ خون کے ایک دم دوڑ جانے کی وجہ سے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بے چینی سے پھڑپھڑا رہے تھے اور وہ بمشکل اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے تھی۔

"اب ہم...... گیندا بھئی اب ہم۔" میں نے رشک سے تڑپ کر کہا۔

"اہا!" بھیّا نے ٹہنیاں ہٹا کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا ——— "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

گیندا نے ہڑبڑا کر گھونگھٹ پھینک دیا اور سہم کر بیٹھ گئی۔ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے۔

بھیّا کیا، کسی کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہم "دُلہن" کا کھیل کھیل رہے تھے تو یقیناً ہم پر مار پڑتی۔ یہ پُرشوق کھیل تو ہم ہمیشہ چھپ کر ہی کھیلا کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں؟

"آں...... ں"...... میں نے اٹھلا کر کہا ——— "ہم تو کھیل رہے ہیں۔"

بھیّا شاید نیکی کے دم میں تنے کر جھکتے ہوئے خود بھی اندر آ گئے اور اکڑوں بیٹھ گئے مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ گھبرا گئے۔

"اوں ہوں۔ کم بختو یہاں کیسے بیٹھی ہو؟" انھوں نے ایک ٹہنی سے اپنی ناک بچا کر کہا۔

"اور گیندا۔" انھوں نے اس کے پھولے ہوئے گال میں چٹکی لے کر کہا ——— "اور تو یہاں بیٹھی ہے کہتا ہوں ننھا سے۔"

گیندا نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

"ارے باپ رے" اور وہ اپنا مختصر سا لہنگا سنبھال کر بھاگنے لگی۔

"آں...... گیندا تو مت جا" میں نے اسے پکڑ کر مچلتے ہوئے کہا۔

"دادا مارے گا پھر۔" اُس نے بھیّا سے ڈرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مارے گا۔ تو نے کام تو کر لیا۔"

"اچھا بیٹھ۔" بھیّا نے نرمی سے گیندا کو اپنے پاس گھسیٹتے ہوئے کہا ——— "مگر بی بی تجھے تو ضرور پٹواؤں گا، یہاں زمین میں لوٹ لوٹ کر کپڑے گندے کر رہی ہے۔"

"کہہ دینا، کہہ دینا - میں کوئی ڈرتی ہوں" میں نے ڈر کر کہا اور کپڑے جھاڑنے لگی ——— !
"گیندا ...... اری او گیندیا ..... آ ...... کدھر مرگئی ——— ؟" بہو کی آواز گونجی اور گیندا بھیا سے ہاتھ چھڑا کر تیر کی طرح بھاگی۔
آن کی آن میں کھیل بگڑ گیا۔ میں بھیا سے اُلجھ پڑی اور کرتی بھی کیا۔
"اِس ..... ل ..... جاؤ یہاں سے" میں نے منمنا کر کہا۔
"تجھنتی"...... انھوں نے گھٹی ہوئی آواز میں دانت پیس کر کہا - اور ایک دھپ میرے لگا کر چل دیے -

(۲)

"بدھوا کاہے کو سنگھار کرے" گیندا نے فلسفیانہ انداز سے کہا -
"بدھوا !" میں نے سُرخ اینٹ کو جسے میں سیندور تیار کرنے کے لیے پتھر پر گھس رہی تھی کُرتے سے پونچھ کر کہا ——— "بدھوا !"
"ہاں، اور کیا، ہم بدھوا ہیں" مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے گیندا نے فخریہ کہا -
"اور ہم ؟" میں نے حرص کی -
"تم" وہ حقارت سے منہ بنانے لگی ——— "تم تو کنیا ہو ——— ہی ——— ہی ——— ہی ——— ہی ———" اُس نے مذاق اُڑایا -
میرا دل بیٹھ گیا - گیندا مجھے ہمیشہ حقیر سمجھتی ہے - میں، مجال ہے جو اس کی برابری کر پاؤں - پچھلے بیساکھ میں اس کا بیاہ ہوا - سُرخ سُرخ کپڑے پہنائے گئے، چمکتے ہوئے چاندی کے زیور بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت ہوگئے اور وہ کئی دن تک چھم چھم کرتی اٹھلاتی پھری - میں بے چاری کسی شمار و قطار ہی میں نہیں - ٹکر ٹکر منہ دیکھنا اور حرصیائی بلّی کی طرح اس کے پیچھے لگے رہنا - کبھی اس کی چوڑیاں گنتی کبھی اس کے گھنگھرو سنبھالتی، کبھی اس کا جھوٹے گوٹے کا دوپٹہ زمین سے لگ جانے پر تڑپ کر اٹھا لیتی - اماں کی زیادتی دیکھو اگر میں لحاف کا بھی گھونگھٹ نکال کر بیٹھوں تو ڈانٹ بتاتی ہیں ——— اونہہ - آخر کیوں ؟"
"کیوں بچھونے کھوند رہی ہے ؟" جیسے لحاف گھونگھٹ کے استعمال سے پھٹ ہی تو جاتے گا -
جو کبھی دوپٹیا اوڑھنے کو مانگوں تو جھڑک دیتی ہیں -
"نہیں ——— کچھ میں لتھڑنے کو نا !"
یہ مانا کہ میں گیندا سے چھوٹی ہوں، مگر اتنی ننھی بھی نہیں کہ دُلہن نہ بن سکوں - مجھ سے کہو ساری عمر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہوں، اور ذرا بھی جی نہ گھبرائے - آخر میں بھی تو انسان ہوں - گیندا کا میاں برسات میں مرگیا - سارا گھر دن رات روتا پیٹتا رہا - گیندا کی تو چوڑیاں توڑ دی گئیں اور وہ بھی خوب روئی ——— "ہا ——— بچاری گیندا" سب اس کو سمجھاتے بجھاتے اور پیار کرتے - اور میرا تو گھر میں کوئی نوٹس بھی نہ لیتا - ہر بات میں یہی کہ بس ابھی بچہ ہوں، ابھی چھوٹی ہوں - خاک پڑے اس چھوٹے پن کو - آخر کب تک چھوٹی رہوں گی ؟ اتنی تو بڑی ہوگئی کہ نیلی شلوار بھی اونچی ہوگئی اور گلابی قمیص بھی اب نرو کو دے دی گئی - ایک ذرا سجے کی قمیص تھی وہ بھی چھوٹی ہوگئی - اچھی اچھی چیزوں کے لیے تو میں "ڈھونگڑی" ہو جاتی ہوں اور ویسے مطلب کے وقت مجھے سب چھوٹا بنا دیتے ہیں - یہ اب تک مجھے نہیں معلوم کہ چھوٹی ہوں یا بڑی - کچھ عجب اُلجھن ہے ——— اونہہ !
"تو تم سنگھار نہیں کرتیں ؟" میں نے بے کار دوہرایا -
"جب پتی ہی مرجائے تو پھر "کس پر" سنگھار کریں ؟" گیندا نے صوفیانہ لہجہ اختیار کرلیا - مانگ کا سیندور، ہاتھ کی چوڑی پتی کے لیے ہی ہوتی ہے نا ؟" اس نے سنی سنائی بات کو یقین کا رنگ دینے کی کوشش کی -
"دیکھ گیندا کتنا ڈھیر سا سیندور بن گیا" میں نے پسی ہوئی اینٹ کو انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کہا -

گیندا سیندور کی چھوٹی سی ڈھیری کو ایک مکمل بیوہ کی طرح دیکھنے لگی لیکن جلد ہی ہم دونوں مسکرانے لگے۔

"تو بھابی سے نہ کہنا...... اچھا...... آؤ" اُس نے آگے سرک کر کہا اور ہم دونوں سنگھار کے لیے تیار ہوگئے۔ میں نے ایک تجربہ کار مشاطہ کی طرح گیندا کے اُلجھے ہوئے بالوں کو بمشکل پانی سے چپکایا اور اس میں سیندور بھر دیا۔ اہا۔

گیندا کا چہرہ لال لال ہوگیا اور اُس نے شرما کر منہ اوڑھنی میں چھپالیا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"ارے ارے" مَیں نے اُسے تنبیہ کی ——— "سب بگڑ جائے گا۔ بھئی ہم نہیں۔"

"لاؤ اب تمہارے لگاؤں" گیندا نے میرے سر پر پانی چپڑ کر کہا۔

"اور بندی؟" مَیں نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"ہاں......ں......اور کیا" اس نے اطمینان دلایا۔

ایک ذرا سی دیر میں ہم دونوں سیندور سے مانگ بھر اور بندیاں لگا سر پر اوڑھنیاں منڈھ کر سلیقے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر اپنے حسن کا اندازہ لگا کر شرمانا ہی پڑا۔

سامنے سے بھیّا نظر آئے اور گیندا سُرخ ہوگئی۔ ہم نے جلدی جلدی ماتھے کی بندیاں چھٹا ڈالیں اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

بھیّا مجھے دھکیل کر گیندا کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ شرمانے لگی۔ بھیّا نے دانت پیس کر اس کے دونوں گالوں میں چٹکی لی اور وہ اوں' اوں کر کے سُکڑ گئی۔

"اے ہے۔ یہ کیا ہے؟" بھیّا نے نفرت سے پسی ہوئی اینٹ کی ڈھیری کو جوتے سے بکھیر کر کہا۔ اُن کی اُجلی قمیص بھی خراب ہوگئی۔ وہ اسی پر چڑھ بیٹھے تھے۔

"یہ تو سیندور ہے۔ ہم نے بنایا ہے" میں نے فخریہ کہا۔

بھیّا انگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا۔

"لائیں تیرے لگاؤں" بھیّا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا۔

"اوں" اور اُس نے ہتیلی سے سیندور چھٹا دیا۔

"بھیّا۔ گیندا تو بدھوا ہے۔ وہ سیندور کب لگاتی ہے" مَیں نے اپنی قابلیت جتائی۔

"لگائے گی کیسے نہیں چڑیل" اور انھوں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُسے پیچھے دھکیلا۔ اس نے اپنا منہ چھپالیا۔

"گیندا' پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں" اور گیندا نے آخر کو منہ کھول ہی دیا۔

"گیندا" بھیّا نے اس کے قریب سرک کر کہا ——— "بیاہ کرے گی؟"

"ہٹ" اور وہ شرما گئی۔

مَیں بھی حرص میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم دونوں گھنٹوں بیاہ کی باتیں کر کے شرمایا کرتے تھے۔ بھیّا کو تو وہ باتیں معلوم بھی نہ ہوں گی جو ہم نے آپا اور ننھی کو کہتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپ کر سُنی تھیں۔

"ہٹ کیسی!" بھیّا نے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا ——— "بول کرے گی بیاہ!"

بہو کے چھڑوں کی جھنکار سے ہم تینوں چونک پڑے۔ وہ کنوئیں پر آ رہی تھی۔

"گیندا!" اس نے پکارا اور دوسرے لمحے ہمارے سروں پر آ گئی۔

"ارے رانڈ' یہاں بیٹھی ہے۔ چل استری دہکا" وہ غرائی۔

گیندا جلدی سے کترا کر جانے لگی مگر اُس نے لپک کر اُسے جالیا اور بال پکڑ کر دو جھٹکے دیے۔

"اور یہ مانگ چوٹی تو نے کیسی کری ہے؟" اس نے دھول مار کر کہا۔ گیندا غوطہ مار کر نکل گئی۔ میں اور بھیّا تڑپ اُٹھے۔ بہو سے میرے بدن میں آگ لگی تھی۔ وہ جب گیندا کو مارتی میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کا نقصان کر دیتی۔ آج بھی جیسے ہی اس کی آنکھ بچی، میں نے مٹھی بھر کے راکھ اس کے صاف ستھرے کلف میں جھونک دی اور بھیّا نے شام کو کالروں پر خراب استری کرنے کے قصور میں نتھا کے دو جھاپڑ کس کس کر لگائے۔

(۳)

"سُونگھو" گیندا نے اپنی پھٹی ہوئی کُرتی کا گریبان میری ناک سے لگا کر کہا۔

"سوں..... ہا ——! عطر کہاں سے آیا؟" مَیں نے بلبلا کر پُوچھا۔

"بھیّا" اور وہ زور سے کھلکھلانے لگی۔ میں بھی رشک کو دبا کر ہنس دی۔

"گیندا!" بھیّا نے برآمدے سے پُکارا —— "یہ کوٹ استری کے لیے لے جا!" وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مُسکراتی ہوئی چلی۔

"گیندا کیسے چلی تھی؟ جیسے لچکی جا رہی ہو۔ میں جب چلتی تھی تو دھپا دھپ، جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ میں تو..... اونہہ میرا جی گھبرانے لگا اور میں جل کر باغ میں پانی دینے کی ہودی میں ایک لکڑی اٹھا کر گھنگولنے لگی۔ صبح کی پیسی ہوئی اینٹ کا سیندور اب تک وہیں پڑا تھا۔ بھیّا نے گیندا کے تو عطر لگایا اور میرے لگانا شاید بھُول گئے۔ بھُول کیوں گئے جان بوجھ کر ہی نہیں لگایا۔ حالانکہ ان کی سگی بہن ہُوں اور گیندا..... وہ تو ان کی کوئی بھی نہیں۔ مجھے بھیّا سے نفرت ہوگئی اور میں زور زور سے لکڑی گھُمانے لگی۔

"ہاں ہاں۔ کیا کرتی ہو بی بی" میوہ رام نے پیچھے سے آکر کہا۔

مَیں غور سے میوہ کو دیکھنے لگی —— "میوہ بھی تو میرا کوئی نہیں!" میں نے سوچا۔ مگر میں اُس کے ہاتھ دیکھ کر اُداس ہوگئی۔ کیا مجال جو یہ کم بخت ذرا اپنے ہاتھ مانجھ کر میل چھڑائے ہر وقت مٹی کھودتا رہتا ہے مگر خیر۔

"میوہ!" میں نے نرمی سے کہا —— "ذرا یہاں آ" اور میں غور سے لکڑی میں سے بُوندیں ٹپکتی ہوئی دیکھنے لگی۔

"کیا؟" وہ لاپروائی سے مُڑا۔ اور ٹوپی آنکھوں پر سرکا کر گُدی کھجانے لگا۔

"یہ...... سیندور میرے ماتھے پر لگا دے" میں نے لجاحت آمیز لہجے میں حکم دیا۔

"یہ سیندور ہے" وہ گھُٹے گھُٹے ہنسنے لگا اور چلا مُڑ کر۔

"سُن بھئی —— مَیں تو —— میوہ —— ذرا ٹھہرنا" ایک نئے خیال کے ماتحت میں نے کہا۔

"کیا ہے بی بی؟" وہ ذرا مڑ کر بولا۔

"میوہ —— بیاہ کرے گا؟" مَیں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پُوچھا۔

"بیاہ! میرا تو بیاہ ہو بھی گیا" وہ کھُرپی کا دستہ پیڑ کے تنے سے ٹھوکنے لگا۔

"کب؟" میں نے مُردہ آواز میں کہا۔

"ارے رام! مُدتیں گُجر گئیں" اُس نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"اچھا تو تُو بدھوا ہے" میں نے فیصلہ کیا۔

"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا —— "کون کوٹھڑیا میں مالن بیٹھی ہے؟"

"کیا مالن سے تیرا بیاہ ہوا تھا؟" مَیں نے حیرت سے کہا۔

"ہوں"، اور وہ چل دیا۔

اچھا تو وہ بڑھیا جسے میں میوہ رام کی اماں سمجھتی تھی اس کی بیوی تھی —— "کیسی عجیب دُنیا ہے"۔ میں نے سوچا اور پھر ہودی میں لکڑی ڈال کر زور سے گھمانے لگی …… میں نے جھک کر اپنا گریبان سونگھا کہ شاید وہاں بھی کسی عطر کی خوشبو ہو، مگر دُور دُور کہیں خوشبو کا نام نہ تھا۔ ہاں صبح جو سالن گر گیا تھا البتہ اُس کی بساندھ تھی۔ میں حیر گئی۔

(۴)

گیندا چپکے چپکے بھیا کے کمرے میں تولیہ میں لپٹے ہوئے کپڑے رکھنے جا رہی تھی۔ میرے دل میں گدگدی ہوئی اور دبے پاؤں بلّی کی طرح میں بھی پہنچی اور دراز میں سے جھانکنے لگی۔

گیندا فرش پر بیٹھی کپڑے گن گن کر الگ کر رہی تھی۔ بھیا کونے میں کھڑے سر کھجا رہے تھے۔

"ہٹ۔ غلط گن رہی ہے"۔ بھیا نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اس نے ایک نظر بھیا کو دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر منہ دی۔ انھوں نے اُسے کھینچا تو وہ سکڑ کر دری پر اوندھے منہ لیٹ گئی اور کسی طرح نہ اٹھی۔ بھیا نے اس کی کمر میں جو گدگدی کی تو تڑپ اُٹھی۔ بھیا جو آگے آئے تو اس نے ایک تھپڑ ان کے گال پر رسید کیا۔

تعجب ہے کہ میں چونک کر نیچے نہ گر گئی۔ بھیا کے تھپڑ؟ بھیا! جن کے خوف سے سارا گھر لرزتا ہے، ان کے گیندا نے تھپڑ مار دیا۔ میں بھاگنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں نے سوچا اب بھیا نے اس کا گلا گھونٹا۔ اور اب گھونٹا۔ انھوں نے کچکچا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اپنی طرف گھسیٹ لیا میں نے سانس روک لی …… مگر …… ارے لو …… میں حیرت اور خوف سے ملے جُلے جذبات سے مجروح ہو کر سرپٹ بھاگی اور کمرخ کے گھنے درخت کے نیچے آ کر دم لیا۔ میرا کلیجہ بلیوں اُچھل رہا تھا۔ کانوں میں جیسے کوئی انجن چل رہا ہو۔ بدن لرز رہا تھا اور زبان خشک تھی۔ میں دیر تک اسی طرح ڈری بیٹھی رہی۔

آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوچا مگر خاک جو سمجھ میں آیا ہو۔ آخر کیوں میری سمجھ میں اتنی ڈھیر سی باتیں نہیں آتیں۔ خاموش اور گرم دوپہر میں، میں نڈھال ہو کر عجیب عجیب معموں سے لڑتی رہی۔ ایک بھی تو حل نہ ہوا۔ رونا آنے لگا جیسے کسی نے مجھے خوب ہی تو مارا ہے۔

گیندا برآمدے میں سے ایک کر اتری۔ میں سمجھ گئی کہ میرے سوالوں کا جواب وہی دے سکتی ہے۔ گیندا مجھے کتنی باتیں بتاتی تھی۔

"کیا ہوا —— ؟" میں نے بے چینی سے پُوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ وہ مکاری سے اترائی مگر فوراً ہی ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر ہم دونوں "عجیب عجیب" باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گیندا نے افوہ، کتنی باتیں بتائیں۔

"ارے، مگر آخر کیوں؟" میں نے سب کچھ سُن کر سوچا۔

گیندا کلف چڑھانے چلی گئی اور میں پھر ایسی بیٹھی رہ گئی گویا راستہ گم کر دیا ہو۔

میں نے چاہا کہ چھوٹی چھوٹی کرضیں بین کر ہار ہی بناؤں یا پھر اس نالی کو پورا کروں جسے میں نے کل پانی دینے کے لیے کھودا تھا۔ یا پھر ایک نظر بالکبیری کی جھاڑی کے نیچے ہی ڈال آؤں۔ یا نہیں تو لاؤ۔ یہی معلوم کروں کہ "نیتر نی" نے انڈے کہاں دینے شروع کیے ہیں مگر نہیں میرا تو دل کسی بات میں نہ لگا۔ نہ جانے کیوں ہر کھیل سے میرا جی اُکتا گیا تھا اور جی چاہتا تھا چپکی آنکھیں بند کیے ہوئے کوئی خواب دیکھتی رہوں جس میں کوئی ننھی مُنّی دلہن ہو اور بس پھر اسی خیال کی دُنیا میں گُم ہو جاؤں۔ آخر کیا کروں۔ گیندا کو دیکھو! مگر میں کیا کروں۔ میوہ کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی اور میں جیسے چونک

پڑی - ایک خیال، ایک اُمید کی ہٹی ہوئی سی جھلک، اور میں زمین پر دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ کر اوندھی لیٹ گئی۔

"سچ — سچ ہا — بی بی زمین پہ ؟ — اُٹھو، — اُٹھو !" اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کوئی مجھے اُٹھا رہا ہے، اور میں نہیں اُٹھی - میری پیٹھ میں کسی نے گدگدی سی کی ...... مگر ...... اونہ ......

"اُٹھو، نہیں تو کہتا ہوں بھیّا سے لو کپڑے میلے کر رہی ہیں۔" اُس نے دھمکی دی اور ویسا ہی لٹھ کا لٹھ دور کھڑا رہا۔

وہ نہایت لاپروائی سے بانس کی کھپچی چھیل رہا تھا مگر اس انداز سے نہیں جیسے بھیّا سر کھجا رہے تھے۔

"اُٹھتی ہو کہ سچ مچ ہی جا کر کہہ دوں۔" اور وہ چلا شکایت کرنے - ذرا سوچیے میرا کیسا جی جلا۔

"شور، تو کون ہوتا ہے - آں ...... ں۔" میں نے چینخ کر کہا، اور ایک پتھر کس کے اس کے گھٹنے پر دے مارا۔

"ارے ہا - ے، ٹھہر تو جاؤ کیسا پٹواتا ہوں - دوپہر یا بھر گھام میں گھومتی ہیں اور رتیا میں لوٹیں لگاتی ہیں - جو کچھ کہو تو ...... ٹھہرو —" وہ سی سی کرتا چلا گیا۔

"یہ کم بخت میوہ رام سدا کا ٹھس ہے - کیا مجال جو مجھ سے سیدھے منہ بات کر جائے - بڑا وہی تو ہے نا !" میں ایسی جلی کہ موتیا کی ساری قلمیں جو اس نے گھنٹوں کی محنت کے بعد لگائی تھیں ایک ایک کر کے کھسوٹ ڈالیں - ایسے انسان کا یہی علاج ہے۔" میں نے سوچا اور لسورتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

(۵)

کون تھا جو مجھ سے ہمدردی کرتا - بھیّا نے تو کبھی منہ نہ لگایا - اماں نے کبھی بہ لاڈ ہی نہ کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدّی ہو گئی - طبیعت میں جو اُلجھن پیدا ہوئی تو سب سے ہی بیَر باندھ لیا۔

باجی جو اَب کے آئیں تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں دن بھر واہی تباہی گھومتی تھی اور لڑتی پھرتی تھی - مجھے گیندا کے چھوٹنے کا بڑا افسوس تھا مگر سفر کی خوشی کچھ ایسی سوار تھی کہ سب کچھ بھُول گئی۔

گیندا - بھیّا - میوہ اور ساری باتیں دو سال کے عرصہ میں خواب ہو گئیں اور جب میں واپس آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی - بھیّا دہلی بھیج دیے گئے تھے - ان کے کمرے میں مہمان ٹھہرتے تھے - میوہ رام نمونیہ سے مر گیا تھا کیونکہ اس نے اپنی مٹی سے کھیلنے کی عادت نہ چھوڑی اور سردی لگ گئی - تعجب ہے کہ میں خوشی اور حیرت سے بے ہوش نہ ہو گئی - جب میں نے سُنا کہ گیندا کے بچّہ ہوا تھا - اظہارِ مسرّت پر مجھے ڈانٹا گیا - میں خاک نہ سمجھی کہ کیوں ؟ ہاں اتنا تو سُنا :

"اے ہے بہتیری تو اس نے کوشش کی ...... مگر وہ تو ......" آگے میں نے نہیں سُنا کہ شیخانی نے کیا کہا۔

"اے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا - بڑی آفتیں اُٹھیں۔" بیوی نے کہا — میں نے فوراً اُسے دہلی چلتا کیا - پڑھنے والا بچہ ! یہ نیچ ذات کمینیاں شریفوں کو یونہی ......" اور پھر باوجود سانس روک کے سننے کے آگے نہ سمجھ سکی۔

"گیندا کا بچّہ !" میں بستر پر لیٹی رہی بار بار دہرانے لگی - مجھے حیرت پہ حیرت تھی" مگر یہ بچّہ ! ...... آخر کیوں ؟"

"وہ تو اگر سرکار کو خبر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا - اسی لیے تو میں نے اُسے جلدی سے دفعان کیا۔" مجھے بیوی کی آواز پھر سُنائی دی۔

اب میں سمجھی، اوہو ! میری نظروں کے سامنے ساری گذشتہ باتیں سینما کی تصویر کی طرح پھر گئیں - اور میرا دل بیٹھنے لگا لیکن فوراً ہی گیندا کے بچے کو دیکھنے کے لیے میں بے قرار ہو گئی - میری آنکھوں میں ننھا مُنّا سا بچہ پھرنے لگا - جیسا ہم نے ریل میں لاہور جاتے وقت دیکھا تھا - ذرا سا بچّہ مگر کتنا پیارا - ہمارے یہاں تو کوئی بھی بچّہ نہیں - کوئی بچہ مہمان بھی نہیں آتا - مجھے گیندا کے بچّے پر پیار آنے لگا - اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ننھے ننھے ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن پر رینگ رہے ہیں - میں چپکی لیٹی رہی کہ کہیں وہ چھوٹی چھوٹی فرشتوں جیسی انگلیاں میرے ہلنے

جلنے سے بھاگ نہ جائیں۔

رات کو خواب میں بچے ہی بچے، سینکڑوں بچے عجیب عجیب شکلوں کے گیندا کی شکل والے، میری شکل کے، بھیا کی شکل کے، یہاں تک کہ مرے ہوئے میوہ رام کی شکل کے سینکڑوں بچے، کلیل کرتے۔ کچھ بے بالوں کے، کچھ بالو دار، گول مٹول سر ذرا ذرا سے ہاتھ۔ ریت کے بے شمار ذرّوں کی طرح ساری کائنات پر بکھرے ہوئے تھے۔

صبح میں چھپ کر گیندا کے بچے کو دیکھنے چلی ہی گئی۔

(۶)

گیندا اپنی کوٹھڑی میں دروازے کی طرف پشت کیے جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی، میرے پیروں کی چاپ سن کر وہ چونک پڑی اور ڈر کر مجھے دیکھنے لگی، اور جلدی سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے۔ میں نے سامنے جا کر دیکھا تو ایک مختصر ترین نیم برہنہ انسان اس کے گھٹنے پر پڑا ہوا اپنا کلھیا سا منہ پھاڑ رہا تھا۔

"اوئی کتنا منّا سا ہے۔" میں نے اس کے پاس اُکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

گیندا کتنی دبلی ہو گئی تھی جیسے لکڑی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔

"ہائے۔ جان ہے تیرا بچہ تو۔" میں نے خوشی سے چیخ کر کہا ——— اور زمین پر بیٹھ گئی۔ جی چاہا۔ گیندا اور اس کے بچے کو اٹھا کر کلیجے سے لگا لوں۔ مجھے نہ جانے کیوں رونا آنے لگا۔

"ذرا مجھے دے گیندا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا مگر وہ خاموش بیٹھی اپنے آنسو پونچھتی رہی۔

"ارے رو رہی ہے تو۔" مجھے تو رقت آنے لگی ——— "ایک تو اتنا گڈو بچہ ہے اور پھر رو رہی ہے۔ لا مجھے دے۔"

وہ سر جھکائے منہ پونچھتی رہی اور بچے کو چھوا تک نہیں۔ میں نے چاہا بچے کو گود میں لے لوں۔ ای۔ ای۔ وہ تو ایسا گلگلا جیسے گوشت کی بوٹی۔ اور کسی طرح نہ اٹھا۔

"اونہ گیندی، ذرا اٹھا دے۔" میں نے اپنے پرانے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

گیندا نے مجھے غور سے دیکھا جیسے وہ میری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ شاید جو کچھ وہ ڈھونڈ رہی تھی اُسے مل گیا اور اُس نے ایسی آسانی سے بچے کو اٹھا کر مجھے دے دیا کہ میں اس کی مشاقی پر حیران رہ گئی۔ جیسے روئی کا گالا۔ ہلکا پھلکا دبلا سا بچہ۔

میں اُسے ٹاٹ پر لیے بیٹھی رہی اور گیندا نے مجھے لاکھوں کروڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں۔ کس طرح وہ مہینوں ماری گئی۔ چودہ پندرہ برس کی گیندا خود بھی بہت سی باتیں نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے کیسے بتاتی، ہم دونوں "کیوں" ——— "کیسے" اور ——— "ارے" پر آ کر رک جاتے۔

جب بہو کے کالا کلوٹا بچہ ہوا تھا جو کچھ دن بعد ہی مر گیا تو کیسے گانے بجانے ہوئے تھے۔ بہو کو منوں گھی اور گُڑ ٹھنسایا گیا اور اب جو گیندا کا اتنا گورا سا بچہ ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ گیندا پٹی اور بھوکی رکھی گئی اور مرتے مرتے بچی۔ تب یہ ننھا سا "للو" آیا۔ للو کے پاس دو ہی کُرتے تھے۔ ٹھنڈ میں مرا جاتا تھا۔ رات بھر روتا تھا۔ بہو اسے ہر وقت کوستی تھی کہ مر جائے تو چھٹی ہو جائے۔ گیندا نے چپکے سے للو کے پیر میں کالا ڈورا بھی باندھ دیا تھا کہ کہیں اسے نظر نہ لگے۔ اس نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ للو دُنیا بھر میں سب سے زیادہ پیارا ہے، اور ہاں میں بھی اور بھیا بھی۔ بھیا کے نام پر اس کی آنکھیں اپنی پرانی روشنی سے چمکنے لگیں اور ان کا متواتر ذکر کرتی رہی۔

"وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟"

"ہاں اب آئیں گے۔ پارسال مسوری چلے گئے تھے۔" میں نے بچے کی انگلیاں گنتے ہوئے کہا۔

"تم انھیں چٹھی لکھوگی، کیوں بی بی؟" اُس نے شوق سے پوچھا۔
"ہاں ہاں" مَیں نے زور سے سر ہلایا۔
"ہاں تو لکھ دینا کہ للّو تمھیں بہت بہت سلام کہتا ہے، اور بہت ہی یاد کرتا ہے۔"
"اچھا" میں نے کہا۔ حالانکہ للّو چوں بھی کرنا نہ جانتا تھا۔
"اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لیے اب کے لال بنیاتن لائیں۔ جیسی بسنتی کا چھورا پہنے ہے۔"
"اور..... یہ کہ......" اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"اب کی بار چھٹیوں میں دو چار دن کے لیے ضرور آنا" جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو، اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی، اور میں للّو کے بالوں سے کھیلتی رہی۔
"دیکھ..... دیکھ گیندا کیسے پچوڑ رہا ہے..... آ آ ــــ" مَیں نے اُنگلی میں گدگدی محسوس کرکے کہا۔
"بھوکا ہے"
گیندا شرما گئی۔
"رے بھئی۔ نہیں رو دے گا پھر"
گیندا نے اپنے دُبلے پتلے ہاتھوں سے بچّے کو اُٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں اُسے کلیجے سے چمٹا لیا۔ اور ساڑھی میں مُنھ چھپا کر ہنستی رہی۔ میں بڑے شوق سے ننھے للّو کے پتلے پتلے ہونٹوں کو دیکھتی رہی اور وہ لمبی لمبی سانسوں سے دودھ پیتا رہا۔ ننھی سی ماں، پھوہڑپنے سے اُسے سنبھال رہی تھی۔

چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلّے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچّے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچّہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلّا اُٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنوں پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو۔ اور بچّہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبری کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے۔ مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمّت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملے میں کبری کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے۔ کتنی چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلّے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبری کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبری کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبری کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبری کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں۔ جیسے جیسے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اُٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچّے بھی ٹھسک دیے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو دیے۔ نئی بیاہی دُلہنوں نے انگشتانے پہن لیے۔ کبری کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح اماں بی سہ دری کے چوکی پر جا بیٹھتی ہیں۔ اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبری کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اُٹھتی

روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو اُن کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ــــ گہری خندقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا، ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور لکڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے، گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پُرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اُتر آئے گی، پر بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا۔ لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں، اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی منچلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی، کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی۔ بے ہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا۔ اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھر والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے میں پہنچ جاتی۔ کوئی کلی اُلٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقہ کا دم بھی پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دُبلے پتلے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی، اوپر سے چکنائی۔ بلغم نہ پیدا کر دے گی؟ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔" ابّا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقّے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔"

اور اب ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں۔ نہ اس کے سینے پر طوفان اُٹھے۔ اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی۔ ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے۔ اور انھیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی امّاں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شب رات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ امّاں بی کو تو بس ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی۔ اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ "بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی امّاں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکرو چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی۔ اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے وہ بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اُٹھا لیے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا

"نہیں۔" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی۔ بی امّاں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں۔ اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی۔ اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں

بھی جو سنجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتے۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی"۔ وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اُٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جُٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی بالائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اُٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں۔ اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندھی بنیان اور ناک سے بھرے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چیچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ"۔ بی اماں تاویلیں پیش کرتیں "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے۔ رنگ ڈھنگ سے، اور کچھ آنکھوں سے"۔

"اے نوج خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا کسی نے"۔ بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے"۔ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی"۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی"۔

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے"۔

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا؟" بی اماں چڑھ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر........" میں لاجواب ہو گئی اور مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں۔

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا"۔

"نہیں ہنسوں گی"۔ میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے"۔ میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے"۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا"۔

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا۔ اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی ماند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے ۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولہا بھائی، کھلی کے کباب کھا رہے ہو" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا۔ اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتائیے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیے اور ہم نے کھائے۔ مزے دار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمھیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے

"کہیے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا۔ اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمھارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ .... نہیں ..... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا۔ بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔

"اونھ۔" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح پلٹ کر جو دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پان کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور میں بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں ..... اوہ نہیں .... کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا

ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ!" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالا پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں۔ بستر بچھاتے ہیں۔ جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو۔۔۔۔۔

مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک۔ بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ۔۔۔۔۔"

"اری چپ مردار۔" انھوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم۔ میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

"آپا بی۔ تم خود کیا پہنوگی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے۔ مٹی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پور اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو محنت نے ان میں زخم ڈال دیے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی، موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

وہ بولے۔" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔" میں نے سوچا آج میں سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے........ دیکھیے میری ساری چوڑیاں چور ہوگئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا........ سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں ہیں۔" میں نے سلگ کر کہا۔ "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں۔" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں۔"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے ۔۔۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں۔ "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔ منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔ اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں۔ شرمانے لگتے۔ اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کر بھیج دیں۔ کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کے کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری، اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصہ پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کے ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا

ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلّے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کے بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کے ایالوں کو چوم رہا ہے۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے، پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی آپا بی چلی آ رہی ہیں۔...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں، ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذرّوں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔ حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ...... یہ ملیدہ" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا......! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے۔ اور سوئٹر نہ بنے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا۔ اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں

سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمّل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرت کیا۔ اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کا دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے۔ اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

ننھّی کی نانی

عصمت چغتائی

ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سرسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دُنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھر لی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دل چسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی بھاگ دوڑ میں کچھ بھوننا بھلسنا بھی آگیا اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے، اِدھر کی اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصا منافع بخش ہوتا ہے۔ محلے میں کھٹ پٹ چلتی ہی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جاکر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارت ہوتی ہے لیکن یہ پیشہ کے دن چلتا، نانی لُتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پاکر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں

"اے بوی گھیاں ڈالی ہیں گوش میں" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بُوا گھیتں نگوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوش۔ جب دیکھو آلو گوش۔ ہا...... اب تو مہینوں گزر جاویں آلو گوش جو آنکھوں سے بھی دِکھ جاوے...... اے بوی کو تمیر چھوڑ دیا؟"—— وہ ایک دم فکر مند ہو جاتیں۔

"نہیں بُوا کو تمیر نگوڑا سب مارا گیا۔ مواستقے کا کُتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کوتمیر کے بھلا آلو گوش کیا خاک مزا دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی، حکیم جی کے لونڈے نے کل شبتن میاں کی پتنگ میں کنکی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو پیچھے پر قدم رکھا۔ تو......"

"اے بیں کوئی نمائے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔"

اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹ پٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے کھسکتی گھسٹتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑکر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کوتھمیر پر ہاتھ۔ کوتھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لیے سارے محلہ میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منھ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لیے۔ شکر کی پھنکی مارلی۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکالی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اُڑس لی — دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر، آدھی اُدھر اور پرسے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کونکتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے پر کسی کو منھ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذراسے شبہے پر ہی وہ فیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں، قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون اُن سے جھوٹا قرآن اٹھواکر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

لتری، چور، اور حکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو اُن کا وہ برقع تھا جو ہر دم اُن کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی۔ پر جوں جوں محلہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیر باد کہہ دیا مگر کنگوروں دار فلیٹن ایل برقع کی ٹوپی اُن کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو، پر پیچھے برقع بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گڑی مڑی کرکے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنجوقتہ نماز کے لیے جاء نماز اور جب محلہ کے کتے دانت نکوستیں تو اُن سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقع کا گھیرا اس کے منھ پر پھنکارا۔ نانی کو برقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر ملی اور احتیاطاً پیوند چپکالیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقع بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جائے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو کل اس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال لیا۔ جب دھتکار پڑی، کوچ کرکے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقع اوڑھا آدھا بچھایا لمبی تان لی۔

مگر برقع سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی نھتی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اُسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے چوکنے ہو گئے۔ اُن کی جوتیوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ نھتی کو اس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ نھنی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بابلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نانی منڈیر پر جامن کی چھاؤں میں جھپکی لے رہی تھی۔ ڈپٹیائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ نھنی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور نھنی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم، بید، چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی نھنی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب نھتی کی نانی کی آنکھ کھلی تو نھتی غائب۔ محلہ چھان مارا، کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھڑی کو لوٹی تو کونے میں

دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگھی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ اُسے گالیاں دینے لگی ——— "مالزادی اُچھا چھکا۔ یہاں آن کرمری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوجھ گئیں۔ ٹھہر تو جا، سرکار سے کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پر دوہتڑ مار مار چنگھاڑنے لگی۔ پڑوس نے سُنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی مگر ڈپٹی صاحب ...... محلّے کے مُکھیا، تین نواسوں کے نانا، پنجوقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ منہ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی۔ آٹے گڑ کا حلوا کھلا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلّہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھُپ چھُپ کر ننھی کو بُلاتیں۔

"نئیں ...... نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی"...... بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں۔

"کیا ہوا ...... کیسے ہوا ......" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچّی کچّی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔ ننھی بھول گئی ...... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچّی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں۔ ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور روڑا پن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں بلکہ ٹیڑھی میڑھی مورت جس پر کسی دیو نے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھنگنی۔ موٹی۔ کچوڑ سی جیسے کچّی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کولھے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چٹکیاں بھرتے۔ مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان تھرک اٹھتا ...... مگر اب نانی بجائے اُسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جالو ربڑ کی گیند، ٹپّا کھایا اور اُچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوکھی سے محلّہ لرز اٹھا۔ سُنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سُنا مسجد کے مُلّا جی کو رجوا کہار نے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سُنا صدیق پہلوان کا بھانجہ منتقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پَیر دھرنے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلّہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دلّی، بمبئی میں اس مال کی تھوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دِن سے نگوڑی چُپ چاپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چُپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھالے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پَیر دبانے لگی۔

"نانی بی .... اے نانی بی ذرا "سبحانک اللھم" سن لو ۔ یاد ہے کہ نہیں' نانی نے سنا فرفر یا دیا"

"جا بیٹی اب سو جا" نانی نے کروٹ لے لی ۔

"اری مرتی کیوں نہیں ۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اُسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سن کر کہا ۔ سمجھی "خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کر دیا ۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لاتی ہے ۔"

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی ۔ ننھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی اور صبح ننھی غائب ہو گئی ۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آ جاتی ہے ۔ کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے ۔ ٹم ٹم ہے ۔ منوں سونا ہے' بیگموں کی طرح رہتی ہے ۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا ۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اُسے سونا گاچی میں دیکھا ۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا ۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی ۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہو گئیں ۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے ۔

"اے نانی نکاح کر لو ———" بھابی جان چھیڑتیں ۔

"کس سے کلّوں ؟ لا اپنے خصم سے کرا دے ۔" نانی بگڑتیں ۔

"اے نانی مُلا جی سے کر لو ۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں ۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں ۔ وہ وہ سپنیرے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے ۔

"مل تو جائے بھڑوا .... ڈاڑھی نہ اکھیڑلوں تو کہنا ۔" مگر جب ملّا جی کبھی گلی کی نکڑ پر مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں ۔

علاوہ محلّہ کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے نگوڑے بندر تھے ۔ جو پیڑھیوں سے اسی محلّے میں پلتے بڑھتے آئے تھے ۔ جو ہر فرد کا کچا چٹھا جانتے تھے ۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچّے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں ۔ پر نانی بھی انھیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں ۔ انہوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی غلیل ہتھیائی تھی اور سر پر برقع کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اُچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے ۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پر رَج چلتی رہتی ۔ محلّہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ' چلّا' چالیسواں ہوتا' نانی جوٹھے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں ۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ جھکیّہ دے کر حصّہ لیتیں ۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اُسے حسرت سے تکتیں ! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا ۔ تو کتنے مزے رہتے ۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں ۔ چھٹی ہوتی مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹور ٹھکانا نہیں اس لیے نانی ٹاٹ کے بسیروں پر جھوٹے ٹکڑے پھیلا کر سکھا لیتیں پھر انھیں مٹکیوں میں بھر لیتیں ۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چڑ مُر کیے ۔ پانی کا چھینٹا دیا ۔ چٹکی بھر لون مرچ بُرکا اور لذیذ ملغوبہ تیار ۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بار ہا یہ نسخہ ان پر ہیضہ طاری کر چکا تھا ۔ چنانچہ لُس جانے پر ملوغا کر یا ان ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تا کہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں ۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مُول تو کیا تحفتاً بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے ۔ وہی عزیز از جان جھوٹے ٹکڑے جنھیں بٹورنے کے لیے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا ۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی ۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں ۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں ۔ چھپّر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں ۔ نانی بھی اس وقت مردِ میدان بنی سر پر برقع کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں ۔ سارا

دن "لگے لگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو ان سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے اور کیوں بدذات لال پچھائے والا، ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقع کے ساتھ ان کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ ان کی گڑیا، وہ اپنے سارے دکھ اس تکیے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھیے نانی منڈیر سے لگی برقع کی آڑ میں نیفہ سے جوئیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے، یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کرے گیا۔ وہ دھاڑیں۔ وہ چلائیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے روٹی دے جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹھی بھر ٹکڑے لٹا دیے، پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کیے گئے مگر اس کا جی نہ پگھلا۔ اور اس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کیے۔ وہی غلاف جنھیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلاف بھی اتر گیا اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجے پر سے پٹکانا شروع کیے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی۔ بنو ستے کا انگوچھا..... حسینہ بی کی انگیا...... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا پھنا......

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ...... منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیص کی آستین مع کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی کجلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ ـــــ ملا جی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا مال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ، دوب اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا گلٹ کا تمغہ جو اسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکارِ عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا ـــــ بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور ـــــ بے ایمان ...... کمینی"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے"

"پولیس میں دے دو"

"ارے اس کی توشک بھی کھولو، اس میں نہ جانے کیا کیا ہوگا" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک، سر نیچا اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھر جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے ہل ہل کر سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں..... دم بھر کو اونگھ جاتیں پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے چلنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی چپکی پہکی روتیں، کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بے چارے خود کونسے لکھ پتی تھے تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقعے پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے

بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتوئی اب سردیوں سے دھینگا مُشتی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ مُنی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈ کلھیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانے میں ایک دیو تھا۔ اس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا، اُس صندوق میں ایک اور صندوق اور اس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا...... اور اس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑی، ادھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دُوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔

دُنیا کا کوئی دُکھ کوئی ذلت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں۔ پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے اور جب ننھی منہ پر کالک لگا گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں۔ سات بار تو چیچک نے اُن کی صورت پہ جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اُونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کُتیا کی کلّی رہی ہوں گی جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو اُن کے قریب پھٹک جائے۔ لبیریاں لگائے پھریں گی مگر مردہ کا کپڑا ان سے نہ چھو جائے۔ کہیں مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے! مگر یوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں لٹے گی، اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں، مُنہ کُھلا ہے، مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انہیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے مگر نانی ہمیشہ ہڑبڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہنسنے والے کو ہزار صلواتیں سُنا ڈالتی تھیں۔

مگر اُس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دُنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں! زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں ٹھونسی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

حشر کے دن..... صور پھونکا گیا۔ نانی ہڑبڑا کر کھنکارتی ہوئی اٹھیں۔ جیسے لنگر کی بھنک کان میں پہنچ گئی ہو...... فرشتوں کو صلواتیں سُناتی لشتم پشتم پل صراط پر سے اکڑوں گھسٹتی خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور میں لپکیں! انسانیت کی اتنی بڑی توہین دیکھ کر خدا کا سر شرم سے جھک گیا۔ اور وہ خون کے آنسو رونے لگا۔

اور خدا کے وہ خون میں ڈوبے ہوئے آنسو نانی کے کچّے ڈھیر پر ٹپکے جہاں سُرخ سُرخ لالے کے پھول لہلہانے لگے۔

لاجونتی

——— راجندر سنگھ بیدی

"ہتھ لائیاں کُملاں نی لاجونتی دے بُوٹے ......"
(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری، ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جاتے ہیں)
——— ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی ....

گلی گلی، محلے محلے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ"، "زمین پر بساؤ" اور "گھروں میں بساؤ"، پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی ———

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے "ملاشکور" میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکرٹری چُن لیا گیا۔ وکیل صاحب، صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلّے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو ——— لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے ——— "ہتھ لائیاں کمہلان نی لاجونتی دے بُوٹے ..." تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا ——— جانے وہ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ ...... اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ——— انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے، وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمہلا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے، بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت

میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کراس کے بڑے سے پتے پر کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دُبلاپن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مارپیٹ تک سہہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی چونکہ وہ دیر تک اُداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی —— "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی ....." صاف پتہ چلتا تھا وہ ایک دم ساری مارپیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں —— "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔ عورت جس کے قابو میں نہیں آتی ....." اور یہ مارپیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگالی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولھا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا —— "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی"۔ لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سُن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدّے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا، ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسالوں اور لوگوں کو بتا دوں —— ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا ..... —— ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے ..... وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا —— انھیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں —— کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح —— ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے .....

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ ملّا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کُتّے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دُبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سُن کر صرف اتنا کہتے —— او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپگنڈہ سُنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوندان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہگین پروپگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کے پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔ پر گنگناتا چلا جاتا ہے، اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انھیں دنوں جبکہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملّا شکور کے کچھ آدمی انھیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انھیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے اور

وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے ......

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انھوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی — سہاگ ونتی — سہاگ والی ..... اور اپنے بھائی کو اس جمِ غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی — تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے — اور بہاری چلّا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد ہے، جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں، ان میں لاجو نہ تھی۔ سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے، اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکارا سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیک دان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام، محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ آتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھو[بی] نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا — میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا[لے] — اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا — ایسی حالت میں جبکہ وہ گربھ وتی تھی — "کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کو[ئی] ثبوت مل سکتا ہے؟" — نارائن باوا نے کہا — "یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے د[یکھا] جاتا ہے۔"

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے کہہ اٹھا —

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!"

"چپ رہو جی — تم کون ہوتے ہو؟ — خاموش!" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا — "مجھے بو[لنے] سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

پھر ملی جلی آوازیں آئیں — "خاموش! — ہم نہیں بولنے دیں گے" — اور کونے میں سے یہ بھی آواز آئی — "... دیں گے۔"

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ـــــ "تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!"

سندر لال نے کہا ـــــ "میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا ـــــ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سُنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں"۔

انہی لوگوں نے جو ابھی مارنے پر تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اُٹھے ـــــ "سنو، سنو، سنو..."

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹہوکا دیا اور سندر لال بولے ـــــ "شری رام نیتا تھے ہمارے ۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی ـــــ انھوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے ؟"

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا ـــــ "اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی ۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔"

"ہاں بابا" ـــــ سندر لال بابو نے کہا ـــــ "اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں ۔ پر میں سچا رام راج اُسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا ۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا.... آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے ...... اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے ...... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا ؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی ؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشس راون کے وحشی پن کی ۔ جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا !"

"..... آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے ..... سیتا ..... لاجونتی ..... اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا ۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سُرخ جھنڈے اُٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیے تھے اور پھر وہ سب "سندر لال بابو، زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی ـــــ "شری رام چندر ....."

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ـــــ "خاموش! ـــــ خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی ۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ محرّر چوکی کلاں جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے ـــــ اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے ۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے ـــــ "ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بُوٹے .....!"

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملّا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اپنا اثر و رسُوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا:

"بدھائی ہو سندر لال"

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ـــــ "کس بات کی بدھائی لال چند ؟"

"میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔"

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا ـــــ "کہاں دیکھا ہے ؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

"واگہ کی سرحد پر۔"

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا ـــــ "کوئی اور ہو گی۔"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا ـــــ "نہیں بھیّا وہ لاجو ہی تھی لاجو ....."

"تم اسے پہچانتے بھی ہو ؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اُٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے

رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھائی اور بولا ——— "بھلا کیا پہچان ہے اس کی ؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر ———"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندرلال نے خود ہی کہہ دیا ——— "تیسرا ماتھے پر" وہ نہیں چاہتا تھا۔ اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آگئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمہلانے لگتا ہے، بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو ——— سندرلال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف، ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا:

"لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی ——— ؟"

لال چند نے کہا ——— "ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔"

"پھر کیا ہوا ——— ؟" سندرلال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا ——— "کیا ہوا پھر ؟"

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا ——— "سچ مچ آگئی ہے لجونتی بھابی ؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— "واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا ——— "تم اسے بوڑھی کہتے ہو ؟ ——— دیکھو ..... دیکھو ..... جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی ؟ ——— اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔"

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا "مال" واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا ——— "لاجو ——— لاجو بھابی ....."، مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندرلال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی ..... اور سندرلال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ——— "پانی دے دو" اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ——— تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے، پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں "گپتی" کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب گپتی کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دان، یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے

دوڑتی ہیں...... ازبیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازاربند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امرت سر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جبکہ وہ غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کے آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی..... عادتاً محض عادتاً ——— دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق ——— دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ ———

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں وہ موٹی ہو گئی تھی۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اُسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہندسرکار کے دباؤ کی وجہ سے اُسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ——— لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے 'موٹی' ہو گئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے......

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا ——— "ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت"

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے کوئی نیا وید، کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے۔ ان سب لوگوں ——— اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت پر تاسف بھی ہے۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شدّ و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملّا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندرلال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندرلال نے لاجو کی سونن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندرلال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندرلال، لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اُسے کہتا تھا "دیوی!" اور لاجو ایک اَن جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندرلال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دُھل جائیں لیکن سندرلال، لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھُل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندرلال سو جاتا تو اُسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندرلال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اونھوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندرلال پھر اونگھ جاتا...... البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندرلال نے لاجونتی کے 'سیاہ دنوں' کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا:

"کون تھا وہ؟"

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا ——— "جماں" پھر وہ اپنی نگاہیں سندرلال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندرلال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندرلال نے پوچھا:

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندرلال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ——— "نہیں"..... اور پھر بولی:

"وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی...... اب تو نہ مارو گے؟"

سندرلال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا ——— "نہیں دیوی! ——— اب نہیں ..... نہیں ماروں گا....."

"دیوی!" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندرلال نے کہا ——— "جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا، جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے۔"

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی ——— بہت خوش، لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار، جس میں ایک شک تھا اور وسوسے ——— وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندرلال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو کو توقع نہ تھی...... وہ سندرلال کی وہی پرانی لاجو ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی ——— لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندرلال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ——— لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی..... اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اُجڑ گئی..... سندرلال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان۔ پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اُسی آواز میں گاتا رہا ——— "ہتھ لائیاں کملان نی، لاجونتی دے بوٹے.....!"

اَپنے دُکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابھی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شالو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابھی، دریا باد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں، اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا — "کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو لبھانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو یُوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو، جس کی طرف بارش کے لیے منھ اُٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکاجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سُونگھ لیتی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اُسے دُور رکھنے کی کوشش کرتا — ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کا راستہ بتانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا، دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یُوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے۔ جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سُنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ جبھی اس نے سوچا — اِندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھُونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالو میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، یہاں اِندو کا منھ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھری کو چھُوا تو وہیں اِندو کا منھ تھا۔ مدن نے سوچا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اِندو نے ایسا کچھ نہ کیا، جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو، اور کسی خیالی بھینس کو سونگھتے رہنے سے اُسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب، اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترہ ہو جاتا ہے بس یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی، جیسے دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگریالے بال —

جبھی اِندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا — جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں — آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یُوں ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اُٹھا لیا اور شرابی کی سی آواز میں کہا ——— "اِندو!"

اِندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اِندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اتنا سا کہا ——— "جی"...... اُسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سُنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے میں ہی نہ آتی تھی۔ اِندو کے پتا، اِندو کی ماں، اِندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اِندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی "جتنی دیر زندہ رہی بچاری" مدن نے کہا ——— "بابو جی کے ہاتھ میں دوا کی شیشیاں ہی رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ——— ۲۸ مارچ کی شام......"

مدن چُپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا اِدھر اور ہچکی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اِندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اِندو کو بھی اپنے پن سے اِدھر اور بیگانے پن سے اُدھر پہنچا دیا تھا....... مدن اِندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اِندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا ——— "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں اِس لیے میں کچھ سمجھتی بُوجھتی ہوں...... میں اب تمہاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا:

"کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"پکی بات؟" اِندو بولی۔

مدن نے کچھ اُتاؤلے ہو کر کہا ——— "ہاں، ہاں ——— کہا جو پکی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا ——— میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے۔ اگر اِندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟

لیکن اِندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا ———

"تم اپنے دکھ مجھے دے دو!"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اِندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا۔ یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اِندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اِندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ——— "دیے۔" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابھی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کے اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا باد والی پھوپھی جو اپنے "نولکھے ہار" کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے سے مل گئی

تھی جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے.......
گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی، چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابھی کی بغل میں ہی گھُسی رہتی - گلی محلے کی کون سی عورت
دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا - آخر یہ سب ختم ہوا اور اِندو آہستہ آہستہ پُرانی ہونے لگی، لیکن
کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جاتے مدن کے سامنے رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے - اِندو انھیں دیکھتے ہی
ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی، لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی نہ دے سکتا تھا -
مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا - کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا اور
دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے - میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے پر
تیار نہ تھے - ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی - اس پر مدن جلد ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا ——— گھر پہنچ کر اس کی ساری
کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں - جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا
اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا - سب سمجھتے بہو ——— بھابھی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور آج
وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے - مدن سب سے بڑا تھا - کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا - جب کندن بھابھی کے سواگت میں
سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا ——— "کھاؤ تم" ——— وہ کہتا ——— "وہ بھی کھا لیں گے"
اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے
——— "رہنے دو بہو برتن صبح ہو جائیں گے" اِندو کہتی ——— "نہیں بابو جی میں ابھی کیے دیتی ہوں، چھپاکے سے" تب بابو دھنی رام ایک
لرزتی ہوئی آواز میں کہتے ——— "مدن کی ماں ہوتی بہو تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟" .... اور اِندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی -
چھوٹا پاشی بھابھی سے شرماتا تھا - اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چکلی بھابھی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی
ہی کو اِندو کی گود میں ڈالا تھا - جب سے اِندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی - جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش
کرتی تو وہ گھبرا اُٹھتا - اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دُوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا، پاس آتا نہ دور ہٹتا - ایک عجیب اتفاق ہے، ایسے میں بابو
جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے ——— "ارے جانا ——— بھابھی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو......؟"
اور دُلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی - اس کے ——— "میں تو بھابھی کے ساتھ ہی سوؤں گی" کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا -
ایک رات اسی بات پر دُلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی آدھی پکی نالی میں جا گری - اِندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اُڑ گیا -
بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے - "بابو جی!" ——— اِندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا ———
ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے - اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگاتے ہوئے اِندو نے اُسے ایک بستر
میں سُلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے - نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو - چوٹ تو ایک طرف، کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی -
پھر اِندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اُسے دُکھا بھی رہی تھیں، اور مزا بھی دے رہی تھیں - دُلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور
پیارے سے گڑھے پڑتے تھے - اِندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ——— "ہائے ری مُنی! تیری ساس مرے - کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں -
تیرے گالوں پر ——— !" مُنی نے مُنی ہی کی طرح کہا ——— "گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابھی!"
"ہاں مُنو!" اِندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا -
مدن کو کسی بات پر غصہ تھا - وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا بولا ——— "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے"
"کیوں، اچھا کیوں ہے؟" اِندو نے پوچھا -
"ہاں - نہ رہے بانس نہ بجے بانسری .... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا"۔

اِندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا —— "تم جاؤ جی سو رہو جا کے، بڑے آئے ہو ...... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چُپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اِندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اِندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب مُنّی کو سلانے کے لیے اِندو کی لوری سنائی دی —— "تو آ نندیا رانی، بورائی مستانی ......"

—— وہی لوری جو دلاری منّی کو سلا رہی تھی۔ مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مُردے کا تصوّر پیدا ہو گیا۔ مدن کو یُوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اِندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے، اور پھر گرتی پڑتی، روتی چلّاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور باہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلّے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے —— "لوگو! میں لُٹ گئی۔" اب اسے دوپٹّے کی پروا نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چڑیاں سب ننگے ہو چکے ہیں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اُڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ رسوئی میں اِندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دُنیا میں واپس آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا ...... ادھر اِندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اُونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹّہ اور دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اِندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اسے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا ...... وہ پھر اپنی دنیا میں لَوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی —— "اِندو" ...... اور پھر چُپ ہو گیا۔ اس اُدھیڑ بُن میں وہ بورائی مستانی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ ہی آئی تھی لیکن ساتھ ہی یُوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی سبطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا —— سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اِندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اُٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ میں پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصّے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا ——

"سو، تم —— آ گئیں؟"

"ہاں!"

"مُنّی —— سو مر گئی؟"

اِندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی —— "ہائے رام!" اس نے ناک پر اُنگلی رکھتے، ہاتھ ملتے ہوئے کہا —— "کیا کہہ رہے ہو؟ ...... مرے کیوں بے چاری؟ —— ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔"

"ہاں! ——" مدن نے کہا —— "بھابھی کی ایک ہی نند۔" اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا —— "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں، اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے۔" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا ——— "پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب دیکھو، جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے، فان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا ———" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ایک دن چل ہی دے گی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی بہن، چچا، تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند نہیں سو سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، نتھن کرنے والے، دانت پھوڑنے والے ماندری بلائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر ——— آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سرپر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔۔۔۔۔

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا ——— "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے؟"

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے .... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں ———"

"دکھاوا ہے یہ سب ——— ہاں!"

"اچھا جی؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا ——— "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آگئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی ——— "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ——— ہوا کیا ہے تمہیں ....؟"

شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا ——— "جاؤ، جاؤ ——— سو جاؤ جا کے" مدن نے کہا ——— "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمہیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے۔ مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی ——— "زندگی بھر لینا ہے۔" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہے۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ———

"پھر مجھے، پھاپھا کٹنی کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو ——— تمہاری تو ———" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا ——— "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرا دیا۔

مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی ———

"تم مرد لوگ کیا جانو؟ ——— جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی، کیا بہن"

——— اور پھر ایکا ایکی دور دیکھتی ہوئی بولی ———

"میں تو دلاری منی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہو گئی" مدن نے کہا ——— "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں ؟"
"نہیں ایک ہاتھ کی دِکھتی ہے نا ؟" اِندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی ——— "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ———" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جب دیر تک نہ کھولیں تو اِندو بولی ——— "اب کھولو بھی، اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" جبھی مدن نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اِندو نہیں، کوئی اور بیٹھی ہے وہ کھو سا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے۔" اِندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجوڑتے ہوتے بولی ——— "تم کیوں پریشان ہوتے ہو ؟ .... یاد نہیں اپنا وچن ؟ ——— تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں ؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اِندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا، ساتھ ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

-

مدن کے لیے اِندو روح ہی روح تھی۔ اِندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بُنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکا چوند، جو ہر وقت اِندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گر پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ———

...... مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے جنھیں سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں بٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا ——— اِندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور...... کبھی اِندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ———

"ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے ؟"

مدن کہتا ——— "چھوٹے سمجھتے نہیں، بڑے سمجھ جاتے ہیں ———"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارن پور ہو گئی۔ وہاں ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوتے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی۔ بچے سب دلّی میں مدن اور اِندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے ہی انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دَورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اِندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارن پور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دُنیا چہک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اتارتے

وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابوجی انھیں سمیٹتے پھرتے، اپنے مدن سے دُور، اسائی ہوئی رتی، اِندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہوگئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں کانے باہر کی طرف منھ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ کے تلے، جو آنگن میں سیکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے کھڑا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں ———

"جھولا کن نے ڈارو رے امریاں" اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں۔ اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں ——— ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اِندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہوگئی ہے۔ جبھی وہ منھ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابوجی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے اور اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس کی شلوار کو، جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے ہمیشہ وہ اپنی ساس والے پُرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے تو نگاہ نیچے کونے میں بہو کے محرم پر جا پڑتی تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں نشاہی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچّہ بل سے باہر آگیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی ——— "اوم نمو بھگوتے واسو دیوا ———"

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابوجی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابوجی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے ——— "ہم تو دھنیہ ہوگئے امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو انھیں موٹے موٹے گدرائے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچّوں کی عمروں میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے جڑواں ——— توام .... اوم نمو بھگوتے ———

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اِندو بابوجی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اِندو سے کہا ——— "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو، اللہ تم کو اجر دے گا" ——— اِندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہوگیا، وہ بھی سارٹر ——— جو نہ ہو سکا اس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابوجی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اِندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی ——— "نہیں بابوجی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجیے نا۔" اِندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابوجی ایک مصنوعی غصّے سے برس پڑتے ——— "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ——— ہوں ———" اِندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو، لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اِندو بابوجی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ——— "اورے یہ پڑا ہے ——— تیری مرضی ہے پی ——— نہیں مرضی تو نہ پی" ——— کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام، دلاری منّی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منھ

لڑھکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابوجی اور مُنّی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو مُنّی نے بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "دُودھ تو کھراب ہو جائے گا بابوجی ——— بھابھی تو پیتی ہی نہیں۔"

"پیے گی، ضرور پیے گی بیٹا! ———" بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا ——— "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔" ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منھ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش ——— بے خصم کھانی" کی آواز آنے لگتی۔ بینہ چلتا بہو بلّی کو بھگا رہی ہے ——— اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو ——— بھابھی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن، بابوجی کے پاس آتا اور کہتا ———

"بوجی ——— بھابھی رو رہی ہے۔"

"ہائیں؟" بابوجی کہتے اور پھر اندھیرے میں دُور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے ——— "جا تو سو جا ——— وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ ———"

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے ——— "چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے ——— جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" ——— اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس۲۰ پچیس۲۵ روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اُس نے لکھا۔ مَیں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے۔ گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹّی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابوجی کے ایک دوست سے تصدیق کی ہوئی چھٹی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار ——— جوابی ———

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اِندو اور بچّے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اِندو سے سیدھے منھ بات ہی نہ کی۔ یہ دُکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی ——— "اِتنا منھ پھُلائے بیٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا ——— "چھوڑ ——— دُور ہو جا میری آنکھوں سے ——— کمینی ———"

"یہی کہنے کے لیے اتنی دُور سے بلوایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہٹاؤ اب۔"

"خبردار ——— یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے؟"

اِندو نے بے بسی سے کہا ——— "ہائے جی ——— تم تو بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ مَیں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو، تو تم نے مجھے بلوا کر بابوجی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں ——— ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچّوں میں۔"

"اور میرا جی ———؟"

"تمہارا جی ———؟ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اِندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی

اری تو تیں ختم ہو گئیں ۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی ۔ اس نے اِندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا ——— "بابو جی م سے بہت خوش تھے ؟"

"ہاں !" اِندو بولی ——— "ایک دن مَیں جاگی تو دیکھا تو سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں"

"یہ نہیں ہو سکتا"

"اپنی قسم !"

"اپنی نہیں میری قسم کھاؤ"

"تمہاری قسم تو مَیں نا کھاتی ——— کوئی کچھ بھی دے"

"ہاں !" مدن نے سوچتے ہوئے کہا ——— "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں"

"سیکس ؟" اِندو نے پوچھا ——— "وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے"

"ہائے رام !" اِندو ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ——— "گندے کہیں کے ——— شرم نہیں آئی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے ؟"

"بابو جی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے ؟"

"کیوں ؟" اِندو نے بابو جی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا ——— "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے"

"کیوں نہیں ۔ جب بہو تم ایسی ہو"

"تمہارا من گندہ ہے" اِندو نے نفرت سے کہا ——— "اسی لیے تو تمہارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے ۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں ۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ ایسے تو جب مَیں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی .... وہ تھا نگوڑا ——— جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے ؟" اور پھر اندو بولی ——— "بابو جی کو یہاں بلا لو ۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا ۔ وہ دُکھی ہوں گے تو کیا تم دُکھی نہیں ہو گے ؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا ۔ گھر میں ماں کی موت نے مدن کے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر اسی پر کیا تھا ۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا ۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں مُوند کر پرارتھنا شروع کر دیتا ——— اوم نمو بھگوتے واسودیوا ۔ اوم نمو .... اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے ۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا ۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اِندو سے صرف اِتنا کہا ——— "ابھی رہنے دو بابو جی کو ۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی سے مل سکے ہیں"

تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا ۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں ڈھل گئے تھے ۔ لکھا تھا ——— "بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پُرانے دن لَوٹ آئے تھے ——— تمہاری ماں کے دن' جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی ۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے ۔ وہی صندل کا صندوق' وہی بیسیوں خلفشن .... میں بازار جا رہا ہوں' آ رہا ہوں' کچھ نہیں تو دہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں ۔ اب گھر میں کوئی نہیں ۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا' خالی ہے .... اور پھر ایک آدھ سطر اور ڈھل گئی تھی آخر میں لکھا تھا ——— دفتر سے لوٹتے سمے' یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہَول سا اٹھتا ہے .... اور پھر ——— بہو کا خیال رکھنا' اُسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چھٹی پکڑلی، سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی، شرم سے پانی پانی ہوتے ہوتے بولی ——— "میں مرگئی، بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟"

مدن نے چھٹی چھڑاتے ہوئے کہا ——— "بابو جی کیا بچے ہیں؟ ——— دُنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر" اِندو بولی ——— "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظرا پنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر بابو جی یا کوئی دیکھ رہا ہو اُس نے ساری کا پلّو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ——— "تمہاری سُسرال سے شیرینی آئے گی۔"

"میری سُسرال؟ ——— اُوہاں" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا ——— "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی کچھ آٹھ مہینے شادی کو ہوتے ہیں اور چلا آیا ہے" اور اس نے اِندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم ——— یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں۔"

"کیوں۔"

"چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔"

"کیا یہ جندگی کا مجا نہیں؟" اِندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو اُن سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم حیا کو تج کر، دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی ——— شمشانوں میں مسان جگاتی ———"

"اچھا! ——— اچھا" مدن بولا ——— "تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی؟"

"ہوگا تو!" اِندو نے سرزنش کے انداز میں اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا ——— "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ نہیں تو اس کی جرورت نہیں۔ پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔"

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منھ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پالنے کے سلسلے میں، اس جان کا ہونا سو تا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منھ سے نہ نکالا۔ اِندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور رونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی ——— "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب تیچھے ہوگا پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں ...... مجھے بچپن سے ہی وہم ہے اس بات کا۔"

مدن جیسے خائف ہو گیا۔ یہ "خوبصورت چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے مرجائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اِندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا ——— "تجھے کچھ نہ ہوگا اِندو .... میں تو موت کے منھ سے بھی چھین کر لے آؤں گا تجھے ——— اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے ———"

مدن سے لپٹ کر اِندو بھول گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے ......

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا، البتہ سہارن پور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اِندو رونے لگی، سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں

مُوندلیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا —— "ادم نمو بھگوتے ......"
دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی —— "بابوجی! چلے آؤ .... بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ——"
لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے .... ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساسِ جرم بڑھنے لگا —— "اگر میں اِندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑتا —— ؟"
وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کی حالت میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچّے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی —— "مبارک ہو بابوجی! —— لڑکا ہوا ہے۔"
"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا —— "بی بی کیسی ہے؟"
بیگم بولی —— "خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے .... زچّہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا؟"
"او ......" مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی —— "تمہارا اندر کیا کام؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔
مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں تسلّی سے یا شاید جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو اردگرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی ہیں .... زچگی کے لیے چکلی بھابھی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچّہ بہت چھوٹا تھا۔ البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام۔ رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی ——
زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آرہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ——
"اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی —— ؟"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔
پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی بچّے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منھ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر مُنّی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا .... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی رُوح تک کانپ اٹھی ہے —— ؟
پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بُو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اُسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اِندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی "و —— ہا —— تے" اور پھر بچّے کے رونے کی آواز ......
تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کتّوں کو اندر آنے سے روکا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بُو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اِندو —— نند اور جسودھا —— اور دوسری طرف نندلال .... اِندو نے بچّے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی —— "بالکل تم پر ہی گیا ہے۔"
"ہوگا۔" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچّے پر ڈالتے ہوئے کہا —— "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا تم بچ گئیں۔"

"ہاں !" اِندو بولی ——— "میں تو سمجھی تھی ———"

"شبھ شبھ بولو !" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے .... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں بھٹکوں گا" ——— اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"توبہ کرو" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے .... اور اِندو خفیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچّہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچّے کو تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دُنیا میں جاکر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔

اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دُنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دَیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے .... مدن نے اندو کے منھ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ——— اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دُبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے .... جبھی ایکاایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں رکھ لیے ———

"کیا ہوا ؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اِندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی ——— "اسے بھوک لگی ہے" اور اس نے بچّے کی طرف اِشارہ کیا۔

"اسے ؟ ——— بھوک ؟ ———" مدن نے پہلے بچّے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "تمہیں کیسے پتہ چلا ——— ؟"

"دیکھتے نہیں ؟" اِندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی ——— "سب گیلا ہو گیا ہے"

مدن نے غور سے اِندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بو آرہی تھی۔ پھر اندو نے بچّے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ——— "اسے مجھے دے دو !"

مدن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچّے کو یوں اٹھایا جیسے وہ مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے اِندو کی گود میں بچّے کو دے دیا۔ اِندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ——— "تم جاؤ .... باہر"

"کیوں ؟ .... باہر کیوں جاؤں ؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ نا ———" اِندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا ——— "تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی"

"ارے ؟" مدن حیرت سے بولا ——— "میرے سامنے .... نہیں پلا سکے گی ؟" اور پھر ناسمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اِندو پر ایک نگاہ ڈالی ——— اتنی خوبصورت اندو آج تک نہ لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اُٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انھیں سُولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر مُنّا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنّی کے برابر گولی پندرہ بیس کی تعداد میں روز کھانے کو دیں، پہلے ہی دن انہیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اُتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انھیں متلی سی ہونے لگی تھی اور انھوں نے پکارا ———

"بہو ! ذرا داتن تو دینا، ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے"۔ بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اُٹھ کر داتن چبا رہے تھے کہ ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو اُن کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ آسمان کے گلزار

میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔
مُنّے کو پیدا ہوتے کل بتیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اِندو نے منہ نوچ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اِندو نے چوڑیاں توڑنے کے بجائے اتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا ——— "لوگو! میں لٹ گئی" کی جگہ اس نے ایک ولدوز آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا ——— "لوگو! ہم لُٹ گئے"۔
گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا، اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر، اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا...... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری مُنّی اور پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اِندو ———۔
نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا، اب تو یہ دُنیا میرے لیے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اُٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔
سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دُہرایا، میں کبھی ہنس سکوں گا؟ ——— اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس بیٹھک میں پڑی تھی۔
باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار، محلے والے سن سے رہ گئے۔
پھر ہندو راج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی...... عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنوئیں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات کے گھر آنے پر پھر سے ہوس میں ڈھل گئی....... اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی، جنک دُلاری اِندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا........ اس رات اگر اِندو اپنا آپا یوں مدن پر نہ وار دیتی تو اتنا بڑا دُکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اِندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دُکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا، اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اِندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا........ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ——— مجبوراً چل نکلا۔
ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اِندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے مُنّا طرح طرح کی ضد کرتا جو کبھی مانی جاتی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اِندو کا خط آیا ——— "مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اُسے کوئی مارتا تو نہیں؟"........ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، لَن پڑھ عورت........ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ——— پھر اس نے اپنے آپ سے پُوچھا ——— "کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟"
سال گزر گئے۔ پیسے بھی اتنے نہ تھے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دِقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا...... کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری مُنّی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اِندو ایک

طرف سے آتی، مسکراتی ہوئی اور کہتی ——— "کیوں دکھی ہو رہے ہو؟" مدن اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ——— "دکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی۔اے کا داخلہ دینا ہے .... منی" .... اندو پھر ہنستی اور کہتی ——— "چلو میرے ساتھ" اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا ——— "مر وگی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا" اور اندو کہتی ——— "ہاں لے جاؤں گی" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آگئے؟"

"کہیں سے بھی آئے .... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ ......"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ، اپنا کام چلاؤ"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی ——— "میں نے ایک سیٹھ کو دوست بنایا ہے نا" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی ——— "میں چور لٹیرا ہوں ——— تم نہیں جانتے؟ ——— سچی لٹیرا ——— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے" .... اسی طرح منی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور کے قرضہ چڑھا اور پھر اتر بھی گیا ....

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی "ہتھ بھرا" کرتی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا اچل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا ——— "تم بہو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا" ——— یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شو تک پہنچا انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا ——— اور یوں ماں، مات لوک میں آکر بہو کی کوکھ میں پڑی ——— اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ....

پھر اندو ایسی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑ جاتی ——— مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی بات میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی ہی رہتی تھیں ——— جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر سبھی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کے شرن میں آتے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابھی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابھی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائداد تو ایک طرف، اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں تقسیم کی زد میں آگئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اٹھتی ——— "تو مجھے جینے بھی دے گی ——— ماں؟"

اور بچی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن، اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن.

بہت سارو پیہ اِندو سے بالا ہی بالا خرچ کرنا شروع کر دیا - بابوجی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا - پوری آزادی تھی -

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی - شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا - مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں - نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کبھی اوپر کھمٹ سے روشنی کی ایک چوکور آکر اسے کاٹ دیتی ہے - کوئی تصویر پوری نہیں بنتی - معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا - کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا - تبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہو گئی - دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا - پیچھے کوئی کتا رونے لگا اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی ....

مدن کو اس کے تصور کے خدّوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا ہے - یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا -

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا - پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا - اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر دے مارا - معلوم ہوتا تھا کسی خونی تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں - کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اٹھائے اور اِندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے -

ایک اِندو کے بجائے دو اِندو ہو گئیں - ایک تو اِندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اِندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا -

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر .... نہا دھو اچھے کپڑے پہن، مگھئی کی ایک جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہوا تھا، منہ میں رکھ کر .... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اِندو کی شکل ہی دوسری تھی - اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا - گالوں پر روج لگا رکھی تھی - لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظر بس ان میں اُلجھ کر رہ گئیں -

"کیا بات ہے آج ؟" مدن نے حیرت سے پوچھا -

"کچھ نہیں" اِندو نے مدن سے بچاتے ہوئے کہا ——— "آج فرصت ملی ہے"

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اِندو کو آج فرصت ملی تھی ! اور وہ بھی اس وقت جب کہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں - ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے، ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں دکھائی دینے لگی تھیں - آج اِندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی - یوں بنی ٹھنی کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ——— "یہ نہیں ہو سکتا" ——— مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا - اس نے پھر ایک بار مڑ کر اِندو کی طرف دیکھا ——— جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں - وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی .... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکتے تھے .... اِندو سچ مچ خوبصورت تھی - آج بھی پندرہ سال کے بعد، پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں .... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر !

آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا - گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا .... ادھر بچی رونے لگی - ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی -

مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں - کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی - جوان عورت بن کر - نہیں نہیں، وہ اِندو تھی - اپنی ماں کی

بیٹی ۔ اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔
اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا ۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک
ہوتی ہے اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا .... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا اس نشے میں
اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔
"اندو —— !" مدن نے کہا .... اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز سے دو سُر اوپر تھی اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے
کہا —— "جی" اور اس کی آواز دو سُر نیچے تھی .... پھر آج چاندنی کے بجائے اماوس تھی ....
اس سے پہلے کہ مدن، اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی ۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے
لگا، اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے ؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
"یہ کیا ؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا —— تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں "
"یونہی" اندو نے کہا اور بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی —— "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل میا نے"
بچّی اب تک خاموش ہو چکی تھی ۔ گویا دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے ؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا ۔ مدن نے
پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "ہاں مگر —— یہ آنسو —— ؟"
"خوشی کے ہیں" اندو نے جواب دیا —— "آج کی رات میری ہے" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی مدن سے چمٹ گئی ۔ ایک
تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا —— "آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے" اندو ! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ——"
"لیکن تم نے کہا نہیں" اندو بولی —— "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا ؟"
"ہاں" مدن بولا —— "اپنے دُکھ مجھے دے دو !"
"تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے"
"میں نے ؟ مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا —— "میں کیا مانگتا ؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا ۔ میرے
عزیزوں سے پیار —— ان کی تعلیم —— بیاہ —— شادی، یہ پیارے پیارے بچّے —— یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا"
"میں بھی یہی سمجھتی تھی" اندو بولی —— "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں"
"کیا مطلب ؟"
"کچھ نہیں" پھر اندو نے رُک کر کہا —— "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی"
"کیا چیز رکھ لی —— ؟"
اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتے ہوئے بولی —— "اپنی لاج —— اپنی خوشی .... اس وقت تم بھی کہہ
دیتے —— اپنے سکھ مجھے دے دو —— تو میں .... اور اندو کا گلا رندھ گیا ۔
اور کچھ دیر بعد وہ بولی —— "اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا"
مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ وہ زمین میں گڑ گیا —— یہ ان پڑھ عورت —— ؟ کوئی رٹا ہوا فقرہ —— ؟
نہیں تو ... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے ۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے
کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا —— "میں سمجھ گیا اندو —— !"
پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے ۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ایسی دُنیا میں لے گئی جہاں انسان
مر کر ہی پہنچ سکتا ہے ....

آخری کوشش

حیات اللہ انصاری

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگھیاکر بابو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک سے باہر ڈھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستے بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اُتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا۔ ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے — وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے، جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی مِل کھلی تھی۔ اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچّا راستہ اور — دو گھنٹے کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزہ نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے، یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکیدار کی جھونپڑیا، جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرامزادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو، اور دوسرا وہ تھا بھورا، اور وہ ڈائن بھنگوی، جو خون پچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور — بھائی ہیں، بھائی ہیں۔ مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لیے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ — جب جیلر نے آ کے مجھے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اک دم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اُڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچّی سڑک کی جگہ اب پکّی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر مل

تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اُترکر، اپنے ہی قصبے کا راستہ پوچھوں۔ وہ آپ ہی آپ ایک طرف مُڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور ایکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد قصبے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی، جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلّم زمین پر لیٹا کائی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں، پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اک دم پھڑپھڑاکر، تڑپ کر نکل آئیں، اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اُچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا تھا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بفاتی، بلاقی، پتنو، نیولا، سورج، بتی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون، ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے کچے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا، اور ادھر آناً فاناً سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے فقیرنی آنکلی، جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلّا کر بھاگے۔ پھر کیا تھا سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے . . . . .

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے اُفق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے، جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوّوں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی، میٹھی میٹھی خوشبو سے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتے دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص کی نگاہ ملی، وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر کرنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج اُفق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور

ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لیے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہوگیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا، یہیں سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی مینا ایسی دلاری، جس کے نہ روٹھنے کا پتہ چلتا تھا اور نہ منے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے۔ شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا، دونوں وقت چنے چباؤں گا۔ مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہوجائے گا تو آؤں گا اور ہیرا لال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ کر گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی۔ گنگنائے گی، میری طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی —— بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو —— اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آگیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی وہ ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آگئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں! یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! گھسیٹے! کدھر مر گیا؟" —— ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیے۔ ان کو اتارو، پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولیے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو —— شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتا پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑا ہوجاتا تو خان صاحبن پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔" پھر پھاڑ لایا؟" —— "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں" —— "یہ کہاں سے کھونچا لگا؟" —— "کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔" ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمھارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آگئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں۔ گاؤں میں ادھر ادھر دبتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں گئے تھے، دیکھ لیا "تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا —— سونے کا بٹن۔" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پتہ ملتا ہے۔ جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لیے بھاگی جارہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں دنیا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے۔ جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں —— ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آگئی۔ اس کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے

دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آگئی جو باجے گاجے لیے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کرکے کنارے آ اُتری تھی۔

بغیا بھی آگئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل اُمید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اُٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھا گل نہ بولے"۔ دن کو کام کاج کرکے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ "اماں روٹی دے۔ اماں روٹی دے"۔ اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ، رو دھو کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہے۔ جب اس کا جی چاہتا تب اُٹھ کر چولہا جلاتی۔ جمیا اور شبراتن! افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی، اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ــــ ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں ــــ مگر واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا، اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آ تیرا سر داب دوں" ــــ "ادھر آ نجر گجر اُتار دوں" ــــ "چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا ــــ دونوں وقت ملتے نہ چلا"۔ ہر وقت ٹنکا اُتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ کر دوا پلا رہی ہے ــــ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے، گلے سڑے، کھٹے میٹھے، جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھربیریاں، کیتھے اور کیا کیا۔ سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق میں رکھ دی۔ میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہوگا ــــ" "تو کھا گئی ہے، تو ــــ کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں؟" ــــ "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک باری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔ "واہ کیا مجا ہے"۔ جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تاکیں گی ــــ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہوگا؟ اماں ابا بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے؟ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں نفیرا تو جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ افوہ کلو کے ناتنوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی تھی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ــــ وہ جگہ تھی وہ ــــ ہاں ــــ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اُجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھما تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف بجو ہڑی کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدہام تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے میڑھے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں

قبرستان تھا۔ اندر نہ چولہا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ـــــ تم کو کیا کھلائیں گے۔

یہی گھر تھا جہاں مُسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی اُمیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے پچھلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا، یکبارگی مُرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا، وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے اور بار بار بکریوں کے موت کی کھراہند اور نابدان کی سڑاند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں ان بالوں کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دو، کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک ڈھارس بندھی اور وہ کھنکھارا۔ جواب نہ ملنے پر پھر کھنکھارا، بار بار کھنکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو پٹ پٹ کھنکھارا، پھر کہنے لگا "کون، فقیرا؟"

"ہاں!" فقیرا ذرا چڑ کر بولا "تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا: "تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ـــــ کہہ تو دیا۔"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصّہ تو غائب ہوگیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کرکے بولا:

"میں بائیس روز کا سفر کرکے آرہا ہوں ـــــ تمھارے پاس۔"

اب بھی فقیرا کچھ نہ سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا: "تو اندر آؤ۔"

اندر آکر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ ... یا۔ چھپر کے نیچے چھ سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انھیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر ... ت پر ایک چھید اٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہوگی مگر اب چیتھڑا ہوکر گم نام ہوگئی تھی، اوڑھنے کے لیے ... ی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دُبلا پتلا، آنکھیں اندر کو دھنسی ... ں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھرّیاں۔ جیسے کچّی دیوار پر ... بھا کے پانی کی تنیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس ... زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: "بھیّا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا: "جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا —— بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"
اب فقیرا ٹھٹکا "پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو —— گھسیٹے تو نہیں ہو؟"
"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون، بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آرہا ہوں۔"
بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو، یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آگئے —— اماں کو دیکھو گے؟"
گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اماں! —— ہے کیا؟"
"ہاں!" چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "وہ پڑی ہے"۔
گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جھونک میں ادھر بھاگا۔
یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کونے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آگئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بد گوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آگیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آرہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھنچی ہوئی الٹی ہنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔
فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانا مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب.... باب..... باب..... باب..... باب..... باب......."
اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے ہوں اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کے بندر چیختے اور رات کو سیار روتے ہیں۔
فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا: "جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"
آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا: "اماں!" آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔
فقیرا نے کہا: "نہ یہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"
بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔
یہ وہی جوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دو پہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے، اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا! ذرا ذرا سی چیز کے لیے کیسا کیسا ترستی رہی! گھسیٹے کے دل میں ماں کے لیے ترس بھرا پیار ابل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے اس ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا مگر افسوس

آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لیے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا: "بھیا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سبیتا کرتا ہوں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولہا جلاکر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولہے کے پاس آبیٹھا اور بولا: "اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں، آج آٹا ختم ہوگیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یونہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ کب کی بند ہوگئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہوگئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بھی بکائی نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کا ہے میں پکڑا گیا؟"

"سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہوگیا مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا "فقیرا مجھ سے اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے اور نہ گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہوجائے، چار دن عیش تو کرلیں گے —— دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا —— بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

"جمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں کے یہاں بیاہ ہوگیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے۔ کسی طرح گجر بسر ہوجاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا: "تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا تھا۔ ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب بچے پیٹ بھرے ہیں، پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس جمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گجری جب چولہا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہوگیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا "کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جاکر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کرکر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گزری وہاں۔ ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا۔ چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لیے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسے کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔"

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا: "بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا "تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سُن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے۔ اور پھر باب باب کرنے لگتی ہے۔"

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالہ بلا پانی کے گھونٹ نہ اُتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بجری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا اپنے میلے کرتے کے چلوے چُن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں، پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے۔ جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے، کندھوں کو آگے جھکائے سوسو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دُکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر، بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی "باب باب" سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو بّرے کی روکھی سوکھی روٹی، اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! اوفوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو، دو آدمیوں کے بیچ میں ایک۔ سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھنچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے۔ اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باب بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں۔ دمڑی دمڑی کے لیے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔ گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا، وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں، خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسے والی سنگل چائے۔ وہ دھیلے والا پان کا بیڑا۔ وہ پیسے کی پچیس بیڑیاں۔ یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لیے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور جمانوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے۔ پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لیے شہر بھاگے۔ وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں۔ کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا۔ کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ رکشا تک چلائی۔ سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو 'جمانتی' لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ چھمن بولا دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیے۔ پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی سی گاڑی دے تو وہ اکڑ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے، مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو

آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے۔ اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض اُدھار کر کے پان، سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، نیبی کٹ لاؤ، یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا؟ کہتے "نہیں ہے صاحب، نہیں ہے ہجور۔" وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرامزادی بھنگوی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی۔ . . . لنگوٹی میں پھاگ . . . .

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا:

"پھر تم نے چُرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمھارا گزر نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصہ؟ بکریوں میں حصہ؟ تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے۔ گیا تھا روپیہ کمانے۔"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا "کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبے سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لیے تگڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد ہی آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا: "ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر ہی تو لے کر جاتے ہیں۔ بلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سُن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا۔ بالکل ہی نہیں سُن سکتا تھا۔ وہ چلّا کر بولا: "اور تو نے کیا کر لیا ہے؟ چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے، بس آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا . . . ."

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔ یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا۔ بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا تھا۔ روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید میں اب ہمیشہ کے لیے اس اُجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا تو جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سُکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دوارے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں۔ جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس، مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ

چھپّر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس۔ ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچّوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا......

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اُٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے..... ایک زبردست اُمنگ اُٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا: "بھیّا فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سُن کر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو بولا:

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیّا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ گیا ہوں کہ کون سا کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو کہ پھیری لگائیں، یہ کریں، وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟" گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہوگیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی۔ پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا: "اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں ——— وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمھارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری بُرائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو، ان کے گھر میں ہُن برس رہا ہے ہُن۔ کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو، دو کنکریاں نمک دے دو، ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں، نہ جائیں تو کریں کیا؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا۔ گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:

"اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے ایک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا: "ہاں تمھارا سادی بیاہ کرنا ہے، روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہوجاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے، اور پھر یہ اماں کے لیے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا، مگر تب انھیں سُن کر فقیرا کو غصّہ آگیا تھا۔ روپیے کے لیے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوندجائے جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے، بیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لُٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا۔ تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنّا پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپے کا گھڑا لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں بیسہ ملتا ہے۔

پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کرلو اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سوگئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہوکر بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ نقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی نقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے۔ ذرا یہ چھپّر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہوجاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہوجاتے پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا گدرایا بدن ہے! جیسے پکّا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ دہ دوہے، اُپلے دہ تھاپے، دہی وہ متھے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھالے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے نقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ یکبارگی پیچھے سے آگئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی۔ کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا نقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے نقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدّھم روشنی میں اُٹھے۔ اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنائی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بُڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اُٹھالیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی 'باب باب' کرکے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیّت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہوگیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جاکر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں سے چھپا دیا۔ ایک طرف کا بانس نقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کے نکل آئے، کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا۔

"کہاں چلے نقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا نقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر نقیرا کی جگہ خود بول اُٹھا:

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماّں کو وہاں لیے جا رہے ہیں۔"

"اماں کو لیے؟" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اُٹھا:
"شاباش تم لوگوں کو ـــــ اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا' اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی
ں آکر ڈولی رکھ دی۔ گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی' اُٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے
نپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب
ب کرتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیوں کہ دس برس
سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور
سی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک
ئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بُری رہی' ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا
تھا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے؛ فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسے کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔
س نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اُڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے
ونچھ پانچھ کر ایک پتے پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لاکر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً
ب باب کرکے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آگئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرا کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع موقع پر بڑھیا کو ایک اُنگلی
ٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی' بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا۔ عقل
ندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا
و دریا میں اُترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھیے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سہما جاتا ہے۔ گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا
تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کئی انگلیاں اور بیٹھی
اک والے کوڑھی' منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں' چندھے چپڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ
ڑھے ہوئے تھے' جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے' پھیکے بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں
کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل' چیتھڑے' ٹھیکرے' میل' آخور' بلغم' ناک' پیک' مکھیاں' جراثیم' فریب' جھوٹ اور ان سب
کو ڈھانک دینے والی' لوریاں دے دے کر' تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہاپاپن بے حسی!

ـــ اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو' چاہے ذلت ہو' حیوانیت ہو' چاہے
انسانیت ہو' مایا کے سمندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف
اور سیدھا راستہ' تنہا راستہ ـــــ پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا: "ابے اِدھر کہاں آیا! بھاگ یہاں سے۔"
پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی
پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے

نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا:

"تمھارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کی لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا:

"چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ جما چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا۔ گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لیے ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے، جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ "جب دے گا اللہ ہی دے گا۔" فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے۔" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیر 'انقلاب زندہ باد' کہے۔ کیوں کہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا۔ جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ، یا ایک ایک دو دو پیسے لیے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر

گھر کی حالت سُدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں، مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ چیلے روزی بہانے موت۔

(۵)

سہ پہر کی سُنہری دھوپ میں گھسیٹے اور نفیرا ڈولی لیے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے۔ تکان سے چور چور تھے۔ مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سائے میں ڈولی اُتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جُلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں۔ تیل کی بہت سی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر پچ میل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ روپے کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اُچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چُن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جو اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے۔ پھر مربھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھادیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اُتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا، جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو بھی وہ یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اُٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھادیا۔

"لو آج تم بھی مزیدار چیزیں کھالو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔"

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جُلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ نفیرا اور گھسیٹے کے لیے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی۔— گھسیٹے جھلا کر بولا: "لو تم بھی کیا یاد کرو گی؟"

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی۔ مگر چبتا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ڈھکیل دیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ ٹکڑا نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبالیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ

سی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا اس کا شیرا ٹھڈی، باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا "باپ باپ" تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور نقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ ٹوکرے میں گر پڑی۔

نقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولہا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلّہ لیے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم، سرخا سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھال میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے۔۔۔۔۔۔ نقیرا خوش تھا۔ بہت خوش ——

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے! اور صرف ایک دن میں۔ پچاس روپے مہینہ! اوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی اسنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ نقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے، سب بکریاں اپنی کرلی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا۔۔۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب نقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ آخر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا —— حرامی سالا نقیرا!

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ نقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا:

"نقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہیے۔"

"کا ہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اس کا۔"

نقیرا تململا کر اٹھ بیٹھا۔ "پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں، ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ بیس برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنایا ہے اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

نقیرا اب شہر والا نقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا: "اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا۔ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی، اب جو کمائی کے قابل

ہوگئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہوگیا اور وہ غصے میں ماں کی طرف لپکا۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا۔ مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آگیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا حد سے اونچا ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ گٹھڑی ہو۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچہ مرگیا ہو عوعو کرکے حلق پھاڑنے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوتی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مرجانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے کھڑے قد نیچے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈھیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے۔ منہ بھیانک ہوگیا اور ہاتھ پاؤں بر رگئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہوگیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیچا کی طرح ہونق ہوگیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مرگیا —— مرگیا۔ —— ہا —— فقیرا —— ناحق مرا —— مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں میں بھی کچھ دن زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا۔ جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو —— پیاری اماں —— کلکتہ، وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتے کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے —— لونڈے کے لونڈے —— زرد زرد بھین ——

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا —— بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھڑ ہوا کے جھکڑ سیکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرتے، مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر ٹپکتے، وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جارہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا لے جائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی —— دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مرکر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بے تاب ہوجاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں

بھٹکے مُسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دُنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا—— امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

گنڈاسا

احمد ندیم قاسمی

اکھاڑہ جم چکا تھا، طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں"، چُن لی تھیں۔ "پڑ کوڈی"، کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے ——— انھوں نے رنگین لنگوٹیاں کس کر باندھ رکھی تھیں، ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹھوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرّے بنا رہے تھے، وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کے دَور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں، یہ کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدّت سے تیل چپڑوا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا، پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آئے، انھوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکّر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے سامنے ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی ——— "مولا کہاں ہے؟"

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دُور دراز کے دیہات سے کھچے چلے آتے تھے ——— "مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!" دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھنے لگے، جما ہوا "پڑ"، لوٹ گیا۔ منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا، مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہو لیے ——— اور پھر اتنے میں جیسے میدان میں سیروں بارود سے بھرا ہوا گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے بجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکّر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھُو کر 'یا علی' کا نعرہ لگانے کے لیے ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کے دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی۔

"مولے، اے مولے بیٹے۔ تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اُٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے ——— "رنگے نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اُس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ لوٹ گیا۔ ڈھول رُک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے، ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اُڑا جا رہا تھا۔ پھر پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھری سینہ سے لگائے بھاگا آ رہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوف زدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا اور جب وہ رنگے کے چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم

میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے :

"رک جا مولے!"

مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے گئے، اور وہ بُت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آتے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے ——— "تو آگے نہیں جائے گا مولے!"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر بولا ——— "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"

"میں کہہ رہا ہوں۔" پیر جی 'میں' پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔

مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا ——— "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیے اور ناک بھی کاٹ ڈالیے میری، مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی، بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔"

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے، رنگے کا بڑا لڑکا بولا :

"آؤ بیٹے آؤ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اگلوا ڈالوں تو قادر نام نہیں۔ میرا گنڈاسا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔"

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والے کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا مگر پھر جکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جگنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کیے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے۔ اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ، ورنہ بدبختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا۔ جاؤ، تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ، قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔"

لوگ سر جھکا کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تاجے سے پٹکا لے کر ادب سے اپنے گھٹنے چھپا لیے اور سیڑھیوں پر سے اتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لیے اس کے پاس آئے اور بولے ——— "اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے۔"

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا ——— "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

"ہاں تاجے!" مولا نے دوسری بار بازو کو آنکھوں پر رگڑا ——— "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے، میرے باپ کے خون پر مکھیاں اڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دُم دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لیے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اس کے باپ کی لاش کو تھانے اٹھالے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ منہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر منہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اس طرح تنے رہے۔ اس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر ابل کر اس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔

کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لیے گاؤں سے نکلے مگر جب وہ تھانہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قل ھو اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانے دار سے انھوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا مگر تھانے دار نے انھیں سمجھایا کہ ——— "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قتل کو ضائع کر بیٹھو گے، کوئی عقل کی بات کرو! ——— ادھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے اُدھر تمھارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھی بھونک آیا ہے؟"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے، لیکن دونوں قتلوں کا وافر چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں سے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا اور کہا ——— "اس روز تم اور تمہارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسّی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا، تمھاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا ہے تو ایسا لگا جیسے گھوڑے کو بھی قتل کا پتہ چل گیا ہے۔ آندھی بن گیا۔ خدا کی قسم! اسی لیے تو لاش ابھی تھانے نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر واپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولے کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادرے کے گنڈاسے سے مرا تھا، رنگا تو صرف ہشکار رہا تھا بیٹوں کو ——— رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتہ چلا کہ قادرا اپنے کوٹھے کی چھت پر مُردہ پایا گیا ہے اور وہ بھی یوں کہ بھائیوں بھلّے اور گلّے نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا۔ تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا، کتنی راتیں اُسے اونگھنے تک نہ دیا گیا، مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آ نکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی، اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی ——— "ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بتیس۳۲ دھاریں بخشوں گی۔ میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے، اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے، اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اس کی مونچھوں میں دو دو بل آ گئے تھے۔ کانوں میں سونے کی بڑی بڑی مرکیں جھمجھمانے لگی تھیں۔ آنکھوں میں سُرمے کی دھار کو کبھی کسی نے مٹا ہوا نہ دیکھا۔ خوشبودار تیل اس کے لہریے بالوں میں آگ کی قلمیں سی جلائے رکھتا۔ ہاتھی دانت کا ہلالی کنگھا اتر کر اس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔ وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہبند کا کم از کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا اور اکثر اس کا ایک ایک سرا زمین پر گھسٹنے لگتا اور گھسٹتا چلا جاتا۔ مولا کے ہاتھ میں ہمیشہ اس کے قد سے بھی لمبی تیل پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے لگتی تو اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔ اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے، مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔ عورتوں اور بچّوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے الانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا۔ مولا اس وقت ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسری دیوار کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے الانگ گیا۔ ایکا ایکی مولا نے بپھر کر ٹیبک میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا ——— "ٹھہر جاؤ چھوکرے، جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ الانگی ہے؟ یہ مولا کی لٹھ ہے۔ مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا ——— "مجھے پتہ نہیں تھا مولے۔"

مولا نے گنڈاسا اتار کر ٹیبک میں اُڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا ——— "تو پھر جا، اپنا کام کر۔" اور پھر لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور مرکیں، اور سب سے زیادہ اس کا لاأبالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی۔ تیل پلی، پیتل کے کوکوں سے اٹی ہوئی، لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی، گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ۔ اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ٹیک تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے پھیلے اور گلے کی راہ تکتا رہتا تھا۔ فادیے کے قتل اور مولا کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا، اور گلے نے علاقہ کے مشہور رسہ گیر چودھری مظفر الٰہی کے ہاں پناہ لی تھی، جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کرلاتا۔ چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور اخبار میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چودھری مظفر کے قصبے کے قریب تک پہنچتے تو جی میں کہتے "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!" انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک جا پہنچے تو کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کے بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چودھری کے خوف کے مارے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر ٹلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے "کھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!"

مولا نے چودھری مظفر اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سُن رکھا تھا، اسے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں صرف چودھری ہی ہے جو اس کی لٹھ الانگ سکتا ہے، لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے ——— "کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!" تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا ——— "اور کچھ نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر، یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میراثیوں نائیوں سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے لے کر ڈرانے لگی ہیں، لڑکیاں تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتے ہیں، کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے، تجھے مولا بیاہ لے جائے۔ سنتے ہو مولے؟"

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کودا تھا اس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا ——— "ابے جا تاجے، اپنا کام کر، گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پیٹھے، تیرا جی چھوٹ گیا ہے تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے، جا اپنا کام کر، میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی ——— جا!" اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراثی کو ہانک لگائی ——— "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا الو کے پٹھے! جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا کیا! چلم لا۔"

تاجا پلٹ گیا، مگر گلی کے موڑ پر جا کر رک گیا اور مڑ کر مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جواں مرگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا تاجے کے پاس آ کر بولا ——— "دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے، اس لیے کہ کسی زمانے میں تیری میری یاری تھی، پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے تاجے، تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر ایسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چُک جائے، میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتوں پوتیوں، نواسوں نواسیوں تک پہنچے گا، اس لیے جا اپنا کام کر۔ تیری میری یاری ختم، اس لیے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پر ترس کھاتے تو آنچ میرے گنڈاسے پر جا پہنچتی ہے ——— جا۔"

واپس آکر مولا نے میراثی سے چلم لے کر کش لگایا تو سلفہ اُبھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لمحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراثی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراثی بل کھا کر رہ گیا اور ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا ——— "ترس کھاتا ہے حرام زادہ۔"

اس نے چلم اٹھا کر سامنے دیوار پر پٹخ دی اور لٹھ اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر گھڑے لئے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں اس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی لانبی سُرخ سُرخ مرچوں کو چُن رہی ہے جو جھکتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ہوئی گھڑی میں سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آ گیا۔ لٹھ کو لانگنا تو ایک طرف رہا، اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چُن رہی ہے، اور جب مولا نے کڑک کر کہا ——— "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چُنی ہوئی مرچوں کو گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا ——— "کوئی سڑی لگتے ہو!"

مولا مارے غصّہ کے اُٹھ کھڑا ہوا، لڑکی بھی اُٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی ——— "اسی لیے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے گُٹے گُٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تو تم پر ترس آ گیا تھا۔"

"ترس آ گیا تمہیں؟ مجھ پر؟ مولا پر؟" مولا دھاڑا۔

"مولا!" لڑکی نے گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا سی چونک گئی۔

"ہاں، مولا، گنڈاسے والا۔" مولا نے بڑے ٹھسّے سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سی مسکرا کے گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چُپ چاپ کھڑا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹھکی، مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا ——— "آجاؤ ماسی، آجاؤ، میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔"

حواس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی ——— "کیسا جھوٹ بکتے ہیں لوگ، جہاں مولا بخش ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے، پر تُو نے تو میرے لیے اپنی لٹھ ———"

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے، ابھی ابھی کنوئیں پر بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں، پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش ———"

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک چکا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دُور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی، وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آ گئیں اور بچّے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے ہی کا پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سُن لی، پلٹی اور پھر وہیں جمی کھڑی رہ گئی۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، چند مرچیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" مولا پکارا ——— "کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔"

لڑکی بولی ——— "میں ڈر کے نہیں رُکی۔ ڈریں میرے دشمن۔"

مولا رُک گیا، پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا ——— "بس اتنا بتا دو تم ہو کون؟ ——— کون ہو تم؟"

لڑکی ذرا سا مسکرا دی۔

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی ——— "یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر راجو ہے مولا بخش!"

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹھیک تک گیا اور پھر لپکتے

کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا ——— "ٹھہرو راجو، یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ۔"

راجو رُک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک مرچ چُن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے راجو کی گٹھری میں ٹھونستے ہوئے بولا ——— "تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہولی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دُور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا ——— "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش!"

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پُوچھا ——— "ماسی، یہ لڑکی راجو کیا یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہیں کی ہے بھی بیٹا، اور نہیں بھی۔" بڑھیا بولی ——— "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دُور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کہ کوئی دو ڈھائی کوس دُور ایک ڈھوک بنالی۔ وہیں راجو اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے، تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے آجاتی ہے اور بس۔"

مولا جواب میں صرف "ہوں" کہہ کر واپس چلا گیا لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا، اور راجو رنگے کے بیٹے کی منگیتر تھی ——— اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی!

اس واقعہ کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں، چراگاہوں میں پھر پھرا کر واپس آجاتا۔ ماں اس کے رویّے پر چونکی، مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں، وہ بھی جو بہا دیے گئے اور وہ بھی جو بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پُر اسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولھا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً لٹھ پر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اُتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آرہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے، بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں ہنکائے لیے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انھیں ٹوکا اور جواب میں انھوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے، یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے، چودھری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اُف تک نہ کرے!

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چودھری مظفر خود بنفسِ نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے، کڑک کر بولا ——— "چوری کا مال میرے گاؤں میں سے نہیں گزرے گا، چاہے یہ چودھری مظفر کا ہو، چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو!" اس نے لٹھ کو جھکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا ——— "جاؤ۔"

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا ——— "جا کر کہہ دو اپنے چودھری سے کہ مولے گنڈاسے والے نے تمہیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چُپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا ——— "یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں، ان کے مالک پرسوں تک آنکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزّت میری عزّت ہے ماں!"

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافتیں طے کر کے کھوجیوں کی ناز برداریاں کرتے یہاں تک پہنچے

تھے اور یہ سوچتے آرہے تھے کہ اگر ان کا مال چودھری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اور جب مولا ان کا مال اُن کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں باہر گلی میں جمع ہوگیا تھا اور اس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور پھر منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا ——— "آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو!"

"کیوں ——— ؟" اس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے ——— "میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور نرسوں بھی۔ نرسوں تھوم پیاز خریدنے آئی تھی، پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی، کل ویسے ہی آگئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔"

"کل ویسے ہی کیوں آگئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی، بس جی چاہا آگئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں ——— ؟"

"ویسے ہی ——— ——— " مولا نے بجھ کر کہا۔ پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا ——— "یہ گھی بیچوگی؟"

"ہاں بیچنا تو ہے، پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔"

"کیوں۔"

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنے لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کُھجل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لیے مڑی تو مولا ایک دم بولا ——— "دیکھو راجو میرے ہاتھوں پر خون ہے ہی، اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے، میرے ہاتھ نہ بیچو، میری ماں کے ہاتھ بیچ دو ——— !"

راجو کچھ سوچ کر بولی ——— "چلو ——— ——— آؤ۔"

مولا آگے آگے چلنے لگا۔ جاتے جاتے جانے اسے وہم سا گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پٹھوں کو گھورے جا رہی ہے۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چگتے ہوئے مُرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ فوراً بولا ——— "یہ چوزے میرے ہیں۔"

"ہوں گے"۔ راجو بولی۔

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا، بولا ——— "ماں یہ سب گھی خرید لو، میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔"

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تاکہ بڑھیا گھی سونگھ لے مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے، اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیو پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کرلیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرّے ہیں، اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں، اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اُوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے، جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح اُلجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا ———

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی ——— "پہلے دیکھ لے ماسی، رگڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر سونگھ لے پہلے!"

"نا بیٹی میں تو نہ سونگھوں گی" ماں نے کہا ——— "میرا تو روزہ مکروہ ہوتا ہے!" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی:

"تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں۔"

"تو پھر جا۔" ماں نے ترازو اُٹھا کر ایک طرف پلٹ دی ـــــــ "تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا۔ رشتہ قتلوں کا اور سودے گھی کے، جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی ـــــــ "جن پر گنڈاسے چلانے ہیں ان سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان۔ یہ گلے کی منگیتر ہے، گلے کی۔ رنگے کے بیٹے کی!"

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا تھا، جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اٹھی اور بولی ـــــــ "تمہارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے۔"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپیڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنّا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مولا بولا ـــــــ "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

ماں جکڑا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا۔ نورے نے وہاں چائے کی دکان کھول رکھی تھی۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیوروں سے شہروں کی خبریں پوچھتے، اور مولا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ لوگ اب مولا کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے پاس سے حقّہ تک اٹھا لاتے مگر کسی کو اس کی لٹھ چھونے یا الانگھنے کی جرأت نہ ہوتی جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے لاری آکر رکی اور اس میں سے مسافر اترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈّے پر اُلّو بول گیا۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گلا اُترا، اس کے پیچھے چار بڑے قد آور گبرو اُترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے۔

مولا اس سنّاٹے سے چونکا اور چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے تیزی سے چارپائی پر سے پاؤں لٹکائے اور ٹپک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا ـــــــ "حقّہ لانا نورے!" وہ پکارا اور زرد رو نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے حقّہ اس کے پاس رکھ کر غڑاپ سے دُکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نووارد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے۔ جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اُڑا دیا۔

"مولے!" گلے نے اسے للکارا۔

"کہو۔" مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دُھواں گلے کی طرف اُڑا دیا۔

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں۔"

"کہو۔ کہو۔"

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو، ہم بھی خالی ہاتھ ہیں۔"

"لو۔" مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چمٹ کر رہ گیا۔ بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلے سے پوچھا۔

گلا جواب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا ——— "تم نے چودھری مظفر کا مال روکا تھا؟"

"ہاں" مولا نے بڑے اطمینان سے کہا ——— "پھر؟"

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا ——— "چودھری نے تمہیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمہارے حوالے کر دیں۔"

"انعام!" مولا چونکا ——— "آخر بات کیا ہے؟"

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے منہ پر مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے واپس ہٹتے ہوئے بولا ——— "یہ بات ہے۔"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھالی، ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نووارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے مگر گلا لاری کی پرلی طرف کنکروں پر پھسل کر گر گیا۔ لپکتا ہوا مولا رک گیا، اٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس زاویے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا۔

دم بخود ہجوم دیوار سے اچیٹ اچیٹ کر آگے آ رہا تھا۔ بچے آوے کی راکھ اڑاتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے اتر آئے۔ نورا دکان میں سے باہر آ گیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے سینے میں اتر جانا چاہتا ہے۔

اور پھر مولا، جو معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گیا ہے، ایک قدم آگے بڑھا۔ لٹھ کو دور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دیا اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا ——— "چودھری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے، رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔"

اس نے ہولے ہولے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا ——— "رسید تم ہی کو دے دیتا، پر تمہیں تو دولہا بننا ہے ابھی ——— اس لیے جاؤ، اپنا کام کرو!"

گلا سر جھکائے ہوئے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا، جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آ کر نہایت وحشت سے بولنے لگی ——— "تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے! ——— ارے تو تو میرا حلالی بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا، تو نے!" وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی ——— "تو تو رو رہا ہے مولے؟"

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا ——— "تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

پرمیشر سنگھ

احمد ندیم قاسمی

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا" کسی نے کہہ دیا —— "ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا"۔ وہ سوچتی "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا۔ اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر —— پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے۔ پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنے توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال وہ جب روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا "میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا۔" اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔ سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے اُلجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا، وہ بولا "ہنسو نہیں یارو، اس بچے کو بھی تو اس واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی بولا —— "ذرا ٹھہر پرمیشرے، کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی —— "اسے مارو نہیں، اتنا ذرا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے ——"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے" —— ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا —— "بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا —— "پتہ نہیں۔"

"لو اور سنو" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی - بولا ——— "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا"
سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے - اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا ——— "سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو - میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا - وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا"
کرپان میان میں چلی گئی - سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی - پھر ایک سکھ آگے بڑھا - بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا ——— "لے پرمیشرے، سنبھال اسے - کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے ——— لے پکڑ"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں - اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما - اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنھوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا - پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا، اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا، مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگتا چلا گیا، جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے - دوسرے سکھ حیران کھڑے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگتا ہوا واپس آیا - اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا -

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا ——— "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر" ——— اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے"۔ پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا ——— "ذرا میری انگلیوں میں جھانکو تو"

اختر ذرا سا جھک گیا - پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی - "آہا" ——— اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا ——— "تتلی"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا -

"ہاں" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا - اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی - اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی - اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا ——— "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا -"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا -

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا ——— "ہم اماں پاس جائیں گے - اماں پاس جائیں گے" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا - پھر جب پرمیشر سنگھ نے اس سے یہ کہا کہ "ہاں ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں" تو اختر چپ ہو گیا - صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا -

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا - پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا - لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرت سر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا - وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چاردیواری میں داخل ہوا تھا ٹھٹک کر رہ گیا تھا - اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں - اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا ——— "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے"
گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے - پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انھیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتارا سنگھ کے بچھڑتے ہی

انہیں کچھ ہوگیا ہے ـــــــ "جانے کیا ہوگیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا ـــــــ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرتار سنگھ بچھڑا ہے۔ تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا، کہتا تھا، بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری۔ ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی ـــــــ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہاں تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتے سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا ـــــــ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" ـــــــ بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پرتیم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پرتیم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی۔ اذان کا تصور تک اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا ـــــــ "ٹھیک ہے سوتے نہیں تو اور کیا کرے، نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلافِ معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی، اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کو دتی ہوئی آئی اور بولی ـــــــ "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا ـــــــ "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں، یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے۔ اس کا نام اختر ہے۔"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی ـــــــ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو۔ کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ واہگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے، اور پھر یارو یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا۔ پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے۔ اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں یہ ذرا پتلی ہیں اور ـــــــ"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا ـــــــ "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا ـــــــ "اری لو۔ یہ اماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جاتے ہو" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آگیا تھا جیسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا ——— "ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما - اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا - ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی - اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولہ بن جاتا - اور پھر ——— بچے ——— تجھے تو کچھ ہو گیا ہے - دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے ؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں واپس ڈال آؤ - خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی ——— "کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے - سمجھیں ؟"

"نہیں" - اب کے بیوی چیخ اٹھی ——— "میں نہیں سمجھی اور نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں' میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا - کاٹ کے پھینک دوں گی - اٹھا لایا ہے وہاں سے' لے جا اسے پھینک دے باہر۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر ؟" ——— اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا ——— "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا ؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا - اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی' چیختی چلاتی بھاگی - پڑوس سے امر کور دوڑی آئی - اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں - مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی - پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے ایک مسلمان کا سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں - پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا - بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی - اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا ——— "اختر کدھر گیا ہے ؟" وہ چنگھاڑا ——— "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر ؟ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو ——— ؟ اختر ——— اختر ——— !" وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا - بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے - عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا ——— "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو - ارے وہ گیا کہاں ؟ اختر ——— ! اے اختر ——— !"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ میں روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا ——— "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹا میں تو سکھ ہوں" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعترافِ جرم کر لیا ——— "تو پھر ہم نہیں آئیں گے" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لیے راستہ صاف کیا -

"نہیں آؤ گے ؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا -

"نہیں"

"نہیں آؤ گے ؟"

"نہیں - نہیں - نہیں۔"

"کیسے نہیں آؤ گے ؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا ——— "چلو" وہ کڑکا -

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے - پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا ——— "نہیں چلتا - بس نہیں چلتا - تم سکھ ہو - میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا - میں اپنی اماں پاس جاؤں گا - میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور اب جیسے پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی - اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا - اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا - اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور

ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا ——— "مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمہارے خدا کی قسم، میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمہاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ پھر وہاں اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا۔ تو تم اسے ادھر گاؤں میں چھوڑ جانا۔ اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا ——— "روتے کیوں ہو پرمیشرے۔ کل ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا ——— "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو اور ادھر اگر کوئی کرتارے کو اختر بنالے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟" پھر اس کی آواز میں گرج آگئی ——— "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرت سر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتو کھ سنگھ اندر آیا اور بولا ——— "پرمیشر سنگھ!"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا ——— "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی ——— "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں مسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے۔ کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے، مُوا نکما۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"واہگورو جی کا لحاظ کون نہیں کرتا گدھی!" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ زیرِ لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے پاس آگیا ——— "اچھا جی، اچھا!" اس نے کہا۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا دشوار ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آکر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی ——— "ذرا ادھر تو آ امر کورے! یہ دیکھ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں!" امر کور وہیں سے جواب دیتی ——— "جیسے واہگورو جی ایک ہیں، اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح

کرتارا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی —— "میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں ماں یہ مُسلا ہے، اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مُسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" —— پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لیے روتیں، اختر چند روز اپنی ماں کے لیے رویا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا —— "میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا —— "یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا —— پر ایک بات کبھی نہ ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ وہ نہیں ہوگا مجھ سے، سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی، اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا —— "الّو کی پٹھی" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا —— "سُنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اُٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجیب اندھیر ہے یارو۔" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی —— "پانی" اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور 'پانی' کا لفظ ایک کراہ بن اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ —— "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھنویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جُت گئی۔ اب کے اختر چلّایا —— "پانی دیتی ہے کہ نہیں —— پانی دے ورنہ مار دوں گا" —— امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی —— "مار تو سہی۔ تو کرتارا نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔" اختر بلک بلک کر رو دیا۔ اور آج اس نے مدت کے بعد اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا —— "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سؤر کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی —— "کیوں پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آتے تو ہمیں کیوں ترس آتے اس پر۔ ہاں۔"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا —— "یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں" اختر بڑے غصے سے بولا —— "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلّایا —— "تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔"

"یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے!" امرکور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے" اختر بولا ——— "تمہیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا ——— "اری سنتی ہو؟ ——— سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امرکور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی ——— "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امرکور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی ——— "سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امرکور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا ——— "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا ——— "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امرکور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا ——— "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا۔" اختر بولا۔

اب کے بھی امرکور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا۔ اور امرکور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا۔ اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی ——— "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قُل ھُوَاللّٰہُ اَحد پڑھنے لگا۔ کُفُواً اَحَدٌ پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا ——— "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

"ہاں ہاں۔" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔ اب کے امرکور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا ——— "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں۔" اختر بولا ——— "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قُل ھُوَاللّٰہ پڑھو نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی، پر امرکور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا ——— "روز پڑھا کر۔ اُونچے اُونچے پڑھا کر۔ اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھا تو امرکور پکاری ——— "نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے۔" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا ——— "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلنا رہے، کیا ہے؟" بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر نہیں دیا ——— "بگلیاں۔" وہ بولا ——— "گدھیاں۔"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قُل ھُوَاللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سوگیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے۔ اور ابھی وہ پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قُل ھُوَاللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا ——— "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں۔"

"کرتارا؟"

"نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولا ——— "ہاں ہاں وہی، کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنوں کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی۔ اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا ——— "کیوں بے کرتارو! تُو نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا۔" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسُول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا ——— "اور کیا تمہارے گرُو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مُسلا۔" لڑکے نے اُسے گالی دی۔

"سِکھڑا۔" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا ——— "سنو بیٹے! میرے پاس رہو گے کہ اماں پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا پھر مسکرانے لگا اور بولا ——— "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سُرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا ——— "دیکھو بیٹے! ——— اختر بیٹے آج یہاں فوج آرہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آرہے ہیں، سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ۔ پھر جب وہ چلے جائیں گے نا، تو مَیں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دُور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولہ دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا ——— "فوجیوں کی لاری آگئی ———" وہ مینڈھ پر سے کُود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا ——— "گیانے او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی ——— پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا، اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کرکے بولا ——— "آؤ بھئی کرتارے، تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔ ہونہہ!" ——— پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی ——— "جاؤں ——— ؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پاکر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔

گھر جاکر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کرکے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رُک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیرِ لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے ممتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیالی گئی تھیں ——— "اور مذہب کیا ہے دوستو۔" اس نے کہا تھا ——— "دُنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کے نام لے کر انسان کو انسان سے چھڑا لیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسُول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری جانے کے بعد لُٹا لُٹا سا الگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آگئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سوچ میں بیٹھ جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک اپنی ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا ——— "ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پُورے کا پُورا۔" وہ چلایا۔ اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے گود میں بٹھا لیا۔ پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سُوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری ——— "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر بعد چونک کر بیوی سے پُوچھا ——— "سنو۔ کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو۔" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی ——— "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے!"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا ——— "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آکر وہ بولا ——— "یہ چاند جو پورب سے

نکل رہا ہے نا بیٹے، جب یہ ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"
اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔
" یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمہاری اماں کے دیس میں۔"
اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔
"یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"
اب کے اختر بولا ـــــــ "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"
"ہاں۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی ـــــــ "چلوگے اماں کے پاس؟"
"ہاں۔" اختر بولا ـــــــ "پر تم تو جاتے نہیں، تم بہت بُرے ہو۔ تم سکھ ہو۔"
پرمیشر سنگھ بولا ـــــــ "نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چِٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔"
"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔
"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لیے جا رہا ہوں۔"
"سچ ـــــــ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا ـــــــ "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چِٹھی لکھیں گے۔"
پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا ـــــــ "گانا سنوگے؟"
"ہاں!"
"پہلے تم قرآن سناؤ۔"
"اچھا۔" اور اختر قُل ھُوَ اللّٰہ اَحَد پڑھنے لگا۔ کُفُواً اَحَد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا ـــــــ "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"
رُک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو کر دی اور بولا ـــــــ "اب تم سناؤ۔"
پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھالیا۔ اسے بچّوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا جے
بنتو دا منہ چن ورگا جے
بنتو دا لک چترا جے
لوکو
بنتو دا لک چترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔
پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا ـــــــ "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بنتو ہے۔ امر کور کا نام بھی بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"
"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا ـــــــ "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنّے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے بہت ڈرا، مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا ——— "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند سنگھ جی کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا۔ اور کہانی ابھی جاری تھی، جب اختر ایک دم بولا ——— "ارے چاند تو سر پر آ گیا!"

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا ——— "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا۔ جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ——— "جاؤ بیٹے، تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ———"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور سرگوشی میں بولا ——— "اذان کے وقت نہیں بولتے۔"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا۔

"شش!" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ——— "میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم ———"

"کیوں ——— ؟ کیوں نہیں آؤ گے ——— ؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا ——— "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتارا نہیں اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو، مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا، تو اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا ——— ؟"

"اچھا۔"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا ——— "جاؤ!"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا ——— "تم بھی آ جاؤ نا۔"

"نہیں بھئی!" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا ——— "تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا۔" بات اختر کی سمجھ میں آ گئی اور وہ قل ھو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو اُفق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی۔ اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگ ڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے ——— "کون ہو تم؟"

"اختر"

وہ یوں بولا جیسے ساری دُنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے جھپٹ کر پگڑی چھین لی اور پھر ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا ——— "میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو، ورنہ مَیں تمہیں ماروں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی دھب سے زمین پر گرے اور رائفل کو کندھوں سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔

"ہالٹ۔"

ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پٹی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا۔ اور وہ کہہ رہا تھا ——— "مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دُور اختر بھاگا آ رہا تھا۔ اور اس کے کیس ہَوا میں اُڑ رہے تھے۔

ابابیل

خواجہ احمد عبّاس

اس کا نام تو رحیم خاں تھا، مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لوہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیے تو اس نے مارتے مارتے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ اگلے دن ضلع دار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہو لہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم کی آگ میں جلے گا۔ مگر یہ سب اُس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا۔ اُس کے سامنے کسی کی ہمت زبان چلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو نے کہہ دیا۔

"ارے بھائی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے؟"

بس اُس غریب کی وہ دُرگت بنائی کہ اُس دن سے لوگوں نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اُس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا کہ اب کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ دلوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اُس کے خلاف گواہی دے کر اُس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اُس نے دونوں کے نام رکھ دیے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا۔

"کیوں بے نتھو! تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا؟' اور ابے چھدو! تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟"

اور پھر ان غریبوں کی شامت آجاتی۔ سوت کی رسّی کی مار سے دونوں بیلوں کی پیٹھ پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو اپنی بیوی بچوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک کم ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے اُس کو اُلٹا لٹا کر بیلوں والی رسّی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیتا۔ غرض ہر روز ایک آفت مچی رہتی۔ آس پاس کے جھونپڑے والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اُس کی بیوی اور بچوں کو مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے۔ مگر بیچارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک بار مار کھا کر

جو بھاگا تو واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں رشتے کے ایک چچا رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بلاس پور کی طرف جاؤ تو ذرا نورو کو لیتے آنا۔"

پھر کیا تھا۔ آگ بگولا ہو گیا۔

"میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں آنے لگا تھا۔ دو سال بعد چھوٹا لڑکا بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا تو بس بیوی ہی رہ گئی۔ وہ غریب تو اتنی پٹ چکی تھی کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پاکر، جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا، وہ اپنے بھائی کو بلاکر اس کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی۔ پڑوس کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں کچھ روز کے لیے اپنے میکے رام نگر جا رہی ہوں۔

شام رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی کچھ روز کے لیے اپنے میکے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اب اس کی بیوی کبھی نہیں آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلّی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اسی کی ہی دُم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھے کو جاکر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا؟ بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو گیا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دوھ کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا، ایک گھڑونچی لاکر اس پر چڑھادی اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچّے پڑے چوں چوں کر رہے تھے اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل نے چونچ سے اس پر حملہ کیا۔ "اری آنکھ پھوڑے گی؟" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ بھر کر کہا اور گھڑونچی سے اتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن اس نے کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں اب اس سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا، لیکن شام کو سورج چھپنے سے پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقہ بھر کر، پلنگ پر لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی طرف دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچّے اڑنے کے قابل ہو رہے تھے۔ اس نے ان دونوں بچّوں کے نام اپنے بچّوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لوگوں کو حیرت ضرور تھی کہ مدّت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدّو خوش تھے۔ ان کی کمروں سے زخموں کے نشان بھی اب قریب قریب غائب ہو گئے تھے۔ رحیم خاں ایک دن کھیت سے جلدی آرہا تھا کہ کچھ بچّے سڑک پر کبڈّی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھتے ہی سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا۔

"ارے میں تمھیں کوئی مارتا تھوڑے ہی ہوں۔"

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ جلدی جلدی بیلوں کو ہانکتا ہوا گھر آیا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے

گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔ اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلاکر اُجالا کیا۔ روز کی طرح باسی روٹی کے ٹکڑے کرکے ابابیلوں کے قریب طاق میں ڈال دیے۔ "ارے نورو! ارے بندو!!" پکارا مگر وہ باہر نہ آئے۔ گھونسلے میں جھانکا تو چاروں اپنے پیروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ ٹھیک جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر تک یہ پانی اسی طرح آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہوجائے گا اور ابابیلیں بیچاری بے گھر ہوجائیں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے کواڑ کھولے اور موسلادھار بارش میں سیڑھی لگاکر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کرکے اُترا تو بالکل بھیگ چکا تھا۔ پلنگ پر جاکر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اُس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ، چادر اوڑھ کر سوگیا۔ اگلے دن صبح اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اُسے کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو فکر ہوئی۔ کالو ضلع دار اور کئی کسان شام کو اسے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا — "ارے بندو! ارے نورو!! کہاں مرگئے؟ آج تمھیں کھانا کون دے گا؟"

کچھ ابابیلیں کمرے میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

"بے چارہ پاگل ہوگیا ہے" کالو ضلع دار نے سر ہلاکر کہا "صبح کو شفاخانے والوں کو پتہ دیں گے کہ اسے پاگل خانے بھجوادیں"۔

اگلے دن صبح جب اُس کے پڑوسی شفاخانے والوں کو لے کر آئے اور اُس کا دروازہ کھولا تو وہ مرچکا تھا۔ اس کے پائنتی چار ابابیلیں خاموش بیٹھی تھیں۔

ٹڈّی

خواجہ احمد عبّاس

کھیت میں گیہوں کی فصل تیار کھڑی تھی اور رامو کے من میں آشا کی پھلواری لہلہا رہی تھی۔ دیکھنے میں ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اُس میں جو فصل کھڑی تھی اس میں کٹائی چھٹائی کے بعد مشکل سے پچاس من گیہوں کے دانے نکلیں گے۔ رامو نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ منڈی میں گیہوں کا بھاؤ تھا پندرہ روپیہ فی من۔ کل فصل کے ہوئے ساڑھے سات سو روپے۔ کوئی خزانہ اُس کے گھر میں نہیں آنے والا تھا، مگر پھر بھی پکی ہوئی گیہوں کی بالیوں کو دیکھ دیکھ کر رامو پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شام کے سورج کی روشنی میں کھیتی جگمگا رہی تھی جیسے وہ سونا مل سُنار کی دکان ہو۔ جہاں سونے چاندی کے زیور ہمیشہ شیشے کی الماریوں میں سجے رہتے ہیں۔ اور جہاں سے اس برس کی فصل کا سودا کرتے ہی رامو، لاجو کے لیے ایک چاندی کی ہنسلی لائے گا۔ اس کی لاجو کی لمبی پتلی گردن تھی اور اس کا پکے گیہوں کی طرح دمکتا ہوا چہرہ تھا۔

لاجو اُس کی بیوی، اس کے دو بچوں کی ماں، چھ برس ہوئے جب وہ اُس کا مکلاوہ کر کے گھر لایا تھا اور پہلی بار گھونگھٹ اٹھا کر اس کا منہ دیکھا تھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سچ مچ لکشمی اُس کے گھر آ گئی ہو۔ اتنی سُندر بہو تو ان کے سارے گاؤں میں ایک بھی نہیں تھی۔ کتنے ہی دن تو وہ کھیت پر ہی نہیں گیا تھا۔ بس ہر وقت بیٹھا لکشمی کو گھورتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ماں کو اُسے دھکے مار کر باہر نکالنا پڑا۔ "ارے بے شرم گاؤں والے کیا کہیں گے؟ ابھی سے جورو کا گلام ہو گیا۔"

چھ برس سے رامو ہر فصل پر لاجو کے لیے ہنسلی بنوانے کا پروگرام بناتا تھا مگر ہر بار اُس کا یہ منصوبہ مٹی میں مل جاتا تھا — یا پانی میں ڈوب جاتا تھا۔ ایک برس بارش اتنی ہوئی اور ایسے غیر وقت ہوئی کہ آدھی پکی ہوئی فصل تباہ ہو گئی۔ اگلے برس سوکھا پڑا اور کھیتیاں جل گئیں۔ تیسرے برس باڑھ آ گئی اور فصلیں پانی میں ڈوب گئیں۔ چوتھے برس گیہوں کو گھُن کھا گئی۔ پانچویں برس ایسا زبردست پالا پڑا کہ فصل ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چھٹے برس ایسی تیز آندھیاں چلیں کہ پکی پکائی فصل کو تباہ کر دیا مگر اس برس بھگوان کی کرپا سے سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ نئی نہر سے ان کو پانی کافی ملا تھا۔ سرکار کے محکمۂ زراعت سے کھاد بھی ملی تھی اور فصل کو کھانے والے کیڑوں کو مارنے کی دوا بھی ملی تھی۔ بارش نہ کم ہوئی تھی نہ زیادہ۔ اس برس رامو کو ایسا لگتا تھا کہ اس کی لاجو کے نازک گلے میں وہ چاندی کی ہنسلی ضرور چمکے گی جو کب سے سونا مل کی شیشے کی الماری میں اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

اپنے کھیت میں کھڑا کھڑا رامو سوچ رہا تھا کہ اب ایک آدھ دن میں کٹائی شروع ہی کر دینی چاہیے، اتنے میں اُس نے دھوپ میں جگمگاتے ہوئے کھیت پر ایک سایہ پڑتا ہوا دیکھا۔ اور نہ جانے کیوں دفعتاً اُس کا دل خوف سے بھر گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو آکاش پر پچھم کی طرف سے آتا ہوا ایک بادل دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بے وقت کی برکھا کیسی؟ ان دنوں تو کبھی بادل نہیں

دیکھے، اُس کے برابر کے کھیت میں اُس کا پڑوسی گنگوا بھی یہی سوچ رہا تھا۔
"ارے رامو اس برس بے بخت کی برکھا ہونے والی ہے کیا؟"
"یہی میں سوچ رہا ہوں بھیّا" اور ابھی وہ کچھ اور نہ کہہ پایا تھا کہ بادل جو بڑی غیر معمولی رفتار سے اُڑ رہا تھا، اب ان کے سر پر ہی آگیا اور برکھا کی پہلی بوند رامو کی ناک پر سے پھسلتی ہوئی گیہوں کی ایک پکی ہوئی بالی پر گری۔ مگر یہ "بوند" پانی کی نہیں تھی۔ وہ بوند ہی نہیں تھی ایک زہریلا بھوکا کیڑا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے گیہوں کے کتنے ہی دانے چٹ کر گیا۔
رامو چلّایا ——"ٹڈّی"
گنگوا چلّایا ——"ٹڈّی"
آس پاس کے کھیتوں سے آوازیں آئیں۔ "ٹڈّی! ٹڈّی!!"
اس سے پہلے بھی یہ آسمانی مصیبت اُن کے کھیتوں پر نازل ہوئی تھی۔ انھوں نے مندروں میں گھنٹے بجائے تھے اور مسجدوں میں دعائیں مانگی تھیں اور کھیتوں میں کھڑے ہو کر شور مچایا تھا مگر وہ ٹڈّی کی یلغار کو نہ روک سکے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی سال بھر کی محنت مٹی میں مل گئی تھی اور وہ زمیندار اور ساہوکار سے گڑگڑا کر مدد مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
مگر اس بار وہ بدل چکے تھے، ان کا ملک اور ان کے کھیت بدل چکے تھے۔ زمینداری ختم ہو چکی تھی۔ اب کاشتکار ان کے اپنے کھیت تھے۔ ان کی اپنی سرکار تھی جو ایسے موقع پر ان کی سہائتا کے لیے تیار تھی۔ سو اس بار صرف چند بڑے بوڑھوں نے ہی مندر میں گھنٹے بجا کر بھگوان سے فریاد کی۔ باقی جتنے کاشتکار تھے سب اپنی محنت سے اُگائی ہوئی فصل کو دشمن سے بچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے سینکڑوں ڈھول اور ٹین کے کنستر پیٹ پیٹ کر ڈرایا اور بھگایا گیا۔ پھر بھی دشمن پسپا نہ ہوا تو کسانوں کی فوج لاٹھیاں اور ڈنڈے لے لے کر ان پر پل پڑی۔ عورتیں اور بچّے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جھاڑوئیں لے لے کر ٹڈّی دل کا صفایا کرنے لگے مگر دشمن اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ہزار ٹڈّیاں ماری جاتیں تو دس ہزار اور آجاتیں۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان میں ایک سوراخ ہو گیا ہے اور اس میں سے ٹڈّی کی مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ لاکھوں ٹڈّیاں، کروڑوں ٹڈّیاں۔ پھر بھی مقابلہ کرنے والوں نے ہار نہیں مانی۔ رات کے اندھیرے میں بھی مشعلیں جلا جلا کر دشمن پر حملہ کرتے رہے۔
ٹڈّی کا مقابلہ کرنے والوں میں سب سے آگے آگے رامو تھا۔ دن بھر، رات بھر اس نے نہ کھایا نہ پیا، نہ پل بھر کو آرام کیا۔ اس کے پڑوسیوں میں کوئی بھی ہمّت ہار جاتا اور کہنے لگتا کہ "اس آسمانی بلا کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھگوان ہی ہمیں اس سے نجات دلا سکتا ہے" تو رامو للکار کر کہتا۔ "ارے مرد ہو کر ایک ذرا سے کیڑے سے ہار مان گئے۔ پورے چھ مہینے خون پسینہ ایک کر کے تو یہ فصل اُگائی ہے، اب اسے دشمن کے حوالے کر دیں؟ چلو اُٹھو۔ ہمّت نہ ہارو" رامو کو تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ٹڈّی اس کی ذاتی دشمن ہے جو اُس سے اُس کی کھیتی ہی نہیں اُس کی زندگی کی ساری خوشیاں اور کامیابیاں چھیننا چاہتی ہے۔ اس کو ایسا لگتا کہ یہ ٹڈّی اُس کی اُگائی ہوئی فصل ہی کو نہیں چٹ کرنا چاہتی بلکہ اُس چاندی کی ہنسلی کو بھی دیمک کی طرح کھائے جا رہی ہے جو وہ لاجو کے گلے میں دیکھنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تو اُس کو ایسا محسوس ہوتا کہ ایک بہت بڑی ٹڈّی اپنے منحوس پنجے لاجو کی نرم نرم گردن میں پیوست کر کے اس کا خون پی رہی ہے اور یہ سوچتے ہی وہ لاٹھی لے کر ٹڈّی دل پر ٹوٹ پڑتا اور لوگ حیرت سے دیکھتے کہ رامو میں یہ بلا کی طاقت اور اَن تھک ہمّت کہاں سے آگئی ہے۔
اور پھر رات بھر کی محنت کے بعد صبح سویرے جب انھوں نے دیکھا کہ پورب سے ایک اور ٹڈّی دل اُڑتا چلا آرہا ہے تو

ایک بوڑھے نے لاٹھی پھینکتے ہوئے کہا۔" اب تو بھگوان ہی ہماری سہائتا کرے تو ہم بچ سکتے ہیں"۔ اور اسی لمحے میں انھوں نے آسمان سے آتی ہوئی ایک گھوں گھوں کی آواز سُنی جیسے کوئی جناتی جسامت کی شہد کی مکھی قریب آ رہی ہو۔ مگر یہ شہد کی مکھی نہیں تھی۔ ایک ہوائی جہاز تھا جو سرکار نے ٹڈی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوائی جہاز نے ہوا میں ایک ڈبکی لگائی اور اُن کے کھیتوں پر سے نیچے نیچے اُڑنے لگا اور اُس کی دُم میں سے نکل کر ایک بھورے رنگ کا بادل سارے کھیتوں پر چھا گیا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ گیہوں پر بیٹھی ہوئی ٹڈیاں ٹپ ٹپ زمین پر گر رہی ہیں، دُم توڑ رہی ہیں۔

سو رامو کی کھیتی بچ گئی۔ اُس جیسے اور ہزاروں کاشت کاروں کی کھیتیاں بچ گئیں۔ رامو کٹائی کرتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ نئی طاقت جواب ہمارے پاس ہے اس کے مقابلے میں سو ٹڈی دل بھی آئیں تو ہم ان کو شکست دے سکتے ہیں۔

اور پھر اناج کو گاڑیوں میں لاد کر وہ منڈی لے گیا۔

سرکاری بھاؤ پندرہ روپے من تھا مگر لالہ کروڑی مل آڑھتی نے اپنی توند سہلاتے ہوئے کہا۔" فصل ٹڈی سے بچ گئی اس لیے منڈی میں اناج ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے اور قیمتیں گر گئی ہیں"۔

" تو کیا آپ چاہتے تھے ٹڈی ہماری فصل کو کھا جاتی تو بہتر ہوتا؟"

" یہ تو میں نہیں کہتا۔ مگر قیمتیں ضرور بڑھ جاتیں۔ اب تو اتنا اناج منڈی میں آ گیا ہے کہ میں نے چند روز کے لیے خرید ہی بند کر دی ہے"۔ اور پھر کسی قدر دھیمی آواز میں کہا۔" ویسے بارہ روپے من دینا چاہو تو میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ . . ."

" مگر سرکاری ریٹ تو پندرہ روپے من ہے"۔

" سو تو ہے مگر میں نے کہا نہیں اناج زیادہ پیدا ہو گیا ہے ہمیں ضرورت ہی نہیں رہی"۔

" تو میں لالہ بنسی دھر کے یہاں لے جاتا ہوں"۔ رامو نے کہا اور ادھر گاڑی ہانک دی۔

مگر لالہ بنسی دھر نے بھی وہی کہا جو کروڑی مل نے کہا تھا اور جو بنسی دھر نے کہا وہی لالہ مکھن چند نے کہا۔

پھر وہ لالہ کروڑی مل کے ہاں واپس آیا۔ وہ بولے" گھنٹہ بھر میں بھاؤ اور گر گیا ہے۔ آسٹریلیا سے کئی جہاز آ گئے ہیں۔ امریکہ میں بھی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ ساری دنیا میں گیہوں کی قیمت گر گئی ہے۔ اب تو میں گیارہ روپے من ہی دے سکتا ہوں"۔

اور سو رامو کو گیارہ روپے من پر ہی اناج بیچنا پڑا۔ کچھ بھی ہو۔ اُس نے سوچا۔" لاجو کے لیے ہنسلی ضرور لوں گا۔ بس سیٹھ مکھن لال سے بیج کے لیے جو قرضہ لیا تھا وہ چکا دوں"۔

سیٹھ مکھن لال کا نام ہونا چاہیے تھا سیٹھ سوکھن لال۔ دُبلے پتلے، سوکھے ہوئے، پچکے ہوئے گال، مگر روپے دیکھتے ہی ان کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ دو سو روپے اصل اور چوبیس روپے سود سرکاری اور چھبیس روپے نذرانہ غیر سرکاری۔

جیب ہلکی کر کے آگے رامو چلا ہی تھا کہ چودھری ملکھاں سنگھ مل گیا جو نہر کا پٹواری تھا اور کاشت کاروں کے جیون میں بھگوان کا درجہ رکھتا تھا۔ جس کو چاہے پانی دے جس کو چاہے نہ دے۔ چاہے کم پانی دے، چاہے زیادہ پانی دے۔ ملکھاں سنگھ کی بڑی بڑی مونچھیں خضاب سے کالی کی ہوئی تھیں اور ہمیشہ تیل میں ڈوبی رہتی تھیں اور کسی کاشتکار جس سے روپیہ ملنے کی امید ہو اُسے دیکھتے ہی یہ مونچھیں لالچی کتے کی طرح دُم ہلانے لگتی تھیں۔ چودھری ملکھاں سنگھ کا قول تھا کہ " جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہو گا"۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جتنا روپیہ نہر پٹواری کی جیب میں ڈالو گے اتنا ہی پانی تمھارے کھیت میں پہنچے گا۔ سو رامو نے اگلی فصل کے لیے پانی کا انتظام کر لیا مگر اس کی جیب اور بھی ہلکی ہو گئی اور جب وہ سونا مل

کی دکان کے سامنے سے گزرا اور شیشے کی الماری میں لٹکی ہوئی ہنسلی نظر آئی تو اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اگلی فصل پر ضرور لوں گا۔" اور نظر جھکا کر گزر گیا۔

رات ہوئے گھر واپس پہنچا تو دیکھا لاجو اس کا انتظار کرتے کرتے چولھے کے پاس بیٹھی بیٹھی ہی سو گئی ہے۔ چنگیر میں روٹی پکی رکھی تھی۔ چولھے پر ساگ کی ہنڈیا دھری تھی۔ وہ لاجو کو آواز دینے والا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک پروں والا کیڑا دیوار پر رینگتا ہوا لاجو کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔

"ٹِڈی" اُس نے سوچا "تو ابھی سارے ٹِڈی دل کا خاتمہ نہیں ہوا؟"

اُس کی انگلیوں میں دبی ہوئی ٹڈی کلبلا رہی تھی، پھڑپھڑا رہی تھی، شاید دم توڑ رہی تھی مگر ابھی تک زندہ تھی۔ چراغ کی روشنی میں لایا تو اُس نے دیکھا کہ ٹڈی کا پیٹ نہ جانے کس کا اناج کھا کر پھولا ہوا ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی ہیں اور اُس کی لمبی نکیلی مونچھیں لالچی کتے کی طرح دُم ہلا رہی ہیں۔

کاکڑاں کا تیلی

اپیندر ناتھ اشک

"اڑھائی روپے!" ــــــــ مولو نے طنز سے سر ہلا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں سے جو گویا کہہ رہی تھیں کہ کم بخت تانگے والے کی عقل شاید ٹھکانے نہیں رہی۔

ابھی مشکل سے آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا لیکن دن پہاڑ سا نکل آیا تھا۔ سورج عین سر پر معلوم ہوتا تھا۔ گرمی اتنی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ گرد کی ہلکی سی دھند چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور اس وجہ سے شعاعیں اگرچہ سیدھی نہ پڑتی تھیں، تو بھی جسم کے برہنہ حصوں میں نوکیں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

مولو نے اپنی بڑی سی پگڑی کو ٹھیک کیا ــــــ جسے اس کی بیوی نے رات کو ریٹھوں کے پانی سے دھویا تھا اور چاولوں کی کنی کو پکا کر کلف دیا تھا اور جسے رحماں اور مہراں اس کی دونوں بیٹیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر آنگن میں چکر لگا کر سکھایا تھا ــــــ پھر اس نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر جو ہونٹوں کے پاس سے پیلی ہوگئی تھی ہاتھ پھیرا، گٹھڑی کو بائیں کندھے پر کر کے دائیں ہاتھ سے تہمد کو ذرا جھٹک دیا اور چل پڑا۔

بیباں، اس کی بیوی نے سامنے جاتے ہوئے تانگے کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول میں آنکھیں جما دیں اور بولی ــــــ "اڑھائی روپے، اس سے تو پندرہ دن تک گھر کا گزارہ چل سکتا ہے، کچھ نہیں تو رحماں اور مہراں کے دوپٹے آسکتے ہیں، یا پھر میرے ننھے چراغ کی چند کرتیاں بن سکتی ہیں۔"

اور اس نے گود میں لیے ہوئے ابلی ابلی سوجی سوجی آنکھوں والے اپنے کالے سیاہ لڑکے کو محبت سے چوم لیا۔

جوتے کے ساتھ گرد اڑ کر مولو کے تہمد پر پڑ رہی تھی۔ رات اس کی بیوی نے اس کے کپڑوں کو دھویا اور نیل دیا تھا جو شاید رات کی تاریکی میں زیادہ دبا گیا تھا کیونکہ تہمد کی سفیدی میں ہلکی سی نیلاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی اور جوں جوں گرد پڑتی تھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

مولو نے پھر ایک بار تہمد کو جھٹکا دے کر اسے ذرا اوپر اٹھا کر ٹھونس لیا ــــــ "ان سالے تانگے والوں نے سڑک کا ستیاناس کر دیا ہے مٹی میدہ بن گئی ہے" ــــــ وہ بولا اور اس نے بیوی سے اور اس کے پیچھے چلی آنے والی دونوں لڑکیوں اور سات آٹھ سال کے بچے سے کہا کہ وہ سب سڑک چھوڑ کر مینڈھ مینڈھ ہو کر چلیں۔

لیکن وہاں تو صرف تانگے ہی چلتے تھے۔ جب مولو تین چار میل چل کر بھیلووال کے پاس پہنچا جہاں ایک لاری بھی چلتی تھی اور بکریوں اور بھیڑوں کا ایک ریوڑ "میں میں بھیں بھیں" کرتا ہوا قصبہ سے نکلا اور رات بھر باڑے میں بند رہنے کے بعد چنچل اور شوخ بکریاں (جو ابھی مائیں نہ بنی تھیں اور جن کے تھن اتنے بھاری نہ تھے کہ ان کے نیچے تھیلی لگانے کی ضرورت پڑے) اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ناآشنا میمنے قلانچیں بھرنے لگے تو مولو کو اس میدے کی حقیقت کا احساس ہوا۔ گرد اس طرح اڑی کہ اس کے لیے آنکھ کھولنا اور مڑ کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھنا مشکل ہو گیا۔

جب طوفان کچھ تھما اور بکریوں اور بھیڑوں کی آوازوں کو دباتی ہوئی، چرواہوں کی فحش گالیوں کی کرخت آوازیں حدِ سماعت سے پرے چلی گئیں تو مولو سڑک کو پار کر کے دوسری طرف گیہوں کے کٹے ہوئے کھیت میں جا کھڑا ہوا۔ گٹھڑی اس نے اتار کر زمین پر رکھ دی اور تہمد اور قمیص کو اچھی طرح جھٹک کر اس نے سر سے پگڑی اتاری اور اسے اچھی طرح جھاڑا۔ قمیص کے دامن کو اٹھا کر کے اس سے منہ پونچھا۔ پھر پگڑی باندھی اور اپنے بیوی بچوں کو آواز دی کہ وہ بھی سڑک کے اس کنارے آ جائیں۔

گرد دائیں طرف زمین و آسمان کے درمیان جا کر معلق ہو گئی تھی۔ جوں جوں ریوڑ آگے جاتا تھا اس کی لکیر بڑھتی جاتی تھی ـــــــــ اس بڑھتی ہوئی لکیر کی طرف دیکھ کر اور دل ہی دل میں چرواہوں کو کئی فحش گالیاں دے کر آخر مولو نے کہا ـــــــــ " بدتمیز! نہیں جانتے کہ راستے میں شریف لوگ جا رہے ہیں۔ ذرا خبرداری کر دیں کہ بھئی ایک طرف ہو جاؤ، بس اڑے چلے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی مہم سر کرنے جا رہے ہوں۔ حرام زادے! ـــــ اور اس نے اپنی مونچھوں کو دو بار پیار دیتے ہوئے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

شریف سے مولو کا کیا مطلب تھا؟ شاید یہ بات اسے خود بھی نہ معلوم تھی۔ وہ کاکڑاں کا تیلی تھا۔ گاؤں کے اس کنارے، جہاں بڑ کا ایک مہیب درخت بڑھ کر آدھے جوہڑ کو اپنے سایے میں لے چکا تھا، اس نے ایک چھوٹا سا کولہو لگا رکھا تھا۔ بارش ہوتی تو جوہڑ کا پانی اس کے کولہو کے قریب تک آ جاتا۔ بارش کی وجہ سے راستہ مسدود ہو جاتا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتیں اور جوہڑ کے کنارے لگے ہوئے کوڑے کے ڈھیروں کی عفونت بڑ کے سایے کی نمی سے جیسے وہیں جم کر رہ جاتی، لیکن اپنی زندگی کے پچپن سال مولو نے اسی کاکڑاں میں گزارے تھے، گاؤں سے تیس میل پرے کیا ہوتا ہے اس کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ زندگی میں شاید دو چار ہی ایسے موقعے آئے تھے جب اسے دھلے ہوئے کپڑے پہننے میسر ہوئے ہوں۔ عید کے موقع پر وہ یقیناً ہر سال کپڑے بدلا کرتا تھا لیکن اس کا کپڑے بدلنا یہی ہوتا کہ ننگے بدن رہنے کی بجائے وہ اس دن قمیص بھی پہن لیتا، یا بیاں ادھیلے کے ریٹھے لے کر انھیں مل ڈالتی ـــــــ ورنہ اس کی عمر تو تیل میں سنے کالے چکٹ کپڑوں میں گزر گئی تھی۔ جس طرح پاس رہتے ہوئے بھی جوہڑ کے غلیظ پانی اور اس کے کنارے لگے ہوئے کوڑے کے ڈھیروں میں اس کے لیے عفونت نہ رہی تھی۔ اسی طرح تیل اور پسینے سے تر، گندے، میلے، خستہ اور بوسیدہ کپڑوں کے لیے بھی اس کا احساس بالکل مر گیا تھا۔ رہی گرد تو تیل کے کام سے اس گاؤں میں گزر اوقات کی صورت نہ دیکھ کر اس نے وہیں کولہو کے ایک طرف چاک لگا رکھا تھا۔ جہاں وہ گھڑے، کوزے، ڈوئے دوریاں اور مٹکے بنایا کرتا تھا ـــــــ ذات سے وہ کمہار تھا یا تیلی، اس بات کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ اپنے دادا اور پھر اپنے باپ کو اس نے یہی کام کرتے دیکھا تھا اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ یہی کیے جا رہا تھا۔ جب اس کے ہاتھ تیل میں نہ ہوتے تو مٹی میں ہوتے۔ رہی تعلیم سو قرآن پاک کی کچھ آیتوں کے علاوہ جو وہ بڑی محبت سے غلط تلفظ کے ساتھ بڑھا کرتا تھا، اس نے وہ گالیاں سیکھی تھیں جو اس کے دادا پھر باپ اور پھر بڑے بھائی دیا کرتے تھے ـــــ لیکن آج اس مٹی اور اس ماحول کے خلاف جس میں وہ پیدا ہوا، پلا اور پروان چڑھا تھا اس کے دل میں جو ایسا نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ ان ننگے بدن، غلیظ تہمدوں میں ملبوس چرواہوں کو بدتمیز سمجھنے لگا تو اس کی وجہ تھی وہ اپنے اس چھوٹے بھائی کے لڑکے کی شادی میں شامل ہونے جا رہا تھا جو لاہور میں رہتا تھا اور دیہاتوں کی نظروں میں شہر والے شریف یعنی باعزت ہوتے ہیں اور چونکہ وہ شریف آدمی کے لڑکے کی شادی میں جا رہا تھا اس لیے وہ خود بھی شریف تھا۔

ڈیرد کے نزدیک ایک کھال پانی سے بھری ہوئی مزے سے رینگ رہی تھی۔ مولو نے اسے پار کیا پھر گٹھڑی رکھ کر بچے کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا اور اس کی بیوی چھلانگ مار کر ادھر آ گئی۔ رحماں پہلے خود آئی اور پھر اس نے فجے کو پار کرنے میں مدد دی لیکن لہراں کے جوتے کی کیل ابھر آئی تھی اور اس کی دائیں ایڑی میں زخم سا ہو گیا تھا۔ دھرتی گرم لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس لیے وہ ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ نہ کر سکی تھی اور ایڑی اٹھائے اپنے دوپٹے سے گردن کے پسینے کو پونچھتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

" اری تو پیچھے ہی لٹکتی چلی آ رہی ہے چلا نہیں جاتا تجھ سے؟" اور لمحہ بھر کے لیے اپنی شرافت کو بھول کر اس نے ایک فحش گالی اپنی اس لڑکی کو دے ڈالی۔

"مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میخ نکل آئی ہے۔" اس نے اونگھی آواز میں کہا۔ مولو نے گٹھری اٹھا کر کنارے کے ایک جامن کے درخت کے نیچے رکھ دی اور بولا ——— "لا ادھر میں اس میخ کو ٹھیک کر دوں ابھی گیارہ میل ہمیں جانا ہے۔"

بیباں اپنے آنچل سے اپنے آپ کو ہوا کرتی ہوئی وہیں درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئی اور ننھے کو دودھ پلانے لگی۔

رحماں نے کھال کے پانی سے منہ دھویا اور گیلا ہاتھ فجے کے منہ پر پھیرا اور لہراں نے وہاں پہنچ کر جوتے اپنے باپ کو دے دیے اور خود لنگڑاتی آکر اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

مولو نے میخ کو دیکھا۔ اس کی پتلی سی نوک جس کا زنگ زخم کی نمی سے صاف ہو گیا تھا کسی باغی کی طرح سر اٹھائے چمک رہی تھی۔ کہیں سے اینٹ کا ٹکڑا ڈھونڈ کر مولو نے اس کو توڑ دیا۔ اسے کند کر دیا۔ پے در پے چوٹوں سے اسے بہت زیادہ اندر کو دھکیل دیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر تہمد کی الٹی طرف سے منہ پونچھتا ہوا کچھ لمحے سستانے کے لیے اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔

"اڑھائی روپے" اس کی بیوی نے کہا ——— "جیسے ہمارے گھر روپیوں کی بارش ہوتی ہو' اور پھر دیکھو اپنی تو جیسے ہو سو ہو' وہاں جائیں گے تو کیا خالی ہاتھ جائیں گے۔ حسن خاں کے بچوں کے لیے بھلا کچھ نہ لے جائیں گے۔"

یہ حسن خاں' جو اپنی زندگی کے پینتیس برس تک گاؤں میں 'حسو' کہلاتا رہا ——— لاہور میں ایشر سنگھ گورنمنٹ کانٹریکٹر کا بیٹا تھا ——— جب لوپو کے پاس نہر بنی اور ٹھیکے دار ایشور سنگھ ادھر آیا تو نہ جانے کس طرح (مولو آج تک اس بات کو نہ سمجھ سکا) حسو جا کر اس کے مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ چھ آنے روز پر۔ پھر ٹھیکے دار ایشور سنگھ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے پانچ روپے مہینے پر میٹ بنا لیا اور پھر آٹھ آنے کر دیے اور جب اس کام کو ختم کر کے ٹھیکے دار ایشور سنگھ لاہور چلا گیا تو اپنے اس معتبر میٹ کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ گاؤں میں ایک بار جب وہ آیا تو اس نے چوڑے پونچوں کی شلوار بوسکی کی دھاری دار قمیص اور سر پر کلے دار صافہ پہن رکھا تھا۔ جس کا طرّہ ایک پھول کی طرح کھلا ہوا تھا ——— اس دن سے حسو' حسن خاں بن گیا تھا اور اس کے لڑکوں کے لیے مٹھائی لے جانے کا خیال بیباں کو تھا۔

اس جامن کے سایے میں بیٹھے بیٹھے اپنی تہمد کی کانٹھ سے مولو نے سب پیسے نکالے۔ اکثر پر تیل اور مٹی کی کالی تہہ جم گئی تھی اور اگرچہ زمین سے نکال کر تہمد میں باندھنے سے پہلے انھیں اچھی طرح دھو لیا گیا تھا۔ تو بھی تہمد کا وہ حصہ جس میں اس نے انھیں باندھا تھا' کالا ہو گیا تھا۔

اگرچہ وہ گھر سے انھیں گن کر لایا تھا پھر بھی گھاس پر تہمد کا ایک پلّا بچھا کر اس نے انھیں دوبارہ گنا۔ چار روپے اور کچھ آنے تھے اور یہ رقم اس نے بڑی مشکل سے پیسہ پیسہ کر کے دو سال میں جمع کی تھی۔ جونہی حسو کا لڑکا آٹھ سال کا ہوا اور اس کی سگائی ہوئی کہ انھیں اس بات کی فکر ہو گئی کہ اس کا نکاح بس اب نزدیک ہی ہے اس لیے انھیں کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہیے اور چونکہ حسو نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ لڑکے کی شادی اب وہ لاہور میں ہی کرے گا اس لیے دو سال سے وہ اس کے بیاہ کی بات سوچ رہے تھے۔ پچھلے برس وہ صرف دو روپے بچا سکا تھا اور اس سال صرف دو روپے اور کچھ آنے اور ان دو برسوں میں اس نے محنت بھی کم نہ کی تھی۔ جتنی سرسوں وہ حاصل کر سکتا تھا اس نے حاصل کی تھی اور جتنا تیل ارد گرد کے پانچ دس گاؤں میں بیچا جا سکتا تھا اس نے بیچا تھا اور اپنی سپلائی کو بڑھانے کے لیے اس نے سرسوں میں توریا ملانے سے بھی پرہیز نہ کیا تھا۔ پھر فصل کے دنوں میں اس نے کٹان کا کام بھی کیا تھا۔ اور پیروں کے میلوں میں گھڑوں اور مٹکوں کی دوکان بھی لگائی تھی لیکن اس پر بھی وہ گذشتہ دو برس میں یہی کچھ بچا سکا تھا اور بے سالن کی سوکھی روٹی سے زیادہ انھیں کچھ میسّر نہ ہوا تھا ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شادی کے خیال سے اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو گبرون کی ایک قمیص اور دریس کی ایک سُتھنی سلوا دی تھی۔ خود بھی ایک تہمد اور صافہ لیا تھا اور فجے کو بھی چھوٹا سا تہمد لے دیا تھا لیکن ان سب کے لیے وہ بھیلو شاہ کا قرض دار تھا جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال وہ جتنا تیل نکالے گا سب اس کی دوکان میں ڈال دے گا۔

وہیں جامن کے نیچے بیٹھے بیٹھے مولو حساب لگانے لگا ——— "اگر وہ اٹاری سے جا کر چڑھیں تو چار آنے تو موٹر کے لگیں گے اس طرح چار ساڑھے چار ٹکٹوں کے......"

لیکن بیباں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ——— "ساڑھے چار کیسے؟ فجے کا ٹکٹ کس طرح لگ سکتا ہے ابھی کل کا تو بچہ ہے تم اسے گودی میں اٹھا

لینا.....؟"

"یہ موٹر والے ایک ہی شیطان ہوتے ہیں اگر مانگیں گے تو"..... مولو نے کہنا شروع کیا ———"سنا ہے تین سال سے بڑے کا ٹکٹ لگتا ہے۔"

"ہاں لگتا ہے۔" بیباں بولی ——— "وہ نہ مانگیں تو بھی تم دے دینا۔"

"تو خیر۔" مولو بولا ——— "ایک روپیہ ہی سہی پھر لاہور شہر ہے وہاں حسّو کی شان ہوگی۔ پیدل گھسٹتے ہوئے تو اس کے یہاں نہ جایا جا سکے گا، پڑوسی نہ کہیں گے کیسے بھکمنگے رشتے دار ہیں۔ تین چار آنے تانگے پر بھی نہ خرچ کر سکے ———"

بیباں کو خود بھی اس بات کا یقین تھا اور اپنے بچوں کو بھی اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ چچا کے گھر سے انہیں بہت کچھ ملے گا اس لیے اس نے کہا ——— 'ایک روپیہ کی مٹھائی حسّو کے بچوں کے لیے بھی لے جانا۔ جب ہمارے بچوں کو اتنا کچھ دیں گے تو ہم کس طرح خالی ہاتھ جائیں گے' اور وہیں بیٹھے بیٹھے انھوں نے حساب لگایا کہ اس طرح سب خرچ نکال کر ان کے پاس بارہ آنے ایک روپیہ بچ جائے گا۔

تبھی لہراں نے اچانک کہا ——— "میرے پاؤں میں چھید ہو گیا ہے۔ میرا جوتا گھس گیا ہے۔ مجھے ایک جوتا لے دینا۔"

رحماں بولی ——— "مجھے ایک چنری کی ضرورت ہے چچا کی لڑکی کے سامنے میں پھٹی ہوئی چنری پہنوں گی؟"

فجّے نے کہا ——— "ابا ہم تو بوٹ لیں گے۔"

"چلو ہٹو ———" بیباں نے ایک جھڑکی دی "سات آٹھ دن وہاں رہنا ہے تو کیا اپنے پاس ایک کانی کوڑی تک نہ رکھیں گے۔ پھر گرمی کی بہار ہے راستے میں شربت لسّی ہی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

لوپو کے پاس انھیں ایک تانگہ جاتا ہوا ملا۔ لیکن جب اس نے اٹاری کے پانچ پانچ آنے فی سواری مانگے تو مولو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تہمد کو پھر اُوپر ٹھونس کر پگڑی کے شملے سے گردن اور منہ کا پسینہ پونچھ کر اور گٹھری کے بوجھ سے آہستہ آہستہ دبنے والی گردن اُٹھا کر وہ چل پڑا۔

لہراں اور فجّے نے ایک بار کہا ———"ابا تانگہ"

کڑک کر مولو نے انہیں چُپ کرا دیا۔ بیباں نے بھی بچّے کو کندھے سے لگا کر منہ میں انگلی ڈال کر اسے جھلاتے ہوئے ——— او ——— او ——— کرنا شروع کر دیا اور جب اس پر بھی بچّہ نہ مانا تو قمیص کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی نکال کر اس کے منہ میں دے دی۔

سڑک بالکل کچی تھی ——— سڑک تو اسے نہ کہا جا سکتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں ضرور سڑک رہی ہوگی لیکن اب تو اس کی وسعت کو دیکھ کر اس پر گرد کے کسی ایسے دریا کا گمان ہوتا تھا جس کے دونوں کنارے وسیع ہوتے ہوتے اردگرد کی ویران زمین سے جا ملے تھے۔ ہاں دونوں طرف پرانہہ کے بے سُود ٹیڑھے بیڑھے سوکھے اور بدصورت درخت اس سڑک کے وجود کا پتہ دیتے تھے اور کہیں کہیں کوئی ببول کا درخت اپنی کانٹے دار شاخوں کو سڑک پر پھیلائے ہوئے تھا کہ اگر کہیں گرمی کی تمازت سے جلتا ہوا کوئی شخص سائے میں آنے کی کوشش کرے تو اس کی پگڑی اُتر جائے یا اس کا چہرہ زخمی ہو جائے۔

لہراں کے جُوتے کی میخ پھر نکل آئی تھی اور زخمی ایڑی کو وہ اور بھی زخمی کر رہی تھی اس لیے اس نے جوتے ہاتھوں میں اٹھا لیے تھے۔ گرد دہکتی ہوئی راکھ کی طرح جل رہی تھی اور بار بار جب گرد میں ٹخنوں تک پاؤں دھنس جاتے تو سارے جسم میں ایک جلن کی لہر سی دوڑ جاتی لیکن میخ کی چبھن سے ٹیس کی جو لہر دوڑتی تھی وہ شاید جلن کی اس لہر سے کم تکلیف دہ تھی اور وہ جوتے اتارے چلی جا رہی تھی۔ پر اس کے باوجود وہ سب سے پیچھے تھی۔ اور مولو سب سے آگے تھا۔ اتنی عمر ہوگئی، مولو کبھی اس سڑک پر نہ آیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ سڑک اتنی ویران اور اتنی واہیات ہے تو وہ کبھی اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب بچّے اس کے ساتھ ہوتے۔ اس کے لہو پر تو بڑ کا گھنا سایہ تھا اور کبھی کبھی اردگرد کے دیہات میں تیل لے کر جانے یا پھر میلے ٹھیلے کے دنوں میں مٹی کے برتنوں کی دکان لگانے کے سوا وہ کبھی گاؤں سے باہر نہ گیا تھا۔ اس نے کبھی اس طرف کا سفر نہ کیا تھا۔ اس کی دُنیا تو بڑ کے ایک گھنے پیڑ کے سائے میں بستی تھی جہاں جلتی ہوائیں بھی

سرد ہو جایا کرتی تھیں اور دوپہر کی دھوپ بھی ٹھنڈک پہنچاتی تھی اور کبھی جب وہ خدا کے حضور میں سر جھکاتا تو اس کا بوجود اس کے دماغ میں آنا دہ کچھ بڑ کے گھنے پیڑ ہی کی طرح ہوتا ـــــــ بڑی بڑی لمبی شاخوں والا گھنا سائے دار تپتے دلوں کی ٹھنڈک پہنچانے والا ـ بے شمار گھونسلوں کو اپنی شاخوں میں چھپائے ہوئے لیکن یہ تپتی ویران دنیا ـ ہریالی کا ایک تنکا تک نہیں اور اس کے درمیان کسی جلتے ہوئے تیر کی طرح جلتی تپتی ـ جلاتی اور تپاتی ہوئی یہ سڑک! ـــــــ اگر اسے معلوم ہوتا تو کبھی اپنے بچوں کو یوں ساتھ نہ لاتا ـــــــ کبھی بھی نہ لاتا لیکن اس خیال کو اس نے فوراً اپنے دل سے نکال دیا اور پھر وہ اکڑ کر چلنے لگا ـ تہمد کو جھٹکا دینے یا قمیص کو جھاڑنے کا خیال وہ کب کا بھول چکا تھا ـــــــ کوئی سائیکل سوار یا بھولا بھٹکا راہی بھی گزرتا تو اس پر گرد کی تہہ چھا جاتی ـ لُو کبھی ادھر سے چلتی اور کبھی ادھر سے اور کبھی کبھار کوئی بگولا مٹی اڑاتا ہوا گزر جاتا ـ تہمد کا نیلاہٹ لیے ہوئے سفید رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا ـ پگڑی کی وہ دمک نہ رہی تھی اور کپڑوں کی الٹی طرف سے چہرے یا گردن کا پسینہ پونچھنے کے بجائے اب وہ سیدھی طرف ہی کو کام میں لانے لگا تھا ـ

اس سے کچھ فاصلے پر اس کی بیوی چلی جا رہی تھی ـ اس کی تمام تر کوشش بچے کو پچکارنے کی طرف لگی ہوئی تھی ـ پھر رحماں تھی ـــــــ اپنے خیالات کی دنیا میں مست، شاید اپنے پڑوسی گوا لے نورے کا خیال اسے اس چلچلاتی دھوپ کی شدت کو محسوس نہ ہونے دیتا تھا ـ اس کی انگلی تھامے فجّا چلا آ رہا تھا ـــــــ جسے کبھی وہ اٹھا لیتی تھی اور کمر، کندھا یا بازو تھک جانے پر پھر اتار دیتی تھی ـــــــ اس کا پھول سا چہرہ کمہلا گیا تھا ـ ہونٹ سوکھ گئے تھے ـ گندے میلے ہاتھوں سے بار بار منہ کا پسینہ پونچھنے کی وجہ سے چہرے پر کئی داغ لگ گئے تھے اور اس کی چال بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی ـ

نہر کے پُل کو پار کر کے مولونے دیکھا ـــــــ دائیں طرف ایک گھنا پیڑ ہے ـ مادہ بڑ کا ـــــــ جس کا تنا بہت اونچا نہیں اٹھتا ـ موٹی موٹی لمبی لمبی شاخیں سر کو چھوتی ہوئی چھتری کی طرح پھیلتی جاتی ہیں ـ اس کی شاخوں پر دو مور بیٹھے ہیں بے فکر اور مست! ان کے لمبے لمبے چمکیلے پنکھ دھرتی کو چھو رہے ہیں اور دور کسی کنوئیں کی گادھی پر بیٹھا ہوا کوئی جاٹ ہیر وارث شاہ الاپ رہا ہے ـ اس کی سُریلی باریک لیکن اونچی آواز اس ویران خاموش دوپہر میں گونجتی ـ لہراتی ہوئی اس تک آ رہی تھی ـ

گھر آ ننان نے گل کیتی، بھابی اِک جوگی نواں آیا نی
کنّیں اوسدے درشنی مُندراں نے گلے سیلا عجب سہایا نی

ماضی کی بھولی بسری منزلوں کو پار کر کے آنے والی یاد کی طرح، نوخیز جوانی کے دن مولو کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے ـ جب وہ اپنے بڑ کی موٹی شاخ پر بیٹھ کر یا کسی آم یا جامن کے درخت سے پیٹھ لگائے ہیر وارث شاہ گایا کرتا تھا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ پورے گلے سے تان لگائے :

پھرے ڈھونڈدا وِچ حویلیاں دے، کوئی اوس نے لال گنوایا نی
ہیرے کِسے رَجونس دا اوہ پُتّر رُوپ تدھ تھیں دُون سوایا نی

لیکن یہ تان اس کے جی ہی میں رہی اپنی لمبی داڑھی اپنے شریف لباس اور اپنے پیچھے چلے آنے والے بچوں کا اسے خیال آ گیا اور اس کے دل سے ایک لمبا سانس نکل گیا ـ

قریب قریب روتے ہوئے سوکھے گلے سے فجّے نے کہا ـــــــ "ابّا مجھے پیاس لگی ہے ـ ابّا مجھے اٹھا لو"

اور مولونے پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــــ "لہراں بے چاری تھک کر پرانہہ کی ایک ٹیڑھی سی جڑ پر بیٹھ گئی تھی ـ

"مر گئی وہاں ہی تو؟" کڑک کر مولونے کہا ـ

لہراں اٹھی اور لنگڑاتی چلنے لگی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے بیٹے کو ڈانٹا کہ ذرا دم لے وہ سامنے تو چوگاواں نظر آ رہا ہے، وہیں تمہیں لسّی پلائیں گے ـ

اور چوگاواں تک تو وہ دونوں کسی نہ کسی طرح چلتے گئے۔ لستی پانی سے زیادہ ان کی تسکین کا باعث یہ خیال تھا کہ ابا وہاں سے ضرور تانگہ لے گا لیکن جب کچھ سستانے اور سوکھی روٹی اور تیل پکوڑوں کو جو ان کے ابا نے اڈے سے لیے تھے پانی کی مدد سے پیٹ میں پہنچانے کے بعد انھیں پھر کوئک مارچ کا حکم ہوا تو وہ چل پڑے لیکن مارچ نہیں کرسکے۔ چوگاواں سے دنی کے تک اس مارچ میں کئی ہالٹنگ اسٹیشن آئے جبکہ وہ ایک بیمار تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح اڑ گئے اور جھڑکیاں گالیاں یا ایک دو بار چانٹے کھا کر پھر چل پڑے۔ لیکن دنی کے موڑ پر جو وہ رکے تو پھر نہیں بڑھے۔ تھپڑ کھانے کے بعد بھی فجا ٹس سے مس نہ ہوا اور گالیاں کھا کر بھی لہراں بیٹھی دوپٹے سے آنسو پونچھتی رہی۔

مولو نے تانگے والے سے بالکل ہی نہ پوچھا ہو، یہ بات تو نہ تھی لیکن بغیر سوار ہونے کے خیال سے اور یہ معلوم کر کے کہ لولوکے سے چوگاواں تک وہ گرد کا سمندر پار کرنے کے باوجود ابھی تک کرائے میں صرف ایک آنے کی تخفیف ہوئی ہے اور آگے سڑک پکی ہے اور کہیں کہیں شیشم کے درخت ہیں۔ وہ چل پڑا تھا۔

تھپڑ کھا کر فجا رونے لگا لیکن اٹھا نہیں تب بیباں نے اسے پیار دے کر اٹھانا چاہا اور ننھے کو رحماں کے حوالے کر کے اسے گود میں لے لیا—— ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ سہم کر پکار اٹھی۔

"دیکھو تم اسے مار رہے ہو، اس کا پنڈا تو بھٹی بنا ہوا ہے۔"

اور تب بخار کے زور سے تپتے ہوئے اپنے لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر مولو پگھل اٹھا اور بادل نخواستہ ایک جاتے ہوئے تانگے کو روکا اور اٹاری کا کرایہ پوچھا۔

"چار چار آنے"

"چار چار آنے! لیکن اتنا تو چوگاواں سے مانگتے تھے۔"

"تم کیا دیتے ہو؟"

"ایک ایک آنہ لے لو۔ تین ساڑھے تین میل ہم چل بھی تو آئے ہیں۔"

"تو وہیں سے جا کر چڑھ جاؤ۔" اور تانگے والے نے ہنٹر گھمایا اور "او تیری ماں مرجائے"، کہتے ہوئے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر جما دیا۔

"چھ چھ پیسے لے لو——" مولو بولا۔

لیکن گھوڑا چل پڑا۔

"دو آنے"

"اڑھائی آنے۔" اس نے حلق کی پوری آواز سے کہا۔

تانگہ کافی دور جا کر رک گیا۔ سواریاں تو پوری تھیں لیکن جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق تانگے والے نے دس بارہ آنے چھوڑنے مناسب نہ سمجھے۔

اگرچہ جہاں دو کی جگہ تھی وہاں چار بیٹھے اور سانس تک لینا مشکل ہو گیا لیکن پھر بھی یہ کہنا بے جا نہیں کہ سب نے تانگے میں بیٹھ کر شکر کا سانس لیا۔

جب پلک جھپکتے ہی (کم سے کم مولو کو ایسا ہی معلوم ہوا) اٹاری کا موڑ آگیا اور تانگے والے نے کہا کہ اگر جلدی لاہور کی لاری پکڑنا چاہتے ہو تو یہیں اتر جاؤ تو مولو کے دل کو دھکا لگا۔

"اڈہ آگیا؟" اس نے پوچھا۔

"اڈہ تو آگے ہے، لیکن یہاں اتر جاؤ گے تو جلدی موٹر مل جائے گی۔ وہیں اڈے پر بہت دیر تک بیٹھنا پڑے گا وہاں اور روگ بھی ہوتے ہیں اور آج کل پولیس بھی بڑی سخت ہو گئی ہے۔"

" یہ ٹریفک پولیس کیا بلا ہے" یہ بات مولو کی سمجھ میں نہیں آئی ـــــ بھویں تریر کر تانگے والے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا ـــــ" یہ سب چالاکیاں ہیں سمجھتا ہوں۔"

لیکن جب تانگے میں بیٹھی ہوئی دوسری سواریاں بھی وہیں اُتر پڑیں اور دوسروں نے بھی کہا کہ اگر لاری جلدی پکڑنی ہو تو یہیں اتر جاؤ تو وہ بھی اتر پڑا لیکن گرج کر بولا ـــــ" بس یہیں تک لانے کے تم بارہ آنے مانگتے ہو۔"

تانگے والے نے کہا ـــــ" تمہاری مرضی ہے، تم اڈے تک چلے چلو۔"

مولو کا جی چاہ رہا تھا کہ اس پاجی تانگے والے کو اتار کر سڑک پر پٹک دے۔ اُس نے چیخ کر کہا۔

" تم لٹیرے ہو" ـــــ تانگے والے نے ہنٹر اٹھایا۔ ـــــ" زبان سنبھال کر بات کرو یہاں۔"

اس وقت بیباں تانگے سے اُتر کر دونوں کے درمیان آگئی ـــــ" طیش میں نہ آؤ بھائی ہم پیسے مار کر نہ جائیں گے آدمی آدمی تو دیکھ لیا کرو تم!"

مولو کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ یہ سُن کر گالی دینے کی بجائے اس نے وہی کالے سیاہ اڑتالیس پیسے تانگے والے کے ہاتھ پر گن دیے اور بچوں کو اتارنے لگا۔

" بارہ آنے تو اسے دے دیے اب وہاں کس طرح کام چلے گا؟" بیباں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

مولو چیخ کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر اپنے ننھے بچے کی طرف چلی گئی جس کا چہرہ بخار کی شدت سے اور بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر کرتا اٹھا کر پیٹ کی حرارت دیکھی ـــــ" جسم تو اس کا جل رہا ہے۔" اس نے کہا اور پھر ایک آتی ہوئی موٹر سے بچانے کے لیے اپنے بیوی بچوں کو ایک طرف کر کے وہ انھیں سائے میں لے چلا۔

" ارے مولو، تم کدھر؟" حیرت سے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا جو مولو کے گاؤں کا ہی تھا۔ اداس آواز میں مولو نے کہا:
" حسن کے لڑکے کی شادی ہے وہیں جا رہا تھا کہ راستے میں لڑکوں کو بخار نے آدبایا۔"

" کہاں جا رہے ہو وہاں؟"

" وہاں اچھرہ میں ٹھیکے دار ایشور سنگھ رہتا ہے وہیں جانا ہے، نہ ہوگا بھائی تانگہ لے لیں گے۔ تین چار آنے دے دیں گے۔"

" تین چار آنے" وہ ہنسا ـــــ" تم لاہور کبھی گئے نہیں ارے بھائی۔ وہاں ایک روپیہ سے کم تانگہ نہ جائے گا۔"

مولو نے ان نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو شاید کہہ رہی تھیں کہ روپیہ کی مٹھائی حسن کے بچوں کے لیے بھی لینی ہے اور پھر واپس آنے کے لیے بھی پیسے چاہئیں اور بیباں کی نگاہیں شاید کہہ رہی تھیں کہ اس موئے تانگے والے نے یونہی ہمارے بارہ آنے لوٹ لیے۔

" تم کدھر آئے تھے مہر خاں؟" مولو نے پوچھا۔

" بھیلو شاہ کی بوریاں اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔"

" تو اب واپس جا رہے ہو؟"

" چلا ہی جا رہا ہوں، یونہی ذرا دم لینے کو رُک گیا تھا۔"

تب پھر مولو نے بیباں کی طرف اور بیباں نے مولو کی طرف دیکھا اور مولو نے کہا ـــــ" کیا کہوں یار حسو نے بہتیرا کہا تھا کہ بیوی بچوں کے ساتھ آنا لیکن یہاں آتے آتے بچے بیمار ہو گئے ہیں۔ فجا اور چراغ بخار سے تپ رہے ہیں اور لہراں کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کہیں تکلیف بڑھ نہ جائے شادی کا معاملہ ہے۔ کھانے پینے میں پرہیز رہتا نہیں اور پھر وہاں وہ بات تھوڑی ہی ہے، جو اپنے گھر میں ہے۔"

" یہ ڈاکٹر سالے تو اچھے بھلے کو بیمار کر دیتے ہیں۔"

" ارے بابا، ان تک ہماری پہنچ کہاں۔" اور پھر ایک بار اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مولو نے کہا ـــــ" تم ایک مہربانی کرو مہر خاں، ان سب

واپس لے جاؤ مجھے تو جانا ہی ہوگا۔ کل برات چڑھے گی لیکن ان سب کو تم لے جاؤ۔" اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بیوی بچوں کو بیل گاڑی پر چڑھانا شروع کر دیا۔

مہر خاں گاڑی پر آ بیٹھا۔

"راستے میں بھیلووال کے حکیم نرنجن داس سے کچھ دارو لیتی جانا۔" گاڑی کے پیچھے چلتے چلتے مولو نے اپنی بیوی سے کہا۔

اس وقت دور سڑک پر امرت سر کی طرف سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔

مولو نے جلدی جلدی اپنے بچوں کو پیار کیا۔

فجے کی جلتی ہوئی پیشانی کو چوما — "تمہارے لیے ہم بوٹ لائیں گے۔"

لہراں کے سر پر ہاتھ پھیرا — "تمھارے لیے نیا جوتا لائیں گے۔"

رحماں کو ڈانٹا — "بچوں کا خیال رکھنا اور ماں سے لڑنا نہیں۔"

پھر گٹھری اٹھائے بھاگتا ہوا وہ سڑک پر آ کھڑا ہوا اور اس نے آتی ہوئی لاری کو روکنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا یہ اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کا زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے!

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رُکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"....... اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ اور نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دل ربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنّم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"....... اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا پھر ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں ہر وقت بارہ اُبھرن، سولہ سنگار کیے ہر راہ رو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سنان برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشہ میں سرشار سُود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسن زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پُر اسرار لذّتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا...؟"

اسی موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرّس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے شغف رکھتے تھے بول اُٹھے:

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلباء کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رُکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا ——— "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز عزت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دَور دَورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے

ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دُنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایے میں پنپتا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اُٹھے۔ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔بولے:

"صاحبان! رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا، ہو ہو ہو سُن سُن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے......"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز تھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رُکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں، جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے۔گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بُردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔بولے ـــــ "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لیے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اُٹھے ـــــ "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اِس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے ـــــ "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے اس لیے ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منھ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے ـــــ "بلدیہ کو ان کے نجی معاملے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا ـــــ "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ان کی تعداد دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں پر پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات بھی ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور ان کو رہنے کے لیے شہر سے کافی دُور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ان عورتوں نے بلدیہ کے اسی فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے بیشتر

مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پُرانے مکانوں ہی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصہ میں وہ نئے علاقہ میں مکان بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا۔ وہ شہر سے چھ کوس دُور تھا۔ پانچ کوس تک پکّی سڑک جاتی تھی اور اس کے آگے کوس بھر کا کچّا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے اُلّو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یُوں ہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صُورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبُور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہوگئی تھیں ورنہ باقی عورتوں نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اس شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ دیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مال دار تھیں اس شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انھیں اچھے مل گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کو تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اُونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کرلی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے گئے اور چابک دست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چُونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لاد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے۔ مزدور اِدھر اُدھر دوڑتے۔ مزدورنیوں کو چلّا چلّا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہَوا کے جھونکوں کے ساتھ دُور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آوازیں سُنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمّت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہوگئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بستی کی خبر سُن کر آگئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا کر پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے کی صدا لگانے لگا۔ اس شخص نے کیا کیا کہ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آموجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے ۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا ۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ۔ کسی گاؤں کے ایک مُلّا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسائل رکھ کر آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھاتے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا، کباب کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا ۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے، مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھوس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی ۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پُرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا، اِدھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے ۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں ۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں ۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بے کار مباش کچھ کیا کر، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی ۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرد اگرد چکر لگاتے رہتے، فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے ۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا، اب ہر طرح گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی ۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا ۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور سُرخ سُرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اِرد گرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے ۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے لگا اور اسے دھونے لگا ۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے ۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا ــــــــ "جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے ؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا ۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے ۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے "اللہ ہو" کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے ۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے ۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی سڑک تھی اور ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دوکانیں تھیں ۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رُخ وسیع برآمدہ تھا ۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا ۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے ۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی ۔ فرش سبز چمک دار اور پتھر کا بنایا گیا تھا ۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں

جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرکے شامیانے نصب کر دیے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتّوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دُھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دُودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پان دان، پیک دان، پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دُور دُور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رُخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پَر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں سے بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اُتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ فانوس، ظروف، بلوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات، سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصّہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سُننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دُور سے جھل مِل جھل مِل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں۔ آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیاں کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے ہوئے چند روز ہی ہوتے تھے کہ دو کانوں کے کرایہ دار پیدا ہونے شروع ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دوکاندار آیا وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انھیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لیئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال

دو تین قسم کے سگریٹ تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں کنجڑا آ بسے تھے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں، چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پرلے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کر سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بے وقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ جاتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دوکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا۔ اور اپنے ساتھ ایک رنگ ریز کو بھی لیتا آیا۔ اسی کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں نہیں چلتی تھی بلکہ اسے دکان کا کرایہ بھی نکالنا مشکل ہو جاتا تھا، شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دوکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی، مندے کی وجہ سے یا شہر میں بڑھے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دوکان کرائے پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے، ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دوکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ دوکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھونٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دوکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دوکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دوکاندار آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دوکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے مُلّا جی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے مگر اب جب کہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے مُلّا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجے کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رُخ کیا اور بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کرکے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن میں محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے۔ جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے، پانچ پانچ، چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حُسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو"۔ شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کی لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منھ سے سیٹیاں بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پُراسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور مکانوں اور دوکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے کو تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی یہ دن دُونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بے وقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دوکان دار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دوکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی تھی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتّر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلیں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی

میں بھی سینما کھول دیا جائے - یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا - چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا - اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں - ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی سستانے یا سیر کرنے کی غرض سے آ آ کے بیٹھنے لگے - یہ باغیچہ خاصا سیرگاہ بن گیا - رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے - سر کے تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے -

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں - مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانے کے آ رہے - ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی - فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا -

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی - سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا -

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں - یہ بستی اب ایک بھرا ہوا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی ہے - آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے - شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے - چھ سینما ہیں اور چار بینک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کی شاخیں ہیں -

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں - ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے - شہر کے مختلف حصوں میں دو مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری اسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے -

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے حُسن آباد کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی - یعنی بجائے حُسن آباد کے "حَسن آباد" کہلانے لگا مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے - آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سیکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے ——— "آنندی"

یوں تو سارا شہر بھرا پُرا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں -

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے - ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں - بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے -

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں ——— "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیم اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی"

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا -

جگّا

بلونت سنگھ

ماجھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا مشکل سے سو گھر ہوں گے - زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی - یہاں کی ایک بات تھی وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پُر رومان ہوتی کہ سسّی پنوں، سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھے کے قصّے بھی مات ہو جاتے تھے ——— اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا -

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچادی تھی - وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصوّر ذہن میں نہ آتا تھا لیکن وہ معصوم تھی - شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پُرشباب دوشیزہ کی پُرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پُرسکون سمے میں کہیں دُور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے - ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی - وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا - اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گورنام اس سے محبت کرتی ہے ——— ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گورنام کو بھگا لے جائے گا - اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گورنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے - اس نے سُن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے - اس پر شنگارا نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلادیا[1] - اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا - اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا ——— "تو نے بکرا کیوں بلایا ہے ؟"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا - دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں - قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں - مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا ——— آخر کہاں تک ؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا - دلیپ کا ٹخنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا - جان تو اس کی بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی - اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گورنام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا -

رات بھیگ چکی تھی - چاند جوبن پر تھا - گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی - کبھی کبھی کتّوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے قریب ایک جنگلی بلّا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا -

---

[1] کسی کی تضحیک کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا -

یہ رہٹ اروڑیوں[1] کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے، جی چاہتا ٹھہر جاتے۔ اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا، اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اُونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں ابھری ہوئیں، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسا دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا، گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمک دار چھوی[2]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنی کلائی کے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا کر پانی کی چھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے سرے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا چھال کے نیچے کیا۔ اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اَولو[3] سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اروڑی پر جہاں ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے ہوئے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آرہے ہوں —— لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا مگر اس کی ڈراونی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا —— "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروّتی کے ساتھ مخاطب کیا تھا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے۔ جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا —— "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا —— "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا —— "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ بولی —— "گورنام۔"

---

[1] کوڑے کا ڈھیر [2] ایک تیز خمدار ہتھیار جو لاٹھی کے سرے پر چڑھا ہوتا ہے۔ [3] جہاں پانی گرتا ہے۔

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں۔ اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا ——"کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا ——"لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمک دار آنکھوں کی طرف دیکھا ——"تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے۔ اس کے قہقہے کی آواز سُن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گورنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[1] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دُور سے نظر آتی تھی۔

دروازے کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گورنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا ——"واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!"

"واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا ——"میں دُور سے آرہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا ——"میں ہر طرح سے خدمت کے ......"

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پُورا کر سکے، اجنبی سانڈنی کو لڑکے کے سپرد کر کے دروازے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کُل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہیں ہیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے۔ سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچّہ سینے سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے مُوت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا ایک طرف کھُرلی[2] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھُس اور کھلی کی سانی کی بُو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسّی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس[3] دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، یہ بڑے بڑے اُپلے، کونے میں کپاس کی چھپڑیاں، چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرے میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے سے پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے لیے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو، اجنبی کو دروازے سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔ تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچّی دیوار اٹھا دی گئی تھی

---

[1] نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ۔

[2] ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔

[3] بیلوں کے ذریعے چلنے والی چکّی۔

سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے ۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی ۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک تکیہ اس پر رکھ دیا گیا ۔

گورنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی ۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے ڈھلک گئی ۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے ۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا ۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں[1] کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گورنام اجنبی کو دے آئی ۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور و شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گورنام کو معلوم ہوگیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے ۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اُتار رہا ہے ۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا ۔ گورنام ٹھٹھک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا ۔

"گورنام! بس جا رہی ہو کیا ؟"

گورنام حسب معمول اپنے طفلانہ انداز میں مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی ——— "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی ۔"

اجنبی دُور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ شرینہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے ۔ لنڈمنڈ بیریوں پر بَیئوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے ۔ ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی ———

باگے وچ کیلا ای
نکل کے مِل بالو !
ساڈا او تجھنے دا ویلا ای
نکل کے مِل بالو !

اتنے میں گورنام دبے پاؤں شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی ۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کے باتیں ہونے لگیں ۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے ۔ قریب تھا کہ گورنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا ۔

گورنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا ۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی :

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لاتے ہو ——— ؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو ؟ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے ۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں ۔" یہ کہہ کر گورنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی ۔ جیسے کوئی سچ مچ

---

[1] بیر کی مانند ایک پھل ۔

کا قاتل اس کا گلا دبانے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو، یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ!"

گورنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی ——— "تم کتنے اچھے ہو ——— یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

گورنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا ——— "تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھُردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری بیوی کون بنے گی، بنے گی بھی یا نہیں؟"

گورنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا ——— "ہاں تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینے میں جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔

مگر گورنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گورنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا ——— "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا ——— "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گورنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھُل گئیں۔ تالی بجا کر بولی ——— "میں ان کو اپلوں میں چھپا دُوں گی ——— کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا ——— "گورنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گورنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ——— "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گورنام چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گورنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا ——— "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے؟"

اجنبی نے اپنے کالے کالے، میلے کچیلے، لمبے چوڑے ہاتھوں میں گورنام کا کنول سا ہاتھ تھام لیا۔ گورنام نظریں جھکائے بچّوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصّہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گورنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی ——— "اماں کھانس رہی ہے ——— اب مَیں جاتی ہُوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔
گورنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پُوچھا ——— "جاؤں کیا؟"
اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس گئے۔
اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گورنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھناسی[1] کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گورنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا ——— "روتی کیوں ہو؟"
"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"
اجنبی ہنس پڑا ——— "مَیں پھر آؤں گا۔"
باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔
باپو اجنبی کو رُخصت کرنے کے لیے کچھ دُور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا ——— "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"
"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز میں دیکھتے ہوئے مزید کہا ——— "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"
بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔
اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا ——— "آج رات جگّا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"
جگّا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمینوں کا مالک تھا۔ بڑے بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کرتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبّت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا۔ اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصّہ قیامت، دہن شعلہ ——— وہ قہر تھا۔ لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لیے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

پکّے پل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکّے پُل تے
پکّے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں، تے چھویاں دے کِل ٹُٹ گئے ...... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا، اس کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

جگّے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگّے ماریا
جگّے ماریا لائل پور ڈاکہ، تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کے طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا اور وہ تارا تھی ——— گورنام۔
گورنام بے چاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی۔ اس کے جذبۂ پندار

[1] بڑا کٹورا

حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے، اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہ زور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گورنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے۔ اس نے کبھی بھی اس سے محبّت جتلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے۔ وہ سوچتا تھا کہ نہ معلوم اس کے اظہارِ محبت کرنے پر گورنام کیا رویّہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گورنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ وہ نہایت مہر و محبّت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی۔ اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گورنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کو سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ جگا صبح و شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو سے منت کی کہ گورنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے، اور جو کچھ اس نے لُوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گورنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چوّدہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اوّل تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیت کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دُنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گورنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروالے۔ خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروبِ آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گورنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سُوت دینے کے لیے گئی ہے۔

جگے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظر بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر اُلٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود ڈاڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بَل دیتا ہوا

گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔
ہر طرف دھندسی چھائی ہوئی تھی، چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔
دور سے ایک صورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گورنام۔ جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔
گورنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھری تھی ——— "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"
"اس گٹھری میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے من بھر کا بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔
"اپلے ——— اور کیا ہونا؟" گورنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا ——— "آرہی تھی، رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ اسی میں شام ہو گئی۔ دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
آج جگے نے گورنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے، کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتاتے۔ آخرکار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گورنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی ——— "گورنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا ——— "گورنام! تم کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"
گورنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الہڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔
جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا ——— "کیوں گورنام! کس سوچ میں ہو؟"
گورنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا ——— "میں بہت پریشان ہوں ——— میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن . . . ."
"لیکن کیا؟"
"شرم آتی تھی۔" گورنام نے جھینپ کر جواب دیا۔ جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر مونچھ مسکرایا ——— "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"
گورنام چپ رہی۔
جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گورنام نے بتایا ——— "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"
"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"
گورنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ——— "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں ——— جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے . . . ." یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔
جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا ——— "نہیں گورنام نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اس سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا . . . . ہاں تو . . . . مگر وہ ہے کون؟" جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔
گورنام نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینے کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا۔ اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گورنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رُک گئی .... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی ——— "تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بے زار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ...."

جگے کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ .... دلیپ سنگھ"

جگے کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے" گورنام نے دُہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔ اس کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گورنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ" اس نے بھاری آواز میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ" اس نے کرخت لہجے میں گرج کر کہا۔ گورنام چُپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اس طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی سی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی۔ آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی ——— معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ——— "دلیپ سنگھ! ———"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدّے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصّوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو۔ یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پُل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچّے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پُل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دوکان بھی تھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گُل قند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع۔ مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا۔ اس کا چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے، اس واقعے کو وارث شاہ کی ہیر

سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دُور دُور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقت ور اور دلیر نوجوان تھا مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے ذرا بلند آواز میں "چھپئی"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سُن کر اس کو ذرا تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پُل پر سے پار ہو چکا تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ــــــ اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پُل کی دیوار پر سے آ چکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیص میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ــــــ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا اور بولا ــــــ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں ہو جس نے تین سال پہلے چند آدمیوں سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا .... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے .... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار رہا ــــــ اور قتل تو میں نے بہت کیے ہیں۔ اس پُل پر گیارہ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں .... اور آج مجھ کو بارہواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڈپن پر تعجب ہوا۔ بولا ــــــ "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گو رنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے تنگارا سنگھ کو اس پل پر سخت زخمی کیا تھا ــــــ آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا .... "اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا ــــــ "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا ــــــ "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو گدھے کو ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی۔ ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مُکّا اجنبی کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور مُنہ بگڑ گیا .... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا تھا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھار چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ــــــ مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

---

[1] پنجاب کا ایک مشہور گیت۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا ـــــــ "اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"
یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا ـــــــ دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا ـــــــ "تیرے پاس چھوی ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"صفا جنگ؟"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے، وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا!" اجنبی نے پکار کر کہا ـــــــ "لاٹھی لے آ ـــــــ میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھائی اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔
ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہوا کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست و چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا، بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم، قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا ـــــــ "ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا ـــــــ "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا ـــــــ "تین!" ـــــــ یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا ـــــــ "او سنبھل چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر اور آگے کی طرف اچک کر بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینے تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارے پر جا گرا .... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔
جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا، منہ ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی پھاڑ کر باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کر کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعے کے پچیس دن بعد ——

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔
گورنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کام سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف!
اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔
شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔
گورنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی[1] باہر کھڑی ہے اور اُسے جلدی واپس جانا ہے —— چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا —— پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز میں کہنا شروع کیا ——
"مَیں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ گورنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی —— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ مَیں چاہوں گا۔"
سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گورنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لیے وہ خاموش رہے۔
"........ اور وہ شخص یہ ہے" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا —— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔
ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔
گورنام نہ معلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اُٹھ کر اس کے قریب آگئی۔
جگے نے دلیپ کے کان میں کہا —— "اگر گورنام کو مجھ سے محبّت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ مَیں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ مَیں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبّت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گورنام تمہارے سپرد کر رہا ہُوں —— اُمید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے ...."
دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔
جگا بلند آواز میں بولا —— "باپو! —— ماں!! —— بے بے!!! —— مَیں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین بھی دُوں گا۔"
باپو اصل قصّہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ اس کو ڈاکوؤں نے خُونی پُل پر قتل کر دیا تھا۔
دلیپ نے قصّہ گھڑ کر سنا دیا کہ خُونی پُل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا تھا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا تھا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر

---

[1] سانڈنی۔

وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔
جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔
گورنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اُس نے جگّے کا بھدّا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگّے کے بلند سینے اور غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی ——— "تم کتنے اچھے ہو........ تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔"
قریب تھا کہ جگّا چیخیں مار مار کر رو پڑے مگر وہ جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے نکل گیا۔

شادی ہو گئی ———
کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گورنام' باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اُٹھا۔ کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے' ان کی سجی سجائی سانڈنیاں' مردانہ اور دیو پیکر صورتیں' چمکتی ہوئی چھوبیاں ——— عجیب منظر پیش کرتی تھیں۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گورنام اسے دیکھتے ہی چلّا اُٹھی ——— "باپو وہ کون لوگ ہیں؟ ——— یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔"
"نہیں بیٹی' نہیں۔ وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا ——— اور پھر ببول کے درختوں کے جھُنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا ——— "آج جگّا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لیے جا رہا ہے۔"

زرّیں تاج

عزیز احمد

جیپ بہرحال دغا دینے پر تُلی ہوئی تھی - ہر دس دس گز پر رُک جاتی تھی - بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا - یہ خوب صورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت - کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی - اور آج جنگ کا پہلا دن تھا - بھلا جنگ کو اور جیپ کی یہ مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا ــــــ ؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا - ایک چھوٹی سی گلی ڈرینج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی اور کنارے سے موٹر تو کیا، آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا - اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا ــــــ "سرکار، گلی بالکل کھدی ہوئی ہے - پھر کیا حکم ہوتا ہے - گاڑی کو لے چلوں ؟" ــــــ آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی - دور پر کوئی ریل گاڑی کھڑکھڑ کرتی گزر جاتی - لیکن اور ہر طرف سناٹا تھا - دُور دُور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں - مذاق تو نہیں تھا - آج جنگ کا پہلا دن تھا - سب جگہ بلیک آؤٹ تھی - لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا - اور سوئی ہوئی زمین پر انسان سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے - یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں - جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی -

اتنے میں اوپر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی - ارشد نے اپنے دل میں کہا ــــــ امجد بھائی نے آج دعوت کے لیے کیا اچھا دن چُنا تھا ...... چاندنی میں سڑک کے حسین درخت جیپ کو چُھپا نہیں سکتے تھے اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کیڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آگیا تو ...... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی - اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چُھپ جانے کے لیے کہا - وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا - اب دور پر ...... چشم زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا، اور پھر سڑک کے بالکل قریب تقریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گزر گیا - اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کے لیے رُک گئی - جسم نے تھرتھری سی لی - جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا - ایک سُرخ سا گولا زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا، سُرخ شعلہ - "سرخ پیاز" اس نے اپنے دل میں کہا - ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا - اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت ممانعت تھی - اب ہوائی جہاز بہت دور جا چکا تھا - شہر کی طرف - اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا - کوئی جواب نہیں آیا - الٹے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا - شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھرتھر کانپ رہا تھا - اس نے پھر انجن کا رُخ کیا اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمّت پر ارشد کو تعجب ہوا ــــــ "میں پیدل چلتا ہوں، تم گاڑی کو یہیں

چھوڑ دو ـــــ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار، میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف واپس جا رہا تھا۔ بہت دور پر ـ اور اب بہت اوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا، پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے کھسیڑ کر سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح امڈے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح، عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل رُبا اور خوں ریز معشوقوں کے رُخ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرح سُرخ سُرخ ـــــ اور اسے جنگ پھر یاد آ گئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی گزرا تھا ـــــ دور پر ایک موٹر گزری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور بے وقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گزری وہاں چورا ہا ضرور ہو گا۔ چورا ہا ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سُرخ ہونٹوں کی طرح خوں ریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سیکڑوں میل دُور تھی۔ تیزی سے ہَوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آ سکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہ نمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ ہی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہو گا ـــــ ؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک اور چورا ہے پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز، بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی، ایک آدمی آر پار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی ـــــ "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی ـــــ سائیکل سوار فوجی لاری کو جُل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لیے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد ـ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دُور۔ جیسے طلسم ہوش ربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ـــــ حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی، سانپوں کی اور دُور دُور کتّوں کی۔ ابھی بہت دُور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

اور دفعتاً چاندنی اسے بڑی ہی دل کش معلوم ہوئی۔ خواب کی طرح، عشقِ حقیقی کی طرح، ذرا ذرا سے سلجھے ہوئے جنون کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتے کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے، جیسے وقت کی طنابیں گر گئی ہیں ـ جیسے وہ ماضی یا مستقبل میں چل رہا ہے۔ اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے ....

اور اگر کہیں یہ سچ ہو ـ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گزرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ بیپ، شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں، فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے کہ اس زندگی اور اس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اس کی یاد، اعلیٰ کا سلسلہ ہے ......

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطبِ جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی ـ ٹی ـ ایس ـ ایلیٹ والا ـــــ یہ تیسرا کون ہے ؟" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم، عدم سے وجود کی طرف ـ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں۔

یہ قدموں کی چاپ، یہ جوتوں کی چاپ ـ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے ـ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، پیدل ـ کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور

بے چارہ شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش اور حسین اور یہ سڑک، یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے، یہ کالی کالی زلفیں ....

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی، وہ دوسرا ساتھی، چاندنی رات میں یہ ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر، اس کی ہم سفر .... اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں زرّیں تاج ہوں۔"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی، تفریح کی تھی، کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے "دوئی" فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے۔ اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں، کانٹوں کی جھاڑیاں، دیوہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر عذر واماندگی اے حسرتِ دل .... اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سَو سال کے قریب ہونے کو آتے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باپ کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دُنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زرّیں تاج کو مخاطب کرکے کہا ——— "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں، مجھے سب سے زیادہ تم سے محبّت ہوئی ہے۔ اگر کبھی ماضی حال کی طرف جا سکا یا میری رُوح تمہاری رُوح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دورانِ محض میں، مرورِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا۔ اور تم سے اپنی اس محبّت کا اظہار کروں گا جو عشق سے، ہوس سے، خواہش سے، ادراک سے جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لٹی ہوئی، حسین ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پُل صراط پر، زندگی سے موت کی طرف ...... صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب اُلٹ دیا تھا۔ یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ خلیجی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بارفروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہوگا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی، کافور کی چمک تھی۔ ایک حسین آسیب الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکۂ کوکاچین کی مہکی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام:

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مر گئی۔ اب میں محبّت ہوں ——— اور زندہ ہوں۔ اور چونکہ زندہ ہوں، بھول گئی۔ اور چونکہ محبّت کرتی ہوں معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلۂ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے، جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا: "تم ملکۂ کوکاچین ہو۔ تم زرّیں تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی ——— "کوکاچین نہیں، وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں زرّیں تاج ہوں۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے، اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عش عش کہتے ہیں۔ پھر محبت کرتے ہیں، جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں، اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گزر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں، اپنی رقیب سمجھ کر۔ اور جب میں مر جاتی ہوں تو سیکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا؟"

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی، چاندنی کانپ گئی۔ سب درختوں اور ان کے

سایوں کو فالج مار گیا — دور، پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی — پھر ایک نیلا ستارہ چمکا — پھرکتے بھونکے، جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا — اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا ——— زرّیں تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی — موت اور حیات کی درمیانی شاہراہوں پر، پل صراط پر، چاندنی کے برزخ میں۔

دور پر ہوائی جہاز نے پھر "سرخ پیاز" پھینکے — زمین سے ٹکرا کر پھر سُرخ شعلے اٹھے — پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا۔

اور وہ چاندنی سے زیادہ خوب صورت تھی، چاندنی سے زیادہ حسین، ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل، اس کے لب لعلیں چاندنی رات میں چمک رہے تھے — سیکڑوں میل دور ٹینکوں سے بچ بچ کا خون بہہ رہا ہوگا — اور سچ مچ پناہ گزیں غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزّت ——— زمانۂ امن کا تصوّر ——— بچانے کے لیے کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی — مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی — پل صراط کے اس پار تک، جس پر سے گزرتے ہوئے زرّیں تاج نے پوچھا ——— "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا — اب پھر رات کے پرانے "محرمِ راز کتے"، سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے — اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زرّیں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی — اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زرّیں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا ——— "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی — کاش آنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی — چاندنی رات میں اور وہ مسکرائی — چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے — اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا — گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا — اسے نہیں دیکھا — مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زرّیں تاج کا کالا، طلسمی حوروں کا لباس چاندنی رات میں یک لخت چمکا — جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ——— اور اس نے اپنا قصّہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سیرا ہے — کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی — لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے — مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا — کسی نے مہین بانو کی — لیکن میں ایرانیت میں اس طرح کھو گئی کہ نہ مجھے، اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا — مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا فسانۂ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا — اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا — یہ اس زمانے کا دستور تھا — تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے — میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی — مگر اپنی سیاہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے — اس لیے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں — مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے، راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے اور مکالماتِ عشق میں ماہر ہوں، اور اپنی سہیلیوں میں اسی طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند — خسرو، جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے — مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے — اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں، اپنے تیز مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار — میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں — جنہیں مہین بانو نے میری دل جوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لیے مقرر کیا ہے — شیرویہ آتا ہے — دل کا چالاک وزیر، خسرو کا

چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے ۔ میں مبہوت رہ جاتی ہوں ۔ سہیلیاں کہتی ہیں ــــــــ "شیریں ۔ شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے ۔ یہ طلسمات کا جنگل ہے ۔" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی ۔ اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسملوں، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے ۔ پھر پتھر پہ ایک تصویر بناتا ہے ۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں ۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں ۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے ۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں ۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور سوفار، ابروؤں کی اور کمانیں ۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے ۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا ۔ مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دینا ہے ۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

مجھے اس شہر یار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے ۔ جس کی یہ تصویر تھی ۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں مُجل نہیں دے سکتیں ۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے ۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کر نکل پڑتی ہوں ۔ میں شہسوار ہوں ۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی ۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے ۔ چشمۂ آبِ حیواں، چشمۂ نرگس، چشمۂ آبِ حیات، چشمۂ تسلسلِ حیات ۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اُتر پڑتی ہوں ۔ میں کپڑے اتارتی ہوں ۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں ۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا رنگ ہے، اور یہ زلف حبل المتین بھی ہے ۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق و لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور پھر نازِ پستاں، موئے کمر، ساق سیمیں میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت ۔ یہ کیا غضب ہے کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے ۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آنکلتا ہے ۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے ۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جاں سوز عریانی دیکھتا ہے ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے، میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے باد پا پر ہوا پر سوار ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ....

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے ۔ اس کی دال نہیں گلتی ۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے ۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا نہیں ہوا کبھی فنا نہیں ہوا، عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہو گا عرفان ہے ۔ اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں ۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے ۔ اسی لیے "جفا" کی ضرورت ہے ۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی ۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے ۔ خسرو مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے ۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی ۔ شیرویہ آتا ہے ۔ اور ناکام واپس جاتا ہے ۔ اب مہین بانو مر چکی ہے ۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں ۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہر یار ہے، میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں ۔ زاری، زر، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی ۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے ۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے ؟ یہ عورت کا جسم ہے اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں ۔ ایرانی عورت کی ۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے ۔ میں یا ملکۂ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بجھا دی جاتی ہوں ۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے ۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی ۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بد ہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے ۔ جسم جسم سب برابر ہیں ۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے ۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے ۔ وہی سراپا والی بات ۔ اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے ۔ لیکن میں جو شیریں ہوں ۔ عجمی نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور

ہوں۔ بہت دُور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ اور زاری زر، زور کسی کی بھی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرۂ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ عجمیت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دربار کی ملی ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دار السلطنت، میرے قلعے کی اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے، منت و زاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجّت کرتا ہے اور میں اس کی ہر حجّت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں۔ اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے، حواسِ خمسہ سے، شخصیتوں کی بجلی سے۔ اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کے لیے اپنی وارداتِ دل باربد کی زبانی سنواتا ہے۔ میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں جس میں اس کا امڈتا ہوا لشکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زمہریر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا، پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے اُنتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی حالانکہ اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ کنجی گئی اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا ———— اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینئر نہ کرنا۔ اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا۔ وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدک کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا اپنے آپ میں اتنی جرأت نہ پیدا کر سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ شیر کے ساتھ ایک روباہ ہوا کرتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اُسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا، خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آسکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سیکڑوں عورتیں تھیں اور سیکڑوں عورتیں آسکتی تھیں۔ اس قسم کے لین دین کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد، وہ "گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب"، اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لیے میری دوشیزگی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی جو وہ بار بار ان نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا۔ وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا۔ اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شہریار، شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا، شطرنج کے موجد کے نانا جان کو، اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی ———— اور اس کم ہمت مزدور، کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے، بے ستون کو کھودا تھا، مجھے پالیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور، اپنی بے کسی کی رسوم و قیود کا کتنا پابند تھا۔ مرجانے کے لیے اسے اسی تیشے کی ضرورت ہوتی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مر سکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزا ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح تہلاب کا جام تلچھٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ رومیو کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زرّیں تاج یعنی شیریں یعنی عجمی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت الٹ سکتا تھا مگر افسوس اس کا تیشہ درفشِ کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دل دوز چیخ پھر ہوا میں ذرا دیر کے لیے گونج کے خاموش ہوگئی۔

اور پھر زرّیں تاج نے کہا ——

میرا نام مہرالنسا تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ارلیشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ میں ہندوستان آگئی۔ مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ بچپن میں باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھما کے کسی کام سے گیا۔ ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آکے مجھ سے ناراض ہو کر پوچھا، کیسے اڑ گیا؟ تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا: "ایسے اڑ گیا" کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی۔ اور وہ مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انارکلی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اور اس سے پہلے ....

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری ایرانیت ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لیے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی زرّیں تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد، بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے شیر افگن کا خطاب دیا گیا۔ اور اپنے شوہر کی آغوش میں میں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا، جری تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوتی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوتی۔ نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور اپنا انتقام لیتے ہیں مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہیں لگ سکتا تھا۔ اس لیے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ روباہی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی مگر شہنشاہ کو تو بھولے پن سے مہرالنساء کا دوسرے کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا۔ اس لیے جوں جوں انکار بڑھتا گیا۔ میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے ایک عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے، اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے۔ اور کبھی

ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے ۔اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں تو تمہارے اس براعظم میں آج کل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں ۔کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی حاوی ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا ۔ اور میں کئی میں سے ایک ۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا ۔ ایسی محلّات کئی تھیں ۔

محبّت، یعنی اس قسم کی محبّت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی ۔ اب میرے دل میں مر چکی تھی ۔ بالکل مٹ چکی تھی ۔ اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبّت تھی ۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ ۔ گھوڑے کی محبّت اپنے آقا کے ساتھ ۔ اور اس طنزیہ محبّت میں میں نے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزارہا شیر افگنوں اور ابو الفضلوں کے قتل کی تلافی مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر کھلونے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیر عدل کا خوش نما نام دیا تھا ۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی ۔ میں نے بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا ۔ میں نے اس بات کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے ۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں ۔ عرق گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کیے ۔ خوشبوؤں، پیشوازوں، زیوروں میں نئی نئی ایجادیں کیں ۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے ۔ انہیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا ۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا ۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا ۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں ۔ میں نے شہنشاہ سے کہا، اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں ۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے ۔ اگر تو انہیں قتل کرا دے تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفریں بھیجتی رہے گی ۔ اور ان کو شہید تصوّر کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی ۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ، تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسّر ہے ۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے ۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے ؟

لیکن ایک پیالے کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کے اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے ۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابو الفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا تھا ۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا ۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آتے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں اور جو سر خدا کے آگے جھکتا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے ۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے ۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا ۔ اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لیے جال تیار کیا ۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فوّاروں کے نیچے چراغاں تھا ۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی ۔ کھلی ہوئی فضا میں آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی ۔ تھوڑی ہی دُور پر پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے ۔ جو چنار جہاں پناہ نے نصب کیے تھے ابھی چھوٹے چھوٹے تھے ۔ لیکن بیدِ مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے ۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پر لوٹ رہا تھا ۔ اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا ۔

اور اس ناہنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہہ دیتا ہے ۔ لیکن ادب سے شاہِ شطرنج کو پیٹتا تھا شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی ۔ میں نے بھی اس ناہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے ۔ سارا ہندوستان انہیں بچانا چاہتا تھا اور انہیں بچا سکتا تھا ۔ اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا ۔ اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پر ہاتھ اٹھا سکے ۔ میں اب وہ مہر النسا نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیے تھے ۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بالآخر

بادشاہ کو بچالیا تھا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لیے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر ہندستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا اور ہڈی پسلی چور چور ہوگئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہوگئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام پھر لیا۔ مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا۔ علاج کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا، شیر افگن کو شکار کرادیا۔ جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھنچوادیں۔ جس نے مردوں کو دیوار میں چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعہ سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی۔ اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹوں کے ہاتھ آئی۔ مہرالنسا تو کبھی کی مرچکی تھی۔ اب نور جہاں بیوہ ہوکر جیتے جی مرگئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی۔ جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آگیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زرّیں تاج خاموش ہوگئی۔

پھر زرّیں تاج نے کہا ——————

میرا نام زرّیں تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رفاقت سلب ہوگئی۔ اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الٰہیات، میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہترین مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملّا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابنِ عم سے عشق مشہور ہے، مجھے اپنے ابنِ عم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملّا محمد کو بھی علم و فضل کا بہت دعویٰ تھا، مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سُنے تو اُسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا۔ اور میں جواں سال تھی۔ لیکن میں اس کے جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بغیر دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی۔ اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوشِ بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھہر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھُلم کھُلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتابِ بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی پتلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آجاتے انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنالیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منوّر کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغِ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر اُبھری تھی۔ ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہوگئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کے لیے دل سے چاہتی۔ وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی ذاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لیے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور

موجود تھا - اور اس کی موجودگی سے، اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی - انھوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہا - میں نے کسی کی ایک نہ سنی - اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں - باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے - میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے - اور اس لیے وہ خبیث اور مردود ہو گیا ہے - طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے - پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لیے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے - انہیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں مَیں باب سے دُور تھی - میری آنکھیں کبھی کبھی روبرو اس کے جمال کے مشاہدہ نہ کر سکیں - میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سناتے اور جب میری روح اس مردِ کامل کے لیے تڑپ رہی تھی - عقلِ نسوانی، مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی - میں نے اپنے ذہن پر فکر سخن کے دروازے کھلتے دیکھے - وہ مجھ سے دُور تھا اور میری روح اس کے لیے بے تاب تھی - وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اُسے حالِ دل سناتی۔

گر بہ تو اُفتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

تمہارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا - غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا - لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا - معشوق حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لیے ہوئے تھی

دور دہانِ تنگِ تو، عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لیے عجیب وغریب جذب واحساس کا زمانہ تھا - یہ عشق کا زمانہ تھا - نشاط وفنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں، کبھی لحہ لحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا - یہی میرا تخلص تھا - اور میں نے آبشار گرتے دیکھے - الفاظ کے آبشار - اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ تھی - میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبّی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا - ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اٹھے تھے - میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتش حیرتی بزنی بقلۂ طور دل
فسکلتہ و دکّتہ مستدکد کا متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہاں سوزِ عشق کی آگ تھی، سیّال آگ جو آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی جس کی تہہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں - میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروشِ لا سننے کی دعوت دی۔

اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا - محمد علی باب - اس کے چہرے کا تقدس، ظہورِ حق کی بشارت دیتا تھا - جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو محنت اور ابتلا سے بچ گیا - لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا قہار اور جبار - کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا - قہار اور جبار ہی نہیں تھا - اس میں رحم و لطفِ شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے از نہ کرد اطاعتش نگرفت حبلِ ولایتش
کندش بعید ز ساحتش دھد ز قھر بباءلا
منم آن ظہور مہیمنی منم آن منیتِ بے منی
منم آن سفینۂ ایمنی ولقد ظہرت وقد علا
شہد اے طلعت ناز من بدوید سوے دیارِ من
سرو جان کنید نثار من کہ منم شہنشہ کربلا

اور باشوکت، باعظمت، گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا ۔ عرش سے فرش تک ۔ جلال سے جمال تک ۔ اس کی ہمہ گیر ہستی سے میرے حسّاس ذہن تک ۔

طیر العماء تکفکفت، ورق البہاء تصفصفت
دیک الیضاء ورفت متجملاً متجللا

اس سیلاب اس آبشار میں میرا شوہر ملّا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا ۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی ۔ جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی ۔ تقریروں میں جوش اور سرور کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب الٹ دیتی اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوتے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے ۔ یہ وہی زلیخا اور زنانِ مصر والی ترکیب تھی ۔ آخر میں عورت تھی ۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی ۔

بدر النسا کی مصیبت کے مصنف نے اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی ۔ بڑا دن سے صبح ازل نے محض میری مروت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی ۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا ۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیق جمال کی پابندیاں اور موضوعِ جمال کی پابندیاں ۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا ۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی ۔ باغی عورت کے محاذ پر ۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی ۔ نہ نکالے گئے تھے ۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈر ڈر کر لیتے تھے ۔ میری طرح وہ بھی، ایک منصب کا فرباغی تھا ۔ دونوں سے ناصر الدین شاہ قاچار کو للّہی تھی ۔ اور دونوں کا کام بادشاہوں، پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا ۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا ۔ میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی ۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ۔ ممکن ہے کہ اس کا مرد ملّا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو ۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت .... اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جا سکیں ۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی ۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آگئی ۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتویٰ دے دیا کہ وہ میرے شوہر ملّا محمد اور اس کے باپ ملّا تقی کو قتل کر دیں ۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا ۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا ۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رُخ کیا ۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی ۔

راستے میں مجھے محمد علی بارفروشی ملا ۔ محمد علی باب میرے لیے مرد کی روح اور وجدان تھا ۔ محمد علی بارفروشی مرد کا ذہن اور جسم ۔ اور

تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے ۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے ۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زرّیں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی ۔ اپنی داستان سناتی ہوئی ۔ نقاب الٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا ۔ ارشد نے اس سے پوچھا : ” تمہارے اور محمد علی بارفروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا ۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی ؟ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں ۔“

وہ مسکرائی، چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ، جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرّے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں ۔ اور کہنے لگی ——— ” خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط ۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط ۔ اور کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے ۔“

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی ۔ خلوت کی ملاقاتیں ۔ باب میرے لیے محض روح تھا ۔ ملا محمد محض جسم، محض ہوس ۔ محمد علی بارفروشی ان دونوں کے درمیان تھا، ذی روح جسم، جسم کے اندر جان ۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی ۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے ۔ قرار دے لے ۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو ۔ جس سے مل کر میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں ۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی ۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی ۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی ۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی ۔ شیریں کی طرح، نور جہاں کی طرح ۔ لوگوں نے مجھ اسیرِ زنداں کو طہران کی گلیوں میں دیکھا ۔ ہارون الرشید کی طرح ۔ میری شہرت سن کے ناصرالدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا ۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کبوتر بھی نور جہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا ۔ لیکن میں جو کبھی نور جہاں تھی ۔ نور جہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی ۔ میرا شیر افگن محمد علی بارفروشی مجھ سے چھن چکا تھا ۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی ۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا ۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا ۔ ناصرالدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ، اپنی نور جہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی ۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لیے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا :

تو و ملک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش است تو درخوری، دگر ایں بداست مرا سزا

اور ظاہر ہے کہ اس جرأتِ انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی ۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی ۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں ۔ باغ میں گانٹ سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا ۔ یا مجھے کنوئیں میں دھکیل دیا گیا اور کنوئیں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا ۔ یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دُم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دارالقضا لے گئے ۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں ۔

پھر زور سے سائرن بجا اور دفعتہً رُک گیا ۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا ۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دل دوز چیخ سنائی دی اور سکرات کی طرح اُکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی ۔ دو ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لیے دور پر دو سرخ اور سبز نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے ۔ قریب ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی ۔ سڑک پر ۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی ۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔

زرّیں تاج مسکرائی ۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا ۔ اس لیے زندگی نہیں ہوتی ۔ زرّیں تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی ۔ اگرچہ وہ اس سے آگے آگے رہی ۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا ۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی اب گویا ایک کا چیستانی سراپا رہی تھی ۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ ۔ میں نیچی سڑک پر جاؤں گی ۔ دوراہا آچکا تھا ۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی ——— چاندنی میں غائب ہو گئی اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لیے مستقبل ابھی بہت بہت دور تھا ۔

جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمھیں کیا لکھوں، وہ کون سا مضمون ہے جس پر ادیبوں نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ تم نے لکھا ہے کہ تم عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتے، یہ قصہ بہت پُرانا ہو چکا، اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی ان باتوں سے اُکتا گیا ہے، اب جی چاہتا ہے کہ میں اپنے متعلق لکھوں، کچھ اپنی اداسی، اپنے غم، اپنے دُکھ کی نسبت، شاید تم اس اداسی، اس غم، اس افسردگی میں اہلِ دل کی اداس روح کی ایک جھلک دیکھ سکو۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حُسن سے متاثر ہو کر دہلی اور لکھنؤ کا طواف کر کے اور پونا کے ملیریا بخار سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں۔ آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لیے کوئی مقام نہ تھا کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا، راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی۔

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ بمبئی کی ٹراموں اور بسوں اور ریلوں کو سراہا ہے۔ لیکن میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا، مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو دل کو سکون مل جاتا ہے۔ یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر اور اس پر کالے کالے جھکے ہوئے بادل، جیسے کسی دوشیزہ کے سیاہ بال — اور دور، بہت دور ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں، اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، ناریل کے درخت خوب لمبے ہوتے ہیں، سرو اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی اونچے اور لمبے۔ جب ہوا زور سے چلتی ہے تو یہ درخت ہوا میں جھولتے اور لہراتے اور آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں، اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے گزرتی ہے تو ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان کے لانبے لانبے پتّے ہوا میں لہراتے ہیں کسی جوان لڑکی کے آوارہ بالوں کی طرح — چاند کسی شرمائی ہوئی دُلہن کی طرح لانبے درختوں کی اوٹ میں چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاندکی سیمیں کرنیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتی ہیں، ان کو چومتی ہیں، ان سے کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر پیچھے لوٹ جاتی ہیں۔ شور بڑھتا ہے اور پھر مدھم ہو جاتا ہے۔ ریت کے ذرّے ان چمکتی ہوئی کرنوں میں چمک اُٹھتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی، تازہ، پاک اور صاف ہوا ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اُداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں۔ سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس۔ اصل میں ان تینوں [illegible]

زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی بمبئی نہ رہے، شاید دلی بن جائے یا لاہور۔ دہلی ایک معمولی، بے کیف سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتی ہو، وہی پرانی، روزگار کی تلاش۔ پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ اگر اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل ہوتا تو بنگال میں اتنی موتیں نہ ہوتیں۔ یہ ہولناک جنگ بپا نہ ہوتی۔ یہ بھوک، یہ غریبی، یہ پیاس نہ ہوتی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں اور باہر ناریل کے پتوں پر سورج کی کرنیں رقص کر رہی ہیں اور دور گرجے کی صلیب پر ایک کوّا کائیں کائیں کر رہا ہے اور میری بھوک ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں، آخر پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں تم ایسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم دونوں کسی ریستوران میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے ادھار لیتا ہوں، مگر یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینہ پن ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں، بھوک ہی کمینہ پن سکھاتی ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تیار کرتا ہے۔ فیکٹریاں بناتا ہے اور بال بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے یورپ بھیجتا ہے۔ تو کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ جابر کمزور کو مغلوب کرکے ایک عالیشان سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ حاکم، محکوم کو کچل کر، پیس کر حکومت کرتا ہے۔ کیا یہ رذالت نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لے لیتا ہوں تاکہ اپنی بھوکی انتڑیوں کو بہلا سکوں، تو کیا میں کمینہ ہوگیا؟ چھوڑو میاں۔ تمھارے سماج کی عجیب قدریں ہیں اور میں ہر گام، ہر قدم پر اور ہر منٹ اور ہر سکنڈ ان کھوکھلی قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں، ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار ——

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی پسندیدہ ترین جگہ ہے۔ شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہوکر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کی ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پہ یا ایرانی کے ریستوران میں تم ایکٹروں کو دیکھ سکو گے۔ یہ لوگ ایسے ہی عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جیسے تم یا میں۔ یہاں آکر ایکٹر اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کا جی نہیں چاہتا کیونکہ ہر روز تم انھیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے —— اس کی دل کشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں ہی پرتیما کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی، چھوڑو ان ایکٹرسوں کو، کیوں دردِ سر مول لیتے ہو۔ بیچاری پرتیما اب کافی موٹی ہوگئی ہے۔ کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو —— شاید مہتاب تھیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں یہی ایک ایکٹرس ہے جسے ایکٹرس کا پارٹ دیا جا سکتا ہے۔ باقی تو پھول کر کُپّا ہوگئی ہیں۔ ہندوستان میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کو اپنے جسم کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ ایک بار ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹی ہونے، نہ کمر رہی نہ سینہ، نہ آنکھوں میں شوخی نہ بالوں میں چمک۔ گالوں پر گوشت چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ چہرے کے خطوط غائب ہوگئے۔ کولھے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں ندارد۔ سینہ اتنا بڑھا کہ پیٹ بن کر رہ گیا۔ اب بتاؤ کیا کرو گے ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے میٹرو کے سامنے ایک فلم کا اشتہار دیکھا۔ اشتہار پر مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ صرف ٹانگیں —— اف کیا ٹانگیں تھیں، کتنی سڈول اور گداز —— گداز اور سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں، کتنی خوب صورت، دل کش، توانا اور صحت مند، کتنی پُرفریب، جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ تمام ہندوستان چھان لو، اتنی خوب صورت، متناسب، موزوں ٹانگیں نہیں ملیں گی۔ میاں ان لوگوں سے پوچھو خوب صورتی کس چیز کا نام ہے۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوب صورت ٹانگیں کس طرح تیار ہوتی ہیں۔ سڈول بازو، ابھری ہوئی چھاتیاں، صحت مند جسم کس طرح بنتا ہے، اور پھر یہ تو بس، جو عورت کی خوب صورتی کی روح ہوتی ہے کہاں سے آتی ہے۔ کس طرح بنتی ہے۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے، ہندوستان مفلس ہے، غریب ہے۔ لیکن یہ ایکٹریس تو غریب نہیں۔ یہ تو ہزاروں روپے ماہوار کماتی ہیں لیکن خوبصورتی کا احساس کس کو ہے۔ یہاں تو عورت کو گٹھری بننے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر عورت گٹھری بن گئی تو سمجھو حسن کا مجسمہ تیار ہوگیا۔ یہاں تو خوبصورت

جسم پر غلاف چڑھائے جاتے ہیں، مبادا ان ٹانگوں میں زندگی آجائے اور یہ ٹیڑھی سیدھی ٹانگیں چلنے پھرنے لگیں۔ مرنے اور جینے کے انداز ان مغربی لوگوں سے سیکھو میاں۔ ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ بہت پیچھے ——

ارے کر رہا تھا بات پرتیما کی کہ ذکر آ گیا براڈوے گرلز کی ٹانگوں کا۔ اگر اتنے ہی بے بس اور مجبور ہو رہے ہو تو چند دنوں کے لیے بمبئی آجاؤ، تمھارا ہندوستان کی تمام مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ شہرت کے اس قدر بھوکے ہیں جتنے تم انھیں دیکھنے کے لیے ترستے ہو، آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں —— میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کر رہا تھا ذکر اپنا، درمیان میں بیچاری ایکٹرس آگئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمھیں کیا بتاؤں میں کہاں رہتا ہوں۔ پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ وہاں سے کیوں چلا آیا۔ لو اس کی وجہ بھی سنو۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے، جتنا کہ دشمن —— میرا دوست جس کا نام تم R رکھ سکتے ہو ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھو تو جی پھڑک اُٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین ہے۔ وہ دن رات ورزش کرتا تھا۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ دراصل اس کا سپنا اب حقیقت بن چکا ہے۔ بے چارے میں صرف ایک خامی تھی، یہ کہ وہ عورت کو دیکھ کر گھبرا جاتا تھا اسی لیے وہ عورتوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ہے جوان عورتوں کی طرف۔ اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ کرتا تو وہ اس بات کو بُرا سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نقطۂ نظر درست ہے۔ آخر۔ یوں ہی اپنے دل و دماغ کو پراگندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڑ پیلے جائیں۔ من من دو دو من کے پتھر ہر روز اٹھائے جائیں اور جب انسان پتھر اُٹھا اُٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی ان گنت لہروں کو گنتا رہے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں، پانی ہی پانی —— دور نظروں سے دور جہاں سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور پھر گہرے نیلے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر طرف سُرخی ہی سُرخی پھیل جاتی ہے۔ آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل شفق کی سُرخی سے چمک اٹھتے ہیں اور ٹھنڈی تازہ تازہ ہوا بالوں کو چومتی آگے بڑھ جاتی ہے، ناریل کے درخت پیار بھری نظروں سے جھانکتے ہیں اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ اس نظارے کو چھوڑ کر کسی عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے۔ سراسر حماقت۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے کہ یہ کتنا متناسب، حسین تراشا ہوا یونانی بُت ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ ہے۔ اس کے رخسار پکے ہوئے سیب کی طرح سُرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو ایک عجیب صحت مند خوشبو اس کے جسم سے نکلتی ہے جو صرف خالص گھی کھانے سے، دودھ پینے سے یا سُرخ ٹماٹر کے استعمال سے یا عورت کی طرف نہ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ عورتیں اکثر میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں۔ نگاہوں میں آرزو ہوتی ہے جسم کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے۔ بس یہ دیکھنے کے لیے کہ اس بُت میں کیا ہے، اس کے بازو اس قدر سڈول کیوں ہیں اس کی چال میں کیوں ایک زندگی ہے، اس کی نگاہوں میں کیوں ایک چمک ہے۔ لیکن میرا دوست عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اکثر میں اسے لکچر دیا کرتا ہوں کہ بھئی عورت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخر عورت بنی کس لیے ہے، عورت سے اس قدر دور رہنے سے کیا فائدہ۔ آخر زندگی میں ہر شخص کا نصب العین ایک خوب صورت جسم بنانا تو نہیں ہے۔ میری طرف دیکھو، میں چاہتا ہوں کہ میری صحت اچھی رہے اور میں تندرست رہنے کے لیے تھوڑی، بہت ورزش بھی کر لیتا ہوں۔ لیکن میں پہلوان بننا نہیں چاہتا۔ میں زندگی میں ورزش کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں اس لڑکی کو، جو اکثر بالکونی کے دروازے میں کھڑی رہتی ہے نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم نے نہیں دیکھا اسے، دیکھا ہوگا اور ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے کہ تم چاند کی سیمیں روشنی سے متاثر ہو کر باغ میں چلے

جاتے ہو اور ہری ہری گھاس پر ایک سفید چادر بچھا کر لیٹ جاتے ہو اور اپنے جسم کو چاند کی ٹھنڈی کرنوں کے حوالے کر دیتے ہو۔ اور دیر تک ان سیمیں برفیلی کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ بھلا یہ کیوں، تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ بھی تو چاند ہی کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی کرنیں پھوٹتی ہیں مگر یہ کرنیں عجیب سی ہوتی ہیں میٹھی، ہلکی، نرم، گداز — نیند آجاتی ہے۔ ان کرنوں سے مجھے بھی نہانے دو ان کرنوں میں۔ تم نے کبھی چاند کو چھونے کی تمنا کی ہے! ضرور کی ہوگی، چاند اس کائنات میں مسرت کا سرچشمہ ہے۔ میں بھی اپنی کرنوں کے منبع کو چھونا چاہتا ہوں، میں اس لڑکی کو نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، میں اس کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے میری موجودگی کا علم ہوجائے کہ وہ انسان جو ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہے اسے کتنا پسند کرتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ ایک نہایت پاک اور مقدس خواہش ہے۔ آخر اس لمبے بالوں والی لڑکی سے تمھیں کیوں نفرت ہے۔ کیا ہوا اگر اس نے تمھاری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔ کیا ہوا اگر ایک دن وہ تمھارے کمرے میں اچانک آگئی اور اس نے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کرنا چاہا۔ لیکن تم نے اس کی بے عزتی کی۔ اور اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے ایک نیک کام کیا اور اس لڑکی کی عصمت کو بچایا لیکن تم نے اس کی محبت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لیے خشک کر دیا۔ آج کل وہ کیوں اداس رہتی ہے۔ تم نے اس کے گالوں کی زردی کو نہیں دیکھا۔ تم نے اس کی نگاہوں کی تشنگی اور بھوک کا بھی اندازہ نہیں کیا۔ تم ورزش کر کے اور گھی پی کر سو گئے اور وہ بے چاری محبت کی جھلستی ہوئی آگ میں جل بھن کر سوکھتی چلی گئی۔ مجھے ایسی شرافت پسند نہیں، میں جانتا ہوں کہ جب تمھیں عورت کی یاد ستاتی ہے تو تم کیا کرتے ہو۔ اس وقت تم کیوں ٹھنڈے پانی سے بار بار غسل کرتے ہو۔ مگر آخر کب تک؟ اگر دنیا کے تمام انسان ٹھنڈے پانی سے نہانا شروع کردیں تو دنیا اس چیز سے محروم ہوجائے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت ہی زندگی کی محور ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے جان ہے، بے کیف ہے۔

ہاں اس دن کی بات ہے کہ ایک نوجوان لڑکی میرے کمرے میں آگئی۔ میرے دوست نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ اس نے اس بات کو ناپسند کیا۔ وہ یہ بات برداشت نہ کرسکتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے گھر کی طرف رخ کرے۔ میرے دوست نے اس لڑکی کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ رنڈی ہے، ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بے چاری تکتی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نیا نیا دھندہ شروع کیا تھا اور وہ ان لوگوں سے آشنائی کرنا چاہتی تھی جو کم ازکم اسے اچھے لگیں۔ اس سے پہلے وہ ایک لڑکے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف مائل پرواز تھی۔ میرے دوست نے لڑکی کو بے عزت کر کے گھر سے باہر نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں طوائف ہے وہ کیوں اپنا جسم بیچتی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں سے آگاہ نہیں۔ وہ انھیں بالکل نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی لڑکی پر حملہ کرتا ہے جو نہتی ہے۔ جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں ہے۔ جس کے پیشے کا ذمے دار ہمارا سماج ہے، حکومت ہے، موجودہ سامراج ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسے شخص کو کیا سزا ملنی چاہیے۔ طوائفیت کے مسئلے کو حل کرنا، طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہوگا بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں پر دنیا کے دروازے کھولنے سے، عورتوں کو کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے، عورتوں کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے جب تک حکومت یہ کام نہیں کرے گی طوائفیں قائم رہیں گی۔ اور آج کے دن تک وہ واقعہ بھول نہیں سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی، میری بہن کی بے عزتی کی گئی تھی۔ اس دن میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے ظاہر کر دیا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے میں بھی اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے

دوست کی طرف دیکھا تھا اس سے صاف یہی عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ مار کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہوگا جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہ گیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے؟ کیا اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا شوہر ملے جو خوب صورت ہو، نیک ہو، اچھے پیسے کماتا ہو اور اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں نہ ہوں اور بھوک اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو فروخت کرنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور ـــــ؟ وہ اداس شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل ماہم میں رہتا ہوں، سمرسٹ ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے ہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ رخت ہوا میں جھومتے ہیں اور سمندر کی ہوا ناریل کے پتوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ آسمان ابر آلود رہتا ہے اور کبھی کبھی خوب زور سے بارش ہوتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور بھٹکے ہوئے انسان کی طرح ادھر ادھر یکھتا رہتا ہوں۔ لوگ میری طرف دیکھتے ہیں اور ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے، کیا سس کا دماغ ٹھیک ہے۔ اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں جیسے میں ان کے ں کی ویرانی، ان کی بے بسی، ان کی ناچاری سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ مگر میں نے انھیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں نے اکثر ایک خوب صورت لڑکی کو اس کے کمروں میں گھومتے دیکھا ہے۔ سنا گیا ہے کہ یہ لڑکی Extra کا کام کرتی تھی، پھر اس ایکٹر نے یہ لڑکی پسند کر لی۔ اور اب وہ گھر کی چار دیواری میں ر کر دی گئی ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کر لیتے ہیں، اور جب شادی کر لیتے ہیں تو اپنی بیویوں کو ی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہوتی ہے۔ کہاں وہ پہلے ہر مرد سے م کھلا مل سکتی تھیں، لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ یعنی ایک انتہا سے گزر کر دوسری انتہا یچ جاتی ہیں۔ نتیجہ بے بسی، یاس، ایک ڈر، جو ہمیشہ ان کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کے شوہر انھیں کسی غیر مرد سے ں کرتے دیکھ لیں اور ان کا پھر وہی حشر ہو جس سے اکتا کر انھوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے چند ں کے بعد انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنی ہی دہشت ہے، اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی ی ہے جتنی ان کی پہلی زندگی میں تھی۔ کبھی کبھی ایکٹر کی بیوی میری طرف دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی ہے۔ چہرے کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا زور زور سے چلتی ہے۔ ناریل کے پتے ہوا میں تے ہیں، آنکھیں چمکتی ہیں لمحہ بھر کے لیے اور پھر وہی تاریکی چھا جاتی ہے۔

میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمھیں معلوم ے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا سڑا شہر ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سرخ فراک دیکھ لو۔ کسی جوان لڑکی کا ہوگا اور وہ لٹکتا ہوا ل کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساریاں، پاجامے، دھوتیاں، انڈرویر، چادریں جا بجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ت ناریل کا درخت گرا ہوا ہے۔ ذرا بچ کے چلنا کہیں ٹھوکر نہ لگے۔ چند دن ہوئے بہت تیز و تند ہوا چلی تھی اور یہ ناریل کا گر گیا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر تمھیں ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دے گا۔ دراصل یہ مندر نہیں ہے، صرف ایک ٹین کی ہے جس کے نیچے ایک مورتی رکھ دی گئی ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں، بہت کم گردوارے ہیں، بہت کم مسجدیں ہیں

ہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں، شاید ماہم کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ بے چاروں نے اسی ٹین کی چھت کے نیچے مورتی نصب کردی۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں، چندروز ہوئے ناریل کا درخت اسی پتھر پر گرا تھا۔ میرا مطلب اس خدا پر، اس دیوتا پر، درخت بھاری تھا۔ دیوتا کچھ نہ کرسکا بے چارا اور درخت کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ بیسویں صدی کے خدا بھی بے جان ہیں، جامد ہیں، غیر متحرک ہیں۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ نہیں تو اس بات پر ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی کی جائے۔ آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے۔ جب پیٹ بھرا ہوا ہو تو پرماتما یاد نہیں آتا، مذہب بے چارا ——

میرا فلیٹ دوسری منزل پر ہے۔ اس لیے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو اردگرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ میرے فلیٹ کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بے چارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے۔ اگر خوب صورت ہوتی تو میں ضرور اس سے رومان لڑاتا۔ میری جمالیاتی حس کی داد دو کہ میں یوں ہی ہر لڑکی سے محبت نہیں کرسکتا۔ بے چاری نہایت ہی بدصورت عورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی۔ وہ اکثر پھولوں کا ایک گچھا اپنے جوڑے میں باندھتی ہے۔ یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے عشق ہے۔ معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنا ہی وہ پھولوں سے محبت کرتی ہے۔ یہاں تم ہر لڑکی ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے لیکن پھر بھی حسن عنقا ہے۔ حسین عورت بہت مشکل سے دکھائی دیتی ہے اور پھول لگا کر یہاں کی عورتیں اور بدصورت نظر آتی ہیں۔ خوب صورتی میں اضافہ تو ہوتا نہیں بدصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس گجراتن کو پھولوں سے محبت ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر لیٹی رہتی ہے۔ بالکل اوندھی تکیے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے۔ آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کے لبوں کو چوستے ہوئے دیکھا۔ پھر دروازے کی چٹخنی بند کردی گئی۔ کچھ عرصے تک قہقہوں کی آواز آتی رہی۔ جب شام کے وقت گجراتن باہر نکلی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔ جسم میں سے ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی۔ آنکھوں میں خوشی کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہوگئی۔ بوڑھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہوگیا اور اس نے نوکر کو نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے یاس ٹپکتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں اداسی تھی۔ اس کی باتوں میں غمی کی جھلک تھی اور اب وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی سڈول پنڈلیاں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہو گے کہ میں محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں، برا تو نہ مانو گے؟ میں ہر طریقے سے کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ بھی نہ لکھوں۔ لیکن ہر بار جب لکھنے لگتا ہوں تو عورت سامنے آجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید عورت کے بغیر بات پھیکی رہے گی۔ اچھا آؤ، تمھیں عورت کی دنیا سے دور لے چلتا ہوں۔ میں تمھیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں جس جگہ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لیے ہے۔ لیکن آج کل اس فلیٹ میں سات انسان رہتے ہیں۔

ان سے ملو، یہ ہیں مسٹر چٹرجی، یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آئے ہیں۔ وہی تلاش روزگار —— یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انگریز اتنی دور سے چل کر آئے ہیں اور اگر ایک بنگالی نوجوان بمبئی میں اپنی قسمت آزمانے آیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ اور جب کبھی وہ سیاہ سوٹ پہنتا ہے اور سگریٹ سلگا کر دھواں منہ سے نکالتا ہے تو بالکل ریل کے انجن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ عام بنگالیوں کی طرح دبلا پتلا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تپ دق

کا مریض ہے۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں، چہرے پر ہر وقت مُردنی سی چھائی رہتی ہے۔ بازو لمبے اور پتلے۔ ٹانگیں سوکھی ہوئی، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ۔ مگر بے نور، بے جان، کھوئی کھوئی سی، کسی چیز کی جویا۔ ایک آنے والے زمانے کی امید پر زندہ۔ وہ زمانہ جب بھوک اور بے کاری مٹ جائے گی، جب دنیا میں انسانیت کا راج ہوگا۔ جب ایک نئی زندگی کی صبح ہوگی۔

تیسرا۔ چٹرجی نہایت ہوشیار آدمی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ مگر حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی روزگار نہیں ملا۔ وہ بمبئی میں اس لیے آیا تھا کہ وہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اس کا بھائی فوٹو گرافر تھا اور اس نے بھی فوٹو گرافی کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے۔ ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں۔ لیکن عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول لیتا ہے۔ ایک بار ایک فلم میں کام ملا تھا، لیکن چند دنوں کے بعد اسے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ ڈائرکٹر بننا چاہتا ہے اور اس کے بعد پروڈیوسر۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے پیسے مانگ لیتا ہے۔ آج کل وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لیے اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے۔ پچھلے ہفتے اسے زکام ہوگیا اور ساتھ ہی بخار۔ پہلے ہی کون سا طاقت ور تھا۔ زکام اور بخار نے اسے لاغر کر دیا۔ دو دن تک اس نے کچھ نہیں کھایا، اس کی بے نور آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں، اس کا چہرہ اور سیاہ ہوگیا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی ہمت نہیں ہاری، وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ڈائرکیٹ ضرور کرے گا۔ کیا ہوا اگر اس کے پاس نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ ایک دن میں ایک بار کھانا کھاتا ہے۔ وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ کسی خاتون کو پھانسے یا وہ خود اتنا حسین ہو کہ کوئی عورت اسے پھانس لے۔ لیکن چٹرجی نہ خوبصورت ہے نہ جوان، کوئی ذہین، سمجھ دار، خوبصورت عورت اس سے عشق نہیں کر سکتی۔ مگر وہ اپنی دُھن کا پکا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے مگر کبھی کبھی جب وہ بمبئی کے اسٹوڈیوز کے چکر لگا لگا کر تھک جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اس زندگی سے اُکتا گیا ہے۔ وہ کب تک جدوجہد کرتا رہے، وہ کب تک لوگوں کی گھڑکیاں سنتا رہے۔ اسے لوگوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ اسے خود زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔ وہ خودکشی کرلے گا اور جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہے۔ اف ان خشک لبوں پر بے جان مسکراہٹ! یہ مسکراہٹ نہیں خون ہے۔ مسلسل فاقوں کی ایک تصویر ہے جو زندہ ہوکر اس کے لبوں پر ناچتی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے۔ بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں۔ بمبئی کے شراب خانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ناچ ہوتے ہیں، نگاہوں میں پیاس اور ہوس کی بجلی کوندتی ہے۔ میرین ڈرائیو پر لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی جاتی ہے۔ سمندر کی لہریں بڑھتی ہیں، شور مچاتی ہیں اور پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ٹراموں، بسوں اور موٹروں کی کھڑکھڑ مدھم نہیں ہوتی۔ لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اداس دکھائی دیتا ہے؟ اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے مگر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد ہے؟ آج کل چٹرجی کھانستا ہے، وہ ہلکی ہلکی کھانسی۔ خدا بچائے اس کھانسی سے۔ کیا اسے تپ دق ہوگیا ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائرکٹر نہیں بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟ میرے دوست اکثر چٹرجی کو چڑاتے ہیں۔ اس سے مذاق کرتے ہیں کہ وہ کب ڈائرکٹر بنے گا اور کب پروڈیوسر بنے گا۔ کچھ سب اسے گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں محض اس لیے کہ اس کا کوئی وارث نہیں، محض اس لیے

اس کے پاس پیسے نہیں اور فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور وہ اکثر دوستوں کا دست نگر رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس فلیٹ سے نکال دیا گیا تو کہاں اور کدھر جائے گا۔ وہ کس جگہ رات بسر کرے گا۔ وہ غصے میں آ کر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو ـــــ جس نے اسے پیدا کیا۔ یا شاید اپنی ماں کو جو کب کی مر چکی ہے یا اپنے بھائی کو جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ خط لکھو، لکھے جاؤ، دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو۔ روز ویلٹ کو تار دو کہ وہ تمھیں روپے بھیجیں۔ اسٹالن کو خط لکھو جس نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمھیں اس زندگی سے نجات دلائے۔ تم دنیا کے ہر بڑے شخص سے پوچھو کہ تم چترجی کیوں اس دنیا میں اکیلے ہو، تم کیوں فاقے کرتے ہو، تم کیوں بھوکے رہتے ہو، تمھیں کیوں سونے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لیے خاموش نہ رہو، تم دوستوں کی گالیاں اس خاموشی سے نہ سنو۔ تم کیوں اس ذلت کو برداشت کرتے ہو۔ یہ ذلت مجھے ناگوار معلوم ہوتی ہے، ناگوار ہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ میں یہ سکوت برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پٹک دوں، دنیا میں ہر شخص کمینہ ہے، رذیل ہے...... دنیا میں ایسے نظام کی ضرورت ہے، ٹھہرو ـــــ میں اشتراکی بننا نہیں چاہتا، میں فسطائیت کا حامی نہیں، میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا، میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں، میں کہانی لکھنا جانتا ہی نہیں۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ میں ماحول تعمیر کرتا ہوں، نہ کردار نگاری کے معجزے دکھاتا ہوں، نہ رنگین عبارت لکھتا ہوں۔ میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں لفظ خدمت سے نفرت کرتا ہوں۔ میں غلط زبان لکھتا ہوں، غلط محاورے لکھتا ہوں، مجھے مذکر اور مؤنث کی کوئی تمیز نہیں۔ میں نئی نئی تشبیہیں نہیں لکھتا، میں دل کش اسٹائل کا مالک نہیں۔ میں موپساں اور ٹالسٹائی کی طرح بڑا ادیب بننا نہیں چاہتا۔ میں شہرت کا قائل نہیں ـــــ میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں ـــــ صرف چار آنے ـــــ میں جو کچھ کہوں گا، صاف صاف کہوں گا۔ میرے خیالات ایک فرد، ایک قوم کے نہیں بلکہ انسانیت کے ترجمان ہیں۔ میں انسانیت کا قائل ہوں اور اس لیے پوچھتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے، اتنی بے کاری کیوں ہے۔ اس کا جواب تم کیا دو گے۔ انسانی خداؤں اور رہنماؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ خیر ـــــ ان سے ملو، ان کا نام ہری چند ہے۔ یو پی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہری چند اپنے مال دار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا۔ لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سٹے میں سب کچھ ہار گیا اور بے چارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ کچھ عرصہ وہ ڈپو میں کام کرتا رہا لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا تم ایکٹر بن سکتے ہو، تو بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بے چارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ اصلیت کا کبھی سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ آج کل ہری دن میں دس بیس بار کنگھی کرتا ہے، آئینہ ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اس کے جسم کی تشکیل میں ایک عجیب نسوانیت کی سی جھلک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مرد کم ہے اور عورت زیادہ ہے۔ وہ بال عجیب انداز سے بناتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا کر باہر نکلتا ہے تو کریم اور پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ چہرے پر کریم ملتا ہے اور ملتا رہتا ہے اور پھر پنکھے سے ہوا کرتا ہے تاکہ چہرے کی جلد کے ہر مسام میں کریم جذب ہو جائے۔ لیکن کریم کے متواتر استعمال سے ابھی تک رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہری ہر روز دوگنی اجرت پر کپڑے دُھلاتا ہے اور روپے گھر سے منگوا کر گزارہ کرتا ہے لیکن کب تک۔ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں بن سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوب صورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ بتاؤ ان باتوں میں کون سی بری بات ہے۔ ہر عقل مند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری

کر کے وہ یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے۔ کیوں کہ ایک ایکٹر آج کل ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر بن جائے یا محض بھکاری۔ صاف ظاہر ہے کہ زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے — جن حالات، جس ماحول میں وہ رہتا ہے اس ماحول میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ روز بروز اس کا وزن ہو رہا ہے۔ سر کے بال گر رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آج ہری طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ ہر روز اسے استعمال کرے گا اور زندگی کی کش مکش جاری رکھے گا۔ دواؤں کے استعمال سے انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر کب تک — ؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے وہاں کی خوراک میں غذائیت کا نام نہیں، ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو کی نوکری کر لے، وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور آئینے کو سامنے رکھ کے مسکراتا ہے اور اپنے بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی ہے، اور زور زور سے کریم ملتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ "میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکتا۔ شام کے وقت میری ٹانگیں ڈگمگاتی ہیں، سر چکراتا ہے اور ہر روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی کی شکایت بھی ہے مجھے، لیکن میں ڈپو کی نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ بامشقت قید ہے۔ میں یہ قید برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو، اس ٹرنک میں میری بی۔ اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مرگیا" وہ پھر ہنستا ہے۔ موٹے موٹے لبوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ "تو یہ ڈگری لکھنؤ یونی ورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصے اپنے پاس نہ رکھ ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی — ہے بھی کیا۔"

اور میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں مانتا۔ اس دور ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کے انسانوں کی قسمت ہے وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت، عزت اور رتبے کو برقرار رکھنے کے لیے اس راستے پر گامزن رہنا چاہتے ہیں جس پر چل کر کئی صدیوں تک ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر تمام دن باہر رہتا ہے اور تقریباً رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے — پوچھو گے کہ وہ کیا کرتا ہے، تو میں اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص بھی رہتا ہے، اس کے متعلق یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ بستے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے — اوتار سنگھ کو چھوڑ کر لیکن اس کا ذکر پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا۔ وہ چھوٹا سا قد دور سے دیکھو، ایک خوب صورت کھلونے کی طرح دکھائی دے گا۔ اس کے بال بھورے رنگ گورا، اس کی خوب صورتی اس کے سنہرے بالوں میں پنہاں ہے۔ اسے اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے۔ جب کبھی وہ ایک اچھا سوٹ پہن کر اور نکٹائی لگا کر فلیٹ سے باہر نکلتا ہے تو گلی کی تمام جوان لڑکیاں اس کی طرف آرزو مند نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور رگھبیر ایک شعر گنگناتا ہے۔ "زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" رگھبیر شاعر ہے لیکن اس کی کوئی نظم کبھی کسی رسالے میں نہیں چھپی۔ وہ ایک کامیاب ایکٹر ہے۔ لیکن کسی فلم میں ابھی تک اسے کوئی پارٹ نہیں ملا۔ وہ ایک دل چسپ عاشق ہے۔ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے۔ بلکہ وہ لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ سڑک پر چلتے پھرتے، ٹرام میں چڑھتے اترتے، گلی کے موڑ، ہوٹل، سینما، باغ، اسٹیشن، ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے، وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آہ بھرتا ہے۔ شعر کہتا ہے "زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اپنی ناکام محبت کے فسانے دوستوں کو سناتا ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے ضرور شادی کا وعدہ کرتا ہے۔ چند دنوں کے بعد عشق کا جوش سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر رگھبیر کی جنوں پروری لگا ہے

کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا۔ ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم اس کی گہرائی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہر روز وہ اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتا ہے اور کبھی بات کا جواب نہیں دیتا۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ مایوسی سی آگئی ہے۔ کیا رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے؟ رگھبیر نے بتایا کہ شروع میں بنگالن، جس کا نام گیتا ہے اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ گیتا ایک ترکی ہے۔ ایک مشہور فلم اسٹار کے ٹروپ میں کام کرتی ہے اور بیچارا رگھبیر بھی اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور اس بنگالن کی خاطر تمام ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب ٹروپ کلکتہ پہنچا تو گیتا نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ شاید گیتا کے چاہنے والوں نے اصرار کیا ہوگا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور گاڑیوں کی طرف دیکھو، یہ چمکتے ہوئے ہیرے، یہ صوفہ سیٹ، یہ رنگین پردے، یہ نوکر، یہ لونڈیاں، یہ باندیاں اور طرح طرح کے کھانے —— وہ شاعر تمہیں کیا دے گا۔ فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی۔ وہ خود بھوکا ہے، وہ تمہیں کیا کھلائے گا اور پھر وہ بنگالی نہیں ہے۔ شمالی ہند کی ایک گھٹیا سی ریاست کا باشندہ ہے۔ اپنے دیس میں رہو، یہاں ناچو، گاؤ، لوگوں کو اُلو بناؤ اور زندگی کے دن ہنسی خوشی.... بسر کرتی چلی جاؤ — اور بے چارا رگھبیر، جب سے وہ کلکتہ سے آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ عورت کی بے وفائی نے اسے بُری طرح اداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے۔ پہلے وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن اب اس کے حوصلے بہت پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ رات کے بارہ بجے گھر واپس آیا۔ اس نے کافی شراب پی رکھی تھی، اور اُس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی پینٹ میلی اور ڈھیلی ہو گئی تھی۔ کوٹ پر دھبے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ہنسنا چاہتا تھا لیکن ہنسی لبوں کے قریب ہی رُک گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کرسی پر گر گیا اور بڑبڑانے لگا۔ یہی کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا۔ وہ واپس شملہ جائے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہری لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ اس نے بوٹ اتار دیے اور پسینے سے بھیگی ہوئی جراب کو سونگھنے لگا اور جرابوں کو اس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ وہ شملہ کی حسین وادی میں اپنا مسکن بنائے گا۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا اور نمک اور تیل کی دکان کھول لے گا۔ اب رگھبیر نے کوٹ اتار دیا تھا۔ قمیص اُتارتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور پھر اس نے پتلون بھی اتار دی اور صرف انڈرویر پہنے کرسی پر ڈھیر ہو گیا — اسے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو شملہ میں دوبارہ زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کی پہاڑیوں کو کبھی بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دُھند، سفید، ٹھنڈی، نرم و نازک، اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقش اُبھر آئے جس نے اسے شہر جانے سے روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دُھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور وہ دونوں دُھند میں اُڑے جا رہے تھے۔ کدھر، کہاں۔ لڑکی کو رگھبیر نے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ لڑکی کی چھاتیاں اس کے سینے سے ٹکرائیں اور ایک عیرفانی نغمہ پیدا کرتی گئیں۔ لڑکی کے دل کا طوفان اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور دُھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی — لیکن وہ کیا کرتا۔ اس نے لڑکی کے گرم جلتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور وہ دُھند کی انتہائی گہرائیوں میں کھو گیا۔ وہ نرم نرم، پتلے پتلے ہونٹوں کا مزہ۔ وہ لڑکی کے سینے کا طوفان، اس کی آنکھوں کی عاجزی، رگھبیر کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔ رگھبیر لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا آیا۔ اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان اَبدی بوسوں کا مزہ ابھی تک لڑکی کے ہونٹوں پر ہو، لیکن کون کہہ سکتا ہے

کہ کسی زمیندار نے اس لڑکی سے شادی نہ کر لی ہوگی۔ ایسی حسین لڑکیوں کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہر اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں جگہ ظلم ہے۔ محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ رگھبیر نے اب انڈرویر بھی اتار دیا ہے۔ اور اب وہ مادرزاد ننگا ہے۔ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا ہے اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو بدستور آرہی ہے۔ باہر ناریل کے درخت پر الو چیخ رہا ہے اور ہوا زور زور سے سائیں سائیں کر رہی ہے۔

بے چارا رگھبیر...... اور پھر اوتار سنگھ —— بڑی دل چسپ شخصیت رکھتا ہے۔ اوتار سنگھ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ وہ صبح چھ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے آٹھ بجے واپس آتا ہے۔ وہ ایک ایسے ڈپو میں کام کرتا ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپے کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مال دار جاٹ کا لڑکا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ آج کل اسے ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف ستھرے کپڑے ہیں اور خاص کر اس کی نیلی نکٹائی جو اس کے سپرنٹنڈنٹ کو بہت پسند ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز ہے۔ دفتر کے باقی کلرک دھوتی یا پاجامہ پہن کر آتے ہیں، اس لیے وہ زیادہ پسند نہیں کیے جاتے۔ اور چونکہ دفتر میں سردار ہی سب سے زیادہ خوش پوش انسان ہے اس لیے اسے جلد ہی ترقی ملنے والی ہے۔ اوتار سنگھ خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ گوردوارے نہیں جاتا۔ وہ اکثر قینچی سے داڑھی کے بال بھی کاٹ لیتا ہے۔ مگر سکھوں کے متعلق کوئی ریمارک پاس کیا جائے تو وہ برا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے اور آزاد خیال ہوتے ہوئے سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فلیٹ کی ہوا میں اداسی رچ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں۔ آخر کب تک وہ دن رات کام کرے اور کیوں۔ ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ اور یہ نوکری کتنی ذلیل ہے۔ اندر جانے کے لیے شناختی کارڈ لانا ضروری ہے، کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے۔ پھر رجسٹر پر حاضری لگانی پڑتی ہے اور کوئی کلرک ایک دو منٹ دیر سے پہنچے تو اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دوست، یہ موت ہے۔ اور پھر ان لمحوں میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے، کسی عورت سے مسکرا کر بات کر لے۔ اس کے حسین زندہ بالوں سے کھیل لے۔ کبھی تو عورت کے حسین خطوط کی داد دے سکے۔ کبھی تو عورت کی دلفریب مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو سکے۔ کبھی تو انسان عورت کے جسم کی گرمی، اس کے بالوں کی خوشبو، اس کی آنکھوں کی دلکشی، اس کی باتوں کی موسیقی سے ہمکنار ہو سکے۔ لیکن اس فلیٹ میں عورت کہاں۔

یہاں تو ہم سب بھوت رہتے ہیں۔ عہدِ پارینہ کے انسان۔ تم نے بمبئی آنے کے لیے لکھا ہے۔ آؤ، بڑے شوق سے آؤ۔ اور میرے پاس ٹھہرو۔ جب اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ خرید لو۔ اور پھر ماہم پوسٹ آفس، ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے، بس چلے آؤ اس گلی کی طرف۔ جو دوسرا مکان نظر آئے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔ آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا —— اور جوں ہی داخل ہو گے، تمھیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھبرانا نہیں، یہ پاگل خانہ نہیں ہے۔ یہاں انسان بستے ہیں۔ یہ پاگل اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے، یہ کیا کرتا ہے، روٹی کہاں سے کھاتا ہے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں، لیکن میں نے کبھی اسے کوئی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ شخص آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ ایک کالی سیاہ، پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے، اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان پر مٹی جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان بہت دبلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی کسی سے بات کرتے

ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر خاموش چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے لیٹے رہنے سے تنگ آجاتا ہے تو گلی میں آ کھڑا ہوتا ہے اور سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یا کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہے۔ اس کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمھیں دیکھ کر بھونکے گا۔ کتے کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہونا، یہ کتا ہر نو وارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی سرخ آنکھوں میں تم غم و غصے کی جھلک دیکھو گے اس کے جسم کو دیکھ کر تم آشیانہ بلڈنگ میں رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہے وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔

نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔ میں نے اس عورت کو اکثر روتے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر اُدھر جانے والے لوگوں کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر ایسی عورت کہاں سے لے آیا اور کس طرح لے آیا۔ میوزک ماسٹر کی شکل ایک بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے لیکن اس کے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر خراب ہو جاتی ہے۔ جب رات پڑتی ہے تو میوزک ماسٹر عورت کو کار میں بٹھا کر کہیں لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے کے بعد گھر واپس آتا ہے۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے روتی اور چیختی چلاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ دونوں خوب زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن دونوں پھر اسی کمرے میں رہتے ہیں، سوتے ہیں اور عورت کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں!

اب ذرا سیڑھیاں چڑھو، دیکھ کر چڑھنا، پھسلن ہوگی۔ یہاں ٹھہر جاؤ ذرا دم لے لو۔ ایک ہی بلڈنگ میں تمام ہندوستان کو دیکھ سکو گے۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی۔ اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ کہتے ہیں اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں پر کھیلا کرتے ہیں۔ بچوں کے جسم پر پھوڑے نکلے ہوئے ہیں۔ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس کرسچین لڑکی کا نام کیا ہے۔ نام پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔ بے چاری کی حالت ابتر ہے۔ گو رنگ سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نہیں۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے نکلے ہوئے ہیں۔ کرسچین لڑکی فراک پہنتی ہے۔ کاش شلوار یا دھوتی پہنا کرے تو کم از کم اس کی پنڈلیاں تو ہماری نظروں سے اوجھل رہیں۔ نہایت پتلی پتلی سی ٹانگیں اور کچھ کچھ مڑی ہوئی، جیسے جسم کے بوجھ سے مڑ گئی ہوں۔ میں نے اس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس کے گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہر حال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہوگا۔ ورنہ یہ بچے کہاں سے آ گئے۔ اور بے چاری کرسچین لڑکی گزارہ کس طرح کرتی ہوگی۔ جب تم پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے۔ وہ تمھاری طرف دیکھے گی اور منہ موڑ لے گی۔ وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے نہ آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہے۔ وہ کب تک انتظار کرے گی۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اسے دروازے میں کھڑی دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، بلکہ ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں جوان ہیں لیکن وہ شباب ہی کیا جو تمھیں اپنی طرف نہ کھینچ لے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کو جی نہ چاہے۔ عورت کے حسن میں کشش ہونی چاہیے۔ اگر تم ایک بار دیکھ لو، تمھیں محسوس ہو جائے کہ تم ایک زندہ، متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو، لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حسن مردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حسن سے پیدا ہوتی ہے۔ خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوب صورت بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے، لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے، اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ ان کے گھر سے کبھی قہقہوں کی آواز نہیں آئی۔

گھر کے دروازے بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اس میں سے ایک بیوہ کا چہرہ تمھیں ڈھونڈتا ہے۔ دو موٹی موٹی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے چمکتی ہیں۔ پھر ایک جوان سڈول بازو آگے بڑھتا ہے، اور پھر یہ تمام جسم پیچھے حرکت کرتا ہے۔ تم نے بیوہ کا چہرہ نہیں دیکھا۔ چہرے پر نفرت کی جھرّیاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار، جو اکثر مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں ہی سے نہیں، بلکہ اس کا پرتو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں دیکھ سکتے ہو، صرف آنکھوں ہی میں نہیں، بلکہ اس نفرت، اس پیاس، اس بھوک، اس تشنگی اور بیوگی کی تشکیل تم ان لڑکیوں کے جسموں میں دیکھ سکتے ہو۔ لڑکیاں اکثر خاموش اور اُداس رہتی اور ناریل کے درختوں کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ ہم سب اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنوں کو دے جاتے ہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انھیں دینا۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کمرے کی چابی لینے کے لیے کتنی بے قرار رہتی ہیں۔ دروازہ اکثر بند رہتا ہے، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاؤ، فوراً دروازہ کھل جائے گا اور ایک بدصورت چہرہ تمھاری طرف دیکھے گا۔

چہرہ، بالکل بدصورت چہرہ، جذبات سے عاری، نہ ہنسی، نہ خوشی، نہ غم، نہ زندگی، نہ موت — بالکل بے حس، بے جان چہرہ اور پھر ایک میلا گندا سا ہاتھ تمھاری طرف بڑھے گا۔ میری انگلیاں کئی بار غیر ارادی طور پر ان بدنما انگلیوں سے مس ہوئیں، لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہوکر پیدا ہوتی ہے۔ ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں۔ ان کے جسم، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ وہ تمھاری طرف بار بار دیکھیں گی۔ لیکن نگاہوں سے یہ پتہ لگتا ہے جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کا ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی تربیت، ایک نئی تشکیل دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں اور اس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔

اگرچہ ان کا رنگ سیاہ ہے، لیکن جوانی کو رنگ سے کیا نسبت۔ دور کیوں جاؤ، ہمارے محلے میں ایک اور لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ بالکل ان مدراسنوں سے ملتا ہے مگر اس کے حسن میں کتنی کشش ہے۔ کتنی جاذبیت۔ اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ یہ لڑکی اکثر سفید ساری پہنتی ہے، سیاہ رنگ اور سفید ساری۔ سفید ساری اور سیاہ رنگ۔ سیاہ رنگ سفید ساری میں خوب چمکتا ہے۔ خوب پھبتا ہے۔ لڑکی کو ساری پہننے کا طریقہ خوب آتا ہے۔ جسم کا ہر خط اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ لڑکی کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی ایک مصوّر ہے جو ساری کو مصوّر کے برش کی طرح استعمال کرتی ہے۔ ایک ہلکا سا جھٹکا، کہ انسانی جسم نے ایک نئی طرز اختیار کی۔ وہ ہر روز ساری بدلتی ہے۔ کبھی کبھی آسمانی، جیسے ناریل کے سبز پتے، کبھی کبھی سُرخ، جیسے شفق کی لالی، سُرمئی، مٹیالا رنگ بدلتے ہیں، حُسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے۔ لیکن لڑکی کا حُسن اسی طرح قائم ہے۔ آؤ میرے قریب آؤ۔ وہی لڑکی آ رہی ہے، لو وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ دو کبوتر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں۔ سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پر ناچتی ہیں۔ نگاہیں لڑکی کی طرف لپکتی ہیں۔ ساری جسم سے چپکی ہوئی ہے۔ جسم کا ہر خط واضح ہے۔ پنڈلیوں سے اوپر رانوں تک اور پھر کولہوں کا سنگم۔ کتنا دلفریب، کتنا دل کش ہے۔ مصوّر کو داد دو۔ اس کی حنائی انگلیوں کو چوم لو۔ اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں ہے، اور پھر سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم — اور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اوپر — ایک چھوٹا سا خوب صورت چہرہ، چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ، اور کسی کی

ان پتلے ہونٹوں پر بکھرتی ہوئی، نچلا ہونٹ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئی — یہ جانتے ہوئے
ے دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں، آنکھوں میں مستی ہے، کامرانی ہے۔ لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو
ر سکتی ہے۔ کتنا صحت مند احساس ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے، ہری چند اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک آہ بھرتا
ور کہتا ہے مار ڈالا، مار ڈالا — ہائے مار ڈالا — اور چٹرجی کی ہنسی جیسے مُردہ زندہ ہوگیا ہو۔ اور اوتار سنگھ کا جھک کر
اور رگھبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں
خدا کو، تہذیب کو — سرمایہ داروں کو، حکومت کو، ماں باپ کو، سب کو۔ رگھبیر کا عُریاں ہوکر کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر
، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اُتارنا اور لمبے لمبے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا اور میرا لڑکی کی طرف
، رہنا — دیکھتے رہنا — یہاں تک کہ حُسن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، یہاں کہ شباب کی خوشبو ہوا گم ہو جاتی ہے اور
کے قدموں کی مدھم چاپ آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتی ہے۔ اور صرف گالیوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دماغ سے
، رہتی ہے۔ ابے او حرام زادے، ابے او اُلو کے پٹھے …… —

ہاؤسنگ سوسائٹی

ــــــــ قرۃ العین حیدر

جنوری کی برفانی صبح کا کہرہ درختوں پر سے چھٹنے لگا۔ دور گومتی کے اُس پار، ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سُورج نکل آیا تھا اور ندی کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں چمکنے لگی تھیں۔ شبرّو اُمشعلچی باورچی خانے کی چھولداری کے آگے، نم زمین پر اکڑوں بیٹھا سیاہ مسالے والی لمبی تختی پر نہایت فراٹے سے چھریاں صاف کرکر کے ایک طرف کوڑھیر لگاتا جارہا تھا اور سردی کم کرنے کے لیے گانے میں معروف تھا ۔

تجلّی طور کی موسیٰ کلیما بن کے نکلیں گے
محمدؐ مصطفےٰ محشر میں دولہا بن کے نکلیں گے

پھر اُس نے دوسری قوالی شروع کی ۔

دیکھنا ساکی گھٹا گل جار پر چھائی نہ ہو

"باپ رے باپ ــــــ اتنا بڑا اجاڑا ــــــ" دوارکا پرشاد "مخادیم" نے چپراسیوں کی چھولداری میں سے نکل کر اظہارِ خیال کیا۔

"آج آدھی رات تک کی دلیل ہو ہیے ــــــ" شبرّو نے جواب دیا اور چھریاں چمکانے میں جُٹا رہا۔

امرتوں کے دھندلکے میں سے دو ہیولے نمودار ہوئے ۔ کُہر آلود فضا میں سُورج کی کرنوں کا چوڑا راستہ سا بن گیا جو سُورج سے شروع ہو کر عین شبرّو کے سر پر آن کے ختم ہو رہا تھا۔ کرنوں کی زد میں آنکھیں میچتے ہوئے اس نے آگے آگے آتے ہوئے آدمی کو ذرا بلندی سے آواز دی ــــ "بندگی ــ سلاما لےکم ــــ" اور دوارکا پرشاد سے مخاطب ہوا ــــــ "بڑے سبیرے سبیرے ڈالی لائے ہیں"

سید مظہر علی جھینگا پاسی کے سر پر مرغیوں کا جھوا اٹھوائے نزدیک آگئے ۔ خشک میوے اور تازہ پھلوں کی کنڈیاں انھوں نے خود اُٹھا رکھی تھیں۔ دوارکا پرشاد انگوچھا کندھے پر ڈالتے کافی لمبا فاصلہ طے کر کے میم صاحب کے خیمے پر گئے اور باہر سے کہا ــــــ "حجور ــــــ کوئی جنے ڈالی لائے ہیں"

"واپس کردو ــــــ" اندر سے آواز آئی۔

چند منٹ بعد دوارکا پرشاد پھر خیمے میں گئے ــــــ "میم صاحب آؤ کہت ہیں کی ــــــ"

"ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے ۔ ہمارا سلام دو اور ڈالی لوٹا دو ــــــ"

دوارکا پرشاد نے واپس آکر میم صاحب کے الفاظ دہرا دیے ۔

"اچھا" ــــــ سید مظہر علی نے مزید اصرار نہیں کیا اور سر جھکائے گاؤں کی سمت لَوٹ گئے ۔ اُنھوں نے سوتی اچکن پر گاڑھے کی چادر کا بکل

مارا ہوا تھا اور کنٹوپ پہن رکھا تھا اور ادھوڑی کے جوتوں کے ساتھ ہاتھ سے بُنے ہوئے سُرخ موزے پہنے تھے جن کی ایڑیاں نکل چکی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑا سا جھوا سر پر اٹھائے جھینگا پاسی اچکتا اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز چلتا شبّو کو بہت قابلِ رحم سا معلوم ہوا۔ دونوں آدمی بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ اس نے تختی پر پوڈر چھڑکا اور "راجہ ہرلیش چندر" نوٹنکی کی "چیز" الاپنے میں مصروف ہوگیا:

" ہم محلن کے باسی رے پنڈت
کِت تک دُور توری کاسی۔ کِت تک دُور——"

سُورج کی روشنی تیز ہوتی۔ کیمپ میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا۔ دُور دُور تک کھیت کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ یکّے، ادھے، بہلیاں اور سائیکلیں کھڑی تھیں۔ اہلکار، عرضی نویس، محرر، کسان، زمیندار، گواہ، مؤکل درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے۔ ڈولی درخت کے نیچے رکھ دی گئی۔ اس کے اندر بیٹھی ہوئی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی۔ مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا۔ عورت نے اپنا بیان دیا۔ پھر وہ سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی۔

دوپہر ہوگئی۔ شیشم کے جھنڈ میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوا اور جھومتا جھامتا کیمپ کی جانب بڑھا۔ وسط کے بڑے خیمے کے سامنے پیادے نے نیچے اُتر کر دوارکا پرشاد کو آواز دی۔ دوارکا پرشاد پھر میم صاحب کے خیمے کی طرف لپکے۔

" نواب شمس آرا بیگم کا ہاتھی آوا ہے۔ چھوٹی بٹیا کھاطر۔"

" واپس کردو——" میم صاحب نے حسب معمول جواب دیا۔ وہ اس وقت خیمے کے عقب میں آرام کرسی پر بیٹھی اپنے بیٹے کو الٰہ آباد خط لکھ رہی تھی۔ چھوٹی بٹیا دوسرے خیمے سے تیر کی طرح نکلیں —— " ماما—— ماما—— ماما——" انھوں نے دہاڑنا شروع کیا —— " ہم تو جمبو پر ضرور چڑھیں گے۔ ہم تو جمبو کو امرود کھلائیں گے—— ماما——" اتنا کہہ کر وہ زمین پر لوٹ گئیں۔

" اچھا—— اچھا—— جاؤ۔ مٹی میں مت لوٹو——" میم صاحب نے جھنجھلا کر جواب دیا اور خط لکھنے میں منہمک ہوگئیں۔

چھوٹی بٹیا نے جھک کر اپنی سُرخ جوتیوں کے بکل بند کیے اور گود میں اٹھائے جانے کے لیے دوارکا پرشاد کی طرف ہاتھ اٹھا دیے۔ مدار بخش خدمت گار نے جلدی سے پھول دار ریشمی چھتری لا کر دی۔ مہاوت نے ہاتھی گھٹنوں کے بل بٹھایا۔ دوارکا پرشاد بٹیا کو گود میں لے کر ہودے میں فروکش ہوگئے اور اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر بڑے وقار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ کلکٹر صاحب کے چپراسی تھے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا۔ نواب شمس آرا بیگم کا پیادہ ان سے بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ گھسی ہوئی زربفت کی جھول اور منقش ہودے والا ہاتھی اجلاس کے سامنے سے گزرتا پاربتی پور کی گڑھی کی سمت روانہ ہوا۔

عدالت میں ڈولی کے اندر سے پردہ نشین بی بی کی فریاد جاری رہی۔ ڈولی کے پیچھے تین طرف چھوٹی سی قنات لگا دی گئی تھی۔ قنات کے اندر ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی ہری چھینٹ کا تنگ پاجامہ پہنے، گلابی ململ کا دوپٹہ سر سے لپیٹے زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ سے ڈولی کا پردہ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتی تھی۔ باہر اجلاس میں اس کا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ قنات کی درز میں سے جھانک کر اس نے باہر دیکھا۔ سامنے سے ہاتھی گزر رہا تھا۔ اس پر سنہرے بالوں والی ایک بہت چھوٹی سی بچی سوار تھی۔ بچی نے بھالو کی کھال ایسا بڑے بڑے بالوں والا کوٹ پہن رکھا تھا اور ایک سفید مونچھوں والے وردی پوش بڑے میاں نے رنگ برنگی چھتری سے اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ بالکل جیسے پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ڈولی کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی حیرت سے جھانکتی رہی۔ یہاں تک کہ ہاتھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ سر جھکا کر گیلی مٹی پر اُنگلی سے تصویریں بنانے میں دوبارہ مشغول ہوگئی۔ اب کے سے اس نے ہاتھی کی تصویر بنائی۔ اس پر ہودے کی چار لکیریں کھینچیں اور اس میں تاج پہنے ہوئے شہزادی بٹھال دی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا:

" یہ شہزادی میں خود ہوں —— میں بسنتی بیگم——"

" مسماۃ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم نابالغ——" عدالت میں اس کا نام پھر لیا جا رہا تھا اس نے سہم کر ڈولی کا پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ہاتھی گاؤں سے باہر نکلا ـ آبادی کے سرے پر صدیوں پرانی خانقاہ تھی اور باؤلی اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر مخدوم زادہ شاہ منوّر علی کا مکان تھا ـــــــ ہاتھی مکان کے برابر کی گلی میں سے گزرا۔ ہودے میں سے چھوٹی بٹیا کو مکان کا کچا آنگن نظر آیا جس میں لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ کاکلوں والے ایک بزرگ نارنجی رنگ کی کفنی پہنے ایک کھاٹ پر بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے۔ چگی داڑھی اور اداس شکل والے ایک اور بزرگ مونڈھے پر بیٹھے تھے ـ امرود کے پیڑ کے پیچھے ایک لڑکی سرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مسالہ پیس رہی تھی۔ اس نے چاندی کی میلی میلی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

دھوپ تیز ہوگئی۔ اجلاس لنچ کے لیے برخاست ہوا. لالہ حسین بخش متصدی نے وہ مسل لپیٹی جس میں مسماۃ بوٹا بیگم مدعیہ کی درخواست منسلک تھی۔

"منکہ مسماۃ بوٹا بیگم، بالغ، قوم مسلمان، ذات سید، سکنہ موضع محمد گنج، تحصیل ہرونی، ضلع سلطان پور، بیوہ سید زوّار حسین جنت آرام گاہ، کاشت کار موضع ہذا کی ہوں۔ عرصہ تین سال کا ہوا ـ فدویہ کی اکلوتی دختر سیدہ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم کے واسطے، جس کو اللہ تعالیٰ جل شانہ، نے بہ طفیل جناب بتول پاک علیہ السلام دولتِ حسن صورت و سیرت و عصمت سے مالا مال کیا ہے ـ نواب سکندر علی خاں عرف نواب بھولے تعلقہ دار سہرولی و درگاکنڈ نے خواہشِ کتخدائی کی ظاہر کی ـ فدویہ نے پیغام نامنظور کیا۔ کس واسطے کہ نواب صاحب موصوف باوجود تعداد کثیر ازدواج منکوحہ و ممتوعہ و غیر ممتوعہ ہونے کے بعمر پینسٹھ سال از حد عادی جملہ فسق و فجور و لہو لعب کے ہیں ـ بعد چند روز مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۷ء چار گھڑی رات گئے بذریعہ پیادگان مسلح اغوا بسنتی بیگم سلمہا بعمر ساڑھے تیرہ سال عمل میں آیا اور اس بانوئے معصوم و عفیفہ کو گڑھی درگاکنڈ میں قید کر دیا گیا ـ نواب شمس آرا بیگم تعلقہ دار پاربتی پور اس وقت تک فدویہ سے بہت موافق تھیں کس واسطے کہ ممدوحہ نے بعالم طفولت فدویہ سے درسِ قرانِ حکیم لیا تھا اور فدویہ گڑھی پاربتی پور میں آتوجی کے عہدے پر مدت مدید تک منصوب رہی تھی ـ علاوہ ازیں شوہر فدویہ کا گڑھی کے ذاکر ول میں اسم تھا اور وہ مرحوم اخیر ایام زندگی تک باوجود فتور بصارت امام باڑہ ممدوحہ میں سوز خوانی کرتے رہے تھے۔ لہٰذا بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے از طرف فدویہ رجوع عدالت کیا اور مقدمہ فوجداری و اغوا نواب بھورے پر دائر کر دیا کہ ما بین تعلقہ ہائے ممدوحہ و نواب صاحب موصوف پشت ہا پشت سے سلسلہ مقدمہ بازی بہ وجوہ گوناگوں جاری ہے۔

بعد چند روز بوقت نصف شب نقاب پوش ڈاکوؤں نے غریب خانہ میں کود کر فدویہ کے دُرِ یتیم سید کرار حسین سلمہ، کو بعمر اٹھارہ سال گنڈاسوں سے شہید کر دیا اور غائب ہو گئے۔

بعد ازاں، عدالت حاکم پرگنہ کے روبرو میاں نوروز صاحبزادہ نواب شمس آرا بیگم نے بیان دیا کہ مسماۃ بسنتی بیگم منکوحہ ان کی ہے اور اس لڑکی کے وارث وہ خود ہیں ـــــــ از بسکہ بوجہ اس شعلہ جدید و رخنہ و فتنہ ثانی کے یہ امراب از حد نازک و پیچیدہ ہو چکا ہے۔ بحکم جناب خلائق پناہ مسٹر رام سرن بھارگو حاکم پرگنہ مسماۃ بسنتی بیگم بذریعہ پولس گڑھی درگاکنڈ سے نکال کر میری تحویل میں دے دی گئی مگر اب طاقت میاں نوروز کے دعوئے باطل کے مقابلے کی اس اجل گرفتہ میں نہیں ہے اور فدویہ بحالت افلاس و لاچاری و بے کسی و اضطرار و اندوہِ شدید حضور کیوان قدر نوشیرواں وقت ہمایوں شکوہ جناب کلکٹر صاحب بہادر سے فریادی ہے کہ مزید ابواب فساد و آتش افروزی اس ضمن میں بحکم خاص بند فرماویں اور یہ امر کہ اعانت ارباب استحقاق کی منظورِ نظرِ فیض مظہر ہے باعثِ ثواب و حسنات اور زیادتی نام و نشان آپ کا ہووے گا۔

دیگر عرض یہ ہے کہ گواہی میں فدویہ درایں حالات پُر آشوب فقط سید مظہر علی کاشت کار سکنہ محمد گنج کو پیش کر سکتی ہے جو گو کہ رعیت، نواب شمس آرا بیگم کی ہیں لیکن بکمال صفائے باطن ـــــــ

دھوپ اب اتر کر صحن کی دیوار پر آچکی تھی ـ سید مظہر علی اپنے کھیتوں کا ایک چکر لگا کر پھر مونڈھے پر آن بیٹھے ـ ان کے بڑے بھائی شاہ منوّر علی مدینہ اخبار سے منہ ڈھانپ کر کھاٹ پر لیٹ گئے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دن بھر دھوپ میں سُرخ مرچیں سکھائی تھیں جن کی دھانس سے سید مظہر علی کو

دو تین چھینکیں آئیں۔ جھینگا پاسی کی عورت دہلیز میں بیٹھ کر منظور النساء کے سر میں جوئیں دیکھنے لگی۔ منظور النساء کے سُرخ لول کے تنگ پاجامے کے پائنچے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے کیونکہ وہ دن بھر اوسارے کے سامنے گیلی مٹی سے گھروندے بناتی رہی تھی۔

شاہ منور علی بے چینی سے پھر اُٹھے ——— "اللہ غنی ———" انھوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ مُرغیاں کُٹ کُٹ کرنے لگیں۔ ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھڑکی اور سید اختر علی اندر داخل ہوئے۔

"بھتیا لوٹ آئے تحصیل سے ———" سید مظہر علی کی بی بی نے کہا۔

"السلام علیکم" ——— نووارد نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو ذرا زور سے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام، جیتے رہو ———" سید مظہر علی نے کہا۔ سید اختر علی نے صحن کے کونے میں رکھے ہوئے مُرغیوں کے جھوتے پر نظر ڈالی

"میم صاحب نے ڈالی واپس کر دی؟" سید مظہر علی نے کہا۔

"پورے دس روپے اشرفی لال سے اُدھار لے کر ای ڈالی لے گئے رہے تمہری خاطر" بھاوج نے ٹاٹ پر سے مرچیں بٹورتے ہوئے فریاداً کہا۔

"ہمارے کام کا کیا ہوا ———؟" سید اختر علی نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔

"ہم ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط لے کر اجلاس سے قبل کلکٹر صاحب سے ملے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ہمیں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ ——— درخواست بھجوا دیجیے، ہم جانسن صاحب سے بات کر لیں گے۔"

"جانسن صاحب شام کو پہنچیں گے۔ کل سویرے ہی شکار کے لیے چلے جائیں گے، ہم کیمپ سے سب معلوم کرتے آئے ہیں۔ دو روپے لالہ حسین بخش کی نذر کیے۔"

"میم صاحب انگریز ہیں نا ———؟" سید مظہر علی نے دریافت کیا۔

"دادا انگریز تھے۔ مرزا پور میں نیل کی کاشت کرتے تھے۔ نواب صاحب وکرم پور کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ کلکٹر صاحب بہار کے کسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میم صاحب کو میکے سے زمین داری ملی ہے۔ الٰہ آباد اور مسوری میں کوٹھیاں ہیں۔ دو لڑکے[1] ہیں۔" سید اختر علی نے جواب دیا۔

"اللہ کی شان ہے۔ وہ پاک پروردگار بعضے لوگن کو دُنیا کی ہر نیامت عطا کرت ہے۔" بھاوج نے شوپ میں ارہر کی دال پھٹکتے ہوئے قناعت سے اظہارِ خیال کیا ——— خاموشی چھا گئی۔

"خداوند تعالیٰ عاشق کو بہت لمبی جائیداد عطا کرتا ہے۔ صبر کی جائیداد ———"

شاہ منور علی نے دفعتاً کہا اور اُٹھ کر باہر چلے گئے اور سنسان گلی میں سے گزرتے درگاہ کی منڈیر پر جا بیٹھے۔

"بھائی صاحب نے بھی تمہارے لیے اتنے چلّے کھینچے ——— کچھ نہ ہوا۔" سید مظہر علی نے آہستہ سے کہا۔ "پچھلے سال چھ مہینے تک گومتی کنارے کُٹی میں پڑے رہے۔ چلّے کے جاڑے تھے نمونیہ ہو گیا۔ منظور یا حقّہ لے آؤ بیٹا ———" انھوں نے لڑکی کو آواز دی۔ اس نے حقّہ تازہ کر کے باپ کے سامنے لا رکھا۔ سید مظہر علی نے جو بڑے بھائی کے سامنے حقّہ نہ پیتے تھے۔ اب ایک کش لگایا اور بات جاری رکھی "ہم بہت ہاتھ پیر جوڑ کر گھر واپس لائے آج کل جنّاتوں کو قابو کرنے کا عمل کر رہے ہیں ——— ہم نے کلکٹر صاحب سے تمہارے لیے کہا کہ ہمارا چھوٹا بھائی وکیل ہے مگر قسمت کا ہیٹا ہے۔ ضلع کچہری میں وکالت کی وہاں نہیں چلی۔ کان پور میں پریکٹس شروع کی وہاں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا ہے۔ سُنا ہے لکھنؤ سکتر صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت خالی ہوتی ہے اگر حضور کرم گستری فرما کر اس کی سفارش کر دیں۔ وہ کہنے لگے۔ سید صاحب ہم کس قابل ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے وہ دیر یا سویر سب کی سُنتا ہے۔"

---

[1] لڑکے پورب اور اودھ میں اولاد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

"اب ہم تیرہ تیزی کے مہینے میں سندیلے جائے کے شاہ مدار کے مزار پر چادر چڑھیئبا جبے تم کا نوکری ملیبھ ———" بھاوج نے سوپ دیوار پر ٹانگتے ہوئے کہا۔

سیّد اختر علی نے بیزاری سے بھاوج کو دیکھا اور گھڑونچی کی سمت نظر دوڑائی۔ بھاوج لپک کر گئیں اور جگر جگر کرتے مراد آبادی کٹورے میں گھڑے سے تخ ٹھنڈا پانی انڈیل کر دیور کو پیش کیا۔ وہ دیور سے ماں کی طرح محبت کرتی تھیں۔

سیّد مظہر علی نے دوپلی ٹوپی سر پر رکھی اور کھڑاؤں پہن کر عصر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ سیّد اختر علی نے مدینہ اخبار اٹھا کر حقّے کی نے اپنی طرف کرلی کیونکہ وہ بھی بڑے بھائی کے سامنے حقّہ نہیں پیتے تھے۔ دور درگاہ کی منڈیر پہ سے شاہ منوّر علی نے یا بدّوح کا دل ہلا دینے والا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اس مکان اور اس فضا پر ایسی اُداسی طاری تھی کہ کلیجہ پھٹتا تھا۔

باہر باؤلی کے نزدیک نیم تلے بھیڑ جمی تھی۔ نواب بھورے کا بھتیجا مُنّن خاں جوڈا کوؤں میں مل گیا تھا۔ بستی کے چند بے فکروں کے ساتھ بیٹھا چوسر کھیل رہا تھا اور پانسہ پھینکتے ہوئے بار بار جمشید کو چڑا رہا تھا ؎

مرغان چمن دیتے ہیں جا جھیل میں انڈے
مختار لوگ دیتے ہیں تعطیل میں انڈے

جمشید علی ایک طرف کو اکڑوں بیٹھا بے دلی سے کھیل دیکھ رہا تھا۔ جب مُنّن خاں نے تین چار بار اس کے باپ کی بے روزگاری پر اس طرح چوٹ کی تو غم و غصّے سے بھنا کر اس نے مُنّن کو ایک تھپّڑ رسید کیا، بساط اُلٹ دی اور باؤلی کی نالیاں پھلانگ کر لمبے لمبے قدم رکھتا خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

کھنڈر کے پیچھے چھپ کر اس نے چھنگلیا سے پلکیں خشک کیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ نرکٹ کی باڑ کے نیچے قبرستان تھا جس میں اِدھر اُدھر روئی کے چند پیڑ کھڑے تھے اور روئی کے سفید سفید پھول سارے قبرستان میں بکھرے ہوئے تھے۔ قبروں کے چاروں طرف اُونچی اُونچی گھاس تھی اور خاردار جھاڑیاں اور ناگ پھنی اور کروندے اور تھوہڑ کے پودے۔ چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے غار۔ ببول کے درخت۔ مٹی کی ڈھیریاں۔ سانپ کے بِل۔ سفیدی سے پُتے مزار۔ کچی قبریں۔ دور کونے میں شیشم کے نیچے مجاور اور گورکن کے کچے گھر کھڑے تھے۔ گورکن کی بیوی نے رات کے کھانے کے لیے چولہا سُلگا دیا تھا اور کھیکر کو لپیٹتا ہوا دُھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ ایک گوشے میں تین چار ٹوٹے ہوئے گھڑے بکھرے پڑے تھے۔ ایک قبر پر کسی نے چراغ جلا دیا تھا اور اس کی لَو سے کتبے کا طاقچہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سڑک کی رُخ والی منڈیر کے نیچے چنبیلی کی خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو چرواہنیں اپنی بکریوں کو ہنکا کر گھر لے جاتی ہوئی اُدھر سے گزریں اور چنبیلی کے سائے میں بنی ایک نئی قبر کو دیکھ کر ایک چرواہن نے کہا ——— "سہاگن کی قبر ہے۔ جبھی چنبیلی رات کو ایسی مہکت ہے ———" شام کے سنّاٹے میں سرد ہوا قبر پر جھکی بیری کی ٹہنیوں میں سرسرانے لگی۔

جمشید کو ڈر سا لگا، اُس نے چپّل جھٹک کر تلوے کے نیچے سے ایک کنکری نکالی اور مٹی کے تودوں اور اینٹوں کو پھلانگتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ شاید مہاوٹیں برسنے والی تھیں۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ جمشید بغلوں میں ہاتھ دیئے سُوں سُوں کرتا بہت دیر تک منڈیروں پر گھومتا رہا ——— ہاتھی پاربتی پور کی گڑھی کی طرف سے واپس آرہا تھا۔ تالاب کے کنارے گولر کے نیچے کھڑے ہو کر جمشید نے بڑی دلچسپی سے ہاتھی کو دیکھا اور اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چھوٹی بٹیا ہودے میں بیٹھی دوارکا پرشاد سے نل دمینتی کا قصّہ سننے میں اس قدر محو تھیں کہ ان کی سرخ چھتری ان کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

جمشید نے نقرئی موٹھ والی رنگ برنگی ریشمی چھتری زمین پر سے اُٹھائی اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہاوت کو آواز دی مگر ہاتھی بڑھل کے درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھتری ہاتھ میں لیے لیے گھر لوٹ آیا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے چھتری بیٹھک کے ایک کونے

میں کھڑی کر دی اور چکر لگا کر ڈیوڑھی کی طرف پہنچا۔ چپلیں اُتار کر ان کی گرد جھاڑی۔ ان کو دیوار پر رکھا اور پھر ایک پاؤں نالی پر ٹکا کر اندر آنگن میں کود گیا۔

اس کے تینوں اُداس شکلوں والے بزرگ، بڑے ابّا، چچا ابّا اور ابّا دالان میں تخت پر حسب معمول سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چچی دال میں بگھار لگا رہی تھیں۔ چچا ابّا کی لڑکی منظور النساء بلا وجہ اچھلتی کودتی پھر رہی تھی اور زور زور سے الاپ رہی تھی۔

"ڈنڈا ہرایا گلی رووت ہے
ڈنڈے کی ماں روٹی پووت ہے"

اتنے میں چچی باورچی خانے سے نکلیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور زور کا طمانچہ لگایا ——— "جب دیکھو تب کھیل ——— اتنی بڑی ہو گئی جب دیکھو تب کُدکڑے۔ دونوں وخت ملت ہیں۔ اپنے ابّا کے وضو کا پانی لگا ———"

منظور النساء بھائیں بھائیں کر کے رونے لگی اور پناہ لینے کے لیے باہیں پھیلا کر اپنے چچا زاد بھائی کی طرف دوڑی جو اسی وقت دیوار پر سے اندر کودا تھا۔ جمشید نے بے پرواہی سے اپنے چپل دیوار پر سے اتار کر اسے تھما دیے۔

"جا انھیں کوٹھری میں رکھ آ ———" اس نے لڑکی سے کہا۔ منظور النساء نے فوراً رونا بند کر دیا اور گرد آلود بڑے بڑے چپلوں کو بڑے پیار سے بانہوں میں سنبھالا گویا وہ اس کی چہیتی گڑیاں تھیں اور اندر چلی گئی۔

جمشید مونڈھا کھینچ کر اپنے بزرگوں کے قریب بیٹھ گیا۔ جھینگا پاسی کی عورت سائبان میں سے گائے کھول کر ناند کی طرف لے جا رہی تھی۔ باہر گاؤں کے گھروں میں چراغ جل چکے تھے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دالان میں آ کر روئی کے پردے چھوڑ دیے۔ مغرب کی اذان ہوئی۔ اندھیرا چھا گیا۔

شبرو مشعلچی نے سارے خیموں میں جا جا کر گیس کے ہنڈے، لیمپ اور لالٹینیں جمع کیں۔ ان کو باورچی خانے کی چھولداری کے سامنے لا کر ایک قطار میں رکھا۔ مدار بخش خدمت گار آئے، اس قطار کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جھاڑن سے شیشے اور چمنیاں صاف کرنی شروع کیں۔ چھوٹی بٹیا ایک طرف سے اچھلتی کودتی آئیں اور اکڑوں بیٹھ کر بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگیں۔ ان کو ہر شام یہ تماشہ دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔

مدار بخش نے چمنیاں صاف کرنے کے بعد بتیاں روشن کرنا شروع کیں اور ہمیشہ کی طرح پہلا لیمپ روشن کرتے ہوئے انھوں نے زیر لب کہا:

"چراغ روشن مراد حاصل صلوٰۃ صلوٰۃ سلام آلیکم یا منکر نکیر۔
دل میرا ایمان قبر میرا مکان ———"

"مدار بخش تمہارا مکان قبر میں کیوں ہے؟" چھوٹی بٹیا نے ایک بار پھر حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔

"شبیر ——— بُلاقن کو بھیجو ——— جنم جلی نے ابھی تلک استری گرم نہیں کی ———" دور کے خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی ———

چھوٹی بٹیا کو استری کا تماشہ بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تیر کی طرح بھاگتی ادھر پہنچیں ——— "ماما ——— ماما ——— بُلاقن جنم جلی کیوں ہے؟" اُنھوں نے دریافت کیا۔

"بھاگ جاؤ، یہاں سے ———"

"نہیں ——— بتائیے نا ماما ———"

"ہئی وہ جنم جلی ———" میم صاحب نے غصّے سے جواب دیا۔ دراصل اس وقت وہ دوار کا پرشاد سے مخاطب تھیں۔

"ماں باپ کو کھا گئی۔ میاں نے دوسری عورت کر لی۔ گھر کا بارہ باٹ ہو گیا مگر وہ نجنتی بھی کیا کرے۔ سب کرموں کا پھل ہے"

"ماما —— ماما —— کرموں کا پھل کیا ہوتا ہے ——؟"

"بیٹا چلیے آپ کو کمشنر صاحب آدکرتے ہیں" —— دوسرے چپراسی نے اندر آکر کہا وہ اسی تیز رفتاری سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔ کیمپ میں اس رات بڑا بندوبست تھا۔ چاروں طرف گیس کے ہنڈے چھک چھک کر رہے تھے۔ چھوٹی بٹیا کو آج خاص طور پر اجازت مل گئی تھی کہ وہ بڑوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ وہ خیمہ طعام میں اپنی اُونچی کرسی پر بیٹھی "انکل جانسن" کو جمبو کی سواری اور گڑھی پاربتی پور کے پالتو ہرنوں اور بارہ سنگھوں کا قصہ سنا رہی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے چھوٹی بٹیا کا قد بہت چھوٹا تھا اس لیے وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر ہی میز کے برابر آسکتی تھیں۔ میز کے سرے پر میم صاحب سورت کے روپہلی "پارسی" بارڈر والی پیازی ریشمی ساری اور وائٹ وے لیڈلا کلکتہ کے یہاں خریدا ہوا فراک پہنے روسٹ کاٹنے میں مشغول تھیں۔ سنہری مائل کتھئی بالوں کے گچھے مروجہ فیشن کے مطابق ان کی پیشانی اور کانوں پر چھائے ہوتے تھے اور انھوں نے کانوں میں انگریزی وضع کے بُندے پہن رکھے تھے جس میں طلائی زنجیروں کے سرے پر دو بڑے بڑے موتی لٹک رہے تھے۔ جب میم صاحب دوران گفتگو میں سرہلاتیں تو یہ بُندے گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہلتے۔ میم صاحب انگریز نژاد تھیں مگر انگریزی انھیں واجبی سی آتی تھی۔ اور شادی سے پہلے اپنے میکے میں سخت پردے میں ان کی پرورش ہوئی تھی لیکن ان کی سفید رنگت اور ذرا ولایتی چہرے مہرے کی وجہ سے نوکر چاکر انھیں "بیگم صاحب" کے بجائے اَدبدا کے میم صاحب کہنے پر مُصر تھے۔

میز کے نیچے انگیٹھی دہک رہی تھی۔ پرال پر بچھی ہوئی دری پر ملازمین قابیں اٹھائے دبے پاؤں اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ میم صاحب جانسن صاحب کو بسنتی بیگم کے اغوا کا قصہ سنانے لگیں۔ جانسن صاحب بہت نفیس اردو بولتے تھے۔

"مگر نواب بھورے بھی ایک گھاگ ہیں، پُرانے سیار۔ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ ہمیں بے چاری بوٹا بیگم پر بڑا ترس معلوم ہوتا ہے ——"

میم صاحب نے جانسن صاحب سے کہا۔

جنوری کی رات کی یخ بستہ ہوا تیز ہوگئی۔ خیمے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ سن سن کرتے گیس کی روشنی ذرا مدھم پڑی تو شبر وانے پھرتی سے اس میں ہوا بھر دی۔ مدار بخش نے لپک کر آخری کورس کے لیے پلیٹیں بدلیں۔ جب انھوں نے ایک قاب جانسن صاحب کے آگے پیش کی۔ جانسن صاحب نے نفی میں سرہلا دیا۔ مدار بخش نے بڑی متانت سے ان سے کہا —— "فِنِش" —— یعنی فنش —— یعنی یہ آخری کورس ہے۔ مدار بخش پُرتکلف دعوتوں کے موقعوں پر انگریز مہمانوں سے ہمیشہ انگریزی بولتے تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ان کے دادا، پردادا صاحب لوگ کے بنگلوں پر بولتے آئے تھے۔

جانسن صاحب نے میزبان خاتون سے ڈنر سروس کی تعریف کی اور میم صاحب نے انھیں بتایا کہ یہ روسی برتن انھوں نے پشاور سے منگوائے تھے جہاں ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کے مشہور روسی برتنوں کی ایک دوکان تھی۔ اس کے بعد جانسن صاحب نے کلکٹر صاحب سے کل کے شکار کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔

خیمے کی ایک دیوار ذرا زور سے ہلی اور درز میں سے دو متجسس، متحیر آنکھوں نے اندر جھانکا۔

جمشید نے ایک بار پھر ہمت کی کہ اندر جاکر چھتری میم صاحب کو دے دے لیکن ایک بار پھر اس الف لیلوی منظر میں کھو گیا۔

اب بلوری پیالے میز پر لائے گئے جن کے پانی پر گلاب کی سرخ پنکھڑیاں تیر رہی تھیں مگر ان لوگوں نے یہ پانی پینے کے بجائے پیالوں میں اپنی اپنی انگلیاں ڈبو دیں۔

جمشید نے سنہری بالوں والی بچی کو دیکھا جس کے عین مغز کے اوپر بڑا سا سُرخ ربن سجا تھا۔ اسے اپنی چچا زاد بہن منظور النساء یاد آئی جو کانوں کے بہت سارے سوراخوں میں چاندی کی میلی میلی بالیاں پہنتی تھی اور موٹی چھوٹی مارکین، ڈوریے اور گاڑھے کے خاک آلود کپڑوں میں بھٹکتی رہتی تھی اور بڑی ہوکر اس کے پلّے بندھے گی اور وہ دونوں کان پور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اسی سفید پوشی اور تنگ دستی کی زندگی گزار دیں گے جیسی زندگیاں ان کے باپ اور چچا اور دادا اور پردادا نے گزاری تھیں جب کہ میم صاحب اور کلکٹر صاحب اور ان کی برادری والے اسی طرح معطر پانی کے بلوریں پیالوں میں نفاست سے اپنی انگلیاں ڈبوتے رہیں گے۔

دیوار کا پردہ ہلتا دیکھ کر مدار بخش اچانک اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اندر جانسن صاحب نے سگار سلگایا۔ میزبانوں کو شب بخیر کہا۔ بچی کو پیار کیا اور لڑکھڑاتا ہوا چمکیلا، سفید نیپکن میز پر رکھ کر کرسی سے اُٹھے۔ دوارکا پرشاد نے باہر سے لپک کر دروازے کا پردہ اُٹھایا۔ جانسن صاحب بے حد لمبے تڑنگے انگریز تھے۔ وہ سر خم کرکے دروازے سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔ دوارکا پرشاد سُرخ بانات کی چپکن پہنے پھر دروازے کے پاس اپنے اسٹول پر آن بیٹھے۔ انھوں نے جمشید کے پیروں کی چاپ سن لی اور آہٹ پر کان لگا دیے ــــ "کو ہے؟" انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

جمشید ہڑبڑا کر سرپٹ بھاگا۔ بھاگتے ہیں وہ خیمے کے رسّوں سے اُلجھ گیا۔ دوارکا پرشاد اور دوسرے چپراسیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ چور چور، وہ سب چلاتے اور اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی۔

"چور ــــ سٹرؤ ــــ چوٹٹے!" دوارکا پرشاد نے جمشید کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔

"ہم چور نہیں ہیں ــــ" اس نے بھنا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے ــــ "ہم بٹیا کی چھتری دینے آئے تھے۔ ہمیں تالاب کے کنارے پڑی ملی تھی۔"

"سٹرؤ ــــ ہم کا پڑھاوت ہو بے ایمان۔" دوارکا پرشاد گرجے اور تین چار طمانچے اور لگا دیے۔

"مدار بخش" اندر سے میم صاحب نے آواز دی مگر مدار بخش بھی موقع واردات پر پہنچ چکے تھے۔

چھوٹی بٹیا نے دروازے میں سے جھانکا ــــ "ماما ــــ ماما ــــ ماما ــــ دوارکا پرشاد نے چور پکڑا ہے۔" انھوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

"یہ کیا ہلّا ہو رہا ہے۔" میم صاحب نے دروازے میں آکر دریافت کیا۔ دفعتاً جمشید نے آنسو خشک کیے اور میم صاحب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم چور اور بے ایمان نہیں ہیں۔ ہم سید جمشید علی ہیں۔ ہم درگاہ شریف کے شاہ منوّر علی کے بھتیجے ہیں۔ ہمارے چچا سید مظہر علی صبح آپ کو سلام کرنے۔" پھر اس نے جلدی سے الفاظ تبدیل کیے ــــ "آپ سے ملنے آئے تھے مگر آپ نے ان کو باہر ہی سے لوٹا دیا۔"

"شاہ منوّر علی۔" میم صاحب نے ذرا دلچسپی سے دہرایا ــــ "شاہ منوّر علی۔ ہم نے ان کی شہرت سُنی ہے۔ وہ جناتوں کو قبضے میں کرتے ہیں نا ــــ؟"

"بڑے ابّا کے قبضے میں کوئی جنات نہیں ہیں۔ مسلسل افلاس اور احساسِ محرومی سے ان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔" جمشید نے تلخی سے جواب دیا۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت بجنے لگے اور اس نے ایک سسکی بھری۔

"اندر آجاؤ ــــ باہر کیوں کھڑے ہو ــــ؟" میم صاحب نے کہا ــــ "مدار بخش پلیٹ لگاؤ۔"

"جی نہیں ــــ میں کھانا گھر سے کھا کر آیا ہوں۔"

میم صاحب نے اس کی بدلتی رنگت دیکھی۔ انھیں اپنا بیٹا سلمان یاد آگیا جو اسی طرح غیور اور خود دار تھا۔

وہ خیمے کے اندر آکر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"بٹیا۔ جمشید بھیا کا شکریہ ادا کرو۔ یہ اتنی سردی میں تمھاری چھتری دینے آئے ہیں۔"

چھوٹی بٹیا نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یُو" کہا۔

"اب گڈ نائٹ کہو۔"

"گڈ نائٹ ــــ!" اور اس کے بعد وہ مُلاقن کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

"تمھاری نواب شمس آرا بیگم سے قرابت داری ہے نا؟" میم صاحب نے دریافت کیا۔

سلمان نے سانس روک لیا اور اس کا رنگ سفید ہو گیا۔

"—— اتوار کے روز فوجی کونوائے کے ساتھ مسوری سے لاہور روانہ ہو گئے —— ڈاکٹر ہری رام ملہوترہ ۔ سردار خوشحال سنگھ اور لالہ گلاب چند ——"

کچھ دیر کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ سلمان اسی طرح ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ ثریا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اسے اپنے کمینے پن پر پشیمانی ہوئی۔ وہ جلدی سے اس کے لیے چاء بنا کر لے آئی۔

"ماما کا خط چند روز ہوئے ——" سلمان نے چاء میں شکر گھولتے ہوئے آہستہ سے کہا: "جس دن ان کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی اس کے اگلے روز انھوں نے لکھا تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔ اب تک سینکڑوں نوجوان لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔"

"گھبراؤ مت ——" ثریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا —— "وہ لوگ خیریت سے پہنچ جائیں گے۔"

کمرے کی بجلی فیل ہو گئی۔

"ہمیں ایک سگریٹ جلا دو۔"

ثریا نے فرش پر ٹٹول کر سگریٹ اور ماچس تلاش کی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔ سلمان نے سگریٹ جلایا۔ ثریا مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد سلمان نے آہستہ سے کہا —— "بابا بہار کے ایک قحط زدہ گاؤں میں ایک خانقاہ کے سائے میں فقر و فاقے سے مانوس صوفیوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ پی۔ سی۔ ایس میں نامزد ہوئے اور با اقتدار متوسط طبقے میں شامل ہو گئے مگر ذہنی لحاظ سے وہ ہمیشہ فقیر رہے —— مجھے ماما اور چھوٹی بٹیا کی فکر ہے۔ انھیں بڑے شدید جذباتی صدموں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"تمھاری مسوری والی کوٹھی جلا دی گئی —— ؟" ثریا نے پوچھا۔

"ہاں ——" اندھیرے میں سلمان کی آواز آئی —— "جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا۔ اسی عصبیت کے ہاتھوں اس سماج کے محل جلا دیے گئے مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ماضی کی محل سرائیں جل کر راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے —— کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہو رہا ہے ——" اس نے ماچس جلا کر گھڑی دیکھی اور دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا

"ثریا، مجھے سرحد پار بھیجا جا رہا ہے —— میرا ساتھ دو گی —— ؟"

وہ خاموش رہی۔

"میرے ساتھ تمھیں زندگی بھر تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی اور خدا جانتا ہے تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسایش کی مستحق ہو —— مگر میرے ساتھ تم کو دل کا چین ملے گا اور ذہنی سکون —— اور میری انتہاہ محبت ——"

"تم وہاں جا کر جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے۔ میں کہاں رہوں گی؟"

"تم سپاہی آدمی ہو ثریا —— جنگ جاری ہے۔ صرف محاذ بدل جائیں گے۔"

وہ خاموش رہی۔

"ثریا ——"

وہ خاموش رہی۔

وہ دیوار سے لگ گیا —— "ثریا" —— اس نے آخری بار کہا۔

وہ پھر بھی چپ رہی۔

کسی نے مقابل کے مکان میں لالٹین جلائی۔ اس کی مدھم سی روشنی کھڑکی میں سے آکر کمرے میں پڑنے لگی۔ سلمان نے ثریا پر نظر ڈالی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں گویا آخری بار اس کی تصویر اپنے دل میں محفوظ کرلینا چاہتا ہو —— وہ سیدھا کھڑا ہوگیا اور اس نے بڑی نارمل آواز میں کہا —— "اچھا بھئی ثریا —— اب ہم جاتے ہیں۔ صبح سویرے سفر پر روانہ ہونا ہے —— زندگی منتظر ہے منھ پھاڑے وغیرہ وغیرہ" اس نے ذرا ہنس کر اضافہ کیا —— "خدا حافظ" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا " Come on Shake Hand Like A Man"

وہ اسی طرح چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دفعتاً اس سے لپٹ گئی۔

"سلمان —— سلمان" اس نے سلمان کے شانوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا —— "میں وقتی طور پر قنوطی اور بزدل ہوگئی تھی۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھاری ساتھی ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمھیں کبھی مایوس نہیں کروں گی —— میں تمھیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔"

سلمان نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے پوچھا:

"وعدہ —— ؟"

"وعدہ —— ؟" ثریا نے آنسوؤں سے بھری آواز میں دہرایا۔

"ملاؤ ہاتھ —— !" سلمان نے کہا۔

"But not like a man" ثریا نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اس کے دل میں مادرانہ شفقت کا سیلاب اُمنڈ آیا جو ہر لڑکی اپنے محبوب کے لیے محسوس کرتی ہے۔

"صلح —— ؟" سلمان نے دوبارہ پوچھا۔

"صلح —— ! سلمان۔ کریک داس! کیا میرے وقتی ڈپریشن سے تم اتنا ڈر گئے؟ تمھیں معلوم ہے میں کتنی مُوڈی ہوں —— !"

"کیا کہنے ہیں آپ کے! پکا سوکی خالہ نہیں تو —— !! اچھا —— یہ بتاؤ کہ کب تک آسکوگی —— ؟"

"جیسے ہی اسکول نے استعفیٰ منظور کیا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع پہنچتے ہی بھجوا دینا سلمان —— !"

وہ دروازے میں جاکر چند لمحوں تک نیم تاریک کمرے میں کھڑی اس تنہا باہمت لڑکی کو دیکھتا رہا اور جلدی سے گلی میں اُتر گیا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا اور آخری مرتبہ اس چھوٹے سے مکان پر نظر ڈالی، جسے اتنے برسوں تک اس نے اپنی جدوجہد کا سمبل اور اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ یہاں کتنی شامیں اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جدلیاتی مادیت اور انقلاب پر بحثیں کرتے گزاری تھیں۔ ثریا کو اپنی پسندیدہ کتابیں لاکر دی تھیں۔ ٹالسٹائی۔ گورکی۔ رومن رولاں۔ جواہرلال نہرو۔ کرسٹفر کاڈویل۔ ہاورڈ فاسٹ (جن میں سے بیشتر کتابیں ثریا نے ابتدائی صفحوں سے آگے نہیں پڑھیں) اُس نے ثریا کو اہم مضامین اور اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات پڑھ کر سنائے تھے۔ وہ پڑھتا جاتا اور وہ ایزل کے سامنے کھڑی تصویریں بناتی رہتی۔ بعض مرتبہ وہ جھنجھلا کر کہتا:

"ثریا —— ثریا —— تم تو بالکل اسپ جہالت پر سوار ہو۔ سُنو —— لینن کا نظریہ آرٹ کے متعلق کیا ہے؟"

"ثریا —— احمق نہ بنو —— بالزاک پڑھا کرو ——"

"ثریا —— اب کی ٹرم یونیورسٹی جوائن کرلو ——"

"ساری دُنیا میری یونیورسٹی ہے!" وہ آنکھیں گھما کر بڑے ڈرامائی طریقے سے گورکی کا جملہ دہراتی۔ پھر وہ دونوں خوب ہنستے۔ ایک رات اس نے ثریا کو جولیس فیوچک پڑھ کر سنایا تھا اور کتاب ختم کرنے کے بعد وہ رونے لگا تھا۔

مکمل ذہنی رفاقت، مکمل جذباتی ہم آہنگی —— کس قدر خوبصورت اور مکمل ترین دوستی ان دونوں کی تھی۔ ثریا حسین اور سلمان مرزا —— ساتھیوں کے حلقے میں کتنے احترام سے ان کا نام لیا جاتا تھا۔ اس نرم و نازک، ذہین، دل کش، بہادر کسان لڑکی میں سلمان کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔

مستقبل کی عورت، آنے والے سماج کی ہیروئن جو محبوبہ، بہن، بیوی اور ماں، عورت کے ہر روپ میں مکمل ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے کسی خاندانی جاہ و جلال کے چھننے، کسی محل سرا کے جلنے کا غیر شعوری تاسف بھی نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ وہ اس طبقے کی ایک فرد تھی جسے اپنی زنجیروں کے سوا اور کچھ نہیں کھونا۔

اس کے پاس ریشمی ساری ایک نہ تھی۔ زیورات کے نام سے ناآشنا تھی۔ پاؤڈر، لپ اسٹک سے اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ فیشن ایبل سوسائٹی کے ڈنر پارٹیوں کا تذکرہ اس کے لیے وحشت خیز تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کو خاصی قابل رحم ہستی سمجھتی اور ہمدردی کے ساتھ اکثر سوچا کرتی ——— یا اللہ ——— یہ بے چاری اپنی ساری زندگی موٹر میں سوار ہو کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے اور سوئمنگ اور رولر اسکیٹنگ کرنے گزار دیں گی۔

سلمان اکثر اپنی بہن سے کہتا ——— "بٹیا چلو آج تمھیں ثریا کے یہاں لے چلیں۔ ڈھنگ کی چار باتیں ذرا تمھارے کان میں پڑیں گی!"

"ہرگز نہیں ———" چھوٹی بٹیا جواب دیتیں ——— "ایک بات تو یہ کہ آج ہمارے کالج میں فینسی ڈریس ہے۔ دوسرے یہ کہ ثریا باجی اس قدر بلندی سے ہم سے بات کرتی ہیں کہ ہمیں رونا آجاتا ہے ——— قسم سے!"

"ثریا کو تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں اور تم بھی کیا کرو۔ اپنے طبقے کی نمایندہ لڑکی ہو!" وہ ہنس کر کہتا۔

اسی سال ثریا کی تصویریں آل انڈیا نمائش میں دہلی بھیجی گئیں۔ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام اس کا "ون مین شو" الہ آباد میں منعقد ہوا اور ایل۔ ایم۔ سین نے لکھنؤ سے آکر اس کا افتتاح کیا۔ بڑے بڑے ادیب اور دانشور اس خستہ حال مکان میں اس سے ملنے آئے جس کا سارا فرنیچر چند مونڈھوں اور دو تین کرسیوں پر مشتمل تھا۔

سلمان کو اس ثریا پر کتنا فخر تھا۔ یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔ آج وہ اس ثریا کو ایک ان جانی مدت کے لیے تنہا چھوڑ کر بہت دور جا رہا تھا۔

ثریا کے کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا اور تیز تیز قدم رکھتا گھپ اندھیری رات میں گلی کے باہر نکل گیا۔

نئے ملک میں پہنچ کر سلمان سال بھر تک روپوش رہا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ بیاس عبور کرتے وقت ہی مار ڈالے گئے ہوں لیکن ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن لاڑکانہ میں مقیم ہیں۔ اپنے لیے حالات سازگار ہوتے ہی وہ لاڑکانہ پہنچا۔ پُرشور، گرد آلود بازار میں سے گزرتا، سندھی عاملوں کے ان سارے مکانوں پر نظر ڈالتا جن میں اب یو۔ پی کے مہاجر آباد تھے ——— وہ بالآخر اس پتے پر پہنچ گیا جو اسے اطلاع میں بتلایا گیا تھا۔

یہ کسی ہندو بنیے کا مکان تھا۔ دروازے پر ہنومان جی۔ لکشمی اور گنیش جی کی مورتیاں نصب تھیں۔ سیڑھیوں پر رنگ برنگے نقش و نگار بنے تھے۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر جھانکا۔ ماما صحن میں انگیٹھی رکھے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ بابا پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں اندر گیا۔

"بھیا" ——— بابا نے دیوانِ حافظ ایک طرف رکھ کر تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا: "ہم تمھارے استقبال کے لیے نہیں اٹھ سکتے کیوں کہ ہمارے پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔"

"بھیا ———" کچھ دیر بعد ماما نے اس کے آگے کھانا چنتے ہوئے کہا ——— "اگر ممکن ہو تو کراچی میں مکان لے کر ہم لوگوں کو وہاں بلالو۔ یہاں ان کے علاج کی بڑی دقت ہے۔ دنیا بھر کی بیماریوں نے انھیں آن گھیرا ہے ———"

"پروونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے ہیں۔ قصرِ سلمان متروکہ جائداد قرار دے دیا گیا۔ الہ آباد بنک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس انھوں نے منجمد کر لیے ہیں تاوقتیکہ دونوں ملکوں میں موویبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ تمھاری ماما کی زمینیں زمین داری کے خاتمے کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ"۔ بابا نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ انھوں نے اضافہ کیا ——

نہ عیش نہ دُکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

چھوٹی بِٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں۔ انھوں نے سلمان کو ہکا بکا ہو کر دیکھا۔ وہ بہت دُبلا اور کالا ہو گیا تھا۔ چھوٹی بِٹیا کی رنگت بھی صحرا کی دھوپ میں کمہلا چکی تھی۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

دوسرے روز چھوٹی بِٹیا نے بھی سلمان سے کہا۔

"بھیّا ـــــ اگر ہو سکے تو ہمیں کراچی لے چلو۔ ہماری پڑھائی کا دوسرا سال برباد جا رہا ہے۔"

"کوئی جگہ وہاں سُنا ہے۔ الٰہی بخش کولونی کہلاتی ہے۔ وہاں کوارٹروں کے کرائے سستے ہیں۔ وہیں انتظام کر لو۔ ہم سے پیسے لیتے جاؤ" ماما نے کہا

"پیسے ہیں ـــــ؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"مسوری سے نکلتے وقت جو گہنے ساتھ تھے وہی اب تک فروخت ہو رہے ہیں۔ چھوٹی بِٹیا گریجویٹ نہیں ہیں اس لیے ان کی تنخواہ بہت کم ہے۔" ماما نے جواب دیا۔

"بِٹیا کو بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کر لینا چاہیے۔" بابا نے کہا۔

"بھیّا جاتے ہی مکان ڈھونڈنا۔" ماما نے کہا۔

"جی اچھا۔"

"چائے پی لو۔"

"جی اچھا۔"

"کراچی میں اپنے کھانے پینے کا خیال رکھو۔"

"جی اچھا۔"

وہ مدتوں سے اس طرح کی اوائی توائی اور خطرناک زندگی گزار رہا تھا۔ میم صاحب بظاہر اس کی عادی ہو چکی تھیں مگر دل میں بُری طرح کڑھا کرتیں۔ ان کے چاند سے بیٹے نے برسوں سے کیسی جنگل کا نٹھ رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا۔ ان کے کیسے کیسے ارمان خاک میں مل گئے۔ وطن میں تھیں تو سارے ہم چشم دُر دُر پھٹ پھٹ کرتے۔ خاندان کی بیبیاں الاہنا دیتیں ـــــ انجمن آرا کا اکلوتا پوت ـــــ آوارہ نکل گیا۔ روز دوڑا آتی ہے۔ تین بار چھ چھ مہینے کی کاٹ چکا ہے۔ ایسے لڑکے کو کون اپنی بِٹیا دے گا ـــــ؟

وہ خود ثریا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا بے چاری بوٹا بیگم خود تو اللہ کا جی تھیں۔ لڑکی بڑی ہو کر ایسی بے تکی نکلی ـــــ بھیّا کو تو ایسی لڑکی چاہیے جو انٹلکچوئل، سوشلسٹ، آرٹسٹ، وارٹسٹ کچھ نہ ہو بلکہ ان کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھے۔ میم صاحب نے ایک دفعہ اظہار خیال کیا۔

"خیر ثریا باجی ایسی لمبی چوڑی انٹلکچوئل بھی نہیں ہیں ـــــ" چھوٹی بِٹیا نے ذرا جل کر جواب دیا تھا۔

"بے چاری ثریا کے متعلق تم یہ خالص نندوں والی جلی کٹی باتیں نہ کرو گی تو اور کون کرے گا ـــــ"، سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

"ثریا باجی آ گئیں ـــــ؟" چھوٹی بِٹیا نے بیٹھے بیٹھے دفعتاً سوال کیا۔

"معلوم نہیں ـــــ"، سلمان نے جواب دیا۔ پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ـــــ "ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ لیں تو اچھا ہے۔ پرسوں صبح ایک اخبار کی ملازمت کا انٹرویو ہے۔ اتنی مایوس نہ ہو بِٹیا۔ حالات اتنے خراب نہیں ہیں۔" اس نے بہن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ماں باپ سے رخصت ہوا۔

باہر جھکڑ چل رہا تھا۔ زرد رنگ کی جلتی جلتی ریت آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ تارک وطن ہندوؤں کے رنگ برنگے ٹائلوں والے مکانوں کی چھتوں پر بادگیر کے جنگل کھڑے تھے اور گرم ہوا بادگیر کے سوراخوں میں منڈلا منڈلا کر سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے

روزانہ کھوکھراپار عبور کرکے راجستھان۔ دلّی اور یوپی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلّوں میں چھاؤنی چھاتا۔ کیسی کیسی مصیبتیں اٹھاکر لوگ ہندوستان سے نکلے تھے اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں سلمان نے اسٹیشن کے راستے پر چلنا شروع کیا۔ سرخ رنگ کی عبائیں پہنے سندھی عورتیں چھکڑوں پر بیٹھی سامنے سے گزر گئیں۔ چاء خانوں میں ثریا اور شمشاد بیگم کے ریکارڈ چیخ رہے تھے۔ ایک غلیظ سے ریسٹوران کے آگے جس پر "کیفے ڈی پیرس" کا بورڈ لگا تھا۔ رام پور کے چند مہاجر ٹین کی کرسیوں پر بیٹھے زور زور سے باتیں کرنے میں منہمک تھے۔

"ابے چمن خاں۔ میں نے کہا ——— اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرالیا، یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔ میاں اگر تم نے اڑائی ہیں تو ہم نے بھون بھون کھائی ہیں۔ ہمیں بتّا بتاتے ہو ——— چھمن میاں سے نہ کہہ دیا ہو تو ———"

"ابیں جاؤ یار ——— یہاں ریاضت حسین خاں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اپنی بات کرو اپنی ———"

"کھال میں رہو کھال میں ——— میں نے کہا ———"

وہ آگے بڑھتا گیا۔ بازار میں چو طرفہ غل مچا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں، رنگا رنگ لہجے۔ رنگ برنگ لباس۔ خوانچے والوں کی صدائیں۔ ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے لیے از سر نو زندگی شروع کرنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سلمان نے سامنے کے منظر کو دیکھا اور سر اٹھاکر تیز تیز چلنا شروع کردیا۔

اسٹیشن پر بھی مہاجروں کی ریل پیل تھی۔ سلمان ان کو دیکھ کر سوچا کیا۔ یہ جانے کون کون لوگ ہوں گے۔ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے۔ پورب اور بہار کے باشندے جن کے چہروں پر اہمٹ اُداسی تھی۔ گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے رام پور اور بریلی کے بانکے۔ مرادآباد کے برتن فروش۔ علی گڈھ کے قفل گر۔ فیروزآباد کے چوڑی والے۔ فرخ آباد کے رنگ ریز۔ لکھنؤ کے زردوز اور شاعر۔ دلی کے کرخندار۔ اعظم گڑھ اور بنارس کے جولاہے۔ مرزاپور کے قالین باف۔ ان کی برقعہ پوش عورتیں اور بچّے۔

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اس گھمسان کا نظارہ کرتا رہا۔ وقت گزارنے کے لیے (ایک اسٹال سے کوئی رسالہ خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے) اس نے سندھی کی تیسری کتاب نکال لی۔

پیر الٰہی بخش کولونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔ صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں اور کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتے چپکا دیے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر مہاجر آباد تھے جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ ان کی زندگیاں خاصی بے آرام تھیں مگر ایک عجیب و غریب ولولہ اور قومی جوش سارے میں طاری تھا۔

چھوٹی بٹیا بی۔اے کے لیے کالج میں داخل ہوگئیں۔ سلمان کو ان کی طرف سے بہت فکر تھی۔ اپنے "ڈی کلاس" ہونے پر کڑھتے کڑھتے انھوں نے اپنی صحت تباہ کرلی تھی۔ ایک روز کالج سے لوٹ کر انھوں نے کہا:

"ماما ——— ماما ——— ہمیں ایک کالا برقعہ بنوا دیجیے۔"

"کیا ———؟" سلمان نے چونک کر پوچھا۔ جو پلنگ پر لیٹا پاؤں ہلا ہلا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔

"بس میں سب لوگ ہمیں بُری طرح گھورتے ہیں ہمیں سخت شرم آتی ہے۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ سب کی نظریں تیر کی ایسی ہمیں چبھتی ہیں۔ برقعے میں کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ کون جارہا ہے۔" اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی۔

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اور ایسی ایسی بسیں جن کو دیکھنے سے دل دہلتا ہے" چھوٹی بٹیا نے پلکیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ان بسوں میں تمھارے جیسے انسان ہی سوار ہوتے ہیں۔ بیٹا۔ تم اور انسانوں سے قطعی مختلف نہیں ہو" سلمان نے کہا۔

"بٹیا ———" بابا نے اپنی چارپائی پر سے کہا "یہ تمھارا خیال ہے۔ تمہیں چھوٹی بٹیا سمجھ کر کوئی نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پرواہ

نہیں ہے۔ انھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں۔"
"لیکن بابا، پرانے شناساؤں کے سامنے کتنی بے عزتی ہوتی ہے ہماری۔ رضیہ باجی وغیرہ ہمیں روز بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھتی ہیں اور زن سے کار میں نکل جاتی ہیں ——— اور آج ———"
"آج ——— ؟" سلمان نے پوچھا۔
"آج ہم گھنٹہ بھر بس کا انتظار کرنے کے بعد پیدل صدر کی طرف آ رہے تھے تو وہ ٹیبل ٹینس چیمپئن نہیں ہیں عالیہ سیّد ——— انھوں نے کار روک لی اور کہنے لگیں دھوپ بہت تیز ہے۔ آئیے میں آپ کو لفٹ دے دوں۔ یہ شکر ہے کہ وہ ہمیں جانتی نہیں ———" اتنا کہہ کر وہ سُوں سُوں کرتی منہ دھونے کے لیے غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔

کراچی پہنچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا اور میکلوڈ روڈ پر ایک متروکہ دفتر حاصل کیا۔ وہ ہندو تاجروں کے انخلاء کا زمانہ تھا اس لیے اسے اپنا کاروبار جمانے کے لیے بہت آسانی رہی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دو منزلہ کوٹھی عامل کالونی میں خالی ہوئی تو اس نے اپنے نام الاٹ کروالی۔ اس نے بڑی محنت اور توجہ سے اپنے کاروبار پھیلایا اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔
دوسرے سال وہ کان پور گیا اور اپنی ماں سے کہا:
اصغر اور انور کے امتحان ختم ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر چلی آئیے ورنہ عالیہ اور آپ میرے ساتھ ہی چلی چلیے۔ یہ لوگ بعد میں آ جائیں گے میں نے ایک بہت اچھے سینے ٹوریم میں آپ کے داخلے کا انتظام کر دیا ہے۔"
"اور فرحت بٹیا کو دیکھے محمد گنج نہ جیہو ——— ؟"
"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں مصروف آدمی ہوں۔ آپ لوگ فوراً میرے ہمراہ چلیے ورنہ بعد میں آ جائیے گا۔"
اگلے ہفتے وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر کراچی آ گیا۔ عالیہ کان پور سے بی۔ اے کر چکی تھی۔ یہاں آ کر اس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے ا وہ کان پور کالج میں بھی ٹیبل ٹینس کے کئی مقابلے جیت چکی تھی۔ یہاں وہ بہت جلد یونیورسٹی چیمپئن بن گئی۔
جمشید نے نو عمری میں آئی۔ سی۔ ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے وہ اس کو اب تک نہ بھولے تھے۔ وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر جا تھا کہ بڑے افسر کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ چھوٹے بھائیوں کو سی۔ ایس۔ پی کے امتحانات دلوائے گا۔ بزنس مین کا ایک بھا اعلیٰ عہدے دار بھی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے!
اپنی بیٹی فرحت النساء کو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ کچھ دنوں سے اس کے خیال نے جمشید کو بُری طرح ستانا شروع کر دیا۔ اس کی بچی ج بہت دُور کسی دُنیا میں ایک پسماندہ گاؤں کے ایک غربت زدہ کچے گھر میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چچا ابا کو خط لکھا۔ ویز بنوایا اور ہندوستان روانہ ہو گیا۔
گیارہ برس کے طویل عرصہ کے بعد جمشید محمد گنج پہنچا۔ (وہ ۱۹۳۸ء میں منظور النساء کو بیاہ لے جانے کے لیے آخری بار یہاں آیا تھا)۔ — اسٹیشن پر اُتر کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ گوبندوا یکہ لیے اسی طرح اس کا منتظر ہے۔ گویا وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اسکول سے گھر آیا ہو۔
"بھیا آئے گئیں ——— !" گوبندوا نے آگے بڑھ کر کہا۔
"گوبند ——— چاچا ——— ؟" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا ——— "تم کیسے آئے ——— ؟"
"چھوٹے ساہ جی بتائے رہن کی آج کی گاڑی سے آوت ہو ———"

جمشید نے یکّے پر چڑھتے ہوئے دقت محسوس کی — اور ذرا جھینپ کر اپنی قیمتی پتلون کی کریز پر نظر ڈالی۔

سیّد مظہر علی کے مکان پر تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ شمبھو دادا — شیخ رمضان — مولوی محمد حسن — توقیر میاں — پنڈت لچھمی نرائن — گوبردھن چاچا — رحمت بھیا — گوسائیں کاکا اور جانے کون کون۔ بچّے جوان ہو گئے تھے۔ جوان ادھیڑ ہو چلے تھے اور بوڑھے قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ گوبر چاچا نے اُسے گلے لگایا اور بھوں بھوں کر کے رو دئیے۔ جھینگا پاسی کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ احمقوں کی طرح منھ کھولے بھیّا کو تک رہا تھا۔ ساری بستی میں اودھم مچی ہوئی تھی ——— "جمشید بھیّا پاکستان سے آئے ہیں۔ بڑے رئیس ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی سونے کی گھڑی لگائے ہیں ——— بالکل جنٹ صاحب معلوم پڑتے ہیں ———"

جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا۔ جواب موجود نہ تھے۔ چپاتی بھانڈ مر چکا تھا۔ سلّو موہوڑن مر چکی تھی جو نکڑ پر سگریٹ پان بیچا کرتی تھی۔ نواب منّن خاں اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے۔

منظور النساء کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ جمشید آنے والے ہیں وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھرتی رہی تھی۔ اس نے دالان اور کوٹھریوں کی تن دہی سے صفائی کی تھی۔ گھر کے سارے برتن مانجھ مانجھ کر چمکا دیے تھے۔ جھینگا پاسی کی عورت کے ساتھ مل کر دالان اور سارا لیپا تھا۔ پلاؤ اور فرنی کے لیے چاول صاف کیے تھے۔ آدھی رات سے اٹھ کر صبح کا ناشتہ تیار کیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی یہ سرگرمی اور مصروفیت دیکھتے اور الم سے نظریں جھکا لیتے۔ فرحت النساء کے لیے اس نے تین دن اندھیرا پڑے تک صحن میں بیٹھ کر ہاتھ سے نیا جوڑا سیا تھا۔

ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو منظور النساء نے لڑکی کو نہلا دھلا کر گوٹے لچکے کا نیا جوڑا پہنایا۔ اس کے بالوں میں تیل لگا کر مینڈھیاں گوندھیں۔ ناشتے کا سامان تخت پر چنا اور خود اسی طرح بکھرے بالوں کو میلے دوپٹے میں سمیٹتی چہرے کا پسینہ خشک کرتی کوٹھے پر چلی گئی وہاں وہ چھت کے منڈیر سے لگ کر بیٹھ گئی اور پرنالے کے موکھے میں سے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی سڑک کو تکتی رہی۔ جب جمشید یکّے سے اترا تو منظور النساء نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور لرزتی رہی۔ جمشید نے سیّد مظہر علی کو جھک کر سلام کیا۔ گاؤں والوں کے گلے لگا ور اندر آکر اپنی بیٹی کو لپٹا لیا۔

شاہ منوّر علی خانقاہ کے حجرے میں سے نکل کر آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر منھ سے کچھ نہ بولے اور پھر خانقاہ واپس چلے گئے۔ سیّد ...ستر علی کو بلانے کے لیے بہت سے آدمی دوڑے مگر گومتی کے کنارے ان کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔

جمشید ہفتہ بھر وہاں رہا اور سارے وقت اس نے سیّد مظہر علی اور ان کے احباب کو کراچی کی ایسی محیر العقول داستانیں سنائیں کہ ن لوگوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بڑی مشکل اور محنت سے اس نے ان بوڑھوں کو ایکسپورٹ، امپورٹ، بلیک مارکیٹ، پگڑی، لائسنس، ...مٹ اور الاٹ منٹ کے معنی سمجھائے۔

"سمجھ گئے۔ پگڑی تو یوں جانو۔ جیسی ہم پنچ کے یہاں صاحب لوگ کی ڈالی ہوت رہی۔" شمبھو دادا نے سر ہلا کر کہا۔ "بجر بھینٹ نہ کہو ...ری کہہ لو۔"

"ای سب تو ہم ہُو جانت ہیں ———" پنڈت لچھمی نارائن مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ اس پوری محفل میں محض وہی ...نفِ اسرار تھے کیوں کہ ان کا انگریزی داں بھانجا کئی برس سے دہلی میں ٹھیکے لے رہا تھا اور اب اس نے بمبئی میں بھی بزنس اور ایکسپورٹ ...ورٹ شروع کر دی تھی اور ایک مرتبہ اس نے محمد گنج آکر اپنے ماما کو دہلی اور بمبئی کی بے انتہا محیر العقول داستانیں سنائی تھیں۔

"ہمرے گاؤں سے خالی دوئی ٹھو منئی بہوتے قابل نکسے ہن۔" توقیر میاں نے فخریہ کہا۔ "ایک تمہرا پھیگو اور ایک ای جمشید وا۔"

"اسلامی دار الخلافہ ہے۔ کراچی میں مساجد تو ایک سے ایک شان دار بن گئی ہوں گی" ——— مولوی محمد حسن نے کہا۔

"جی ———" جمشید نے مختصراً جواب دیا۔

"انگریزوں کو بڑی دقت پڑتی ہوگی تمھارے کے یہاں ۔" مولوی صاحب نے مزید اظہار خیال کیا۔

"کیوں ——— ؟" جمشید نے پوچھا۔

"ارے ام الخبائث جو ممنوع ہوگی ۔ ماشاءاللہ سے اسلامی ملک ہے ۔"

جمشید نے دل میں سوچا کہ اگر ان بے چاروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا عزیز بھتیجا کراچی جم خانہ میں روز شام کو گھڑوں وسکی لنڈھاتا ہے ———

"جی نہیں ——— ابھی تو ممنوع نہیں ہوئی ———" جمشید نے ذرا بے تعلقی سے جواب دیا۔

"ہمارے کے یاں تو لگ گئی ہے پابندی ۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"پابندی سے کیا ہوت ہے ۔" پنڈت لچھمی نارائن نے جو واقفِ اسرار تھے کہا۔

"بھیگو بتاوت رہا کی لوگ اب لک چھپ کے اور جیاستی پیت ہیں دارو ۔"

پابندی کیا شے ہے ۔ جمشید نے فلسفیانہ انداز میں سوچا۔ اخلاقی سیاسی، مذہبی پابندیاں ۔ گزر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پینے تھے پینے والے۔

بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا ——— اس نے دل میں دہرایا مگر اب اس کا دماغ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ۔ وہ پھر محمد گنج کی درگاہ کے نیم تلے واپس لوٹا۔

"بھیا تنک ای تو بتاؤ تمھارے کے ہاں قومی پہناوا کیا ہے ۔" توقیر میاں نے سوال کیا ——— "ہمارنے کے یہاں تو افسران کو حکم مل گیا ہے کہ ولایت جائیں تو قومی پہناوا پہنیں ۔" وہ مدینہ (بجنور) اور قومی آواز (لکھنؤ) باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

"پاکستان میں تو مستورات پردے میں رہتی ہوں گی ۔ اسلامی ملک ہے ۔" مولوی صاحب نے کہا ——— "ہمارے کے ہاں تو آزادی کی ہوا بہت چل گئی ہے ۔"

شیخ رمضان اور توقیر میاں اور دوسرے مسلمان بوڑھے پاکستان کی باتوں کو بے حد عقیدت سے سن رہے تھے۔

"فرحت النساء کیا پڑھ رہی ہے ؟" جمشید نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کے لیے اپنے چچا سے استفسار کیا۔

"ہم خود پڑھاتے ہیں ۔ اُردو اور قرآن شریف ۔ شمبھو بھیا انگریزی بھی پڑھا دیتے ہیں ۔ اے ۔ بی ۔ سی ۔ ڈی ۔ گوسائیں بھیا سے ہندی پڑھا رہے ہیں ۔" سید مظہر علی نے فخر سے بتایا۔ جمشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتے تھے ۔ وہ یہ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصہ بعد وہ فرحت النساء کو تعلیم کے لیے سوئٹزرلینڈ بھیج دے مگر اب چچا ابا اور شمبھو دادا اور گوسائیں کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اسے بے حد شرم آئی جیسے وہ ان افلاس زدہ لوگوں کا مذاق اڑانے والا ہو ۔ اپنی پستی اور ان معصوم لوگوں کی بلندی کا اسے شدت سے احساس ہوا ۔ وہ سر جھکا کر چبوترے پر نیم کے تنکے سے لکیریں کھینچنے لگا۔

منظور النساء کا اس سے پردہ تھا مگر جب تک وہ یہاں رہا وہ کواڑوں کی درزوں میں سے چھپ چھپ کر متواتر اسے دیکھا کی ۔ ایک بار اس کی ماں نے اسے اس طرح جھانکتے دیکھ پایا تو وہ اس پر برس پڑیں ——— "اری جنم جلی ۔ بھیا اب تیرے لیے نامحرم آئیں ۔ تیرا سامنا ہوگا تو گنا ہوئیے ۔ پاپ ہوئیے ۔"

"نامحرم آئیں ۔ ہمرے چچا کے پوت تو ہوں ۔" منظور النساء وہیں کواڑ سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور بلک بلک کر آہستہ آہستہ روتی رہی

جمشید فرحت النساء کو محمد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا ۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے لیے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ اب وہ گھر پہ اور اسکول میں فیری کہلاتی تھی اور چند سال کے اندر اندر بڑی اسمارٹ اور تیز و طرار TEEN AGER بن چکی تھی ۔ جو تنگ موریوں کی شلوار، بغیر آستین کی نہایت چست قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے

ایک قسم کا پٹہ سا کندھے پر ہلگائے رہتی تھی اور راک این رول کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اس نے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔
عالیہ گاہے بگاہے سید مظہر علی کو یہاں کی خیر خبر سے مطلع کرتی رہتی:
—— آج بھیا نے نئی کار خرید لی۔ ماشاءاللہ سے چالیس ہزار کی آئی ہے —— کل بھیا کاروبار کے سلسلے میں یورپ روانہ ہوگئے۔ یہ بھیا کا یورپ کا چوتھا سفر ہے —— میں اگلے مہینے نیویارک جا رہی ہوں (یہ امریکہ میں ایک بہت بڑا شہر ہے) —— فیری بٹیا اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مری گئی ہیں (یہ مغربی پاکستان میں ایک پہاڑی مقام ہے) ——

" میں یہ سطریں پرسکون اور ہرے بھرے سلہٹ کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ سامنے ڈھلوان پر سُرما ندی بہہ رہی ہے۔ عقب میں درختوں سے گھری ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ پہلو میں ندی کے سرخ رنگ کے عظیم الشان اور بلند و بالا آہنی پل پر سے رانگیروں، سائیکل رکشاؤں اور اِکا دُکا موٹروں کا لامتناہی جلوس گزر رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر تم کو دن بھر یہ "خط" لکھتی رہوں گی اور پھر اسے اپنے ٹرنک کی تہہ میں چھپا دوں گی۔ پچھلے برسوں میں مَیں نے اس طرح کتنے، اَن گنت مفصّل "خط" لکھ لکھ کر بکس میں مقفل کر دیے ہیں یا تلف کر دیے ہیں۔ ان مختصر اِکا دُکا سطور میں جو ہم دونوں فرضی ناموں سے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں ان کے رمز و کنائے۔ مبہم الفاظ، تلمیحات اور محتاط استعاروں میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش کے بعد جب میرا دم گھٹنے لگتا ہے تو میں بیٹھ کر بے حد لمبے چوڑے کھرے کھرے خط لکھتی ہوں۔ جب بھی تم سے "بلاکم و کاست" اور مفصل باتیں اور گپ شپ کرنے کو بے طرح جی چاہتا ہے تو میں کاغذ قلم لے کے بیٹھ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں۔ کاش یہ بلند سے تم تک پہنچ سکتے مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب میں یہ سارے طولانی دفتر تمہیں پڑھنے کو دوں گی تاکہ RETROSPECT میں تم سے ہم کلام ہو سکوں۔

ابھی سرکٹ ہاؤس کا چھدری داڑھی اور لمبے لمبے دانتوں والا شفیق بوڑھا بیرہ میرے لیے چاء لے کر آیا ہے۔ وہ مجھے اپنے گاؤں کے اور سلہٹ کے اولیاء کے بڑے دلآویز قصے سنایا کرتا ہے۔

رات کو سلہٹ کے بازار میں دور دور تک شمعیں جلتی ہیں، بڑا عجیب غیر حقیقی، پرستان کا ایسا نظارہ ہوتا ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں غدر کے وقت کے کسی انگریز فوجی افسر کی قبر ہے۔ اس کے چاروں طرف سبز گھاس پر ایک گائے دن بھر چرا کرتی ہے۔ یہاں پر کس قدر امٹ سکون ہے۔ کل میں نے چاء کے باغوں میں گھوم کر دن بھر اسکیچ بنائے۔

آج مجھے مشرقی پاکستان آئے پورے چھ سال ہو گئے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں مجھے تمہارے متعلق اطلاع ملی تھی کہ تم مشرقی پاکستان میں ہو۔ اس مبہم سی خبر کے بھروسے پر میں نے اسکول سے استعفیٰ دیا اور ڈھاکے آ گئی۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اطلاع غلط تھی۔ یہاں میں نے وہی جدوجہد اور محنت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے تم کو مجھ پر اتنا فخر ہے اور جس سے اب میں بری طرح تھک چکی ہوں۔ میرے کانوں میں تمہاری آواز گونجتی ہے۔ "خدا جانتا ہے ثریا، تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو —— کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب پدما کے گہرے پانیوں میں میری کشتی پہنچتی ہے تو بے اختیار میرا جی چاہا ہے کہ ندی میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں —— لیکن پھر تمہاری آواز میرے دل کے کانوں میں آتی ہے —— تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی؟ ہمیں مایوس نہ کرنا —— بہادر لڑکی —— سپاہی لڑکی!

بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم جھک مار رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے۔ میں بھی جھک مار رہی ہوں مگر پھر مستقبل کا بھروسہ آڑے آتا ہے۔ خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز مجھے ضرور ہی زندگی میں خوشی ملے گی —— "اُمید" بھی کیا چیز ہے!
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا۔

آج کل اسکول میں چھٹیاں ہیں جہاں میں آرٹ ٹیچر ہوں۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ سلہٹ آئی ہوں۔ اس کا شوہر یہاں دورے پر آیا ہے — وہ دونوں کل سے مولوی بازار گئے ہوئے ہیں اور میں آج دن بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔

مشرقی بنگال کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے پیارے ہیں، کبھی ایسا ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہو گے اور میں تمہاری موجودگی میں ان جنگلوں اور

ان ندیوں کی تصویریں بناؤں گی ؟

تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یار لوگوں نے اڑا دیا ہے کہ میرے فن کا "بنگالی پیریڈ" شروع ہوگیا ہے۔ بکواس! میں تو اپنی زندگی کا اہم ترین خوبصورت ترین، پیریڈ شروع کرنا چاہتی ہوں اور تمہیں خوب معلوم ہے اس پیریڈ کا نام کیا ہوگا ؟ ڈھاکے میں میری دو نمائشیں ہو چکی ہیں۔ تمہارے بغیر یہ گورکھ دھندا مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آج میری اکتیسویں سالگرہ ہے یعنی آج سے اکتیس برس قبل میں اس "آنسوؤں کی وادی" میں روتی چلاتی داخل ہوئی تھی۔ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں وہاں چاندی کے شمع دانوں کے بجائے شکستہ لالٹینیں تھیں۔ "ہیپی برتھ ڈے" کے سُروں کے بجائے گائے بیلوں کی گھنٹیاں تھیں اور چاکلیٹ کیک کے بجائے اوپلے تھے۔ میری اس دنیا میں سالگرہ کے جشن نہیں منائے جاتے تھے۔ تم جس طلسماتی دنیا میں پیدا ہوئے وہاں تمہاری "برتھ ڈے" پر قصرِ سلمان میں دھوم کی فینسی ڈریس پارٹی منعقد کی جاتی تھی! بہرحال، آج میں اس وقت پہلی بار اپنی سالگرہ منا رہی ہوں اور سالگرہ منانے کا طریقہ میں نے یہ سوچا ہے کہ میں تم کو اکتیس صفحے کا خط لکھوں گی اور اس کے بعد اڑتیس صفحات کا اس میں مزید اضافہ کروں گی جو تمہاری عمر کے اعداد ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں کی مجموعی عمر انہتر برس کی ہے یعنی تم اور میں ہم دونوں انہتر برس کے بوڑھے ہیں۔ ابھی میں نے آنکھیں بند کر کے تصوّر کیا ہے کہ ہم دونوں نے یہ انہتر برس اکٹھے گزارے ہیں۔ جوانی کے خواب اور ولولے اور جنوں خیزیاں۔ پختہ سالی کا جذباتی توازن۔ بڑھاپے کا آرام اور سکون اور رفاقت دردمندی۔ Calm of mind all Passion Spent.

پچھلے ہفتے یہاں آکر جب میں "قمر جہاں بیگم" کو ایک مختصر سا خط پوسٹ کرنے گئی تو مجھے ڈاک خانے کا راستہ معلوم نہ تھا اور میں سڑک پر چلتی ہوئی ایک سرکاری بنگلے میں داخل ہوگئی جسے دور سے میں ڈاک خانہ سمجھی تھی۔ میں سیدھے کمرے میں چلی گئی اور وہاں ایک شکستہ سا گاؤن پہنے ایک بنگالی وکیل مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا جرح کر رہا تھا! میں ضلع کی عدالت میں گھس گئی تھی! اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میرا اور تمہارا —— ہم دونوں کا —— عدالت سے کتنا تعلق رہا ہے!

تمہارا آخری خط مجھے چھ مہینے ہوئے ملا تھا جس میں تم نے صرف اتنا لکھا تھا —— "پرسوں رات بابا کا انتقال ہوگیا۔ اگر تم اس وقت میرے پاس ہوتیں تو میں اپنی آنکھیں تمہارے ہاتھوں میں چھپا لیتے اور خوب روتے —— بابا نے کبھی اس کا شکوہ نہ کیا کہ اگر ان کا بیٹا کہیں افسری کر رہا ہوتا تو ان کو یہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے۔"

اس کے بعد سے تم بالکل خاموش ہو —— نظربندی کی گذشتہ مدتوں میں تم مجھے برابر لکھتے رہے ہو۔ میں سوچ سوچ کر باؤلی ہوئی جا رہی ہوں۔ اب سُرماندی پر شفق کی سُرخی پھیل گئی ہے اور بازار میں موم بتیاں جھلملانے لگی ہیں۔ اور ——"

جمشید اپنے ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے لیے کاک ٹیل تیار کر رہا تھا۔ جب نوکر نے آکر اطلاع دی۔

"صاحب۔ کوئی بڑے میاں آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے والد ہیں ——"

"میرے والد —— ؟" جمشید جلدی سے باہر گیا۔

نارنجی کفنی میں ملبوس سید اختر علی موٹر رکشا میں بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا ٹین کا بکس، دری میں لپٹا ہوا بستر اور لوٹا ان کے قدموں میں رکھا تھا۔ انھوں نے آنکھیں اٹھا کر جمشید کو دیکھا اور مسکرائے۔ "ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے آئیں۔" انھوں نے اطمینان سے کہا۔

"میں یہ اہم اطلاع تمہیں بھجوا رہی ہوں کہ میں عنقریب کراچی پہنچنے والی ہوں۔ یہ چند سطریں میں تم کو نرائن گنج جاتے ہوئے لانچ میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ کراچی پہنچ سکوں اور جب تک وہاں کام نہ ملے میں ——"

ایک روز چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں تو انھوں نے چائے پیتے ہوئے حسبِ معمول صبح کے اخبار میں "ضرورت ہے" کا کالم پڑھنا شروع کیا۔ ایک بڑی فرم میں ریسپشنسٹ کی جگہ خالی تھی۔

دوسری صبح اسکول سے چھٹی لے کر وہ اس پتے پر ویسٹ وہارف کی ایک نئی عمارت پر پہنچیں۔ تیسری فلور کی گیلری میں ایک اینگلو پاکستانی لڑکی نے ان سے پوچھا:

"یس پلیز؟"

چھوٹی بٹیا نے بہت گھبراتے ہوئے بیگ سے اخبار کا تراشا نکالا۔

"امیدواروں کا انٹرویو کون کرتا ہے؟"

"مینیجنگ ڈائریکٹر خود ——— آپ کا ان سے اپوائنٹمنٹ ہے؟"

"نہیں ———"

"اپنی درخواست مجھے دے دیجیے۔"

"درخواست تو میں نے لکھی نہیں ہے۔"

لڑکی کو چھوٹی بٹیا کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ترس آگیا۔

"آپ یہیں ٹھہریے۔ میں باس سے کہتی ہوں۔"

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور چھوٹی بٹیا اس کے ساتھ ساتھ ایک اور خنک اور نیم تاریک جھل مل کرتی گیلری میں سے گزرتی ایک وسیع ایرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں جس میں بہت بڑا سبز رنگ کا قالین بچھا تھا اور ہلکی سبزی مائل سفید جھلملیوں والے طویل دریچے کے نیچے اور ایک طویل و عریض میز کے اس پار مینیجنگ ڈائریکٹر گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھا۔ وہ سانولی رنگت کا خاصا خوش شکل آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ آنکھوں میں سنجیدگی اور ایک نوع کی سوچ تھی۔ دستخط کرنے کے بعد اس نے ڈکٹافون میں کچھ کہا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ اینگلو پاکستانی لڑکی چھوٹی بٹیا کو اندر پہنچا کر جا چکی تھی۔ وہ میز کے قریب جا کر کھڑی ہوگئیں مگر مینیجنگ ڈائریکٹر اسی طرح کاغذات میں منہمک رہا (یہ اس کی خاص تکنیک تھی۔ تاکہ نووارد پر ظاہر ہو سکے کہ اس کا ایک ایک منٹ کتنا قیمتی ہے)

فائل بند کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔

"سلام علیکم ——— فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کے یہاں ایک جگہ خالی ہے۔"

"جی ہاں ——— جی ہاں ——— تشریف رکھیے۔" اس نے امیدوار کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ لڑکی میں شدت کی سیکس اپیل تھی۔ چھوٹا سا قد، بہت سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں، سنہری مائل بال۔ بالکل جاپانی گڑیا ایسی۔ بالوں کی اس نے خوب موٹی سی ایک چوٹی گوندھ رکھی تھی جو تراشیدہ بالوں کے مروجہ فیشن کے مقابلے میں بہت انوکھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے دل میں فوری فیصلہ کرتے ہوئے دریافت کیا:۔

"سلمیٰ مرزا۔"

اس نے کاغذ پر نام لکھ لیا۔

"کوالی فیکیشنز؟"

"بی۔اے۔بی ٹی۔"

"پہلے کبھی کام کیا ہے؟"

"جی نہیں ـــــــ جی ہاں ۔ ـــــ جی ہمارا مطلب ہے، ہم نے کسی دفتر میں کام نہیں کیا ۔ ہم اسکول ٹیچر ہیں ۔"

مینجنگ ڈائرکٹر، لڑکی کے اس "ہم" کہنے کے انداز پر زیرِ لب مسکرایا ۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے کہا :

"بہت خوب ۔ دیکھیے ہمارے یہاں صرف یہ کام ہے کہ یہاں دفتر میں آپ کو ہمارے غیر ملکی کلائنٹس کو ریسیو کرنا ہوگا ۔ علاوہ ازیں جب کبھی ہم غیر ملکی تاجروں، اعلیٰ افسروں وغیرہ کو ہوٹل یا جم خانہ وغیرہ میں مدعو کریں تو ان کو انٹرٹین کرنے کے سلسلے میں بھی آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی ۔"

"مگر ـــــــ" چھوٹی بٹیا نے کہنا چاہا ۔

مینجنگ ڈائرکٹر نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی ـــــــ "آپ یقیناً آج کل کے مغربی طور طریقوں سے واقف ہوں گی اور ڈانس بھی کر سکتی ہوں گی ۔ معاف کیجیے گا یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے پچھلے دنوں ایک پاکستانی لڑکی کا اسی کام پر تقرر کیا مگر وہ پارٹیوں میں بات کرتے گھبراتی تھی ۔ اور ٹیبل مینرز (TABLE MANNERS) سے اچھی طرح واقف نہ تھی ۔ تو میرا مطلب ہے کہ آج کل اعلیٰ پیمانے کے کاروبار میں پبلک ریلیشنز کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے ۔ میں کسی یورپین لڑکی کو بآسانی اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں مگر آپ جانتی ہیں آج کل یورپین اور امریکن حضرات مشرقی خواتین سے کس قدر متاثر ہیں ۔"

"جی ـــــــ لیکن ـــــــ ہم ۔ ۔ ۔ ـــ"

مینجنگ ڈائرکٹر فوراً بھانپ گیا کہ امیدوار یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے جھجک رہی ہے مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی غیر معمولی دل کشی اور سکس اپیل کی مالک لڑکی اسے آسانی سے دستیاب نہ ہوگی اور اسے اپنا "آئیڈیا" "سیل" کرنا بھی خوب آتا تھا ۔ اس نے لڑکی کو سمجھانا شروع کیا ـــــــ چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے وہ پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹا ۔ "مثال کے طور پر ـــــ یہ دیکھیے کہ مغربی ممالک کی مشہور ایرلائینز اپنی ایر ہوسٹس لڑکیوں کو ساریاں اور کیمونو پہنا رہی ہیں ۔ محض اس لیے کہ مسافروں کو ۔ ـــــــ"

"جی ـــــ مگر ـــ"

"نیویارک کی اقوامِ متحدہ میں خود دیکھ کر آیا ہوں جو گائڈ لڑکیاں مشرقی ممالک کی ہیں ۔ ان کے پیچھے سیاحوں کا جمِ غفیر چلتا ہے ۔ یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں ہے ۔ تو پھر طے ہے ۔ ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی مکمل سکرٹری ثابت ہوں گی ـــ ۔ پہلی مارچ سے میں آپ کا تقرر کیے لیتا ہوں ۔ آپ کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ہوگی ۔" اس نے کن انکھیوں سے اُمیدوار لڑکی کا ردِ عمل دیکھا اور گھنٹی بجائی ۔ دبیز پردوں میں سے ایک سیاہ فام گوانی کلرک جن کی طرح نمودار ہوا ۔

"مسٹر پیٹرک ۔ ـــ آپ مس مرزا ہیں ۔ ان کو میں اپنا سوشل سکرٹری مقرر کر رہا ہوں ۔ ان کا ذاتی فائل تیار کیجیے ـــــ"

"یس سر ـــــ"

پندرہ منٹ کے اندر اندر ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار پر اس کا تقرر ہو گیا ۔ یہ بات چھوٹی بٹیا کو بہت عجیب لگی ۔

"لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ اشتہار آفس ریسپشنسٹ کے لیے تھا ۔" انھوں نے ایک بار احتجاج کیا ۔

"جی ہاں ـــــ مگر آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا خیال بدل دیا ۔" مینجنگ ڈائرکٹر نے کرسی کا رُخ گھمایا اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر دل میں سوچا ۔ بہت بھولی اور ذرا بے وقوف بھی ہے اور بے حد ضرورت مند اور ناتجربہ کار تو یقیناً ہے ۔

"دوسری بات یہ ۔ ۔ ۔ ـــ" اس نے بآوازِ بلند کہا ۔ ۔ ـــ "کہ آپ رہتی کہاں ہیں ؟"

چھوٹی بٹیا نے اپنا پتہ بتلایا ۔

"اوہ !" ـــ مینجنگ ڈائرکٹر کے منہ سے نکلا ۔

چھوٹی بٹیا ساری کا پلّو سنبھال کر اُٹھیں ۔

"آپ کو یہ ملازمت منظور نہیں ہے ؟"

چھوٹی بٹیا نے لحظے بھر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

بابا کے انتقال اور بھیّا کے جیل چلے جانے کے بعد وہ اسی طرح نشستم پشستم ایک پرائیویٹ اسکول میں پونے دو سو روپے ماہ وار پر پڑھاتی رہی تھیں۔ وہ ہر اتوار اپنے بھیّا کے لیے اچھے اچھے پھل، اور ان کے پسندیدہ سگریٹ اور نئی نئی کتابیں اور رسالے لے جانا چاہتی تھیں مگر وہ اس تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ پھر بھیّا یہاں سے کہیں بہت دُور بھیج دیے گئے تھے اور اسے بہاول پور کے ایک گرلز اسکول میں سکنڈ مسٹریس کی جگہ مل گئی تھی۔ کولونی کا مکان انھوں نے بہار سے آئے ہوئے ایک ددھیالی رشتے دار کے حوالے کیا تھا اور ماما کو ساتھ لے کر بہاول پور چلی گئی تھیں۔ وہاں زندگی کے مزید پانچ جھلسے ہوئے برس انھوں نے تپتے ہوئے ریگستان کے وسط میں ایک دُور افتادہ، گمنام تحصیل میں لڑکیاں پڑھاتے گزارے تھے۔ وہاں ماما پر دل کے دَورے پڑنے لگے تھے۔ اس تحصیل میں ان کا علاج ناممکن تھا اس لیے وہ ماما کو ساتھ لے کر پھر کراچی آگئی تھیں پچھلے ایک برس سے وہ پھر کولونی کے اسی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہی تھیں۔ جس پر اب ددھیالی رشتہ دار نے قبضہ کرلیا تھا اور اسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ اس ایک برس میں کلیم کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی دَوڑ بھاگ میں بسوں اور سائیکل رکشاؤں پر اور پیدل، شہر کی خاک چھانتے چھانتے اب ان میں سکت نہ رہی تھی مگر بھیّا کا کبھی کبھار جو خط آتا تھا وہ اس میں کتنے پیارے الفاظ میں ان کی ہمّت بندھاتے تھے ——— اور وہ پھر سر اُٹھا کے زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بابا کو مرے، بھیّا کو گھر سے گئے کتنی مدّت گزر گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء آچکا تھا۔ پچھلے پندرہ برس میں ایک دن، ایک رات ایسی نہ آئی تھی جب وہ فکروں اور پریشانیوں اور رنج والم سے ایک لمحے کے لیے آزاد ہوئی ہوں۔ جب انھیں روزی کمانے کے لیے جی توڑ کر محنت اور تگ و دو نہ کرنا پڑی ہو۔ ساڑھے سات سو روپیہ ماہ وار ——— ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار ——— ناقابلِ یقین ——— ——— اور دُنیا کی لڑکیاں دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔ دفتر میں سکریٹری کا کام کرنا قطعاً کوئی گھٹیا بات نہ تھی ——— بھیّا نے ان کو کتنی بار سمجھایا تھا ——— "بٹیا تم دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف نہیں ہو ———" اور پچھلے پندرہ برسوں میں انھوں نے بھیّا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں تھیں اور بھیّا کو ان پر کتنا بے پناہ فخر تھا ——— میری بہادر بہن ——— میری سپاہی بہن۔

انھوں نے فیصلہ کرلیا ———

"جی ہاں ———"

"گڈ! پہلی تاریخ کو ساڑھے آٹھ بجے صبح ہماری مائیکرو بس آپ کو پک اپ کرنے آجائے گی۔"

دفعتاً چھوٹی بٹیا ایک بار پھر گھبرا گئیں ——— "مگر ——— مگر ہمیں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ تو آتا ہی نہیں۔"

"نیور مائینڈ ——— ہمارے یہاں آدھی درجن ٹائپسٹ لڑکیاں موجود ہیں ——— پہلی تاریخ ساڑھے آٹھ بجے ——— خدا حافظ مس مرزا۔"

گھر میں داخل ہو کر چھوٹی بٹیا نے پھولے ہوئے سانس سے آواز دی ——— "ماما ——— ماما ——— ہمیں ساڑھے سات سو کی نوکری مل گئی ——— ایک دم ساڑھے سات سو ——— اور آنے جانے کے لیے موٹر ———"

"اچھا ———" ماما نے مختصر جواب دیا۔ انھوں نے کلکٹر صاحب کی موت کو برداشت کرلیا تھا مگر سلمان کے جانے کے بعد سے انھیں چُپ لگ گئی تھی۔

دہلیز پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے منہ پر چھپکے مارتے ہوئے اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بٹیا سوچا کیں ——— مینجنگ ڈائرکٹر آدمی تو خاصا معقول نظر آتا تھا۔ اس کے فوراً بعد بوس اور سکریٹری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت، اس سے متعلق لطیفے اور کہانیاں ان کے ذہن میں گھوم گئیں۔ لوگ ہمیں کیا سمجھیں گے۔ سستی، گھٹیا سکریٹری لوگ کیا کہیں گے ——— بٹیا۔ یہ تمھارا خیال ہے۔ لوگوں کو تمھاری اتنی پرواہ نہیں ہے ——— انھیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں، انھیں بابا کے الفاظ یاد آتے، مگر یکم مارچ سے وہ اس مشتبہ ملازمت پر جانے والی تھیں۔ انھوں نے فوراً ساڑھے

سات سو روپیہ کا تصور کیا۔ ساڑھے سات سو روپیہ ماہ وار ایمکیشنٹ ——— فنٹاسٹک ——— اتنی بڑی رقم انھوں نے مدّتوں سے نہ دیکھی تھی۔ انھوں نے پہلی تنخواہ کا بجٹ بنایا۔ سب سے پہلے تو بھیّا کے لیے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں گے۔ سب سے پہلے ایک عمدہ سا شیونگ سیٹ۔ بھیّا کا شیونگ سیٹ اب تک کتنا خستہ حال ہو چکا ہوگا۔ نئے پاجامے اور قمیص بنوائیں گے۔ بہت سارے چاکلیٹ کے ڈبّے اور سگریٹ کے ٹین لیں گے۔ بھیّا نے پچھلی مرتبہ ایک کتاب کے لیے لکھا تھا جو وہ بے حد پڑھنا چاہتے تھے اور طامس اینڈ طامس میں جاکر دیکھا تو اس کی قیمت پچیس روپے نکلی۔ اب ان کے لیے پچیس روپے کی کتابیں خریدنا کیا مشکل ہے۔ ہمارے پاس ساریاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ اس مہینے تو صرف سَو روپیہ کی ساریاں خریدیں گے اور ایک جوڑا نئی سینڈلز سیاہ رنگ کی، جو ہر ساری کے ساتھ چل جائے اور منیجنگ ڈائریکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں جانا ہوگا۔ اس کے لیے کیا ہوگا؟ اس کے لیے تو بہت عمدہ ساریاں خریدنی پڑیں گی۔ اور میک اپ کا سامان ——— خیر میک اپ تو میں کبھی نہ کروں گی۔ بھیّا کو پاؤڈر لپ اسٹک والی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہے۔

اچھا اور دوسری بات یہ کہ اس آدمی نے کوئی ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو ہم فوراً استعفیٰ دے دیں گے ——— یہ طے کرکے ان کو یک گونہ سکون ہوا اور وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

سید اختر علی کا کمرہ جمشید کی کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا۔ جہاں وہ مسہری پر دن بھر چپ چاپ لیٹے رہتے۔ ان کی بیوی سینے ٹوریم سے صحت یاب ہو کر آ چکی تھیں مگر ان سے شوہر کی ملاقات بہت کم ہوتی۔ سید اختر علی کو زندگی میں پہلی بار آرام، آسائش اور سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پیٹ بھر کر اچھے سے اچھا کھانا کھاتے اور سوتے رہتے۔ ایک ملازم محض ان کی خدمت پر مامور تھا۔ مکمل اطمینان اور سکون کی وجہ سے ان کی دماغی حالت رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی اور جب ان کے دماغ نے دوبارہ باقاعدگی سے کام کرنا شروع کیا تو وہ اس مسلسل بے کاری سے اُکتا گئے ——— "ابّا" جمشید نے ان سے کہا جس کا بیسوں نارمل اور "اب نارمل" ہر طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑتا تھا اور جو اچھا خاصا ماہر نفسیات ہو چکا تھا ——— "کمپنی لا کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیا کیجیے۔ آپ کی قانون دانی میری فرم کے کام آئے گی۔" چنانچہ سید اختر علی بے حد ذوق و شوق سے قانون میں کھو گئے۔ تقریباً اٹھارہ سال بعد انھوں نے اپنے ایل ایل بی کے علم کو دوبارہ بروئے کار لانا شروع کیا۔ کبھی کبھی وہ جمشید کے دفتر بھی جانے لگے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ بیٹے کے کاروباری معاملات میں گھل مل گئے۔

ثریا کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں اتری جو چند برس قبل ڈھاکہ اسکول میں اسٹاف پر اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اس نے دبی دبی زبان سے سلمان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی ——— مگر جن لوگوں سے اس نے یہ استفسار کیا، انھوں نے اسے ذرا عجیب اور مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ چند روز بعد اسے پتہ چلا کہ سلمان کو کراچی سے بہت دُور کسی نامعلوم جگہ پر ایک نامعلوم مدّت کے لیے منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس نے چھوٹی بٹیا کی تلاش شروع کی۔ سلمان نے اپنے خطوں میں احتیاط کی وجہ سے کبھی چھوٹی بٹیا کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ نہ کبھی ان کا پتہ تحریر کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں چھوٹی بٹیا جیسی گمنام اور مختصر ہستی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا لیکن ایک روز ثریا کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اب کراچی میں نہیں ہیں اور غیر معروف دور افتادہ مقام پر کسی اسکول میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا پتہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ ثریا خاصی مشہور آرٹسٹ تھی۔ اسے ایک گرلز کالج میں آرٹ کی لیکچررشپ مل گئی۔

اسٹاف کی چار پانچ لڑکیوں نے ناظم آباد اور پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں تین تین سو اور چار چار سو گز کے پلاٹ خرید لیے تھے اور ان پر اپنے مکان بنوا رہی تھیں۔ انھوں نے ثریا سے اصرار کیا۔ کراچی میں مکان کرائے پر لے کر رہو گی تو دیوالہ نکل جائے گا تم بھی قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کروالو۔ ثریا نے "سوسائٹی" میں چار سو گز زمین قسطوں پر خریدی ——— مکان کی تعمیر کے لیے قرضہ لیا اور چھ مہینے میں بیس ہزار کے صرفے سے اس کی خوبصورت کاٹج تیار ہو گئی۔ بوٹا بیگم نے اس کا باورچی خانہ اپنی پسند کا بنوایا۔ چونکہ دونوں ماں بیٹیاں سمندری راستے سے مشرقی پاکستان سے آئی تھیں۔ بوٹا بیگم ڈھاکے سے باورچی خانے کا رتّی رتّی سامان، پتیلیاں، کرچھے، ڈوئیاں، توا، چمٹا، سل بٹہ، ہاون دستہ، ایک بڑی سی بوری میں بھر کے ساتھ لیتی آئی تھیں لیکن فرنیچر خریدنے کے لیے ثریا کے پاس پیسہ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی ساری تصویریں ڈھاکے سے لے آئی تھی مگر ابھی وہ ان آرٹسٹوں میں نہیں تھیں جن کی تصاویر

دھڑادھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ یوں بھی کراچی میں پینٹنگز کے خریدار بہت زیادہ نہیں تھے۔ اس نے ناظم آباد والی سہیلی سے ادھار لے کر دو سیکنڈ ہینڈ کرسیاں دو میزیں اور دو نواڑی پلنگ خریدے۔ غسل خانے کی چوکی، ایک اسٹول، نوٹا بیگم کے لیے نماز کا چھوٹا سا تخت، اور پرانی ناظم آباد والی سہیلی نے لمبے مستعار دے دی۔

نوٹا بیگم مدتوں پہلے جب محمد گنج میں رہتی تھیں تو ڈولی میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔ قصر سلمان میں بھی انھوں نے اپنا پردہ قائم رکھا۔ کلکٹر صاحب سے ان کا کانا پردہ رہا۔ پرانے کرشے کے مکان میں البتہ وہ ثریا کے تین چار دوستوں کے سامنے آگئیں۔ وہ سب انھیں بڑے پیار سے "اماں —— اماں ——" کہتے اور کرید کرید کر بے حد دلچسپی سے ان سے گاؤں اور گڑھی کے قصے سنا کرتے تھے۔ ڈھاکے آکر نوٹا بیگم نے کبھی کبھی ساری پہننا شروع کر دی۔ گو برقعہ ترک نہ کیا مگر کراچی میدانِ حشر تھا۔ یہاں ان کا پردہ زیادہ عرصہ نہ چل سکتا تھا۔ کاٹیج انھوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی۔ اس لیے ٹھیکیداروں اور راج مزدوروں کے سامنے آنا پڑا۔ اس کے بعد گھر جمانے کی ساری بھاگ دوڑ انھوں نے خود کی۔ انھوں نے برقعہ اتارا اور بسوں اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھ کر مختلف کاموں کے لیے سارے شہر کے چکر لگانے شروع کیے۔ پڑوس کی کوٹھیوں کی "یوپی والی" بیبیوں سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اب وہ بیگم حسین کہلاتیں اور ساری پہنے، بڑی متانت کے ساتھ آنچل سے سر ڈھکے، براؤن پلاسٹک کا بیگ اور گلابی پلاسٹک کا جالی دار تھیلا ہاتھ میں سنبھالے، سائیکل رکشا پر بیٹھی لوری بازار جاتی نظر آتیں۔

ثریا دن بھر اپنی مصروفیتوں میں لگی رہتی اور سلمان کو بھلائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ رات کے سناٹے میں سلمان کی فکر اور یاد اسے کھا جاتی مگر کتابوں رسالوں، سیاست، دنیا کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ اپنی مصوری سے سلمان کی یاد سب سے زیادہ وابستہ تھی۔

ان دنوں اسے پیسے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ زمین اور مکان کے قرضے کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ نوٹا بیگم کا دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ اس کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں تھے اور وہ ڈھاکے میں خریدی ہوئی ساریوں ہی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ تصویر بناتے وقت بھی ننانوے کے پھیر میں پڑی رہتی۔

ایک روز وہ ڈھنڈار کمرے میں ایزل کے سامنے کھڑی اپنی تازہ تصویر مکمل کر رہی تھی کہ باہر ایک چمکیلی شیورلے آن کر رکی اور زنگ موریوں کے سلیکس میں ملبوس ایک بے حد اسمارٹ لڑکی اندر آئی۔ اس کے ساتھ دو امریکن خواتین تھیں۔

"میں عالیہ سید ہوں ——" لڑکی نے کہا ——" آپ کا پتہ مجھے آپ کے کالج سے معلوم ہوا۔ یہ میری دوست کچھ پاکستانی پینٹنگز خریدنا چاہتی ہیں ——"

نوواردوں نے چاروں طرف دیکھا اور بیٹھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو فرش پر گھٹنے ٹیک کر تصاویر دیکھنے لگیں۔ دونوں سکنڈ ہینڈ کرسیاں پچھلے برآمدے میں رکھی تھیں۔ ان پر نوٹا بیگم نے کپڑے دھو کر پھیلا دیے تھے۔ اسٹول باورچی خانے میں تھا۔ ثریا کو اس وقت شدت کی کوفت ہوئی —— تصویروں کے خریداروں کو بٹھانے کے لیے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اشد ضروری تھا۔

امریکن عورتوں نے تین تین سو روپے میں سہلٹ کے دو مناظر فوراً خرید لیے۔ ثریا نے عالیہ سید کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ سید نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور اسے بتایا کہ اسے اتنی بڑی آرٹسٹ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ثریا کو اپنے گھر مدعو بھی کیا۔

اسی روز شہر جا کر ثریا نے ایک صوفہ سیٹ، ایک چھوٹا سا بک شیلف اور ایک ٹیبل لیمپ خریدا اور یہ سامان بڑے کمرے میں سجا کر سوچنے لگی کہ اگر ایک خوش رنگ سا قالین اور پردے بھی ہوں تو کمرہ جگمگا اٹھے۔

لیکن یہ فرنیچر خریدنے کے لیے اس نے پچاس روپے گھر کے خرچ میں سے بھی ڈال دیے تھے اور ہر مہینے قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں آرٹسٹوں کو بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اسے عالیہ سید کا خیال آیا جو بہت بارسوخ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کالج سے اسے فون کیا۔

دوسرے سرے پر فون کا ریسیور عالیہ کے بھائی جمشید علی سید نے اٹھایا اور جب اسے معلوم ہوا کہ مشہور فنکار ثریا حسین بات کر رہی ہیں تو اس نے

کہا ——— "کمال ہوگیا! مجھ سے عالیہ نے کل ہی آپ کا ذکر کیا تھا۔ میرے چند امریکن دوست بھی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں۔ کسی روز آپ میرے ساتھ لنچ کھانا پسند کریں گی؟"

چنانچہ اتوار کے روز ثریا حسین موٹر رکشا میں بیٹھ کر کراچی جم خانہ گئی۔ جمشید ٹینس کورٹ کے رُخ والے بڑے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹینس کھیل کر عالیہ بھی آگئی۔

باتوں باتوں میں عالیہ نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا: "ثریا ——— تم تو ریڈ ہو نا؟"

"ریڈ ——— ؟" ثریا چونک پڑی اور ذرا گھبرا کر اس نے کہا ——— "نہیں تو ——— کیوں؟"

"ارے کچھ نہیں ——— میں نے سُنا تھا ———" عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔

جمشید زور سے ہنسا ——— "کالج کے زمانے میں رہی ہوں گی ———" لیکن ثریا کی گھبراہٹ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا ——— "مس حسین آپ کے لیے کسی بھی ایڈورٹائزنگ فرم میں جگہ نکل سکتی ہے ——— اس کی فکر نہ کیجیے ——— مگر اپنے خیالات ——— اگر وہ اس قسم کے ہیں ——— تو ذرا ان کو ——— میرا مطلب ہے ——— ان کا اظہار نہ کیجیے گا۔ علاوہ ازیں زیادہ تر امریکن ٹورسٹ ہی ہمارے مصوّروں کی تصاویر خریدتے ہیں اور بہت اچھے دام دیتے ہیں اور میرا مطلب ہے ——— آپ کی تصویریں امریکنوں کے ہاتھ خوب بک سکتی ہیں اگر ——— ان کو یہ خیال نہ ہو جائے کہ آپ یعنی کہ ———"

وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی ——— عالیہ کو کہیں اور جانا تھا۔ وہ ان دونوں کو لنچ کھاتا چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

اگلے مہینوں میں ثریا کی کئی تصویریں عالیہ اور جمشید کے ذریعے بک گئیں۔ اس نے نشست کے کمرے کے لیے کھدّر کے خوبصورت پردے خریدے جن پر موہن جو دارو کے نقش و نگار چھپے تھے۔ رنگین جوٹ کی بڑی آرٹسٹک سی چٹائی خریدی اور ٹیلی فون لگوانے کی درخواست دے دی۔ اس کے آئندہ مہینے میں اس کی ایک بڑی تصویر خود جمشید نے اپنے دفتر کے لیے سات سو روپے میں خریدی اور ایک اور تصویر کے لیے ایک امریکن سیاح نے پورے ایک ہزار روپے دیے۔ ثریا نے اس مرتبہ ایک چھوٹا سا فریجڈیر بھی خرید لیا۔ کھانے کے کمرے کا فرنیچر اور اپنی سنگھار میز اس نے کچھ عرصے بعد سنٹرل جیل سے بہت واجبی قیمت پر بنوالی۔ ٹیلی فون بھی لگ گیا اور اب اس کا کالج منھ سے بولنے لگا۔ بڑے سے بڑا آدمی اس سے ملنے آجاتے، اُسے کوفت نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اس کا خرچ بڑھتا جا رہا تھا۔ ٹیلی فون کا بل ——— بُوٹا بیگم کے ڈاکٹر کا بل ——— دوکانوں کے بل۔ کالج جانے کے لیے اسے روزانہ ایک نئی ساری چاہیے تھی ——— وہ ایک ہی ساری کلاس میں دو دن نہیں پہن سکتی تھی۔ اس کی طالبات ایک سے ایک فیشن ایبل تھیں۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ روز شام کو کہیں نہ کہیں باہر جانا ہوتا تھا اور یہاں کے فیشن ایبل ماحول کے مطابق معقول ساریاں درکار تھیں۔ ڈھاکے میں تو چھ سات سوتی ساریوں میں سارا سال گزر جاتا تھا اور یوں بھی وہ ایک "شخصیت" میں تبدیل ہو چکی تھی اور معمولی کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر نہ گھوم سکتی تھی۔ اس کا معیارِ زندگی روز بروز اُونچا اور مہنگا ہوتا چلا گیا لیکن خوش قسمتی سے اسے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نو سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایجنسی جمشید کے کاروبار کی ساری پبلسٹی سنبھالتی تھی۔ اس معقول مشاہرے کی وجہ سے ثریا کی بیشتر مالی اُلجھنیں حل ہو گئیں۔

اس ایجنسی میں ابھی اُس نے سال بھر ہی کام کیا ہوگا کہ ایک بے حد نفیس اسکالرشپ اسے پیش کیا گیا۔ اس نے بُوٹا بیگم کو اپنی سہیلی کے ہاں ناظم آباد منتقل کیا۔ کار چار سو روپے ماہوار کرائے پر اُٹھایا اور دو سال کے لیے پیرس چلی گئی۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں وہ کراچی واپس آئی اور لوٹتے میں جرمنی سے اپنے لیے ایک فوکس ویگن بھی خریدتی لائی۔

چھوٹی بٹیا کے تقرر کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بوس نے بیچ لگژری میں ایک بہت بڑی پارٹی دی اور اپنی سوشل سکریٹری سے ڈکٹا فون پر کہا کہ وہ سات بجے شام کو تیار رہے وہ خود آکر اسے پک اپ کر لیں گے۔

"جی نہیں - چچا اباّ ان کی زمین جوتتے ہیں - راجاؤں اور نوابوں سے ہماری کوئی قرابت داری نہیں۔"
میم صاحب چونکیں - لہجے کی یہ تلخی انھیں بہت مانوس سی معلوم ہوئی - ان کا لاڈلا بیٹا سلمان یونیورسٹی سے گھر آکر اپنے دوستوں کے ساتھ جانے کیا کیا اڑایا کرتا تھا - جاگیردار طبقہ - برطانوی استحصال - زرعی انقلاب - ناقابلِ فہم الفاظ اور اصطلاحات۔
"کہیں پڑھتے ہو ——— ؟"
"کان پور میں پڑھتے ہیں سکنڈ ائر میں۔"
"شاباش!"
"اب اجازت دیجیے۔"
"کافی تو پی لو ———"
"کافی ——— ؟" کافی اس نے آج تک نہ پی تھی ——— "جی نہیں" اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔
"ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر ہے - پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی - اچھا آداب عرض!"
اتنا کہہ کر وہ خیمے سے نکلا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر وہ دبے پاؤں والان میں داخل ہوا - برابر چھوٹے سے دالان میں برابر برابر چارپائیوں پر تینوں بھائی سو رہے تھے - چچی اماں اور منظور النساء دوسری طرف تخت پر فرخ آبادی چھاپے کے میلے میلے لحافوں سے منہ ڈھانپے خوابیدہ تھیں - وہ آہستہ سے جاکر اپنی کھاٹ پر گر گیا - اور پتلا سا لحاف اوپر تک کھینچ لیا - زیادہ سردی لگی تو الگنی پر ٹنگی ہوئی لوئی بھی لحاف پر ڈال لی اور ٹانگیں سکیڑ کے کروٹ کے بل، گڑی مڑی ہو کر سو گیا۔
تہجد کے وقت شاہ منور علی اٹھے - اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے سرہانے آئے - کچھ پڑھ کر اس کے ماتھے پر دم کیا - اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھا اور پھر جاکر اپنی چارپائی پر پڑ رہے - اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دم سادھے لیٹا رہا اور اس کا جی چاہا کہ خوب روئے - کچھ دیر بعد چچی اماں اٹھیں اور انھوں نے لالٹین جلائی - منظور النساء بھی فوراً اٹھ بیٹھی - دونوں ماں بیٹیاں دلائیاں سر سے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور وہاں انھوں نے جمشید کے سفر کے لیے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا - وہ پھر اونگھنے لگا - صبح کاذب کے وقت مرغ نے صحن کی دیوار پر جاکر اذان دی - وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا - اس کے پاس گھڑی نہیں تھی - اس نے جلدی سے اندھیری گھپ کوٹھری میں جاکر اپنا ٹین کا بکس نکالا - دری میں بستر لپیٹا اور در میں جاکر آہستہ سے آواز دی۔
"منظوریا ——— ہمارے چپل کہاں ہیں ؟"
منظور النساء بھاگی بھاگی آئی - دالان کی دیوار پر ٹنگی تیل کی ڈبیا روشن کی - مچان پر سے چپل اتارے - اس کا کوٹ لائی - کھونٹی پر سے اس کا مفلر اتار کر دیا - منہ دھونے کے لیے گرم پانی لے کر آئی اور لوٹا اور بیسن دانی تخت کے کنارے رکھ دی۔
چچی اماں نے ناشتہ دان بھر کر تخت پر رکھا اور چائے بنانے کے لیے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔
"بھیا ——— تمھرے لیے پوری ہم خود بناوا ہے" منظور النساء نے کہا۔
"اچھا" جمشید نے جوتوں کے فیتے باندھتے ہوئے ذرا محبت سے اسے دیکھا اور اس کا دل بھیچ گیا - بے چاری، بے چاری - بدنصیب لڑکی - اس نے دل میں کہا۔
ڈیوڑھی پر آکر گوبندوا نے آواز لگائی - اس کے باپ اور چچا جاگ اٹھے - چچی نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھا - وہ گوبندوا کے یکے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔
چنے کے کھیتوں پر کہرا ڈولتا تھا اور چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی - بہت دور کلکٹر صاحب کے کیمپ میں اِکا دُکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں - دریا پار

سے ریل کی سیٹی کی آواز سُنائی دی ۔ آم کے باغات، خانقاہ، تالاب، ہنومان جی کا مندر، جھینگا پاسی کا جھونپڑا، بڑے ابا ——— چچا ابا، چچی اماں، منظور النساء ——— یہ سارے ہیولے پیچھے ہٹتے ہوتے ایک بڑے دھندلکے میں غائب ہوگئے۔ اس رات کیمپ سے واپس آکر اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ کان پور لوٹ کر جی توڑ محنت کرے گا۔ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔ مقابلے کے امتحان پاس کرے گا اور ایک دن اس کے نام کے آگے لکھا جائے گا ——— ایس۔ جے۔ علی۔ آئی۔ سی۔ ایس۔

پھر جب ہیں محمد گنج آؤں گا تو کسان کہیں گے۔ جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں۔ جنٹ صاحب، کلکٹر صاحب، کمشنر صاحب کچے راستے پر یکے کو زور کا دھچکہ لگا۔ اس نے جلدی سے یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب میں سے پاسنگ شو کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔ جب اس نے ماچس جلائی تو گوبندوا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ای کا کرت ہو ———" اس نے صدمے سے کہا۔

"گھر پہ نہ بتانا گوبند چاچا ———"، جمشید نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے سارے خواب گوبندوا کی تیوری پر بل دیکھ کر پَل کی پَل میں ہَوا ہو گئے۔

"اچھا۔ نہ کہبا، مل سہرن مارہ کے ای سب نہ سیکھو"——— گوبندوا نے مریل گھوڑے کو دوبارہ چابک لگائی ———"چلت ہنیں سسُر۔ توہو کا سرگٹ چاہی ؟"

جمشید نے ایک طویل کش لے کر ناک سے دھواں نکالا۔ اتنے میں سامنے سے گوبردھن چاچا آتے دکھائی دیے۔ وہ کندھے پر ہَل رکھے بیلوں کی جوڑی ہنکاتے اپنے کھیت کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جمشید نے گھبرا کر سگریٹ مٹھی میں چھپا لیا۔

گوبر چاچا نے اگر دیکھ لیا تو یکے سے اتار کر پچاس جوتے لگائیں گے اور گنیں گے ایک۔

گاؤں میں کس قدر دقیانوسیت ہے اس نے شدت کی جھنجھلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ ہندوستان کے گاؤں ——— ہاہاہا ——— ہندوستان کے گاؤں۔

اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح وہ تقریباً آخری بار اپنے گاؤں سے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس طرح محمد گنج نہ آئے گا۔ اس طرح گوبندوا کے یکے پر نہ بیٹھے گا۔ گوبردھن چاچا سے خائف ہونے کی ضرورت اسے پھر کبھی محسوس نہ ہوگی۔

کان پور پہنچ کر وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سامنے گلی کی دیوار پر 'بھابھی' اور 'پکار' فلموں کے اشتہار اور کانگریس کے جلسے کے پوسٹر لگے تھے۔ بیٹھک کے دروازے پر چق پڑی تھی اندر اینٹوں کی فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لیے تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ بی۔ اے ایل ایل بی کا گاؤن پہنے کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سر سید احمد خاں اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھی۔ پنجتن پاک کے نام اور کلمے اور "فاعتبروا یا اولی الابصار" فریموں میں لگے ہوئے تھے اور مدینہ منورہ کا ایک کلنڈر ——— ایک کونے میں تذکرۂ غوثیہ کی جلد اور نظام المشائخ، دین و دُنیا اور مدینہ کے فائل دھرے تھے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ کی ایک بڑی سی تصویر کارنس پر رکھی تھی۔ کئی برس قبل سید اختر علی نے اپنے حصّے کے کھیت بیچ کر کان پور میں یہ مکان خریدا تھا اور پریکٹس شروع کی تھی۔ جمشید میلا سا سُوتی پردہ اٹھا کر زنان خانے میں گیا۔ اندر تپلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے میں اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ اس کی اپنی چارپائی کے سرہانے اُس کی میز لگی تھی جس پر اس کی کتابوں کا انبار تھا جن پر اخبار اور باتصویر رسالوں کے کاغذوں کے کور چڑھے ہوئے تھے اور کڑھے ہوئے میلے میز پوش پر سیاہی کا بڑا سا دھبہ لگ گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس کی اماں سِل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھیں۔ چھوٹی بہن عالیہ باورچی خانے میں تھی۔

جمشید نے اسباب ایک چارپائی پر رکھا اور دالان کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔

"بھیّا ——— گاؤں سے روپیہ لائے ؟" عالیہ کی آواز پر وہ چونکا۔

"ابّا نے کہا تھا کہ چچا ابّا سے لے کر روپیہ بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے —— چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے۔ یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔"

"نہیں۔ ہم روپے نہیں لائے مگر ابّا کو جلد نوکری مل جائے گی، شاید۔ ورنہ ہم کالج چھوڑ کر خود نوکری کر لیں گے —— ارے ارے —— روتی کیوں ہے گدھیا ——" اس نے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ امّاں نے جو برسوں سے پلنگ پر پڑے پڑے حد سے زیادہ چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھیں، حسب معمول چیخنا چلّانا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ جمشید تخت کے کنارے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

الہ آباد سول لائنز کی ایک پرانے طرز کی کوٹھی کی برساتی میں ایک لمبی چوڑی ۱۹۳۵ء کے ماڈل کی سیلون کار تیزی سے آن کر رُکی اور ایک حساس شکل اور سانولی رنگت والا نوجوان بے حد اکسائیٹڈ انداز میں کار سے اُتر کر اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی میز کی درازیں کھولیں۔ کاغذات الٹ پلٹ کر ایک پرس تلاش کیا۔ سُرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا دوہرا کارڈ جیب میں سے نکالا۔ ایک دفعہ اس کے اندر لکھا ہوا اپنا نام پڑھا اور بڑی احتیاط سے اُسے پرس میں رکھ دیا۔

ملازم ڈاک لے کر آیا۔ ماما کی لکھائی لفافے پر دیکھ کر وہ محبت سے مُسکرایا اور خط پڑھنا شروع کیا —— "ہم دورہ ختم ہوتے ہی سیدھے الہ آباد آ رہے ہیں۔ اب تمھیں آئی، سی، ایس کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں نیازی بیگم تمھارے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ اب تم ماشاءاللہ سے ——" خط ختم کر کے اس نے واپس لفافے میں رکھ دیا اور اُداسی سے مسکرایا۔ پھر وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہوا اور سگریٹ جلا کر سوچنے لگا۔ ہم بابا اور ماما کو یہ اطلاع کن الفاظ میں دیں کہ ہم ان کی درخشاں اُمیدوں پر پانی پھیرنے والے ہیں۔

محمد گنج کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھ کر سید مظہر علی نے خطِ شکست میں پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا:

برخوردار سعادت آثار راحت جاں عزیزی جمشید میاں طولعمرہٗ

واضح ہو کہ تمھارے ابّا چند در چند وجوہات کی بنا پر ہنوز محمد گنج میں ہیں۔ کیمپ اُٹھ چکا ہے۔ تمھارے ابّا نے متعدد درخواستیں لکھ کر سکنڑ صاحب کے دفتر بہ مقام لکھنؤ روانہ کر دی ہیں۔ اللہ بہتری کرے گا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ بوٹا بیگم کے مقدمے کی پیشی ملتوی ہو گئی ہے۔ کلکٹر صاحب نے بہ کمال مہربانی ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے اور دورانِ مقدمہ بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی کے شہر الہ آباد میں کلکٹر صاحب کی سرپرستی میں رہیں گی۔ نواب شمس آرا بیگم نے حرفہائے خلاف و نامعقول اس ضمن میں سب سے کہے ہیں و نیز تمھارے ابّا کہتے ہیں کہ اپنی سیکل فروخت کر دو۔

چھ مہینے بعد جمشید کو ایک اور پوسٹ کارڈ ملا۔

برخوردار نورِ چشمی سلمہ تعالیٰ۔ یہ معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ تم نے ٹیوشن شروع کر دیے ہیں۔ تمھارے ابّا کے روزگار کی ہنوز کوئی صورت نہیں نکلی۔ اب وہ دن بھر خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم کو فکر شدید اس امر کی ہے کہ خدانخواستہ ان کا خطرہ نہ ٹل جاوے کیوں کہ کل شب وہ ہم سے کہتے تھے کہ ان کو بشارتیں ہو رہی ہیں۔ بھائی صاحب قبلہ کو بھی ان کی طرف سے از حد تشویش لاحق ہے۔ اللہ سے دُعا کرتے رہو وہ مسبب الاسباب ہے۔

دو سال بعد پوسٹ کارڈ آیا۔ "نورِ چشمی منظور النساء سلمہا اب اس لائق ہو چکی ہے کہ اُسے اس کے گھر بھیج دیا جاوے۔ لہٰذا عید کے چاند اسے رُخصت کر کے لے جاؤ۔ تمھارے ابّا اب مستقل ندی کے کنارے کٹی میں رہتے ہیں۔"

دو روپے گز والی سُرخ ساٹن کے غرارے اور ریشمی ململ کے سُرخ دوپٹے قمیص میں ملبوس، گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپلّو والی حمیل، اور کانوں میں چاندی کے بالی پتے پہنے، لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے منظور النساء دُلہن بنی برقعے میں لپٹی تانگے سے اُتری۔ اس کے جوڑے پر جھوٹا لچکا ٹکا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں فیروز آباد کی سرخ ریشمی چوڑیاں اور چاندی کی پہونچیاں پہن

رکھی تھیں، انگلیوں میں چاندی کے چھلّے تھے۔ ہتھیلیوں میں تیز سرخ مہندی رچی تھی۔ بازوؤں پر چاندی کے جوشن بندھے تھے۔ سرخ ریشمی موزوں اور انگریزی گرگابی والے پیروں میں چھڑے اور چھاگل چھن چھن کر رہے تھے۔ تین موتیوں والی بڑی سی نتھ اس کا واحد طلائی زیور تھا۔ یہ سارے گہنے اس کی ماں کے جہیز کے تھے۔ صرف اس کے سات جوڑے۔ دولھا کا ریشمی اچکن کا جوڑا اور تانبے کے چار برتن، اور مراد آبادی پان دان سید مظہر علی اشرفی لال مہاجن سے اُدھار لے کر بنوا سکے تھے۔ تانبے کے باقی سات برتنوں پر جو ان کی بیوی نے منظور النساء کی پیدائش کے وقت سے سنیت سنیت کر پچھلی کوٹھری میں چُن رکھے تھے، دوبارہ قلعی کروالی گئی تھی، نیم تلے شادی کا کھانا ہوا تھا۔ آلو گوشت کا شوربہ، تنوری روٹیاں اور زردہ مٹی کے کونڈوں رکابیوں اور سکوریوں میں نکال کر مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ تام چینی کی پھول دار رکابیاں صرف دولھا اور مولوی صاحب اور چند اور خاص خاص مہمانوں کے لیے تھیں۔ ہندو احباب کے لیے کچھ فاصلے پر پنڈت لچھمی نارائن نے برگد تلے اپنی نگرانی میں بھوجن بنوایا تھا جو کیلے کے پتّوں پر پروسا گیا تھا۔ شہنائی بجی تھی۔ مہمانوں کو محظوظ کرنے کے فرائض چپاتی بھانڈ کے سپرد تھے۔ شادی کے خرچے میں سید مظہر علی کا بال بال قرضے سے بندھ گیا تھا۔ منظور النساء ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اشرفی لال کی سُود در سُود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی بچّی کے بیاہ میں دل کے سارے ارمان نکالیں مگر قدم قدم پر ان کے افلاس کا بھوت سامنے آ کھڑا ہوتا اور وہ جی مسوس کر رہ جاتے تھے۔ جب رخصتی کا وقت قریب آیا تو وہ گھر سے چلے گئے تھے اور درگاہ کی منڈیر پر جا کر چُپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ بیٹی کی سُرخ پالکی نیم تلے رکھی گئی تو اسے وداع کرتے ہوئے انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں جمشید سے کہا تھا —— "بھیّا یہ بڑی بے زبان اور غریب بچی ہے۔ تمھاری کنیز بن کے رہے گی۔ اس کا دل کبھی نہ دُکھانا۔"

سُرخ رنگ کی سُوتی چادر اوڑھے جس پر ابرق کے بڑے بڑے پھول چھپے تھے منظور النساء پالکی میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس کی پالکی اسٹیشن روانہ ہو گئی تھی۔ جھینگا پاسی اور اس کے لڑکوں نے جہیز کے ٹرنک اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے اور سب سے آگے آگے، جامہ پہنے سہرا باندھے ہاتھ میں سُرخ رومال لیے جمشید دولھا بنا گوبندوا کے یکّے پر بیٹھا تھا۔

تانگے سے اُتر کر منظور النساء اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ شہر کی پروردہ عالیہ نے اُسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا منھ بنا کے آواز دی —— "امّاں، دُلہن بھابی آ گئیں۔"

منظور النساء کو دالان کے برابر والی کوٹھری میں بٹھال دیا گیا جو اس کا حجلۂ عروسی تھا۔ یہاں محلّے والیوں کے سامنے اس کی منھ دکھائی ہوئی جو ایک ایک روپیہ، دو دو روپے اس کے سامنے بچھے ہوئے سُرخ رومال میں ڈالتی گئیں۔ ایک ہفتے تک وہ دن بھر بغیر ہلے جُلے پلنگ پر سرنگوں بیٹھی رہی۔ اور جب کوئی محلّے والی اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ دستور کے مطابق فوراً آنکھیں بند کر لیتی۔

اس کے بعد منظور النساء نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گھر کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا مکان اس کے لیے محل کے برابر تھا۔ اس میں برقی روشنی تھی۔ میز کرسیاں تھیں۔ چینی کے برتن تھے۔ کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے نیلی کانچ کے گُل دان طاقچوں میں رکھے تھے اور اس کی بجلی بسنت نند عالیہ اسکول میں انگریزی پڑھتی تھی۔

جمشید اب ایم۔ اے فائنل میں تھا اور رات گئے تک ٹیوشن کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا۔ اس نے بیٹھک کا کمرہ بھی کرایہ پر اٹھا دیا تھا اور کفایت کے خیال سے سگریٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ بائیس تئیس سال کی عمر میں وہ تلخ مزاج، قنوطی اور ذہنی اور جذباتی طور پر بوڑھا ہو چکا تھا۔

منظور النساء نے گھر کا سارا کام مشین کی طرح سنبھال لیا۔ وہ دونوں وقت کا کھانا پکاتی۔ بڑی لگن سے ساس کی تیمارداری کرتی۔ ان کی جھڑکیاں اور طعنے سُنتی۔ دیوروں کی خاطر کرتی اور عالیہ سے مرعوب رہتی۔ جمشید اس سے سیدھے منھ بات نہ کرتا مگر اسے اس کا بھی کوئی غم نہ تھا۔ اس کا فرض اپنے شوہر کی خدمت کرنا تھا اور وہ اپنے شوہر کی پرستش کرتی تھی۔

لیکن جب وہ پہلوٹھی کے بچّے کی پیدائش کے لیے محمد گنج گئی تو اس کے بعد جمشید نے اُسے کان پور واپس نہ بُلایا۔ اُس نے سید مظہر علی کے تشویش ناک اور بعد میں الم ناک خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

جنگ شروع ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ ملٹری اسٹورز کے محکمہ میں حوالدار کلرک ہوگیا۔ سال بھر میں اسے ترقی مل گئی اور وہ شہر کا مکان کرائے پر اٹھا کر گھر والوں سمیت چھاؤنی کے ایک کشادہ اور ہوادار کوارٹر میں منتقل ہوگیا۔ اب وہ چار سو روپے ماہوار پاتا تھا اور گھر میں کنٹین کے سامان کی ریل پیل تھی۔ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ ایمرجنسی کمیشن میں درخواست نہ دے سکتا تھا جس کا اُسے بے حد افسوس تھا۔ اسی زمانے میں اس نے سگریٹ کا پورا ڈبہ رات بھر میں پھونک ڈالنے کے بعد منظور النساء کو طلاق لکھ بھیجی۔

جب منظور النساء کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی تو سید اختر علی کو ان کی کٹی سے پکڑ کر منگوایا گیا تھا اور انھوں نے پوتی کے کان میں اذان دی تھی۔ شاہ منوّر علی نے اَن گنت دُعائیں پڑھ کر بچّی پر پھونکی تھیں۔ محلے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کے خدائی رات منائی تھی۔ نیم تلے چیپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھاتی تھیں اور گاؤں کی البیلی پاتر حشمت ٹھمکی لگا لگا کر ــــــ "دو کھسکے ڈیل ــــــ کھسکے ڈیل ــــــ" الاپتی سید مظہر علی کے نزدیک پہنچی تھی جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انھوں نے بڑے رومال کی گرہ میں سے دو روپے نکال کر اسے دیے تھے۔ اندر صحن میں جھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے اور کمر پر ہاتھ رکھ کے ناچی تھی۔ حیدری ڈومنی اور اس کی بہنوں نے "جچّہ گیریاں" گائی تھیں اور چونکہ منظور النساء بچّی کی پیدائش میں مرتے مرتے بچی تھی، اس لیے چند روز بعد شکرانے کے طور پر بی بی کی صحنک بھی کی گئی تھی۔

جب بچّی کا عقیقہ ہوا تو نانا نے اس کا نام فرحت النساء بیگم رکھا۔ شاہ منوّر علی نے اسے گنڈے تعویذوں سے لاد دیا۔ صحن میں ڈھولک رکھی گئی اور منظور النساء "آنکھ کے نشے" کا فالسئی جوڑا پہنے بچّی کو گود میں لیے چارپائی پر بیٹھی سہیلیوں کو حسب معمول کان پور شہر کے حیرت ناک قصّے سناتی رہی ــــــ "سڑکوں پر ٹن ٹن کرتی ریلیں چلت ہیں۔ یہ بڑے بڑے کارخانے، رات کو آنگن میں سوؤ صبح کو دھواں دھار اٹھو۔ ایک دفعے ہم ان کے ساتھ سینما بھی گئے رہے۔"

اسی وقت سمجھو دادا جو گاؤں کے ڈاکیے بھی تھے رجسٹری خط لے کر آئے۔

سید مظہر علی کی بی بی گم سم بیٹھی پالنے کی ڈوری ہلایا کیں۔ گاؤں بھر کی عورتیں صحن میں جمع ہوگئیں۔ نوزائیدہ بچّی جس کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا تھا اور کلائی میں سیاہ ڈوری بندھی تھی۔ اسی طرح ہنس ہنس کر کلکاریاں مارتی رہی۔ باہر نیم تلے توقیر میاں، گوبر چاچا، لالہ مجلس رائے، شیخ رمضان، مولوی محمد حسن، پنڈت لچھمی نارائن، گوسائیں کاکا اور گوبند وا سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ منوّر علی خانقاہ کے اندر خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے صرف ایک نعرہ لگایا ــــــ "بڑی لمبی جائداد اس نے عطا کی ہے ــــــ شکر ہے ــــــ شکر ہے ــــــ شکر ہے۔"

سید اختر علی گومتی کے ساحل پر مراقبے میں مصروف رہے ان کو کسی نے یہ اطلاع نہیں دی۔

کئی برس گزر گئے۔ بچّی کو اس کی نانی پال رہی تھیں۔ منظور النساء پکانے ایندھنے کے بعد زیادہ تر خاموش بیٹھی آسمان کو تکا کرتی۔ صبح صبح وضو کے لیے اُٹھتی تو کھیرنی کے نیچے پٹرے پر بیٹھ کر مناجاتیں پڑھتی:

توئی سروری اور توئی اکبری ‏ ‏ ‏ ‏ میری بارکیوں دیر اتنی کری

کبھی وہ میلادِ اکبر کھول کر بیٹھ جاتی اور چپکے چپکے ہونٹ ہلاتی:

جب باغِ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی!
اِک پھول اس میں سے چھانٹ لیا، تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

گرمیوں کے طویل دوپہر کے سناٹے میں، جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے میں، برسات کی بھیگی دوپہروں میں اس کی آواز اس چھوٹے سے مکان میں گونجا کرتی:

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہٗ
ترا نام عادل کبریا، تری شان جل جلالہٗ
جسے چاہے جیسا بنا دیا، تری شان جل جلالہٗ

اکثر وہ روٹیاں بیلتے بیلتے، فرحت النساء کی چٹیا کرتے کرتے، دھان پھٹکتے پھٹکتے وہ شعر گنگناتی جو اس نے مولوی محمد حسن کی بی بی سے سنا تھا:

دو پھول ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے — اِک قبر پہ چڑھا ہے اِک سہرے میں گندھا ہے

اس کے دل میں برچھی سی اُتر جاتی اور وہ سوچتی — ان کے سہرے میں جانے اب کون سا پھول گندھے گا۔ روز وہ اس انتظار میں رہتی کہ اب شہر سے اطلاع آئے گی کہ جمشید نے کسی بی۔ اے پاس لڑکی سے شادی کر لی مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔ تب وہ یہ آس لگاتی کہ شاید جمشید اس سے رجوع کرے۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس سالہ دکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔

سلمان مرزا کو بمبئی گئے عرصہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ الہ آباد آتا اور چند روز بعد پھر غائب ہو جاتا۔ قصرِ سلمان کے ایک سائڈ روم میں بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی بسنتی کے گذشتہ چند برس سے رہ رہی تھیں، ان کا کیس چیف کورٹ تک گیا تھا اور وہ مقدمہ جیت کر نواب شمس آرا بیگم اور نواب تھورے دونوں کو بنچا دکھا چکی تھیں اور اب دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی شریف معمولی حیثیت کے برسرِ روزگار نوجوان سے بسنتی بیگم کا نکاح ہو جائے۔ قصرِ سلمان میں ان کی حیثیت ہاؤس کیپر کی سی تھی۔ وہ جمعرات کے روز مجلس بھی پڑھتی تھیں اور جب چھوٹی بٹیا مسوری کانونٹ سے چھٹیوں میں گھر آتیں تو ان کے ملبوسات کی دیکھ بھال بھی بوٹا بیگم کے ذمے تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے کلکٹر صاحب کو دعائیں دیا کرتی تھیں۔ کلکٹر صاحب ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز تصوف کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ بسنتی بیگم اسکول جاتی تھی اور واپس آکر سائڈ روم میں بیٹھی آبی رنگوں سے تصویریں بناتی رہتی تھی۔

جس روز اسکول کی سالانہ نمائش میں اسے نقد سَو روپے آرٹ کا پہلا انعام ملا۔ بوٹا بیگم سجدے میں گر کر دیر تک رویا کیں۔ مدتوں بعد پہلی مرتبہ اُن کے ہاتھ میں سَو روپے آئے تھے۔ ان کا چھوٹا موٹا زیور، گاؤں کی تین بیگھہ زمین، محمد گنج کا آبائی مکان، سارا اثاثہ مقدمے کی نذر ہو چکا تھا۔ اب میم صاحب ان کو بیس روپے ماہوار تنخواہ دیتی تھیں۔ پان تمباکو کا خرچہ، بسنتی بیگم کے اسکول کی فیس، کتابیں، اس کے کپڑے لتے، یہ سب ہی میم صاحب نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا بوٹا بیگم، بسنتی اور سلمان کی بوڑھی انّا نیازی بوا کے لیے پچھلے برآمدے کے تخت پر چن دیا جاتا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد اکثر بوٹا بیگم اپنے جوانمرگ بیٹے کو یاد کر کے تڑپا کرتیں اور آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہ تربتر ہو جاتی۔ محرّم کے دنوں میں وہ علموں کی بلائیں لیتیں۔ ضریحوں اور تعزیوں کی دھول آنکھوں سے لگاتیں اور جناب علی اصغر کے گہوارے اور ذوالجناح کے سامنے کھڑے ہو کر بلک بلک کر دعائیں مانگتیں:

"یا مولا — یا مشکل کشا — یا سید الشہدا — یا امام مظلوم — بسنتی کا نصیبہ کھول دیجیے۔ بسنتی کو عزت و آبرو کے ساتھ کہیں ٹھکانے لگا دیجیے —"

اس وقت سَو روپے کا نوٹ بسنتی نے ان کو لا کر دیا تو انھیں پھریری سی چڑھی یہ کثیر رقم ان کی دکھیاری بیٹی کی صلاحیت اور محنت کا صلہ تھا —

"یا الٰہی اس کا مقدر اچھا کر۔"

آنند موہن گھوش اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا چھوٹا بھائی تھا۔ نمائش میں بسنتی بیگم کی تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے ایل۔ ایم۔ سین کو لکھا —

"اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے ایک تقریباً جینیس کو ڈسکور کیا ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔"

اگلی مرتبہ لکھنؤ آرٹ اسکول کے پرنسپل ایل۔ ایم۔ سین جب الہ آباد آئے تو مس رینا گھوش نے اپنی ہونہار طالب علم کو ان سے ملوایا۔

آئندہ سال میٹرک کے بعد بسنتی بیگم سرکاری وظیفے پر لکھنؤ آرٹ اسکول میں داخل ہو گئی۔ ابھی وہ تھرڈ ایئر میں تھی کہ بوٹا بیگم سخت بیمار پڑیں اور اسے الہ آباد واپس آنا پڑا۔ یہاں وہ کالج میں داخل ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو بسنتی بیگم کہلوانا ترک کیا کیوں کہ یہ نام اس کے شدید دکھی بچپن کی یادگار تھا۔

ایف۔ اے کے بعد وہ اپنے پرانے اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر ہو گئی۔ اس نے بوٹا بیگم سے کہا:

"میں تیرہ برس کی عمر سے دھکے کھا رہی ہوں۔ سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ رہے ہیں، مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب شرم آتی ہے

مجھے سوا سو ماہوار کی نوکری مل گئی ہے۔ شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی اور شہر میں مکان لے کر رہوں گی۔ سامان باندھ لیجیے۔"

"—— اکیلی بٹیا کیسے رہو —— ؟" بوٹا بیگم نے بھونچکی ہو کر پوچھا۔

"اماں ——" اس نے اکتا کر بحث قطعی طور پر ختم کرتے ہوئے جواب دیا —— "میں وہ بسنتی بیگم نہیں ہوں جسے نواب بھورے کے سپاہی اُٹھا کر لے گئے تھے اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ ملک کے سارے عوام، سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے۔" اس نے آنند موہن گھوش کے الفاظ دہرائے جس نے اس سے بے حد جوشیلے انداز میں کہا تھا ——

"سوریہ —— دیش کی ساری جنتا، ساری ورکنگ کلاس تمہارے ساتھ ہے۔" بوٹا بیگم کے پلے کچھ نہ پڑا کہ یہ نئی، حیرت انگیز بسنتی کیا کہہ رہی ہے۔ انھوں نے جا کر میم صاحب سے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" میم صاحب نے آہستہ سے جواب دیا —— میرا بیٹا اسی طرح گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر گلیوں کی خاک چھاننے نکل گیا۔ یہ آجکل کی اولاد ہے ان کو سمجھانا لاحاصل ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی من مانی کریں گے۔ جمعرات کی جمعرات تو آتی رہیے گا نا —— ؟ میں موٹر بھیج دیا کروں گی۔"

بوٹا بیگم رونے لگیں۔

سلمان ایک روز الہ آباد آیا تو آنند موہن گھوش نے اس سے ثریا حسین کا ذکر کیا جو صحیح معنوں میں عوامی فنکار بن سکتی تھی کیونکہ خود ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شام کو آنند موہن گھوش سلمان کو پرانے کٹرے کے ایک چھوٹے سے مکان پر لے گیا اور دروازے پر دستک دی —— بوٹا بیگم نے اندر سے جھانکا۔

"مس حسین ہیں ؟" آنند موہن گھوش نے پوچھا۔

"کو —— ؟"

"مس حسین ——"

بوٹا بیگم کی سمجھ میں نہ آیا —— "بسنتی ——" انھوں نے آواز دی۔ وہ دروازے پر آئی۔

"ارے بسنتی بیگم! ——" سلمان نے حیرت اور مسرت سے کہا —— "تم اتنی پُراسرار بن گئیں! میں یہاں مس حسین کے رعب میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہوں۔"

ثریا نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا —— "آئیے، آئیے، اندر آ جائیے۔" بوٹا بیگم سر پر دوپٹہ رکھ کر جلدی سے اندر دبک گئیں۔ ثریا دونوں لڑکوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جو اس کا اسٹوڈیو بھی تھا۔ سلمان نے چاروں طرف دیکھا —— "حد ہے —— ! کمال ہو گیا —— !!" اس نے قصر سلمان میں ثریا کو آغو جی کی لڑکی بسنتی کی حیثیت سے دیکھا تھا جو اس سے کانا پردہ کرتی تھی اور عموماً ادھر اُدھر دبکی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ہونہار آرٹسٹ ثریا حسین کے نگار خانے میں کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے ثریا کو پہلی مرتبہ غور سے اور توجہ سے دیکھا اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔

سلمان اب پھر الہ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ وہ ثریا کو اپنے ساتھ جلسوں، تقریبوں اور سیاسی اور ادبی محفلوں میں لے جانے لگا اور وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئی۔

ثریا اس طبقے سے آئی تھی جو ان نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ وہ خود اس بھیانک طریقے سے فیوڈل نظام کا شکار رہ چکی تھی۔ وہ سب اس سے درگا کنڈ کی گڑھی کے واقعات سنتے جہاں اسے چھ مہینے تک قید رکھا گیا تھا۔ وہ اس قیامت کی رات کا ذکر کرتی جب ڈھاٹے باندھے ہوئے بدمعاشوں نے اس کے اکلوتے بھائی کو گنڈاسوں سے ہلاک کیا تھا۔ وہ اپنے اندھے اور عسرت زدہ باپ کو یاد کرتی جو ایسی درد بھری آواز میں مرثیے اور سوز پڑھتے

تھے کہ سننے والوں کا کلیجہ دہل جاتا تھا۔ وہ ساتھیوں کے لیے ہیروئن اور سلمان کے لیے اس کا آدرش بن گئی۔ اسی زمانے میں اس نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی کر لیا۔

چھوٹی بٹیا اب کراسویٹ کالج میں تھیں۔ بوٹا بیگم ہر جمعرات کو قصرِ سلمان جا کر مجلسیں پڑھتیں مگر ثریا ان کے ساتھ بہت کم جاتی تھی۔ اس کی اور سلمان کی دوستی کے متعلق خیال کر کے بوٹا بیگم کا دل ہلا جاتا تھا ——— "صاحب میم صاحب مجھے کتنا نمک حرام سمجھتی ہیں ———" وہ لرز لرز کر سوچتیں۔ ثریا سے کچھ کہنے کی ان کو ہمت نہ پڑتی تھی مگر قصرِ سلمان وہ جھینپی جھینپی آتیں۔ میم صاحب نے اس سلسلے میں کبھی کوئی ذکر ان سے نہ چھیڑا۔

۱۹۴۷ء کے اپریل میں چھوٹی بٹیا نے ایف۔ اے کا امتحان دیا اور اسی مہینے والدین کے ہمراہ حسبِ معمول مسوری چلی گئیں۔ سلمان الہ آباد ہی میں تھا جب تقسیمِ ہند کا اعلان کیا گیا۔

جنگ کے بعد وہ محکمہ ٹوٹ گیا جس میں جمشید ملازم تھا۔ وہ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ قسمت آزمانے کراچی روانہ ہو گیا۔

دن بھر جھڑی لگی رہی تھی۔ برساتی کا کالر اونچا کیے تیز تیز قدم رکھتا سلمان مرزا ثریا کے گھر پر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا اور پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کے بچے ان کے عزیزوں کو سناتے جا رہے تھے فضا پر عجیب سی نحوست اور ویرانی طاری تھی۔ سلمان کے قدموں کی آہٹ پر ثریا نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ اندر گیا۔ ثریا نے اس کے لیے کرسی کھڑکی کے نزدیک کھینچ دی ——— "ایک دم حبس ہو گیا ہے۔" اس نے خالی خالی آواز میں کہا۔

سلمان نے کرسی پر ٹک کر گھڑی پر نظر ڈالی اور سگریٹ جلایا۔

"وقت بہت کم ہے ———" اس نے متوازن آواز میں کہا ——— "اور ہمیں معلوم ہے کہ کسی کراتسس میں تمہارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارا ساتھ دو گی ——— ٹھیک ہے نا ثریا ———؟" دفعتاً اس کی آواز میں بچوں کا سا لہجہ عود کر آیا۔ چھوٹی بٹیا کا سا لہجہ۔

"تقریر مت جھاڑو ———" ثریا نے اکتاہٹ کے ساتھ جواب دیا ——— "میں اتنے برسوں سے متواتر تمہاری تقریریں سن رہی ہوں کرائسس، آدرش، اصول، اقدار۔"

"تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی ———؟ ہمیں مایوس نہ کرنا۔" سلمان نے بھونچکا ہو کر بڑے کرب سے کہا۔

"مایوس! تم انسانوں کی طرف سے اب تک خوش فہمی میں مبتلا ہو ———!"

گلی میں ریڈیو کی آواز گونجی ——— "شری نواب چند کھنہ کا خاندان ڈیکوٹا کے ذریعے پشاور سے امرت سر پہنچ رہا ہے ——— جناب فضل دین وکیل کا خاندان خیریت کے ساتھ ہوشیار پور سے لاہور پہنچ چکا ہے ——— چودھری ٹیکا رام اور ان کے خاندان کے لیے ایک ڈیکوٹا جہلم بھیجا جا رہا ہے ——— ایک بار پھر سن لیجیے ———"

ثریا نے کھڑکی بند کر دی۔

"ثریا ———" سلمان نے اسی کرب کے ساتھ کہا ——— "تم تجریدی تصویریں بناتے بناتے حقیقت سے بالکل کٹ گئیں ———"

"ایک اور مفروضہ! اور سلمان مرزا۔ میں تم سے آرٹ پر بحث کرنا نہیں چاہتی۔ یہ تمہارا میدان نہیں ———"

ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔

"میں یہاں بیٹھ کر روز شام کو خبریں سنتی ہوں مگر تمہارے گھر والوں کی خیریت اب تک نہیں سنی ———" اس کی آواز میں بے رخی تھی۔

"ایک بار پھر سن لیجیے ——— جناب قمر الدین مرزا۔ بیگم مرزا اور مس مرزا ———"

چھوٹی بٹیا نے پہلی تنخواہ ملنے پر الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک "انڈین ساری" اصل سے دوگنی قیمت پر خرید لی تھی اور دفتر میں مس ڈی سوزا نے اصرار کیا تھا کہ کم از کم شام کے وقت میک اپ کرنا بہت لازمی ہے ورنہ چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان لگتا ہے چنانچہ چھوٹی بٹیا نے ایک ہلکے رنگ کا لپ اسٹک بھی خرید لیا تھا۔

اندھیرا پڑ گیا تھا اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی میک اپ کر رہی تھیں۔ وہ کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی تھیں کیونکہ اس میں سے گلی کا سامنا ہوتا تھا۔ اس وقت انھوں نے اس کا ایک پٹ کھول کر آئینہ کھڑکی کی گرد آلود جالی میں اٹکا دیا تھا اور پلنگ کے کنارے بیٹھی ناخنوں پر کیوٹیکس لگا رہی تھیں۔

چہرے پر فاؤنڈیشن کریم ملتے ملتے یک لخت ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ انھیں دفعتاً یہ احساس ہوا کہ آج وہ پہلی مرتبہ اپنی اس ڈیوٹی پر جارہی تھیں جس کے لیے ان کو ملازم رکھا گیا تھا۔ انھیں بوس کے غیر ملکی دوستوں کو انٹرٹین کرنا تھا۔ وہ اس پارٹی کی "ہوسٹس" تھیں اور انھیں لامحالہ بوس کی "مسٹریس" بھی سمجھا جائے گا۔ اللہ میاں ——— اللہ میاں ——— ہم مرکیوں نہیں جاتے ——— ہم — انھوں نے نقاہت سے دیوار کا سہارا لیا ——— یا اللہ ہمیں موت کیوں نہیں آجاتی ———

باہر ایک سرخ رنگ کی طویل کرائسلر آکر رکی اور بڑا دبیز سا ہارن بجا۔ انھوں نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ لپ اسٹک لگایا اور بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئیں۔

"ماما ——— ماما ہم پارٹی میں جارہے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لوٹیں گے۔"

"اچھا۔"

برآمدے کے بالکل برابر کار کھڑی کر کے جمشید اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے الٰہی بخش کولونی کے اداس ماحول کو دیکھ رہا تھا جسے جھٹ پٹے کی نیم تاریکی نے زیادہ المناک بنا دیا تھا۔ دنیا میں زیادہ تر انسان کس قدر بے رنگ زندگیاں گزارتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اتنے میں مس مرزا باہر نکلیں۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس کے برابر آبیٹھیں۔

کرائسلر گلیوں کی دھول اور کیچڑ اور گڈھوں پر سے نہایت وقار کے ساتھ گزرتی باہر کی سڑک پر آگئی۔ جمشید نے مڑ کر اپنی دل کش سکریٹری کو دیکھا اور مسکرا کر اخلاق سے دریافت کیا۔

"سو ——— ہاؤ آر یو دس ایوننگ مس مرزا ———؟"

"فائن ——— تھینک یو ———"

کار اب چوراہے کے بھیڑ بھڑکے کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی ——— گھڑگھڑ کرتی بسیں دھواں چھوڑتی ایک ایک کر کے برابر کے میدان میں جاکر کھڑی ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دفتروں سے لوٹ رہے تھے۔ حلوائیوں اور چائے والوں کی دوکانیں تیز نیون لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے برآمدوں پر جافریاں چڑھی تھیں اور ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی تھیں۔ ان سب ناموں کے پیچھے کتنی کہانیاں چھپی تھیں دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں ہومیوپیتھک ڈاکٹروں "پانی بجلی اور بھاپ کے اصل جرمنی علاج" اور پرائیویٹ کالجوں کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔

جمشید نے ایک گہرا سانس لیا اور پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے اسٹاف کے دکھ سکھ میں ذاتی دل چسپی لیتا تھا اور ان سے بڑی دردمندی سے پیش آتا تھا۔

"آپ کو دفتر کا کام کیسا لگ رہا ہے مس مرزا؟"

"اِٹس آل رائٹ۔" جواب ملا۔

اب کرائسلر سنٹرل جیل کی دیوار کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ دفعتاً جمشید نے دیکھا کہ اس کی سکریٹری کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے۔

"مس مرزا ——— مس مرزا ——— کیا بات ہے؟" اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ———" چھوٹی بٹیا نے گھبرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"کیا ہوا ——— بتلائیے تو سہی ——— ؟"
"کچھ بھی تو نہیں ———"
وہ خاموش ہو گیا۔ بہت شریف لڑکی ہے مگر بے حد نروس طبیعت کی مالک ہے۔ خیر ٹھیک ہو جائے گی۔
"اگر آپ پارٹی میں بھی اسی طرح چپ رہیں تو میری بزنس ہو چکی! ———" کچھ دیر بعد جمشید نے ذرا خوش دلی کی سعی کرتے ہوئے کہا۔
وہ دل پر جبر کر کے اخلاقاً ہنسی۔ جمشید نے سگریٹ جلایا۔
"آپ اسموک نہیں کرتیں ؟"
"جی نہیں ———"
اس لڑکی کے بے بس سے وقار نے اسے اتنا مرعوب کر دیا کہ مزید ذاتی سوال کرنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پارٹی کے اختتام پر جمشید اپنی سکریٹری کے قریب آیا اور بڑی گرم جوشی اور طمانت سے اس کا چھوٹا سا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
"——— مس مرزا۔ آپ تو فرنچ بولنا بھی جانتی ہیں۔ چھپی رستم نکلیں آپ تو ——— آپ نے اتنی خوبصورتی سے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ اور پرفیکٹ سکرٹریز ہوتی ہیں تو ہم اپنا سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں!"
"اب ہمیں گھر پہنچا دیجیے۔"
"یقیناً ——— لیکن مس مرزا ——— آپ عموماً اس قدر خاموش رہتی ہیں اور آج شام اتنی ڈپیریسڈ معلوم ہو رہی تھیں کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے پارٹی اینجوائے کی۔ آج میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا اور آپ نے شیری چکھنے میں اتنا تکلف کیوں کیا؟ پڑھی لکھی لڑکی ہو کر اتنی دقیانوسیت! ——— خوش رہیے۔ زندگی سے جی بھر کر محظوظ ہوجیے۔ ہم لوگ اس دنیا میں بار بار پیدا نہ ہوں گے۔ ہنسیے ——— ہنسیے۔ ڈیم اِٹ ——— میں نے بہت آپ جناب کر لیا۔ تم میری سکرٹری ہو۔ میں تمہیں صرف سلمٰی کہوں گا۔ اپنا یہ اسکول مسٹریس کا ذہنی لبادہ اتارو۔ اگر یہ اولڈ میڈ والی ذہنیت اختیار کی تو یاد رکھو واقعی ساری عمر اولڈ میڈ ہی رہو گی ——— اور یہ بڑی سخت ٹریجڈی ہوگی۔ جوانی کی مسرتوں کا تم پر بہت زیادہ حق ہے ———"
جمشید کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔
رات کو جمشید علی گھر واپس پہنچا تو شراب کے مبہم سرور کی لہروں پر تیرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ گو اس لڑکی کے خاندان کا کچھ پتہ نشان معلوم نہیں مگر ہے پیاری سی ——— اور انگریزی بالکل میموں والی بولتی ہے ——— ممکن ہے اس کی ماں انگریز ہی ہو ——— بہترین بیوی ثابت ہوگی — خاموش طبیعت ——— محنتی اور خوش اخلاق ——— مگر رہتی ہے کولونی میں۔ STATUS کا بڑا پرابلم ہے وہ بارات لے کر کولونی کس طرح جائے گا ——— ؟
لیکن کپڑے تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹتے وقت جب اس کا سرور تھوڑا سا زائل ہوا تو اس نے سوچا ——— لاحول ولاقوۃ، یہ میں کیا بکواس سوچ رہا ہوں ——— کیسی شادی اور کس کی شادی ——— ؟ میں اس لونڈیا کو GROOM کروں گا۔ بہترین CONTACT WOMAN ثابت ہوگی۔ ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہو کر سارے کاروباری راز اگل دے گا۔ لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے۔
اس نے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور سگریٹ جلایا۔

WHAT A LUCKY DOG I AM, WHAT A LUCKY DOG

اس نے دل میں کہا۔

برابر کے ایک کمرے میں سید اختر علی چند ملاقاتیوں سے کلیم کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

"آپ نے کتنے کا کلیم داخل کیا ہے وکیل صاحب ؟"

"صرف تین لاکھ کا ——" سید اختر علی کی آواز آئی —— "آپ کی زرعی جائداد بھی تو ہوگی ؟" کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں —— مگر میرے بھائی صاحب ابھی بھارت ہی میں ہیں ——" سید اختر علی نے جواب دیا —— "وہ ابھی تک وہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہت لکھا کہ یہاں آجائیے مگر نہیں مانتے۔ میں نے تو اپنی کان پور کی کوٹھی کا کلیم ہی داخل کر دیا ہے فی الحال۔ منظور ہونے پر بھی اس کا چالیس فی صد ہی ملے گا مگر صبر و شکر کر کے وہی قبول کر لیں گے۔ کیا کیا جائے۔ یہاں تو ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ آبادکاری کے محکمے میں ذرا بھی انصاف نہیں۔ یہ ملک تو بالکل اندھیر نگری بنا ہوا ہے ——"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے وکیل صاحب ——"

جمشید کو پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے روشنی جلائی۔ اٹھ کر الماری میں سے وہسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور ایک گلاس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی —— اب وہ کہہ رہے تھے —— "اب یہی دیکھیے جمشید میاں نے دو ہزار گز زمین سوسائٹی میں لے کر ڈال دی تھی۔ اس پر کوٹھی کی تعمیر شروع کروائی مگر سیمنٹ اور لوہا سب بلیک میں چلا گیا۔ ایک ساڑھے تین لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے"!

جمشید نے گلاس ختم کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دفعتاً ایک بھیانک انکشاف اس کے ذہن کے دھندلکے میں کوندا —— اپنے خدا پرست، فقیر منش، توکّل پسند باپ کو، اس شخص کو جو ایک زمانے میں سید مظہر علی اور گوسائیں کاکا اور مولوی محمد حسن کے محدود و معصوم دائرے کا ایک فرد تھا۔ اس بھولے بوڑھے کو جھوٹا، بد دیانت، ریاکار اور جعل ساز اس نے خود بنایا تھا، OH. WHAT A DOG I AM WHAT A DOG

WHAT A DOG اس نے زور سے تکیے پر مکّہ مارا اور کمبل میں منہ چھپا کر سو گیا۔

منصور احمد ثریا سے پیرس میں ملا تھا۔ وہ ایک ہونہار، محنتی اور بے انتہا ذہین جرنلسٹ تھا اور کئی سال امریکہ میں پبلک ریلیشنز کی تکنیک سیکھنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آیا تھا ان دنوں ایک انگریزی روزنامے سے منسلک تھا اور شہر کے کامیاب اور با اثر صحافیوں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ پریس کلب میں بیٹھا ثریا کی ہونے والی نمائش کے متعلق ایک رائٹ اپ لکھ رہا تھا۔ ثریا نے پریس کلب کو اپنی ایک بڑی پینٹنگ تحفے میں دی تھی اور منصور نے اسے فون کیا تھا کہ وہ خود پریس کلب آکر تصویر کو اپنی مرضی کے مطابق دیوار پر آویزاں کرے اور کھانا بھی وہیں کھائے —— اتوار کی سہ پہر تھی۔ تین چار صحافی ہال کے ایک کونے میں بڑی سنجیدگی سے شطرنج میں غلطاں و پیچاں تھے۔ منصور نے مضمون شروع کرنے کے لیے کاغذ ٹائپ رائیٹر پر چڑھایا کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اسے اپنے اخبار کے لیے بھارت کے متعلق ایک اہم مضمون تیار کر کے جلد از جلد کاپی فائل کرنی ہے۔ وہ فوراً لمبی میز کی طرف گیا جس پر رسالے اور اخبار بکھرے ہوتے تھے۔ اس نے سُرعت سے بھارت کے تازہ انگریزی اور اُردو اخباروں کی ورق گردانی شروع کی۔ شمالی بھارت کے سیاسی کوائف کا جائزہ لینے کے لیے اس نے اُتر پردیش کا ایک نسبتاً غیر معروف سا اُردو اخبار اٹھا لیا۔ اس میں زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے عرسوں کی اطلاعات اور صوبے کے اسلامی اور عربی مدارس اور اوقاف کے انتظامات کے متعلق خبریں درج تھیں۔ اضلاع کی خبروں کے کالم میں ایک چھوٹی سی سُرخی تھی:

شاہ منوّر علی کا وصال

موضع محمد گنج ضلع سلطان پور (اودھ) کی درگاہ شریف کے سجادہ نشین مخدوم زادہ شاہ منوّر علیؒ نور مرقدہ،

ہندوستان جنت نشان کی پاک سرزمین (پاک سرزمین ؟ منصور احمد نے دل میں کہا" پاک سرزمین صرف

پاکستان کی ہے) کے ان عارفین کاملین اور بزرگان گرامی میں سے تھے جو ——— "
منصور احمد نے قلم اُٹھا کر آگے نظریں دوڑائیں - اسی کالم میں ایک اور غیر دلچسپ سی خبر تھی ——— جناب
نوروز حسین خاں آف پاربتی پور (ضلع سلطان پور) نے جو دوھان سبھا میں سوتنتر پارٹی کے ممبر ہیں کل ———
منصور احمد نے اور آگے پڑھا جہاں وزراء پر نکتہ چینی، بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی، ذات بندی، صوبہ پرستی اور فرقہ پرستی کے انسداد کے مطالبے اور دیگر متعلقہ معاملات کے کوائف چھپے تھے - ایک سُرخی پر اس کی نظر ٹھہر گئی جو اہم ہو سکتی تھی ———
کامریڈ آنند موہن گھوش کا لوک سبھا میں سوال ——— نئی دہلی ۱۲ مئی ——— لوک سبھا میں بحث کے دوران کمیونسٹ ممبر کامریڈ آنند موہن گھوش نے ———
" ہیلو ——— کیا ہو رہا ہے ——— ؟" ثریا نے پیچھے سے آن کر آواز دی -
" ہیلو ——— ثریا ———" منصور نے اخبار بند کرتے ہوئے مڑ کر کہا -
" معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی ———" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا - اس کے ساتھ عابد انصاری بھی تھا جو منصور کے مخالف اخبار میں چیف رپورٹر تھا - ان دونوں میں بہت دوستی تھی مگر خبروں کی اسکوپ کے معاملے میں دونوں ایک دوسرے کو چوٹ دینے کی فکر میں رہتے تھے ——— " میں عابد کو اپنے میورل دکھانے لے گئی تھی - اس میں ایک گھنٹہ لگ گیا ———" ثریا نے کہا -
" ——— جو تم ایرپورٹ پر بنا رہی ہو ؟" منصور احمد نے دریافت کیا -
" نہیں - جمشید ہاؤس کی لاؤنج میں ———" ثریا نے کہا -
" جمشید ہاؤس ؟ ——— اچھا ——— وہ جمشید سید کی نئی کوٹھی ———"
" اس کے لیے بہت سے آرٹسٹ دانت لگائے بیٹھے تھے کیونکہ جمشید علی پیسے بہت فراخ دلی سے دیتا ہے ———" عابد انصاری نے کہا -
" میں فوٹوگرافر لے چلوں ؟ میورل کی تصویر بھی تمھارے متعلق مضمون کے ساتھ چھپ جائے -" منصور احمد نے کہا -
" ابھی رہنے دو - ابھی اس میں ہاتھی کی سونڈ باقی ہے -" ثریا نے جواب دیا -
" ہاؤس وارمنگ کے روز دیکھ لینا "
" اچھا - تو تم نے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا موٹیف رکھا ہے -" منصور احمد نے میز پر جھک کر کاغذ پر ایک جملے کا اضافہ کیا - پھر اُس نے کہا -
" ثریا تم کو ماننا پڑے گا کہ تمھاری نمائش کے لیے اس سے بڑھ کر ایڈوانس پبلسٹی نہیں ہو سکتی تھی - ایک مضمون میں اپنے نام سے لکھ رہا ہوں - چار مضامین اگلے ہفتے تک مختلف ناموں سے پریس میں اور آجائیں گے اور تمھاری نمائش کا کتابچہ بے حد خوبصورت چھپا ہے "
" تھینکس ——— ہاؤ سویٹ آف یو -"
" تم دونوں جا کر کھانا منگواؤ ——— میں ایک ضروری نوٹ لکھ کر ابھی آتا ہوں ———"
" جلدی کرنا ———" ثریا نے کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا -
منصور احمد نے نہایت سرعت سے بھارت پر نوٹ مکمل کیا اور ٹائپ رائٹر پر دوسرا کاغذ چڑھایا اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا :
" کراچی کے فنی حلقوں کے لیے مس ثریا حسین محتاج تعارف نہیں ہیں - مس حسین نے جو اتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحبزادی ہیں، مسوری کانونٹ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شانتی نکیتن اور ———"

پی - ای - سی - ایچ - ایس کی ایک اونچی نیچی پتھریلی سڑک پر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں اور معزز مہمان اُتر اُتر کر اندر جا رہے تھے - کراچی

کے مشہور بزنس مین جمشید علی سیّد نے اپنی نئی کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" کی دعوت میں شہر کے تقریباً سبھی اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کوٹھی کی لاؤنج کے طویل دریچے میں سے وسیع اور سرسبز لان کا منظر ایک ٹیکنی کلر سینما اسکوپ پردے کے مانند دکھلائی دے رہا تھا۔ درختوں میں جگمگاتی برقی روشنیاں، قندیلیں، کیاریوں کے خوبصورت پھول، گھاس پر بکھرے ہوئے صوفے۔ اشیائے خورد و نوش سے لدی ہوئی میزوں کی قطاریں۔ سفید کپڑوں میں ملبوس بیرے، تپائیوں پر رکھے ہوئے قیمتی سگرٹوں کے ڈبے۔ سفارت خانوں کے افراد۔ نظر فریب ہندوستانی ساریوں میں ملبوس دلفریب پاکستانی بیگمات .... سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس۔ عطر کی لپٹیں، برف کی بالٹیوں میں ڈوبی ہوئی شراب کی بوتلیں، اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے جرنلسٹوں کے گروہ۔ کیمرہ سنبھالے چاروں طرف ٹہلتے ہوئے فوٹوگرافر۔ وقتاً فوقتاً کوندتے ہوئے فلیش بلب، بڑے بڑے کاروباری جغادری مل اونر! اعلیٰ سرکاری عہدے دار، کابینہ کے وزیر۔ سفیر اور فرسٹ سکریٹری اور پریس اٹاشی اور کمرشل اٹاشی —— چبوترے پر ڈانس بینڈ بج رہا تھا اور چند جوڑے رقص میں مشغول تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر روک اینڈ رول کا شور مچ رہا تھا اور فریٔ اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اودھم مچا رہی تھی۔ نیچے لان پر عالیہ سیّد نہایت بیش قیمت سفید رنگ کی بنارسی ساری میں ملبوس، گلے میں سچے موتیوں کی ایک لڑی پہنے، میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مصروف تھی۔ سیّد اختر علی سوٹ پہنے ایک کونے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ جمشید کے دونوں چھوٹے بھائی امریکہ پلٹ کم عمر لڑکیوں کے ایک گروہ میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

لاؤنج کے اندر چند مہمان دیوار کی سطح پر بنے ہوئے فریسکو پر رائے زنی میں منہمک تھے۔ ثریّا جس نے فرانسیسی شیفون کے بڑے بڑے سرخ پھولوں والی ساری پہن رکھی تھی۔ تصویر کے سرے پر کھڑی مدّاحوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے بال تازہ ترین بی ہائیو اسٹائل میں بنے تھے۔ اور اس نے شنیل فائیو کی خوشبو لگا رکھی تھی اور اس کے بلاؤز کی تراش میں سے اس کی ساری پیٹھ عریاں تھی۔

"مس حسین میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ جیمینی رائے کے اثر سے آزاد ہو چکی ہیں۔ آپ کے بنائے ہوئے نقوش اور رنگوں میں اب قومی کردار اور قومی طرز کی جھلک نظر آنے لگی ہے ——" پاکستانی آرٹ کے ایک مشہور نقاد نے اس سے کہا۔

"پاکستانی آرٹ کا مستقبل اب صرف ہمارے فن کاروں کی نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پیرس پیریڈ کی تصاویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے تہذیبی ورثے کی طرف آ رہی ہیں ——" دوسرے نقاد نے کہا۔

"مثال کے طور پر موسیو ویتریے آپ ہاتھی کی سونڈ ملاحظہ کیجیے ——" فریسکو کے سامنے ایک اور انٹلکچوئیل نے ایک موٹے فرانسیسی کو مخاطب کیا —— "ہاتھی" —— اس نے حلق صاف کر کے مقررانہ انداز میں بات جاری رکھی —— "مشرقی پاکستان کی کلچر کا ایک سمبل ہے وہاں کی ندیاں۔ بوٹ مین، ہاتھی اور مچھلیاں ——"

"مچھلیاں، کشتیاں اور جوٹ ——" دوسرے انٹلکچوئیل نے اضافہ کیا۔

موٹے فرانسیسی نے جو شکل سے ذرا احمق سا معلوم ہوتا تھا، عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کو دیکھا ——

"ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں ——" اس نے حیرت سے کہا۔

"مس حسین ——" پہلے انٹلکچوئیل نے کہا —— "موسیو ویتریے کو اپنے شاہکار کی سمبلزم سمجھائیے۔ پاکستان کی تہذیبی روایت کی جڑوں کی تلاش اور مسلمانوں کے اجتماعی فنی لاشعور کے مظاہر کی معنی آفرینی اور ——"

بیرا شراب کی بوتلیں اور جام ایک ٹرے میں رکھے اِدھر آیا۔ وہ سب جام ہاتھوں میں لے کر فریسکو کے سامنے کھڑے آرٹ پر تبادلۂ خیالات میں مصروف رہے۔

دیوار کی سبز روغنی سطح پر آم کے درخت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے کھڑے تھے۔ عقب میں ایک گہری نیلی ندی بہہ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ہاتھی گزر رہا تھا جس پر زرد رنگ کی جھول اور چوکور سا ہودہ تھا۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پوری تصویر بنگالی فوک آرٹ کی طرز میں بنائی گئی تھی۔

"ثریّا" —— دوسری طرف سے کسی نے آواز دی —— "تمہیں جمشید ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" وہ لاؤنج میں جمع مہمانوں سے معذرت چاہ کر

باہرلان میں گئی۔

مقابل کی روشنی پرسے اس نے ایک سنہرے بالوں والی پستہ قد لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس لڑکی نے جھلمل کرتے ستاروں والی آتشیں گلابی ساڑی پہن رکھی تھی اور بالوں کا بہت اونچا پھیلے ہوئے تاج یا پنکھے کا سا جوڑا بنائے تھی جس کی اونچائی کی وجہ سے اس کے قد میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ پپوٹوں کے ہلکے نیلے روغن اور ہونٹوں کے گہرے گلابی رنگ کے ساتھ اس کا میک اپ بے حد نفیس اور مکمل تھا۔ وہ لڑکی قریب آگئی۔

وہ دونوں آمنے سامنے اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہوگئیں۔ کئی سکنڈ گزر گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"چھوٹی بٹیا ————" ثریا نے چند لمحوں بعد کہا۔

سلمیٰ گم سم آنکھیں پھاڑے گھاس کو دیکھنے لگی۔

"چھوٹی بٹیا۔ "

وہ خاموش رہی۔

"چھوٹی بٹیا۔ —— آپ —— میں —— "

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اوہو ثریا —— !" کسی مہمان نے قریب آکر گرمجوشی سے کہا۔ —— "لونگ ٹائم نو سی۔ تمھیں فون کرتے کرتے عاجز آگیا۔ ویسے تم رہتی کہاں ہو —— ؟"

"ہاؤسنگ سوسائٹی۔" ثریا نے اس آواز میں کہا جو اس نے خود نہیں سنی۔ پھر اس نے جواب دہرایا۔ —— "ہاؤسنگ سوسائٹی۔"

"اچھا۔ میں کل شام کو عالیہ کے ساتھ آؤں گا ————" وہ مجمع میں غائب ہوگیا۔ پیچھے سے جمشید نے آکر ثریا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ میں کاک ٹیل کا گلاس تھا۔

"جان من ————" اس نے ذرا لہک کر کہا ———— "ڈھونڈ تھکا ہوں بن کے بن، چھان پھرا گلی گلی ———— ! کہاں تھیں ؟ ——— ارے تم دونوں ایسی چپ چپ کیوں کھڑی ہو ؟ کیا تمہارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ؟ ثریا۔ دس از سلمیٰ مرزا ———— مائی موسٹ ایفی شینٹ سوشل پرسنل اینڈ کانفی ڈنشل سکریٹری۔ چلو جان من ناچیں۔ ————" اس نے گلاس تپائی پر رکھا اور ثریا کو کھینچتا ہوا چبوترے پرلے گیا ———— وہاں دونوں رقصاں جوڑوں کے بھنور میں غائب ہوگئے۔

ڈانس بینڈ کی دھن تیز ہوگئی۔ سلمیٰ قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت گہرے اندھیرے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ صوفے پر ٹک کر وہ ثریا کو جمشید کے ساتھ ناچتا دیکھتی رہی۔

ثریا باجی۔ اس نے دل میں کہا۔ بھیا آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید کاٹنے چلے گئے۔ جب وہ قید تنہائی کی لمبی مدت کے بعد باہر نکلیں گے، ان کے بال سفید ہوں گے اور وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے لیکن میرے بھیا کبھی بوڑھے نہ ہوں گے۔ کبھی ناامید نہ ہوں گے، کبھی ہار نہ مانیں گے۔ جب کہ آپ نے ثریا باجی۔ اتنی آسانی سے ہار مان لی۔ آپ جنھوں نے بھیا کو روشنی دی تھی۔ دل دیا تھا۔ ہمت دی تھی ———— اس نے آنکھیں میچ لیں تاکہ اس پارٹی کے منظر کی کسی چیز کو نہ دیکھ سکے۔

"ہلو" ———— کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی۔ سامنے کپاس کے ملک التجار پینسٹھ سالہ مسٹر زاویری کھڑے اپنے نقلی دانت نکوس رہے تھے۔ ان دنوں سلمیٰ کی ڈیوٹی تھی کہ ان کو انٹرٹین کرے ———— "ارے تم ادھر پاگل کا مافک کائے کو بیٹھا ؟ ———— ڈانس نہیں بنائے گا ———— ؟" مسٹر زاویری نے کہا۔

"جی نہیں - میں اس وقت ڈانس نہیں کروں گی ——" سلمٰی نے کپکپاتی آواز میں کہا —— "اس وقت مجھے معاف کیجیے "

"ارے ارے —— ہم کو بولو —— کیا بات ہے —— طبیعت کھراب ہے تمہارا —— ؟"

مسٹر زاویری نے اس بے تکلف لہجے میں دریافت کیا جس طرح لوگ اپنی بیویوں سے بات کرتے ہیں۔ سلمٰی لرز اٹھی۔

"اچھا چلو۔ ادھر ٹیبل پہ تمہارا اکھا فرینڈ لوگ ویٹ کرتا ——" وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھی، ثریا باجی —— میں آپ سے کس بات کا شکوہ کر سکتی ہوں۔ میں خود ہار مان چکی ہوں۔

وہ مسٹر زاویری کے ہمراہ میزوں کی طرف چلی گئی - جہاں "بوفے" شروع ہو چکا تھا۔

رقص کے بعد جب ثریا چبوترے سے اتر کر لان میں آئی تو اس نے سلمٰی کو ایک درخت کے نیچے مسٹر زاویری کے ساتھ صوفے پر بیٹھے دیکھا - وہ جس انداز سے سلمٰی کو گھور رہے تھے - ان کے چہرے پر ثریا کو درگا کنڈ کے نواب سکندر علی خاں عرف نواب بھورے کی آنکھیں نظر آئیں۔

دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سینما اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے۔ سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دور ایک مہیب جوالا مکھی نے آگ اگلنا شروع کی۔ گرم گرم، دہکتا ہوا لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سُروں، راک این رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکھناہٹ میں سے گزرتی ایک مدھم اداس، خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی —— "ماضی کی محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا —— کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار ——"

ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں - یہ بلجیئن کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتا، اطالوی معمار کا بنایا ہوا، الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا - یہ ضلع سلطان پور کے تعلقے درگا کنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود بسنتی بیگم قید تھی - پھر درگا کنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہو گئی - اس میں چھوٹی بٹیا قید تھیں - اس نے آنکھیں کھول کر پہچاننے کی کوشش کی - سامنے ہری گھاس پر جاپانی قندیلوں کے نیچے کون لوگ ٹہل رہے تھے - مسٹر زاویری - مسٹر گھاسلیٹ والا - مسٹر برٹن - اس نے آنکھیں بند کیں - نواب بھورے - میاں نوروز - ممن خاں - اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں - نواب بھورے - میاں نوروز - ممن خاں ایک بار پھر مسٹر زاویری - مسٹر گھاسلیٹ والا اور مسٹر برٹن میں تبدیل ہو گئے - اس نے نظریں اوپر اٹھائیں - سامنے جمشید کھڑا تھا۔

"جانِ من ——" اس نے سرور کے عالم میں کہا —— "اس جامِ جمشید کا جام تو پی لو —— جس کا نام جمشید ہاؤس ہے - یہ میرا جامِ جہاں نما ہے ——" اس نے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کر کے کہا —— "یہ میرا ساغرِ جم ہے " اس نے گلاس اٹھایا اور دوسرا گلاس ثریا کو دیا۔

"چیرز —— !"

"چیرز —— !"

پھر وہ ثریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے ڈرائنگ روم کی سمت لے گیا جس کے ایک گوشے میں بار کے اسٹولوں پر تین چار غیر ملکی اور دیسی بزنس مین چڑھے بیٹھے تھے اور مسٹر پیٹرک سیاہ پتلون، سفید کوٹ پہنے، سیاہ بو ٹائی لگائے بارمین کے فرائض انجام دے رہا تھا - جمشید ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اور ثریا کو نزدیک کے اسٹول پر بٹھا لیا۔

گلاسوں میں تیز شراب انڈیلتے ہوئے جمشید نے ان لوگوں سے کاروباری باتیں شروع کیں:

"جمشید بھائی - تم ہمارے کو یہ بولو کہ لندن آفس سے کیبل آگیا یا نہیں —— ؟" سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا نے جو ابھی ابھی بار پر آئے تھے ذرا غرا کر اسے مخاطب کیا۔

"ابھی نہیں آیا سیٹھ صاحب —— !" جمشید نے بے پرواہی سے جواب دیا اور غیر ملکی تاجر کی طرف مڑا —— "ہاں تو جارج میں تم کو کیا بتا رہا تھا —— ؟ ہاں - میں نے لندن سے درخواستیں منگوائی تھیں - ایک مسٹر ایس - ڈی، جانسن کا میں نے مانچسٹر آفس میں تقرر کر لیا ہے - مسٹر جانسن

نے اپنی درخواست میں لکھا ہے کہ وہ انڈین سول سروس میں عرصے تک کلکٹر او رکمشنر وغیرہ رہ چکے ہیں اور برصغیر سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یقیناً وہ مانچسٹر برانچ کا کام اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ میں اپنی غیر ملکی شاخوں میں ہمیشہ وہاں کے ایسے آدمی ملازم رکھتا ہوں جو برصغیر کے معاملات سے اجنبی نہ ہوں۔"

"اپن کے نیاس کا جواب دو جمشید بھائی ——" سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے دوسرا گلاس چڑھا کر یک لخت بار کی چمکیلی سطح پر زور سے مکّہ مارا —— "اپن کا ڈبل سیٹل کیا کہ نہیں ——؟"

اب مسٹر زاویری بھی اندر آکر باتوں میں شریک ہو گئے۔ ثریّا اس کاروباری گفتگو سے اُکتا کر اسٹول پر سے اُتر نی۔ دوسرے کونے میں ایک صوفے پر جا بیٹھی۔

دفعتاً بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے گلاس فرش پر پٹخ کر جمشید کا گلا پکڑ لیا —— "سالا —— تم نے ہم کو پانچ لاکھ کا دھوکا دیا۔ ہم تمھارے اوپر کیس چلائیں گا ——"

"شٹ اپ عیسیٰ بھائی یو اولڈ فول ——" جمشید نے گلا چھڑاتے ہوئے جواب دیا —— "یو شٹ اپ —— یو ڈرٹی بلیک مارکیٹیر" سیٹھ گھاسلیٹ والا گرجے۔

"اوہ —— فور گاڈز سیک لہ ——" جارج نے انگلی اٹھا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا —— "سالا۔ تم خان برادرز سے ایگریمنٹ کرتا، اور ہم سے چار سو بیس کرتا۔ ہم سے پانچ لاکھ کا فراڈ کرتا۔ ہمارا اکھا بزنس میں لفڑا کرتا۔ ہمارے روکڑے میں گول مال کرتا۔ ہمارے ساتھ اتنا بڑا گھٹالا ڈالیں گا۔ تو ہم تم پر سُوٹ فائیل کریں گا —— ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان کیا —— سالا، موالی —— چور —— بے ایمان ——" سیٹھ عیسیٰ بھائی نے نشے میں دھت ہو کر جمشید کی ناک پر زور کا گھونسہ رسید کیا۔ اور ہاتھا پائی شروع کر دی۔ بار میں بیٹھے ہوئے باقی احباب بھی اس مار پیٹ میں خوشی خوشی شامل ہو گئے۔

چیخ و پکار سن کر سلمیٰ اندر آئی۔ مسٹر پیٹرک نے سلمیٰ کے لیے شیری سے جام بھرا۔ وہ ثریّا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

ہاتھا پائی کرتے ہوئے معزّز مہمانوں نے تین چار سرخوشی کے نعرے بلند کیے لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پر جنون سوار تھا۔ انھوں نے جمشید کو پیٹ بھر کے گھونسے مارے۔ جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس جھناکے سے ٹوٹے، جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں میں کرچیں چبھ گئیں اور خون نکل آیا۔ ثریّا اور سلمیٰ اطمینان سے کونے میں بیٹھی تماشہ دیکھتی رہیں۔

باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دُھن تبدیل ہوئی اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند، وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی اور رقصان جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹخنے افریقی تال پر تیز تیز چکر کاٹنے اور اچھلنے کودنے لگے۔

اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی بنکارا کیے —— "جھوٹا —— بے ایمان —— سالا —— چور ——" وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے۔

"ثریّا باجی —— ثریّا باجی —— مسٹر گھاسلیٹ والا نے چور پکڑا ہے ——" سلمیٰ نے سرخوشی کے عالم میں کہا اور نازک سا قہقہہ لگایا۔

جمشید سیٹھ عیسیٰ بھائی کی گرفت سے چھوٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے مکمل سنّاٹا چھا گیا۔ مسٹر زاویری سیٹھ گھاسلیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔ جمشید کہنیوں کے بل قالین سے اُٹھا۔ رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون صاف کیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کُتّے کی طرح چلتا ہوا

لہ OH, FOR GOD'S SAKE

دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔ وہ بری طرح سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سلمٰی پر جھک کر بولا ——— "ہم چور نہیں ہیں ——— ثریا۔
اس کو بتا دو ہم چور نہیں ہیں۔ اس کو بتا دو جمشید داچور نہیں ہے۔"

"یو آر میرلی ویری ڈرنک[1] مسٹر جمشید ———" سلمٰی نے بیزاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

یکایک وہ گانے لگا ——— "اگیا لاگی ——— سندر بن جل گیو رے۔"

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا اور صوفے سے اٹھی اور سلمٰی کی مدد سے لے جا کر اسے بڑے صوفے پر لٹا دیا۔ باقی ماندہ مہمان بھی بار سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تر بتر سطح کو پونچھا اور باہر چلا گیا۔

جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کر دیا۔

"بلائے آفت کا پرکالہ ہوں۔

ناچ نچا دوں دم بھر میں — آگ لگا دوں دم بھر میں
جس کا تاکا اس کو مارا — پو بارہ ہیں پو بارہ — پو بارہ ہیں پو بارہ۔
پو بارہ ہیں پو بارہ ——— ہُترے ہپ ہپ — ہُترے ہپ ہپ ہپ ہپ ———"

"شٹ اپ جمشید ———" ثریا نے اسے سختی سے ڈانٹا اور جا کر دریچے کے نیچے رکھے ہوئے دیوان پر بیٹھ گئی۔

"یس سر ——— آل رائٹ سر ———" جمشید نے اٹھ کر سلوٹ کیا اور دراز ہو گیا۔

مسٹر پیٹرک ڈاک کا پلندہ لے کر اندر آیا ——— "سر کیبل آیا ہے۔ شام کی ڈاک میں چٹاگانگ کے دو ضروری لیٹر ہیں۔ ذرا دیکھ لیجیے۔"

"دگیٹ آؤٹ"

"سر ——— خان برادرز کا اگریمنٹ ——— مسٹر جانسن کا کیبل ——— موسٹ ارجنٹ" مسٹر پیٹرک نے کہا۔

جمشید نے صوفے پر کھڑے ہو کر الاپنا شروع کر دیا۔

" یہ سب کو سیر عجائب دکھائی شیریں نے
ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے
پھر اس طرف دل کوہکن میں آگ لگی + اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے"

سلمٰی ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھے فرش کو تک رہی تھی۔ جمشید صوفے پر سے کود کے الاپتا ہوا اس کی طرف گیا۔

" گلال زلفوں میں اُن کی پڑا تھا ہولی میں' تو لالہ بولا کہ مشکِ ختن میں آگ لگی"

اس نے سلمٰی کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سلمٰی نے غصے سے سر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اچک کر میز پر آ گیا اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر گنگناتا دہاڑتا چلا گیا

"یہ وصف تجھ ہی میں دیکھا نگار غصے میں
ہوا ہے چہرہ تیرا زرد یار غصے میں
تو بلبلوں نے بھی جانا چمن میں آگ لگی ——— ارے ہاں اگیا لاگی۔"

"ڈو شٹ اپ پلیز ———" سلمٰی نے تلملا کر کہا۔

جمشید نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ——— "دگیر ———

---

[1] YOU ARE MERELY VERY DRUNK

میں بھولی باتوں کا اس کے کروں بیاں کیا کیا
شفق کو دیکھ کے کہتا ہے نوجواں میرا
عجب تماشہ ہے چرخِ کہن میں آگ لگی
اجی ہاں آگ لگی ——"

"ثریا باجی ——" سلمیٰ نے میز پر سے اترتے ہوئے آواز دی۔ ثریا جو دیوان پر نیم دراز اونگھ رہی تھی —— اس نے ایک آنکھ کھولی۔

"پری بی ۔ مجھے سمجھاؤ کہ جانِ من تمہاری ثریا باجی کس طرح ہیں —— کیوں کر ہیں —— کدھر سے ہیں —— ایٹ سیٹ را ——" جمشید نے انگلی اٹھا کر سلمیٰ سے استفسار کیا۔

"سر —— !" مسٹر پیٹرک نے دوبارہ زبان کھولی ۔ "ڈاک دیکھ لیجیے ۔"

"آل رائٹ —— آل رائٹ —— یو بلیک مین —— کالیٹین آدمی —— ہمارے غلام کے چلام کے تلام —— نوکر کے چوکر —— ڈی کے اوسار، مسٹر ایس۔ ڈی ۔ جانسن صاحب بہادر آئی۔ سی۔ ایس۔ ریٹائرڈ کا کیبل مارو —— اور دیکھو —— اگر تم نے ہمارا ٹائم زیاستی خراب یا تو ہم تمہارا اتنا ٹھکائی کرے گا ۔ اتنا ٹھکائی کرے گا کہ تم افسوس کرے گا کہ تم پیدا ہوا تھا ——" یہ کہہ کر اس نے کاروباری خطوط کے لفافے کھولے —— مسٹر پیٹرک نے جلدی سے فاؤنٹن پن حاضر کیا۔ اس نے خطوں پر سرسری نظر دوڑائی۔ آنکھ بند کر کے ایک فارم پر دستخط کیے اور کاغذات قالین پر پھینک دیے مسٹر پیٹرک نے لپک کر انہیں اٹھایا اور ایک اور لفافہ پیش کیا جس پر ہندوستان کے ٹکٹ اور مہر تھی۔ اس کے بعد مسٹر پیٹرک باہر چلا گیا۔ جمشید نے اسی طرح بہکتے ہوتے لفافہ کھولا اور خط پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی تیوری پر بل پڑے اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پڑھنا شروع کیا ——

باسمہ سبحانہٗ
متصل درگاہ شریف ۔ موضع محمد گنج ۔ تحصیل بیرونی
ضلع سلطان پور ۔ یو۔ پی ۔ مورخہ ۱۴ ؍ جون ۱۹۶۱ء

برخوردار سعادت آثار نورچشمی جمشید میاں سلمہٗ تعالیٰ

واضح ہو کہ بتاریخ ۱۲ ؍ جون بروز جمعہ بوقت دس بجے شب نورچشمی منظور النساء سلمہا بعارضہ تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی —— انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ مرحومہ کو خانقاہ شریف کے گورستان میں بھائی صاحب جنت آرام گاہ نور مرقدہٗ کے متبرک پہلو میں دفن کیا گیا۔

اوس مرحومہ نے مرتے وقت تمہیں معاف کیا۔ تمہارا خدا بھی تمہیں معاف فرماوے۔

فقط دعاگو
تمہارا چچا —— سید مظہر علی عفی عنہ

جمشید نے خط مٹھی میں زور سے بھینچا اور کاغذ کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا —— دوبارہ پڑھا اور ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گیا۔
ثریا اور سلمیٰ بہت دور کونے میں کشنوں کے سہارے دیوان پر آڑی آڑی لیٹی باہوں پر سر رکھ کر سو چکی تھیں ۔ باہر رقص ختم ہو چکا تھا اور مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔

کمرے میں قبرستان کی خاموشی سرسرانے لگی۔ سنسان خانقاہ کے سارے کواڑ ہوا میں زور سے کھل گئے اور کھڑکھڑائے —— ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو اتنی لمبی جائداد عطا کرتا ہے —— صبر کی جائداد —— بڑے ابا نے کاکلیں جھٹکا کر تاریخی کفنی سمیٹی اور اپنے خالی حجرے میں سے جھانکا —— کھڑاؤں پہنے اور کھٹ کھٹ کرتے، سیڑھیاں اتر کر دوبارہ اپنی قبر میں جا گھسے ۔ ہوا روئی کے پیڑوں میں زور زور سے منڈلانے لگی ۔ بہت سرد ہوا تھی اور لو کے چلتے ہوتے تھپیڑوں میں تبدیل ہو گئی ۔ شائیں شائیں شائیں شائیں زوؤوں —— گھوں گھوں گھوں گھوں —— جھڑاکے کی بارش شروع ہو گئی اور

کچی قبر پانی میں بھیگنے لگی۔ بادل چھٹ گئے — چاند نکل آیا — سرخ آسمان پر سورج بھی ڈوب رہا تھا — اور چاند بھی نکل آیا —
سہاگن کی قبر ہے جیسے رات کو چنبیلی ایسی مہکت ہے — بکریاں ہنکاتی ہوئی چرواہن نے کہا۔ جمشید نے زور سے سسکی بھری۔
"تمہارا نشہ اب تک نہیں اترا — ؟" ثریا نے آنکھ کھول کر استہزا سے دریافت کیا اور پھر سو گئی۔

عابد انصاری تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہانپتا ہوئی سانس کے ساتھ لاؤنج میں آیا — "منصور — منصور — " اس نے آواز دی۔

منصور ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے دوسرے میں ریسیور اٹھائے ٹیلی فون پر جھکا ہوا تھا۔ عابد نے اس کے قریب جا کر چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "— منصور — قیامت گزر گئی —"

منصور نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا اور ریسیور کو ہاتھ سے چھپا کر آہستگی سے جواب دیا:
"مجھے معلوم ہو چکا ہے —" اس نے ریسیور ایک منٹ کے لیے تھامے رکھا۔ پھر فون پر رکھ دیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔
لاؤنج خالی پڑی تھی۔ عابد ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔
"بے کار ہے" — منصور نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"پولس کا اصرار ہے اس نے خودکشی کی اور جیل کے حکام کا بیان ہے کہ پولس نے اسے تھرڈ ڈگری —" عابد نے چونکتے ہو کر چاروں طرف دیکھا اور فوراً چپ ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کا پٹ آہستہ سے کھلا۔

لاؤنج میں باتوں کی آواز سے ڈرائنگ روم کے اندر دیوان پر پڑی ہوئی ثریا کی آنکھ کھل گئی — اس نے دریچے کا پٹ کھول کر باہر جھانکا —
"ہلو — منصور — عابد — یو سوا ینڈ سو — تم لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہو —" اتنا کہہ کر اس نے پٹ بند کیے اور کشتوں گر کر دوبارہ سو گئی۔

لاؤنج میں وہ دونوں فریسکو کے نیچے فرش پر پندرہ بیس منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔
بہت دیر بعد منصور نے آہستہ آہستہ کہا:

"جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضع تکلف تو دیکھیے"

عابد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا — "میں پریس جاتا ہوں —"
"اس خبر کی اشاعت پر چوبیس گھنٹے کی پابندی ہے۔ بیٹھ جاؤ —" منصور نے جواب دیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بٹھا دیا اور قریب کی میز پر رکھی ہوئی تند شراب کی بوتل گلاس میں انڈیلی اور ایک دفعہ میں گلاس ختم کر دیا۔ عابد نے دوسرا گلاس بھر کے پینا شروع کیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا
"میں جاتا ہوں —" اس نے دوبارہ کہا — "یہ میرا بہت بڑا اسکوپ ہے۔"
منصور نے سر جھکا کر شراب کے بلبلوں کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا — "ایں — 'میرا اسکوپ' — جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے ؟"

"یہ رات — یہ رات — اس درد کا شجر ہے —" عابد نے پھوں پھوں کر کے روتے ہوئے گرہ لگائی اور فریسکو سے ٹیک لگا کر ایک ہچکی لی۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ عابد نے دوسرا گلاس چڑھایا — "ہم جو تاریک راہوں میں" — اس نے ایک اور ہچکی لی —
"واہ فیض احمد فیض گریٹ مین دی لالٹین — زندہ باد — مارے گئے —"
"زندہ باد' چیرز — تمہارا جام صحت — وعلیکم السلام" — منصور نے کھڑے ہو کر کہا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر خاموشی

چھاگئی۔ اندر سرپلے کلاک نے ٹکو ٹکو ٹکو کرنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔

"کس نے ——" منصور نے سوال کرنا چاہا مگر چاروں طرف دیکھ کر چپ ہوگیا۔

"کس نے —— ؟" عابد نے ہچکی لے کر پوچھا۔

"یہ کس نے —— ہچ" —— منصور نے تھوڑی دیر بعد دہرایا۔

"یہ کس نے —— لاش پھینک دی —— جوانیوں کی —— راہ میں ؟" —— عابد نے کہا۔

"ابھی گزر رہے تھے ہم جوارِ رزم گاہ میں —— ہچ ——" منصور نے کہا۔

چند یورپین لڑکیاں اپنے سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن ٹخنوں تک اٹھائے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی سامنے سے گزر کر عالیہ کے ڈرائنگ روم کی سمت چلی گئیں۔

"یہ جور و ظلم کی کلائیاں مروڑ کر نکل پڑا ——" عابد نے کہا۔

"اندھیری رات تھی —— ہچ —— مگر یہ چل پڑا ——" منصور نے کہا۔

"مگر یہ کس کی لاش تھی کہ بیڑیاں پڑی ہیں اب بھی پاؤں میں ——" منصور نے کہا۔

"جیل کے حکام کا بیان ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں —— ہچ" —— عابد نے کہا۔

بیرا چھلکتے ہوئے سرخ پیمانوں سے جھلملاتی روپہلی کشتی اٹھاتے ان کے قریب آیا۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیرے نے ان کے خالی گلاس کشتی میں رکھے نئے گلاس ان کے ہاتھ میں تھماتے اور آگے چلا گیا۔

"ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو صبر کی اتنی ای ای لمبی جائنداد عطا کرت ہے" —— ڈرائنگ روم میں سے جمشید کی آواز آئی جو صوفے پر کھڑا ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا۔

"یہ شام غم کا عکس تھا۔ یہ ایک انتباہ تھا —— ہمیں اسے کچل نہ دیں ابھی —— یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں ——" منصور نے کہا اور جام خالی کر دیا۔ "بتاؤ مسٹر عابد انصاری —— کیوں بنے امانتِ زمیں ؟ نہیں نہیں —— بڑھے چلو، کچل بھی دو ——" اس نے انگلی اٹھا کر کہا —— "کچل بھی دو —— ہچ —— خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش۔ یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے۔ لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک۔ جمے ہوئے لہو میں ہے مرے ہی خون کی مہک ——"

"مہک" اس نے اتنے زور سے گرج کر کہا کہ عابد اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس سے زیادہ گرج کر بولا۔

"یہ میرا اسکوپ ہے۔ میں کہے دیتا ہوں۔ یہ میرے کیریر کا سب سے بڑا اسکوپ ہے" —— وہ لاؤنج سے نیچے کیاریوں میں پھلانگتا اور گھاس کے قطعے پر سے لڑکھڑاتا، دوڑتا، کرسیوں سے ٹکراتا، جہاں اب اکا دکا مہمان ادھر اُدھر نشے میں لڑھک رہے تھے، وہ تیزی سے پھاٹک تک پہنچا اور ثریا کی نیلی فوکس ویگن میں بیٹھ کر زناٹے سے اپنے اخبار کے دفتر کی سمت روانہ ہوگیا۔

منصور نے اسے جاتے دیکھا اور سر ہلا کر کہا —— "عابد میاں، میں تمہارے آنے سے پہلے ہی اپنے اخبار کو فون کر چکا ہوں" —— اس کے بعد اس نے کیاری میں چھلانگ لگائی اور سر جھکائے کیکڑے کی طرح ترچھا ترچھا چلتا تاریکی میں غائب ہوگیا۔

ثریا نے جاگ کر آنکھیں ملیں اور سلمیٰ کا بازو ہلایا —— "اٹھو سلمیٰ —— کیا رات بھر یہیں سونے کا ارادہ ہے ؟"

"یہیں سونے دیجیے ثریا باجی۔ ہم بہت تھک گئے ہیں" —— سلمیٰ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔

جمشید صوفے پر سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا لڑکیوں کی طرف آیا اور سلمیٰ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر پوچھا —— "پری بی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ جانِ من تمہاری ثریا باجی کس طرح ہیں —— کیونکر ہیں —— کدھر سے ہیں —— ایں ؟"

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جمشید کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے بے لخت شدید کراہت سے کہا —— "کیپ اوف یو ڈرٹی ڈوگ"

"کیا کہا پری بی ——— ؟ میں ڈرٹی ڈوگ ہوں ؟ اور تم ؟ ——— تم کیا ہو ——— ؟ یو ڈرٹی بلڈی بچ[1] ———"

ثریا آگ بگولہ ہو کر اٹھی۔ اس نے جمشید کے منہ پر اپنی پوری طاقت سے ایک طمانچہ رسید کیا۔

"جمشید علی سید! تم کتنے ہی نشے میں کیوں نہ ہو ——— مگر تم نے میرے سامنے چھوٹی بٹیا کی توہین کی تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گی تمہارا خون کر دوں گی۔"

"آہاہاہا ——— اوہو ہو ہو ——— یک نہ شد دو شد ——— چھوٹی بٹیا ——— ! یہ آپ کی چھوٹی بٹیا ہیں۔ آپ ان کی اماں جان ہیں والدہ محترمہ ——— چہ خوش چرا نہ بودی ——— چھپّر پھینس کو دی۔ آج کی رات بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں ہم پر ——— چودہ[14] دونی اٹھائیس طبق روشن شُد ———" پھر اس نے زور کی تان لگائی ——— "آج کی رات ——— آج کی رآ آ آت ——— ساز درد نہ چھیڑ ———" اور دیوان کے قریب قالین پر دھم سے بیٹھ گیا۔

سلمیٰ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ ثریاّ سے لپٹ گئی ——— جیسے اس کی پناہ لیتی ہو۔

ثریاّ دفعتاً ہوش میں آگئی اور اس نے آہستہ سے جمشید کو مخاطب کیا ——— "جمشید سلمیٰ تمہارے دفتر میں چار مہینے سے کام کر رہی ہے اور تم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور کس کی بیٹی ہے ؟"

"مجھے موصوفہ کا شجرۂ نسب اور ہسٹری شیٹ معلوم کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ——— ان کی ذاتی فائیل سے میرا وزیر باتدبیر مسٹر پیٹرک ڈیل کرتا ہے۔ مجھے صرف اس سے غرض ہے کہ یہ میری نوکر ہیں اور میرے کلائنٹس کی محبوبہ دل نواز ——— مس چھپّن چھُری ——— ارے۔" اس نے پھر لہکنا شروع کیا ——— "ارے ایسے تو جگ میں جوان کوئی ہوئیہونا ——— ارے دِس گُنڈہ آگے۔ دِس گُنڈہ پیچھے ——— ایسے تو۔"

ثریاّ نے طیش سے بے قابو ہو کر تین چار تھپیڑ اسے اور لگائے۔ اس نے بازو چہرے کے سامنے کر کے ثریا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی سلمیٰ نے لرزتے ہوئے ثریا کو اپنی طرف کھینچا ——— "ثریاّ باجی ——— خدا کے لیے ——— ثریاّ باجی۔"

ثریاّ چیتے کی طرح چلتی ہوئی پھر جمشید کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ——— "ہاں جمشید علی سید آج کی رات، یقیناً انکشافات کی رات ہے ———"

وہ ثریاّ کے تیور دیکھ کر بے طرح خوف زدہ ہو گیا ——— "ڈارلنگ ہمیں مارو نہیں۔ ہمیں ڈانٹو نہیں ———" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

پنجرے میں مقیّد شیرنی کی مانند چاروں طرف گھوم گھوم کر ثریاّ نے کہنا شروع کیا:

"جمشید علی سید ——— آج پہلی مرتبہ میری ملاقات کھانے کے میز پر تمہارے والد صاحب سے ہوئی ——— اور میں نے ان کو فوراً پہچان لیا ——— محمد گنج میں وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر اکثر آیا کرتے تھے۔"

جمشید کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا ——— "جمشید ڈارلنگ ! ——— میں کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی نہیں ہوں۔ میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ہے۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ میں سید زوّار حسین مرحوم، سوز خواں و کاشت کار، موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کی لڑکی ہوں۔ تم کان پور کے کسی "مشہور ایڈووکیٹ" کے بیٹے نہیں ہو۔ تم سید مظہر علی، کاشت کار موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول دہرہ دون میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ تم اور میں ——— ہم دونوں اپنے پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں ——— زندہ باد منصور احمد خاں ——— میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

جمشید خاموشی سے اٹھا اور بار پر سے دو[2] گلاس بنا لایا۔

"آؤ ——— ہم دونوں اپنے عزیز پریس ایجنٹ منصور احمد خاں کا جامِ صحت پئیں ———"

ثریا نے بڑی سنجیدگی سے اپنا گلاس جمشید کے گلاس سے ٹکرایا۔ جمشید نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

YOU DIRTY BLOODY BITCH [1]

ٹوٹا بیگم آتو جی کی لڑکی ———— بسنتی بیگم

وہ کہتی رہی ——— "تمھارے چچا آبا سید مظہر علی نے سر پر کفن باندھ کر اپنی آقا نواب شمس آرا بیگم کے خلاف گواہی دی تھی اور مجھے میاں نوروز کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ وہ میرے محافظ فرشتے تھے۔ وہ تمھارے بھی محافظ فرشتے تھے مگر تم نے ان کو بھی نہ پہچانا ——— اور ان کی قدر نہ کی۔ ——— چھوٹی بٹیا کے بابا مرزا قمرالدین احمد نے مجھے آسرا دیا تھا۔ وہ بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل تھے۔ وہ میرے دوسرے محافظ فرشتے تھے۔ میرا تیسرا محافظ فرشتہ" ——— وہ کہتے کہتے یک لخت رک گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بات دوبارہ شروع کی ——— "میرا سب سے بڑا محافظ فرشتہ منصور احمد خاں ہے اور میری آخری جائے پناہ سوئٹزرلینڈ کے وہ بنک ہیں جن میں تمھاری دولت جمع ہے۔ آؤ ——— تمھارے سوئس اکاؤنٹ کا جام پئیں ———" اس نے گلاس دوبارہ ٹکرایا۔ اس نے دو سال پیرس میں رہ کے کبھی اتنی شراب نہ پی تھی جتنی وہ شام سے لے کر اب تک پی چکی تھی۔

جمشید نے وحشت زدہ ہو کر سلمی کو دیکھا جو بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اپنی آنکھیں مل رہی تھی اور ثریا کی ساری کا آنچل پکڑے اس کی آڑ میں دبکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

کہر آلود آم کے باغ میں گرم، روشن خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی بچی نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا۔

کمرے میں لرزہ خیز سکوت طاری تھا۔ دونوں آشفتہ حال، بے سہارا لڑکیاں محمد گنج کے مندر کی سیتا کی مورتیوں کے مانند اس کے سامنے بیٹھی تھیں وہ ان کے سامنے دو زانو جھک گیا اور اس نے آہستہ آہستہ کہا ———

"میری منظوریا نے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دیا۔ ثریا۔ سلمی۔ تم دونوں بھی مجھے معاف کر دو۔"

"کے سیرا ——— سیرا[1] ——— " دوسری منزل سے نغمے کی آواز بلند ہوئی ——— اور رات کے گہرے سناٹے میں گونجی۔ ابھی پارٹی جاری تھی اور فیری کے کسی لوائے فرینڈ نے ریڈیوگرام پر ڈورس ڈے کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔

جمشید دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا اور زینے میں جا کر بے حد زور سے دہاڑا ——— "داری او فرخنیا ——— ہلا بند کر ———" وہ اس زور سے چیخا کہ سارے جمشید ہاؤس میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ فیری نے گھبرا کر اوپر سے جھانکا اور ڈیڈی کی آواز اور اس لہجے سے بے حد متعجب ہوئی ——— ڈیڈی نے آج تک اسے اس گنوارو نام سے نہیں پکارا تھا۔

وہ پھر آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ سُریلے کلاک نے رات کا دو بجایا۔

ثریا نے آنکھیں میچ لیں اور چپکے چپکے کہا ——— "سلمان ——— سلمان ——— تم بھی مجھے معاف کر دو۔ مجھے اس طرح نہ مرنے دو۔ سلمان ———"

کمرے میں ایک بار پھر قبرستان کی خاموشی سنسنانے لگی۔

جمشید ہاتھوں میں سر پکڑے اس طرح بیٹھا رہا جیسے وہ گورکن ہو اور بہت سی میتیں دفن کر کے اب سستا رہا ہو ——— "اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے" ——— اس نے میٹھی ہوئی آواز میں دہرایا اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ختم کرنے کے بعد اپنی آنکھوں پر ہتھیلی پھیری اور پھر بڑی دل دوز نیچی آواز میں آہستہ آہستہ الاپنا شروع کیا: "جلی ہے لاش مری آتش جدائی میں ۔ مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی"

[1] "جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے۔"

—— پھر اس نے کہا —— بسنتی بیگم۔ تمھیں ہمارے گاؤں کا چپاتی بھانڈ یاد ہے، جو یہ خمسہ گایا کرتا تھا —— ؟“
ثریا اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گئی اور آواز ملانے لگی —— ”مد دکو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی ——“ کچھ دیر بعد ثریا نے یک بیک چیخ کر دہرایا۔

پھر وہ دونوں یک لخت چپ ہو گئے۔ سلمیٰ خاموشی سے سر جھکائے قالین کو تکتی رہی۔ ثریا نے ایک سانس میں متواتر دہرانا شروع کیا۔ پل نہ لاگیں موری انکھیاں پیو —پل نہ لاگیں موری انکھیاں۔ پیو پل نہ لاگیں پل نہ لاگیں پل نہ —— سلمیٰ نے گھبرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”—— ثریا باجی —— ثریا باجی —— لیٹ جائیے۔ پانی لیجیے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹی بٹیا ——“ اس نے جواب دیا اور ساری کے آنچل سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا مگر آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے اُمڈ آیا۔ پھر وہ دھیرے سے بولی —— ”جمشید —— مجھے بھی چپاتی بھانڈ کا ایک گانا یاد ہے۔ سناؤں۔!“ پھر اس نے دل کو ٹکڑے کر دینے والی آواز میں کہا —— ”دن کو آ سکتے نہ تھے۔ آنے کو کیا رات نہ تھی —— مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے۔ برسات نہ تھی —— کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی —— سچ تو کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی۔ منظور ملاقات نہ تھی ——“ پھر دفعتاً وہ بالکل خاموش ہو گئی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب اور ٹوٹی ہوئی تپائیوں کے انبار پر اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے دُنیا کا خاتمہ ہو چکا ہے اور وہ جلے ہوئے کرہ زمین کے آخری جاندار ہیں۔

دھڑ سے دروازہ کھُلا اور سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا اندر داخل ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر ایک اسٹامپ پیپر جمشید کی ناک کے سامنے لہرایا۔

”چٹا گانگ سے ٹرنک کال آگیا ہے رشید بھائی۔ ادھر سائین کر دو۔ ہم کو گھر جانے کا ہے ——“ جمشید نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ آنکھیں ملیں اور اسے رفتہ رفتہ یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے آپ پر نظر ڈالی اور اسے یاد آ گیا کہ وہ خود کون ہے —— وہ مشہور بزنس میگنیٹ جمشید علی سیّد تھا۔ آج شام اس کی شان دار کوٹھی کی ”ہاؤس وارمنگ“ ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی اس نے ساڑھے چار لاکھ میں بنوائی تھی۔ اس کے سارے کمرے ایر کنڈیشنڈ تھے جو ایک دوسرے سے ہاؤس ٹیلی فون کے ذریعے منسلک تھے۔ شہر کے خوش پوش ترین جوانوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا اور اعلیٰ طبقے کی بیش تر بن بیاہی لڑکیاں ”بیگم جمشید“ کہلانے کی متمنی تھیں۔ آج صبح اس نے دس لاکھ کا ایک معاملہ طے کیا تھا اور اس کے لیے مسٹر جانسن کے کیبل کا اسے جواب دینا تھا۔ اس کے بعد چٹا گانگ ٹرنک کال کرنا تھا اور اس کے بعد نئے معاہدے کے سلسلے میں ایک جرمن فرم سے گفت و شنید کے لیے کل تیسرے پہر کو یورپ روانہ ہونا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ سگریٹ جلایا اور مسٹر گھاسلیٹ والا کے ساتھ اپنے آفس روم کی طرف چلا گیا۔

اب صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مسٹر پیٹرک ڈرائنگ روم میں آئے اور انھوں نے سلمیٰ کو مخاطب کیا —— ”مس مرزا —— بوس وانٹس یو ——“

سلمیٰ قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس روم میں گئی۔

”مس مرزا“

”یس سر“

”آپ کو اتوار کے دن بھی زحمت دینی پڑ رہی ہے۔ کل نو بجے صبح مسٹر ونکاکس اور ان کا گروپ پی او اے سی سے آ رہا ہے۔ ساڑھے نو بجے وہ دونوں جاپانی پہنچ جائیں گے۔ صبح کو ایر پورٹ چلی جائیے۔ ان لوگوں کے لیے میٹرو پول میں کمرے بُک کروا دیجیے اور دوپہر کو لنچ کھلا دیجیے ——“ —— بوس نے نظریں نیچی کیے کیے اس سے کہا —— ”میں خود نہ آ سکوں گا کیونکہ کل فلائی کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کام نپٹانے ہیں —— کل

دس بجے تک میٹروپول پہنچ جائیے گا۔"

"یس سر" ——— سلمیٰ نے سیدھی کھڑی ہوکر نارمل اور باہمت آواز میں جواب دیا — "گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ ——— مسٹر پیٹرک - قادر بخش کو بولو مس صاحب کو گھر پہنچا دے۔"

سلمیٰ کمرے سے باہر چلی گئی۔

مسٹر پیٹرک پھر ڈرائنگ روم میں گئے۔

"مس حسین ——— مسٹر سید نے بلایا ہے۔"

ثریا قالین پر سے اٹھی - بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس میں گئی۔

"ثریا" ——— جمشید سید نے نظریں اٹھائے بغیر کہا ——— "شام کو تمہارا ٹکٹ بھی آگیا ہے۔ گھر جاکر پیکنگ کرلو - کل ڈھائی بجے ایرپورٹ

آجانا ——— ابھی پیرس سے کیبل آیا ہے - تمہاری نمائش کا انھوں نے ۱۸ جولائی سے انتظام کیا ہے - اتنا عرصہ ہم لوگ جنیوا میں رہ سکیں گے ———

اچھا کل ملاقات ہوگی - گڈ نائٹ ثریا ——— !"

"گڈ نائٹ" ——— وہ بھی باہر چلی گئی مگر چند منٹ بعد اس نے واپس آکر کہا: "میری کار غائب ہے، شاید منصور یا عابد لے گئے۔"

"مسٹر پیٹرک فتح گل کو بولو عالیہ بی بی کی کار میں مس صاحب کو گھر پہنچا دے۔"

"یس سر۔"

دوسرے روز غیر ملکی مہمانوں سے نپٹ چکنے کے بعد سلمیٰ نے میٹروپول کی دو کانوں سے بہت سا سامان خریدا - قیمتی چاکلیٹ، ٹافی، بسکٹوں کے ڈبے - خشک میوے، شیرے میں ڈوبے ہوئے پھلوں کے ٹین، تھری کاسلز سگریٹ کا پورا کارٹن، ایکوا ویلوا اور شیمپو کی شیشیاں، بڑھیا قسم کا شیونگ سوپ، ٹوتھ پیسٹ، بک اسٹال سے بہت سی پیپر بیک کتابیں اور تازہ رسالے اٹھائے اور گھر آگئی - ماما کو ایک ایک چیز دکھائی اور رات کے کھانے کے بعد سارے سامان کا بڑا پارسل بنایا - پارسل کو سرہانے رکھا اور اس پر ہاتھ رکھ کر سوگئی۔

ایک صاحب کے ذریعے وہ ہر پندرھویں روز ایک پارسل سلمان کو بھجوایا کرتی تھی - وہ صاحب گھر سے لے جایا کرتے تھے - مگر پچھلی مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ خود نہ آسکیں گے اور سلمیٰ نے ان سے کہا تھا کہ پیر کی صبح کو وہ سامان خود ان کے پاس پہنچا دے گی۔

صبح کو وہ پارسل دفتر لیتی گئی اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان صاحب کا فون نمبر دیکھنے کے لیے ٹیلی فون ڈائرکٹری کھولی - اتنے میں مسٹر پیٹرک اندر آئے اور انھوں نے ایک لفافہ سلمیٰ کو دیا ——— "بوس کا خط،" انھوں نے کہا اور باہر چلے گئے۔ مس ڈی سوزا آئیں - چند کاغذات کرسی پر رکھے اور چلی گئیں - اس نے کھڑکی میں جاکر لفافہ کھولا:

"چھوٹی بٹیا ——— پرسوں رات انتہائی نشے اور نیم دیوانگی کے عالم میں، میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی اس کے لیے صدق دل سے معافی کا خواستگار ہوں اور جانتا ہوں کہ معاف کیے جانے کا ہرگز مستحق نہیں - میری رذالت کے باوجود اس کے بعد آپ نے اسی تمکنت اور بُردباری سے میرے "حکم" کی تعمیل کی اور آج حسب معمول میرے لیے میزبانی کے فرائض انجام دیے - پرسوں رات جب میں نے دفتر کی میز پر بیٹھ کر آپ سے ایرپورٹ اور میٹروپول جانے کے لیے کہا تھا اس وقت میں آپ کے متعلق ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملازمت کے لیے جو آپ کے وقار اور شرافت کے سراسر منافی ہے اور آپ کی شخصیت کی توہین ہے - میں آپ کو مزید زحمت نہیں دے سکتا کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا لکھوں اور کن الفاظ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے اور جو کچھ میں کہنے والا ہوں اپنے میں ہمت نہیں پاتا ہوں اور ان مناسب الفاظ کا متلاشی

ہوں جن کے ذریعے آپ کے معصوم اور دُکھی دل کو ٹھیس لگائے بغیر اپنا مافی الضمیر ادا کر سکوں۔

چھوٹی بٹیا، پرسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انہیں اپنی الماری میں دوبارہ مقفّل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبا دیا اور آج میں وہی جمشید سیّد ہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے سے واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک انتہائی ذلیل، بے رحم، خود غرض، کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے لیے کسی قسم کی پرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصوّرات لایعنی ہو چکے ہیں لیکن پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مرزا صاحب کی صاحب زادی ہیں تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس اطلاع سے دوسرا ذہنی جھٹکا مجھے لگا اس کا تعلق سراسر میری کاروباری حِس اور میرے کمینے پن اور کامن سنس سے ہے۔ وہ ذہنی جھٹکا یہ تھا کہ آپ نہ صرف مرزا صاحب کی صاحب زادی ہیں بلکہ اپنے بھائی کی بہن بھی ہیں۔

چھوٹی بٹیا آپ کو اب معلوم ہو گیا ہے کہ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں اور میری زندگی کا سب سے بڑا مطمحِ نظر میرا ذاتی مفاد ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میرا کاروبار خصوصیت سے کس غیر ملکی قوم کے ساتھ ہے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری کانفی ڈنشل سکرٹری کس شخص کی سگی بہن ہے تو آپ خود اندازہ کر لیجیے اس کا اثر میرے کاروبار کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا۔

چھوٹی بٹیا ——— ! میں در پردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت کروں گا ——— اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوا دوں گا۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میرا فرضِ اوّلین ہے ——— بٹیا ——— !

اب میں آپ کے "بزرگ" کی حیثیت سے چند پند و نصائح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ دُنیا بڑی ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی دُنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے دُنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یقین ہے اور اُمید ہے کہ بہت جلد اُسے معلوم ہو جائے گا یا شاید معلوم ہو چکا ہو کہ اس کے تجربے اس کی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہیں۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے دُنیا سے ایک حد تک سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریّا نے میرے ذریعے دُنیا سے سمجھوتہ کر کے سُورج کے نیچے اپنی جگہ بنالی۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے قبل اسے شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا ہوگا مگر اُسے معلوم ہو چکا ہے اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دُنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور رُوحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فن کار، دانش ور، عینیت پسند اور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں بَیں خود اکثر ان کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔

میں یہ سب باتیں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید الیوژن اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں ——— اور زندگی کے مکر و فریب اور ریاکاری اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دُنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ آپ اپنی موجودہ ملازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں ——— میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کی دہشت پر جلد از جلد قابو پالیں۔

میں یہ خط ایرپورٹ سے لکھ رہا ہوں۔ میں اور ثریّا مہینے بھر کے لیے یورپ جا رہے ہیں اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ واپسی پر ہم آپ کو خوش و خرّم اور بخیریت پائیں۔

آخر میں میرا ایک اور بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ اور اس نقطۂ نظر سے آپ کی موجودہ جائے رہائش کا آپ کے مستقبل پر اچھا اثر نہیں پڑ سکتا ——— میں جنیوا سے لوٹتے ہی کوشش کروں گا کہ آپ کو میرے قرب و جوار

ہیں ایک معقول کرائے کا فلیٹ مل جاوے تاکہ آپ بھی ہاؤسنگ سوسائٹی میں منتقل ہو سکیں۔
والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں میرا آداب کہیے گا۔ میری پُرخلوص دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں ——— یقین کیجیے میں ہمیشہ آپ کا مخلص اور بے لوث دوست رہوں گا۔

خدا حافظ
آپ کا تابعدار
کمترین جمشید"

سلمیٰ کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ نیچے کرسی پر صبح کا اخبار رکھا تھا جس کے پہلے صفحے پر جلی سُرخی میں منصور احمد خاں کا اسکوپ چھپا تھا۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

قرۃ العین حیدر

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حدِ نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گزرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص، چالیس سال کے لگ بھگ عمر، متبسم پُرسکون چہرہ، ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی، ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر سامنے والے پُرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مُسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی ادق اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارویجین یا ہینگرین، یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے "اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے باتیں کرتے سُنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورانٹو میں چند ایرانی طلبا سے مل چکی تھی۔ چلو یہ تو پتا چل گیا کہ یہ فیبولس گائے (Fabulous Guy) پرشین ہے (اس نے انگریزی میں سوچا میں آپ کو اُردو میں بتا رہی ہوں کیونکہ افسانہ بزبان اُردو ہے)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا آہستہ سے کہا

"دنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے۔"

یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اُداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا "ڈیڈ! اب آرام کرو۔"

اس نے جواب دیا۔" ایڈنا۔ میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کی بیٹی نے رسان سے کہا۔" اچھا۔ اس کے بعد ذرا سو جاؤ۔"

اس کے بعد وہ آکر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ گو انگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔
"میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"تمارا فیلڈنگ۔ ٹورانٹو۔ کینیڈا۔"
"کیمبرج۔ انگلینڈ۔ ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے۔"
"بیمار ہیں؟"
"سرطان۔ اور انھیں بتا دیا گیا ہے۔" ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔
"اوہ۔ آئی ایم سو سوری۔" تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم میں دفعتاً دخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔
"اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے۔" ایڈنا نے آہستہ آہستہ کہا "کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لیے چھوڑنی ہے تو جانے کیسا لگتا ہوگا۔"
"اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہیے۔" تمارا نے کہا اور خفیف سی ہنسی۔
"حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔" تمارا نے کہا۔
ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔
اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔ "میں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں۔ میری والدہ کے دو ماموں ایک خالہ ان کے بچے۔ سب کے سب۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیر لیتی ہیں۔"
"اوہ۔"
"حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔"
"اوہ۔ میں تمھارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمھارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے۔"
"میرے نانا روسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جاکر تعصب سے بچنے کے لیے بدل کر فیلڈنگ کر لیا لیکن میں۔" اس نے ذرا جوش سے کہا "میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں۔ تمارا گرین برگ فیلڈنگ۔"
"واقعی؟" برطانوی خاتون نے کہا "کتنی دلچسپ بات ہے۔"
"اولادِ آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔" تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا کیوں کہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیر رہتی تھی۔

سامنے والے دل کش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو "میں تمھاری بات سمجھتا ہوں۔" لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود بھی مسکرائی۔ اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دل چسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجیے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کر لیں گے۔ کیوں کہ اولادِ آدم کی

باہم کشش کا عجب کھیلا ہے۔
بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"میرے نانا —— جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے۔" تمارا نے آہستہ سے کہا۔

"کوران —— ؟" ایڈنا نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی، ممی کو بتاتی تھیں، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے، دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو۔ اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہو سکتی۔" سگریٹ سلگانے کے لیے تمارا نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے منظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ "یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انھیں جانے کیسا لگتا ہوگا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔"

ایرانی نما شخص دردمندی سے مسکرایا۔ "جس انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔"

"واقعی ؟"

ہم سفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان۔ تبریز یونیورسٹی۔ شعبہ تاریخ۔ کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے بشاشت سے دریافت کیا۔ "این۔ آئی۔ کیو یعنی۔ نو۔ آئی۔ کیو ؟"

"نصرت الدین امام قلی۔"

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت، پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ اکا دکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لیے لیے ڈگ بھرتا کیبارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر دونوں خواتین کو پیش کیے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی بانہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کینیڈین لڑکی سے کہا۔ "تمارا خانم۔ کہاں تک میرے ساتھ رہوگی ؟"

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی۔ کہاں نامعقول ٹم ! اور کہاں تمارا خانم۔ جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمارا خانم کی

یران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا "جہاں تک ممکن ہو۔"
بہرحال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔
"تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟"
"پڑھنے۔ بایو کیمسٹری۔ مجھے ایک اسکالرشپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے۔"
"صرف چند روز کے لیے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔"
ٹرین قرونِ وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے۔ دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔
"بڑا خوبصورت شہر ہے۔" تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔
ڈکتور نصرت الدین ایک پُر مذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔
اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا —
"خانم جون۔"
"ہوں؟ جون کا مطلب؟"
"زندگی!"
"ونڈر فل۔ یعنی میں تمھاری زندگی ہوں!"
اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جون۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو۔"
"بہت خوب۔ آپ سے زیادہ با اخلاق شخص پورے یورپ میں نہ ہوگا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں!"
"واللہ۔ کسی روز تمھیں ان کی تصویر دکھلاؤں گا۔"
دوسری شام وہ اس کے ہوسٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کر کے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔
"بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھ دار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔" اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اُٹھا کر ایک طرف رکھا۔
"لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔"
"چھانٹ لی! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!" تمارا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پُشت پر سر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔

"وہ بھی عجیب عیاش، بُزدل ظالم قوم ہے"۔ تمارا نے مزید اظہارِ خیال کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا الماری کے قدِ آدم آئینے میں پروفیسر کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جُون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انھیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں"۔ نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

"کاکروچ کھاتے ہیں؟" تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔ "وحشی۔ بدو۔ مشرقی۔ معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مَین کہلاتے ہیں"۔ اس نے ذرا انجالت سے اضافہ کیا۔

"درست۔ متشکرم۔ متشکرم!"

"ترجمہ کرو"۔

"جی۔ تھینکس"۔ اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ "تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو"۔

"واقعی؟ بہت جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لوگی"۔

"کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے"۔

"بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد"۔

"فرہاد کون؟"

"تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ"۔ اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو، اس راستے کا نقشہ کھینچا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کوہِ بے ستوں کا جغرافیہ اس کینیڈین دانش جو کو ذہن نشین کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار وکٹور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پُرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اُتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دُہرایا ہوا ڈراما دُہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصّہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا "تمارا خانم اب وقت آگیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں"۔

وہ سُرخ ہوگئی۔ "معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

"معلوم ہے" اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدّت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق اُلٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاورمیانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر

میں سنگترے کے درخت تھے۔

"دادی اماں۔ اور یہ۔ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔"

تمارا نے دیکھا دادی میں اس سے بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"

تمارا نے سینڈل اُتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لیے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا "اتنے نازک چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو؟"

"ہوں تو سہی شاید۔"

"کون سا؟ ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا یا دادا اس وقت سوئٹزرلینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزین ہیں؟"

"میرے والد تو رانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔" تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ ڈکتور شریفیان کے چہرے پر سے گزر گیا۔ "لیکن میرے نانا غالباً خوانین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔"

"اوہو۔ خوانین کریمیا! —— حاجی سلیم گرائی۔ قرا دولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی۔ محمود گرائی۔ کون سے گرائی؟"

"نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اس وقت تم سے سنے ہیں۔"

"اور موصوف تمہارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔"

"ہاں۔ وہی پُرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہو گئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی روزلین سے شادی کر لی۔ اور روزلین کے ابا بہت خفا ہوئے کیوں کہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کیے تھے۔" وہ دفعتاً چُپ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گزرا جسے نصرت الدین امام قلی نے نہیں دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "روزلین کے والد واقعی بہت خفا تھے۔ جب روزلین ان سے فخریہ کہتیں کہ انھوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے 'آج کل ہر چپڑ قنات کوچوان، سائیس، خاکروب جو روس سے بھاگ کر یہاں آ رہا ہے، اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا۔ تمہارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خان کا جو بدار رہا ہوگا' نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔ دراصل شاید جلا وطنی کا الم انھیں کھا گیا۔" اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گزرا جسے تمارا نے نہیں دیکھا۔ "میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کر لی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کر کے امریکہ آ گئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں" —— نصرت الدین نے آہستہ سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے؟"

"کینیڈین۔"

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں اُنڈیلی اور مسکرا کر کہا "تمہارے نانا اور میری دادی کے نام" انھوں نے

گلاس ٹکرائے ۔

دوسرا ہفتہ ۔ سورج غروب ہو رہا تھا ۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی طرف جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے ۔ اچانک وہ کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے ٹھٹھک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا ۔

"تمھارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین ؟" تمارا نے دریافت کیا ۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا " میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری خوب بیوی ہے ۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے ۔ اس کی شادی ہونے والی ہے اور اس کا منگیتر میرے بڑے بھائی کا لڑکا ۔ وہ دراصل ٹسٹ پائلٹ ہے ۔ اس لیے کچھ پتہ نہیں ۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی ۔" وہ ایکدم خاموش ہوگیا ۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا ـــــ اس نے آہستہ سے خوددار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے ، کہا " تم نے کبھی بتایا نہیں ۔"

" تم نے کبھی پوچھا نہیں ۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا ۔ وہ ایک سنگی انسان تھا ۔ کوہ بے ستون کے پتھروں سے ترشا ہوا مجسمہ

ایک ہفتہ اور گزر گیا ۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی ۔ وہ اسے مغرب کی Permissive سوسائٹی کی ایک آوارہ لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے ۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی ۔ اس پر جان دیتی تھی ۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین نے تمارا سے کہا " ہلو خواند خاتون ۔"

" کون ؟ "

" علاء الدین کیقباد دوم کی ملکہ ۔"

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا ۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ۔ کبھی اسے ساقی بیگ کہتا ۔ " کیونکہ تمھارے اندر کم کم پندرہ فی صد تاتاری خون تو ہے ہی ۔ اور سنو ۔ فرض کرو ۔" ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا " اگر تمھارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے ۔ وہیں کسی خان زادی سے شادی کرلی ہوتی اور تمھاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہو سکتی تھیں ۔"

دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ تاریخ ، نسل ، خون ۔ کس کا کیا قصور ہے ؟ وہ بہت بے رحم تھا ۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا ۔ نرمی سے کہا " چلو بی بی جون ۔ گھر چلیں ۔"

" گھر ؟ " اس نے سر اٹھا کر کہا ۔ " میرا گھر کہاں ہے ؟ "

" تمھارا گھر ٹورانٹو میں ہے ۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے ۔" نصرت الدین نے ذرا تلخی سے کہا ۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی ۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے ـــــ اس کی ازدواجی زندگی پرسکون نہیں ۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے " میرا گھر کہاں ہے ؟ "

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی ۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا " آغا ۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں ۔"

"ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"
"آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لیے مونٹریال آؤ یا یو این میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔"
"اور تم کسی امریکن کروڑپتی کی فربہ بیوہ ہو۔"
"ہاں۔ اور فلفنی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں؟"
"پیرہ زن۔"
"اور عربی میں؟"
"مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں۔"
"سنو نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے۔"
"کیا؟"
"جب میں اس امریکن کروڑپتی سے شادی کروں گی۔"
"جو بوجہ السر تمھیں جلد بیوہ کر جائے گا۔"
"ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہوگے۔ تبریز۔ اصفہان۔ شیراز — میں وہاں پہنچ کر اپنے اس نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور بالضرور۔"
نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بعض مرتبہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمھاری طرح۔ تمھاری طرح اپنے ابن عم کو اس شدّت سے چاہتی ہے۔" وہ پھر ملول نظر آیا۔
"آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنتِ عم سمجھو۔"
"تم میری بنت عم ہو تو سہی۔"
"کیوں کہ ہم سب اولادِ آدم ہیں۔ ہے نا؟"
"اولادِ آدم۔ اولادِ ابراہیم۔ آلِ یافث۔ آلِ اسحٰق۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجرۂ نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔"
وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی۔ "میں نے آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔"
"میں نے بھی نہیں دیکھی۔" شریفیان نے کہا۔
"آغا۔ تم میں نرگسیت بھی ہے؟" تمارا نے پوچھا۔
"ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔
اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹینی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔

اے ربِ عظیم۔ میری حفاظت کرنا
میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے
اس نے دل میں دُہرایا۔
اے ربِ عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا
اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے
اور تیرا سمندر ـــــ

"آغا۔ ایک بات بتاؤ۔"
"ہوں۔"
"تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمھارے ملک کے بہت سے دانش جو اور دانش ور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انھوں نے برلن میں کل بڑا بھاری جلوس نکالا۔"
"پڑھا۔"
"تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو؟"
"نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم میں لڑکے پڑھاتا ہوں۔"
"اچھا۔ شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔"
"اچھا۔"

اس رات وہ حسبِ معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا "جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے میں کتنی باتیں یاد کروں گی۔ تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آکر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا؟"

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

"تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لیے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ایرز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔ اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی۔ T کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی "وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔"

"میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علاحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پُرزے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے ذرا سا سر اُٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

ساڑھے آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چُننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلیفون پلنگ کے سرہانے کتابوں کے انبار پر رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا سرک کر ریسیور اُٹھایا اور "ألو" کہہ بغیر نصرت کو اشارے سے بُلایا۔

وہ لپک کر آیا اور ریسور ہاتھ میں لے کر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔
گفتگو ختم کرنے کے بعد نصرت نے جھک کر اس سے کہا "خانم جُون۔ اب اُٹھو۔"
اُس نے سُستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا، قہوے کی کشتی لا کر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی۔ اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جا رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بے حد غضب ڈھایا۔ تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے اُتری اور اس کے قریب جا کر لاڈ سے کہا "آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔"
"ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹمنٹ ہے۔" اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ "جھٹ پٹ تیار ہو کر ناشتہ کر لو۔ تمہیں راستے میں اتارتا جاؤں گا۔"
ٹھیک پونے نو بجے وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سُہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں سی اُٹھ رہی تھیں۔
وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا "یہ تمہارے ہوسٹل کی طرف نہیں جاتی۔ تم دوسری بس میں چلی جانا۔ میں اسے پکڑتا ہوں۔" اس نے ہاتھ [illegible] بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا "خدا حافظ" اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔
شام کو کلاس سے واپس آ کر تمارا نے حسبِ معمول اسے فون کیا۔ گھنٹی بجی۔ وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ وہ کافی دیر میں سو کر اُٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسبِ معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن اٹھائے۔ سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوف ناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ دکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دُبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اُتر گیا تھا۔
نزدیک کے ایک شہر کے ایئرپورٹ میں ایک طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا تھا۔
وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں۔ جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں، سمندر، بے تکی شکلیں، آگ اور آوازیں۔ شاید وہ Clareaudience کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آیا کیں جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ۔ میں نے تمھاری بات

سُنی تھی جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے؟

ونڈرفل۔ میں تمھاری زندگی ہوں! ہاہا۔ میری زندگی۔ جانِ من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ تُسر بُون۔ وقت ضائع نہ کرو۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بے چارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلو ترکان خاتون۔ میں ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں۔ تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔ آلِ اسحٰق۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں بنی آدم کے شجرے کے اس پہلو پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف دُنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساتی بیگ۔

اندھیرا پڑے، پالا اس کی رُوم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ۔ آدھا دستی بم سے اُڑ چکا تھا۔ صرف پروفائل باقی تھا۔ دماغ بھی اُڑ چکا تھا۔ ایئرپورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجا بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں۔ سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پیٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔ تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم از کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی؟ جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لوگی۔

کیمرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مُسافر کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں "نصرت الدین" کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ۔ پھر گوشت کا ملغوبہ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اُٹھی اور غسلخانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اُٹھانے کے لیے جھکی۔ پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو۔ یا اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جا رہا تھا اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے۔ ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد۔ کمرے کے بعد کمرے۔ ایک کمرے میں سفید آتش دان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی۔ شکل سے سنٹرل یورپین معلوم ہوتی تھی۔ پور سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو۔

ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بافی کا کرگھا۔ کرگھے پر آدھا بُنا ہوا قالین۔ اس پر "شجرِ حیات" کا ادھورا نمونہ۔

"یہ شجرِ حیات کیا چیز ہے نصرت الدین؟"

"مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔"

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں۔ پھر بہت سے پردے۔ جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار۔ وہ پردوں کے انبار میں اُلجھ گئی۔ پھر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔

نیچے اتری۔ جیسے بنک کے تہہ خانے ہوتے ہیں چمکیلی سنگلاخ دیواریں۔ چمکیلا فرش یا جیل خانے کے کوریڈور۔ سناٹا۔ اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لیے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے کیچڑ کی وردیاں اسے دیکھ کر استہزا سے ہنسے۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار۔ بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اس عورت کو چھوا۔ وہ عورت مردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مردوں کا ہجوم تھا۔ بسیں اور ٹرامیں مردے چلا رہے تھے۔ دکانوں میں خرید و فروخت مردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا۔ اسٹیج پر "سوان لیک" میں مردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے۔

"یہ زومبی ہیں نا؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"قیں قیں۔" اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ "زومبی نہیں مادموزیل۔ خالص۔ اصلی مردے۔"

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس مفلر سے سر چھپائے مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سرخ ہو جاتیں کبھی سبز۔ اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔ "اِکس کیوزمی" تمارا نے نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہوگئی۔

چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت موجود ہو۔ یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہوگئی۔ بغیر ڈرائیور بغیر مسافروں کے فراٹے بھرتی ایک پل پر سے گزر کر قبرستان کے پھاٹک پر رک گئی۔

یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا اب اسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جا کر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک split Level قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے دو لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پر سنٹرل یوروپین نیلی چہرے والی عورت "للی مارلین" گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۰ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہوگئیں۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لیے بھاگی۔

راستے میں اس نے دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے الٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔

قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور شہر واپس آئی۔ یہاں حسب معمول ہر جگہ مردے ہی مردے تھے۔ دفتروں میں کارخانوں میں ہر جگہ۔ بعض مردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولھویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے نکلا۔ (تابوت گاڑی کو باوردی مردے کھینچ رہے تھے) سلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گم سم بیٹھ گیا اور مٹی کے رنگ کی بھربھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے مٹی کے تھے۔

"یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جنرل لام بندی" ایک گیارھویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا۔ وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صومعہ فوراً اس کے سامنے آگیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر ربائی نماز عشاء پڑھانے میں مصروف تھا۔ دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا آپ حضرت ایوبؑ ہیں؟" اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔" آدمی نے سر اُٹھا کر جواب دیا۔

"آپ ابلیس ہیں؟"

"یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار۔" اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی۔

"آپ نے ایل۔ ایس۔ ڈی بہت نوش جان کی ہوگی۔ آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے۔"

"روح؟ روح گئی چولھے بھاڑ میں۔ کیسی روح؟" اس نے جواب دیا اور بال نوچے۔ میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں اس نے دل میں دُہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی۔ کبھی ایک دم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور سینائی

اور شوریہ

اور

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آگئی اور بغیر پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پٹرا کے سُرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹائیر

اور صدون

اور نینوا

اُفق پر سنسان خیموں کے پردے بادِ سموم میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسّیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچّوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کربناک آواز میں پکارا۔ العطش۔ العطش۔ العطش۔

اس کے کیا معنی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں کہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی۔ سوا اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں ہو آئی ہوں وہاں کچھ نہیں ہے۔ پرچھائیوں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔ العطش

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ العطش۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہوگئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف اور بہت قریب نظر آرہی تھی۔

"آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے۔" جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لیے اسی کیفے ٹیریا میں گئی۔ دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کے سامنے "تازہ اخبار رکھا تھا جس میں" نصرت الدین" اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)

آئس لینڈک کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں، کتنے جذبات، تصورات، نظریے، خواب، کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جاننے کے باوجود۔ منتظر لا کب سے۔ کانٹا چمچے اور پلیٹ اٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔

اس کو خونِ عرب سے۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اُٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

الاؤ

سہیل عظیم آبادی

گاؤں سے پورب ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجا کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت اُتر طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے۔ اس کے بیچ بیچ میں کوئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ اور اس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی کنواں اور اس کے بعد کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے۔ جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا، جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجا اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر میں سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا۔ بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے، وہ بھی راجا اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا —— راجا کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا، اس کا راج محل تو میدان ہے۔ یہ میدان گاؤں کے لیے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ ادکھ پیڑنے کو کولھو بٹھاتے ہیں اور کولھو سار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کارتک کا مہینہ تھا ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کتنی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ بھگوا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی سے کاٹ کر دی تھی، لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگوا نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پیپل کی جڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا رہا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہیے۔ ٹھیک ویسی ہی یا اس سے بھی بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔ بھگوا اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آ گیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناتے میں بھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا "بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے

بحر اس میں گڑا سا لگے تب نا"

بھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور کہا "ہاں چچا۔ پر گڑا سا اچھال جائے تب نا"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر بیل کے پیڑ کے سہارے پر کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ ساموا اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا "ارے بھیا ابھی تو اتنا جاڑا نہیں پڑتا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے۔

اکلو بولا "بھاگو اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی"

باڑھو بولا "مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ ساول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا " واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے ہی بیٹھے بھی آگ تاپنے۔ واہ!"

باڑھو بولا "ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی۔ اس لیے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا "اے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے"

ساول نے کہا "کیا چچا ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی"

باڑھو بولا " نہیں تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے در سننے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھ ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھیدو اور جھبی کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کے ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا"

اتنے میں جھبی آ گیا باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی۔ لیکن جھبی نے کہا—

"بھیا اب سمجھانا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا ریتو کلوا کی عورت کا راستہ روکے ہوئے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے جانے دو ریتو۔ تو ریتو کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو" موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوئی" یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اوجھل دوں گی تو راستے سے بھاگا"

ساول بڑے زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا "چچا یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہو گا— جانتے ہی ہو ریتو کیسا ہنسوڑ ہے"

لیکن جھبی نے بزرگانہ انداز میں کہا "ہشش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات نہیں ہوئی"

ساول چپ ہو گیا اور باڑھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن ساول نے بیچ ہی میں روک کر کہا "ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ سنا ہے دھرم پور میں بڑی بڑی سبھائیں ہوئیں۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدے کی بات ہوئی"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا "ہاں بہت بڑی

سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر ر
تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں"۔

ساول بولا۔ "بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگ پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کرکے اپجاتے ہیں ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں"۔

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی۔ اس لیے باڑھو کچھ اور آگ سے قریب ہو گیا اور بولا "بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا
پھاگو بولا ___ "مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں د
گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے بس! دھرم پور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے"۔

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آگئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے
طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا ٹھریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا آگ رکھ کر ایک دم لگایا۔ اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لیے تیار ہو لیکن طوفانی میاں کو دیکھ کر سب کے سب چپ ہو گئے۔ جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔ جب کوئی کچھ نہ بولا تو طوفانی میاں بولے ___ "ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟

ساول نے جواب دیا ___ "پھاگو دھرم پور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی"۔

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز سے سوال کیا جیسے اگر انھیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا سننا بیکار ہ
پھاگو نے پھر سے ساری بات دہرادی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا ___ "بات تو ٹھیک ہے مگر بھائی کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے"۔

"طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہو
چھکو تیلی نے کہا،

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لیے آدمی کو بڑا چھوٹا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپ
کام ہی نہ چلتا ___"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا ___ "ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا۔ سب جمیندار ہو جائیں تو پھ
کھیتی کون کرے گا"۔

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا، سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھ
تھا۔ بات آ آکر اس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی۔ لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا ___ "اپنے کیے سب ہو سکتا ہے"۔

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ
جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین، جاپان اور امریکہ سے آئے ہوئے مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا ___ "ہم لوگ کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا"۔

ساول نے کہا ___ "ٹھیک کہتے ہو دلو"۔

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے: "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماگ کھراب ہو جاتا ہے"۔ اس کے ساتھ ہی چھٹو اور چھکو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے۔ اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے

لیکن ان لوگوں کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوئی بلکہ ساول نے کہا "ظلم پر ظلم ہے - پرسوں ہی کی بات ہے۔ بیگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی یہ چاہتے تھے بیگھو کی عورت آ کر ان کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل بیگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔" دلو نے رائے پیش کی۔ اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں۔ وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم ـــــ"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی ساول نے کہا ـــــ "تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا ـــــ "پکا بات ہے بھائی - مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا ـــــ بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا ـــــ "لیکن دلو بھیا وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگرس کر دے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگرس کی برائیاں وہ سُن چکا تھا۔ اس نے کہا "دلو بھائی ـــــ کانگرس ـــــ مولانا صاحب تو کہتے تھے ـــــ"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا ـــــ" دھت یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہو۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اُٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا۔ اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اُٹھتے ہی سب کے سب اُٹھ گئے۔

دوسرے دن سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے۔ "آج سبھا ہوگی۔" بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجے پر غور کر رہے تھے کہ بھُس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر مہتوں اور طوطا رام کو بُلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا ـــــ اس سے جوش اور بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے سب گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا "سب کا حشر طوطا رام اور اندر مہتوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے۔ اور پٹواری تمھیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔"

صبح اُٹھ ساول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیارے نے آ کر کہا "ساول بھائی تمھیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔"

ساول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا، جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا بھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ بھاگو نے ساول کو دیکھتے ہی کہا "بھیا جانتے ہو، کچہری سے بُلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں ـــــ کیا ر کیا رائے ہے ـــــ"

ساول نے جواب دیا۔ "چلو تمھارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک دھوبی پہنچاتا ہے۔

اس سے ساول کو بڑا غصّہ آیا اور وہ بولا "وہ سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھچڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے۔ اور اپنے باوا کہہ کر آتا ہے۔ حرامی!"

دلو نے کہا "غصّہ کرنے کی بات نہیں ساول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا —"

ساول نے کہا — "ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

بھاگو نے پوچھا — "تو اب کیا ہوگا؟"

ساول نے کہا — "ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے، وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

ساول چلا گیا۔ دلو اور بھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے ساول سے باتیں اس لیے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصّہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصّہ آ جاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لیے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن بھاگو نے کہا "دلو بھائی ساول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو ساول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا "یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔"

بھاگو بولا — "پھر بھی . . . . ."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ ساول تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ ساول آ گیا اور آتے ہی بولا — "بھاگو لاٹھی تو دے —"

دلو اور بھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے ساول کو سمجھایا مگر وہ تنتنا جا رہا تھا — اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے۔ مگر وہ اس طرف کی دیوار کو، جو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چھٹو اور جھبی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں۔ اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا، اس نے ساول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ بھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لیے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچھ کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا "اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا — "دیکھا جائے گا —"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آ گئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ ساول چلا گیا۔ لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا "بولو اب کیا ارادہ ہے۔ اب عزّت چاہتے ہو یا ذلّت؟"

"ذلّت کون چاہتا ہے۔" سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھا دیا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ صرف اب کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر ساول کو پوچھنے آئے۔ دلو نے کہہ دیا وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھبی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جھبی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جھبی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے تو یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا — "تم اسے نہیں لے جا سکتے

اگر زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ ۔۔۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی' ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں ہے۔"

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اُڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہ سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلّم کھلاّ لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ۔۔۔ اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور' اور دوسری طرف عزّت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار رہتے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا' ان کے لیے کام کرنا۔ تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کو سزا۔ سر اُٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لیے تو زمیندار انھیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کو کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانے پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی۔ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلّہ اُٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے اور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ ساول' دلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمی کو دفعہ ۱۴۴ کی نوٹس مل گئی۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف ۔۔ گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے۔ اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

ساول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھبی آتا ہوا دکھائی دیا۔ ساول ٹھہر گیا۔ جھبی جیسے ہی پاس آیا۔ ساول بولا ۔۔۔

"تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا جھبی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ تم بھی کسان ہو۔

جھبی بولا ۔۔۔ "تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو ۔۔۔"

ساول کو اس کا یہ کہنا دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا ۔۔۔ "دیکھو جھبی بھائی' یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے۔ اپنی بے عزّتی بھی بھول گئے۔

جھبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا ۔۔۔ "بیکار بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

ساول نے کہا ۔۔۔ "یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمھارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

لیکن ساول اس بات کو بھول گیا تھا کہ بھاگو کا باپ گاؤں کا براہل تھا۔ اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھبی سے لے کر زمیندار نے بھاگو کے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے اس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔ جھبی نے کہا ۔۔۔

"سنو ساول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ بھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر۔۔۔۔"

"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی۔ اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو بھاگو سے کہہ کر تمھارا کھیت دلوا دوں ۔۔۔ لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے بابا ڈھو چاچا نے تو لیا نہیں۔ لیا تو تھا زمیندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے؟"

مگر جھبی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اس نے کہا: "ساول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ۔۔۔"

"سب ٹھیک مگر یہ تو بتاؤ۔ اس دن تم پیادے کیوں ساتھ لائے تھے۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ ساتول پھاگو کے گھر پہ ہے میرے باپ نے تو تمھارا کھیت نہیں لیا تھا۔"

جھبی کھسیا گیا اور اس نے کہا ــ "مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا لیکن ساتول نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اور ذرا تیکھا ہو کر کہا۔

"سنو جھبی بھائی۔ تمھیں جواب دینا ہوگا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں۔ یہ تمھارے حق میں بڑا بُرا ہوگا۔"

جھبی جانتا تھا کہ ساتول غصیل آدمی ہے۔ اس لیے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا، وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا۔ اور وہ صرف اپنے فائدے کے لیے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا۔ مگر اب برے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ ساتول کو جواب دیے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا۔

"ساتول دیر ہو رہی ہے ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھبی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا۔ مگر راستے کے لیے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے کھیت تھے۔ جس میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی ساتول نے راستہ نہ دیا تو جھبی نے چاہا کہ اس کو ہٹا کر چلا جائے ــ لیکن ساتول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھبی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا "لڑنا چاہتے ہو کیا؟"

ساتول بولا ــ "ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا ــ؟"

جھبی کو غصہ آ چکا تھا۔ اس نے کہا ــ "کہا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ــ"

ساتول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھبی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے جھبی کے سر پر دے مارا۔ جھبی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا۔ اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولس آئی اور ساتول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے! مقدمے میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہیے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو۔ ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اُجڑ جائے۔ لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہیے۔

ایک طرف ساتول کا مقدمہ کھلا۔ دوسری طرف دلو پھاگو اور دوسرے کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر، جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کی نوٹس تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے۔ زمینداری بھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ــ

آخر اس طرح کب تک چلتا۔ لوگ اُکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لیے چُپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چُپ رہیں تو کب تک چلتا۔ دلو نے پھاگو کو ایک دن بلا کر کہا ــ

"اب کچھ کرنا چاہیے۔ اگر چُپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے چلے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"

پھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا۔ اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اُٹھے۔ دوسرے گاؤں میں جلسے کیے جائیں اور اس پر عمل کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا

تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ رام دھنی بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ جب سانول کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول گیا۔ اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت۔ ہر طرف سناٹا سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا پھر ایک دو چار پانچ دس —— وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولس آئی بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، پھاگو، جمن، ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے۔ ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے —— وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہوگا؟ یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا۔ لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آ رہے تھے۔ انھیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے۔ مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا۔ ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا۔

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا "سالے پٹواری کا کچھ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے اس وقت۔"

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا —— !

مولاں روڈ

انور عظیم

فرانسیسی کونیاک ہو یا شمپین، حسینہ ہو یا زبان، دریائے سین پر کھیلتی ہوئی ہوائیں ہوں یا درختوں پر جھکے ہوئے بادل۔ ہر چیز میں ایک جادو ہے۔ مانا۔ ایسا نہ ہوتا تو میرا نام مولاں روڈ کاہے کو پڑتا۔ یہی دیکھیے ناکہ میری کون سی ادا مولاں روڈ والی ہے۔ لیکن ہوں میں مولاں روڈ۔ پلا بڑھا یہیں کے سرد گرم اور گرد و غبار میں، مگر نام امپورٹ ہوا سات سمندر پار سے۔ اب تو خیر سے برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے۔ اور جوانی کے دن ہیں، جوانی کی راتیں۔ لیکن جب میں پیدا نہیں ہوا تھا تو میں صرف کھنڈر تھا۔ کچھ ٹوٹی ہوئی دیواریں، اونٹ کے کوہان جیسے بھورے سُرمئی ملبے کے ڈھیر اور بس۔ اس کھنڈر کا ناتا میرے پچھلے جنم سے ہے۔ کوئی مجھ سے عمر پوچھے تو میں یہی کہوں گا ناکہ بس ہندوستانی تقسیم کے بعد کی پیداوار ہوں، یعنی نئی نسل ہوں۔ لیکن مجھ میں نہ غصہ ہے، نہ نفرت ہے، نہ بیزاری، نہ میرے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں، اور نہ دیکھنے میں لڑکی یا عورت نظر آتا ہوں۔ کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ اس چمکتی دمکتی عمر سے ادھر بھی میں زندہ تھا۔ کھنڈر ہی سہی مگر تھا تو۔ انسان کی طرح میری عمر بھی دس، بیس، پچاس سال نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جس طرح انسان کی عمر دس، بیس، پچاس سال نہیں ہو سکتی، اسی طرح میری عمر کا اندازہ صرف صدیوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ ایک عمر میں کئی کئی عمریں ہوتی ہیں اور ایک زندگی میں کئی کئی زندگیاں۔

جی چاہتا ہے کوئی سنے اور میں سناؤں۔

جب میں کھنڈر تھا۔ درختوں میں گھرا ہوا، ویران، اُداس اور خوف زدہ۔ میرے مٹے ہوئے در و دیوار پر دُوب اُگ رہی تھی، جسے بکریاں چر جایا کرتی تھیں۔ دن کو کوئی میرے پاس پھٹکتا تک نہ تھا، البتہ رات کو میری قسمت جاگتی تھی۔ جب ستارے جاگتے تھے۔ چور اُچکے میرے دل کے اندھیرے میں بیٹھ کر سبز باغ دیکھتے اور دکھاتے تھے اور کبھی کبھی کوئی زمانے کا ستایا ہوا عاشق تانگے پر اپنی محبوبہ کو لے کر آ جاتا تھا اور میری پناہ میں زمانے کے ظلم و ستم کی ساری کسر اس جانِ جہاں سے نکالا کرتا تھا۔ جسے وہ بھینچتا بھی تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا۔

کوئی سنے تو میں سناؤں۔

اس بھیانک رات کی بات! بڑے کالے بادل گھر آئے تھے اور یہاں، جہاں شہر کا سب سے ماڈرن ریستوران ہے، ایک عورت کا خون ہوا تھا۔ عورت ایک تھی اور مرد تین۔ سب نے دارو پی، کوئی کڑوی چیز تھی آگ جیسی جلتی ہوئی۔ ایک تیزابی دھواں سا اُٹھتا تھا اور دماغ میں بھر جاتا تھا۔ عورت نے نہیں پی۔ وہ مٹھائی کھاتی رہی اور اندھیرے میں منہ بناتی رہی۔

اور شوخی بھی دکھاتی رہی۔ چوڑیاں جھنکتی رہیں۔ تھوڑی دیر میں فضا بدلنے لگی۔ تینوں عورت کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ تھوڑی دیر تو یہ کھینچا تانی رہی، پھر تینوں آپس میں گتھ گئے۔ عورت بھاگی۔ تینوں اپنی لڑائی بھول گئے اور عورت پر جھپٹے جیسے باز گوریا پر جھپٹتا ہے۔ چھرے نکل آئے اور اس عورت کی تکا بوٹی ہوگئی۔ جسم کے ٹکڑے ہوگئے۔ (روح کا حال تو اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے) عورت کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں جو مٹھائی کھا رہی تھی اور اندھیرے میں دارو پیتے ہوئے مردوں کی بھاری بھاری سانسوں کی آواز سن رہی تھی۔

ہاں بالکل یہیں. جہاں چھوٹی سی میز کے نیچے سرخ قالین پر خوب صورت سردارنی کے سینڈل کی نوک کیل کی طرح ہل رہی ہے اگر کوئی دو تین فٹ فرش کھودے تو وہ ہڈیاں مل جائیں گی. ننگی میلی ہڈیاں۔ اور اب مجھے لگتا ہے وہی ہڈیاں زمین سے اُگ آئی ہیں۔ اور اس کرسی پر بیٹھ گئی ہیں، جہاں سردار تیجا سنگھ، سیمنٹ اور اینٹ کا ٹھیکیدار چار کورس کا کھانا کھا کر جماہیاں لے رہا ہے۔ اور کمر پر بلٹ ڈھیلی کر رہا ہے۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا ہے. ضرورت سے زیادہ گوشت۔ جلد پر سنہرا رنگ پھیل گیا ہے، ضرورت سے زیادہ سنہرا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ پپوٹے سوجے ہوئے ہیں، ضرورت سے زیادہ سوجے ہوئے۔ ٹھوڑی ڈبل ہوگئی ہے۔ موٹی موٹی باہنوں پر روئیں اُگ آئے ہیں. ضرورت سے زیادہ روئیں۔ ایک کلائی میں گھڑی چمک رہی ہے. فیروزی رنگ کا نائیلونی آنچل بار بار ڈھلک رہا ہے اور تنگ بلاؤز اُبلتے ہوئے سینوں کو یوں دبا رہا ہے کہ ہر شخص کی نظر اس کی موٹی تہہ دار کمر پر پڑ رہی ہے۔ سردارنی کے سینوں میں غضب کا تلاطم ہے! لیکن باقی جسم سرد ہے۔ ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح سرد۔ وہ چار کورس کا کھانا کھا کر بھی بھوکی ہے۔ یہ بھوک اس کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور ناف سے بھی۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہی ہے اور ہونٹ چاٹ رہی ہے۔ ہونٹوں کی سرخی اتنی گہری ہے کہ اس کی لالچی، پیاسی زبان بھی چاٹ چاٹ کر اسے پھیکا نہیں کر سکتی۔

چھت کتنی نیچی ہے، کالی، پرچھائیاں جانور کی طرح لرز رہی ہیں۔ دیواروں پر رنگ دھبوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کی طرح. ایسا ہے کہ عکس روشنی میں جذب ہوگیا ہے اور روشنی عکس میں۔ ہر چند میز کے بعد دیواریں شطرنج کے مُہروں کی طرح کھڑی ہوگئی ہیں۔ روشنی اور پرچھائیوں سے ایسا جھٹپٹا ہو رہا ہے کہ میز اور کرسیاں جاگ رہی ہیں اور عورتیں، مرد، لڑکے، لڑکیاں سو رہے ہیں۔

سنجوگتا کنارے والی میز پر کونے میں بیٹھی ہے. سفید دوپٹہ گردن میں ہے۔ کُرتا گھٹنوں پر کسا ہوا ہے. شلوار خوبصورت ٹانگوں سے چپکی ہوئی ہے. اس کی سفید چپلیں اس کے پیروں کو چھوڑ چکی ہیں اور ایر کنڈیشنڈ ریستوران کی خنکی نرم قالین پر رینگ رہی ہے۔ اور اس کی تھکی ہوئی انگلیوں کو سہلا رہی ہے۔ اس کے پورے جسم میں گدگدی ہو رہی ہے۔ رنجیت اپنے بھورے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہے اور کھولتا ہے۔ کھولتا ہے اور بند کرتا ہے۔ اس کی جیب میں چار مینار سگریٹ کے دو پیکٹ ہیں. لیکن میز پر گولڈ فلیک کا پیکٹ ہے۔ وہ پوری شام تھرتھراتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا ہے۔ اس کا کُستا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ اور اس کی آنکھوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ وہ سوکھتی ہوئی زبان اپنے سوکھتے ہوئے ہونٹوں پر پھیرتا ہے اور روہانسی آواز میں کہتا ہے۔

"کبھی کبھی میرا جی تڑپ اُٹھتا ہے۔

"I so madly want to kiss you"

"Do you? What a crazy idea?"

"May be!"

"یہ فضول ہے۔ ہر چیز فضول ہے! Futile"

(پاس کی میز سے ایک ٹھیکیدار کی فلسفیانہ آواز آتی ہے) "But that's how the life is made"

"تم نہیں سمجھیں ...... میرا مطلب ہے، میرے اندر جو ایک مرد ہے اور تمھارے اندر جو ایک عورت ہے۔" اس کی زبان سوکھنے لگتی ہے اور اس سے کچھ کہا نہیں جاتا۔

"میں سمجھ گئی" سنجوگتا نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبالیتی ہے۔ خنکی اس کے ننگے پیروں کو گدگدا رہی ہے۔ "ہوگا! بیوقوف!"

"تسی کتھے جاندے او"۔ دوسرے کونے سے آواز آتی ہے۔

سردار جی اور سردارنی بل ادا کر چکے ہیں۔ نیپ کن میز پر رکھ چکے ہیں۔ فنگر بال میں نیبو کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ انھیں اب جانا ہے۔ انھیں کسی کا انتظار نہیں ہے۔ مگر بیٹھے ہیں اور نیم وا آنکھوں سے پورے مولاں روژ کا، یعنی میرا جائزہ لے رہے ہیں۔

مولاں روژ کی چھت سے موسیقی کی پھواریں برس رہی ہیں۔

مشہور رپنیٹر رائے سب سے مدھم گوشے میں بیٹھ گیا ہے، جہاں ہری بیل بہت سے پتّوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے چھت کی طرف بڑھ رہی ہے ــــــ یہ بڑا بدمذاق شہر ہے، بیہودہ، گنوار۔ بس ایک چھوٹا سا کونا ہے جہاں ــــــ "اگر میری پینٹنگ مہارانی نے خریدلی اور اگر نیویارک ــــــ"

میں یہ سب دیکھتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، میں ان سب کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوں۔ دن میں سو سو بار ــــــ یہ آتے ہیں، کچھ کھاتے ہیں، کچھ پیتے ہیں، چلے جاتے ہیں، مجھے بھول جاتے ہیں، لیکن میری روح آنکھوں کی روشنی کی طرح ان کے ساتھ جاتی ہے۔

اُتم سنگھ، جو میرا مالک ہے، بڑا روشن خیال آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے ایسے ریستوران صرف پیرس میں ہوتے ہیں، میں بھی یہی کہتا ہوں ــــــ اور یہ لوگ بھی جو شاندار کپڑوں میں، بڑی بڑی خوب صورت کاروں میں، نوجوان لڑکے لڑکیاں جو ایک دوسرے سے چپکے ہوئے، اسکوٹروں پر یہاں آتے ہیں۔ جن کے کپڑوں سے بڑی طرحداری اور چلنے اور بولنے کے انداز سے بڑی بے نیازی ٹپکتی ہے ــــــ سب یہی کہتے ہیں۔

"ہائے Abstract pattern جو سب کچھ ہونے پر بھی کچھ نہیں، جو کچھ نہیں ہے، پھر بھی سب کچھ ہے ــــــ لڑکیاں خالی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی ہیں اور ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

میرے ناک نقشے میں وہ بات نہیں ہے، جو عام ریستورانوں میں ہوتی ہے۔ میرا انداز بڑا انیکھا ہے۔ سب سے الگ، روشنی ہے تو ایسی کہ پرچھائیاں معلوم ہوں، میزیں، دیواریں، لکیریں، پردے، جھالر، ہر چیز کا اپنا انداز ہی الگ ہے۔ ہر چیز آڑی ترچھی ہے۔ اب اس میز کو دیکھو کونے میں، جہاں اس چھوٹی سی دیوار کا سایہ پڑ رہا ہے، جس پر پلاسٹر نہیں کیا گیا ہے۔ دیوار پر ایک سیاہ تختہ ہے، جس پر سرخ، ہرے اور پیلے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے ہیں اور بیچ بیچ میں سیپیاں اور درخت کی چھال کے ٹکڑے لگے ہیں جو اس دھندلکے میں چڑیل کی آنکھیں معلوم ہوتے ہیں۔ دو دو تین تین میزوں کو الگ کرنے والی سیاہ اور سرخ دیواروں میں روزن بنے ہوئے ہیں جن سے روشنی نہیں گزرتی لیکن نگاہیں گزرتی ہیں اور پُراسرار پرچھائیوں کو دیکھتی ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن جو ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں۔ ایک دوسرے میں جذب ہوجانے کو بے قرار۔

روزنوں کے دونوں طرف دھندلکے میں کیسے کیسے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ کیسی کیسی آنکھیں کھل رہی ہیں، اور خوابوں کے بوجھ سے بند ہوتی جارہی ہیں۔ کیسی کیسی بانہیں ہیں۔ ٹھنڈی، دُبلی، بھری بھری، گوری اور گندی بانہیں ــــــ روشنی کی طرح

تیرتی ہوئی، مڑتی ہوئی بانہیں، ادر گردنیں، جھکی ہوئی بھی، تنی ہوئی بھی، جیسے ان کے سامنے لہراتی ہوئی بانہیں، بانہیں نہ ہو تلواریں ہوں ——— زلفیں کٹی ہوئی بھی، بکھری بھی، گھٹاؤں کی طرح اُمڈی ہوئی بھی، جو ذرا ذرا سی جنبش پر رات کی طرح پھیل جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ نہ جانے کتنا موں اور دلوں کے کن اُجالوں پر چھا جاتی ہیں۔

کونے میں باتھ روم کے پاس، جہاں ہری بھری بیلیں لٹک رہی ہیں، جہاں سُرخ میز کو تین طرف سے چھوٹی چھوٹی دیواروں نے آن گھیرا ہے۔ جہاں دُھندلکے کو اندھیرے نے دبا دیا ہے، ذرا ادھر بھی دیکھو ——— یہ ہونٹ ہیں ہونٹ ان کا رنگ یا توتی ہے لیکن کالے لگ رہے ہیں۔

"نہیں ڈارلنگ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ تم بڑے ریشنل آدمی ہو ——— سمجھو۔ اب میں اس زندگی سے تھک گئی ہوں۔ آگ بجھ رہی ہے۔ آگ بجھانا ہی ہے تو بھرے بازار میں کیوں مجھے ——— کسی جنگل میں ——— کسی غار میں، کسی۔

ہونٹ ہل رہے ہیں۔ لگتا ہے دو باریک پتھر ٹکرا رہے ہیں اور چنگاریاں بکھر رہی ہیں۔

"میں اکیلا کیا کروں گا ——— دس سال کا ساتھ کم نہیں ہوتا میری جان۔ دس سال میں تو انسان . . . . ."

ہونٹ مسکراتے ہیں، لپ اسٹک سے بھیگے ہوئے اُداس ہونٹ، لرزتے ہوئے تشنہ، زہر پیتے ہوئے ہونٹ۔

"تم Sentimental بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ٹہنی ٹوٹ گئی ہے، پتے جھڑ چکے ہیں، پتے۔ پتے۔ پتے۔ تاش کے پتے۔"

"ڈارلنگ وعدہ کرو۔ تم مجھے بھول جاؤ گے۔ تم اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش رہو گے۔ ڈارلنگ اب تم اڑ کے ہو گئے۔ شام کو پنچھی گھونسلے میں لوٹ جاتے ہیں۔"

"اب تم سینٹی منٹل ہو رہی ہو۔ تم اس جٹادھاری ٹھیکیدار کا گھر بسانا چاہتی ہو، جو عورت اور سنگترے میں فرق نہیں سمجھتا۔ جو . . . . ."

"لیکن وہ اچھا آدمی ہے ڈارلنگ۔ اس نے اڑتالیس سال زندگی کے تنہائی میں گزار دیے۔ اس کی نہ کوئی بیوی نہ بچے۔"

"لیکن اس کے پاس سرکاری ٹھیکے کتنے ہیں ——— ؟ جانتی ہو اس کا بینک بیلنس ؟"

"ڈارلنگ وہ بڑا بدقسمت انسان ہے۔"

"لیکن میں اس سے زیادہ بدقسمت ہوں۔"

ہونٹ مسکرا رہے ہیں، ہونٹ لرز رہے ہیں۔ گہرے دُھندلکے میں ہونٹوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"تم بڑے سویٹ ہو۔"

"سویٹ۔ سویٹ۔ بتاؤ پڈنگ کھاؤ گی یا کیسٹرڈ ؟"

"پڈنگ ——— اور تم ؟"

"میں بھی ——— ڈیئر !"

چسکیاں بجتی ہیں۔ ٹھنڈے۔ ہونٹ۔ ٹھنڈے ہونٹوں کو چھو کر لرز جاتے ہیں۔ مرد اور عورت، دونوں کے جسم میں تھرتھری دوڑ جاتی ہے۔

ہری بیلوں سے آگے، اینٹوں کی سُرخ دیوار کے پاس، جہاں سائے اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ آدمی کی پہچانی نہیں جاتی، سُرخ دروازہ کھلتا ہے، جس کے بیچوں بیچ زرد آتو کی گول آنکھیں دُھندلکے میں کبھی پھیلتی اور کبھی

ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مغربی ایٹی کیٹ کا پُتلا' سیاہ سوٹ میں کھڑا اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پنسل دوڑا رہا ہے۔ وہ دروازے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو جھک کر "ویل کم" کرتا ہے۔ اور مختلف کونوں میں میزوں کی طرف بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ہیولے داخل ہوتے ہیں اور مختلف کونوں میں کھو جاتے ہیں' بکھر جاتے ہیں' موسیقی کی طرح' دُھندلکے کی طرح۔

دروازہ کُھلتا ہے' زرد اُلو کی آنکھ پھیل جاتی ہے۔ دھوپ کی شفاف سِل دروازے میں چمکتی ہے ــــ میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے ــــ دھوپ کی شفاف سِل کو چیر کر ایک بڑا سا ہیولا میرے دل میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے چند اور ہیولے داخل ہوتے ہیں۔ مغربی ایٹی کیٹ کا پُتلا اس گروہ کو اس کونے کی طرف لے جاتا ہے' جہاں ایک سیاہ تختے پر موٹی موٹی سُرخ لکیروں اور ٹوٹتے پھوٹتے زاویوں سے ایک عورت کے نقوش اُبھارے گئے ہیں۔ ان نقوش کے بارے میں اکثر رائیں ٹکراتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ عورت نہیں ہے' بکری ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ نہ عورت ہے اور نہ بکری ــــ یہ تو 'اسٹل لائف' ہے۔ اس کے بغل کے بال دیکھو' ناف کے نیچے دیکھو' یہ کیا ہے عقل کے اندھے' کیا بلیرڈ ٹیبل ایسی ہوتی ہے؟"

یہ شخص جو ابھی ابھی' اپنے قافلے کے ساتھ آ کر بیٹھا ہے' بڑا انٹرنیشنل آدمی ہے۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل کے مہاراجہ کی طرح۔ مونچھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا' بڑا نام ہے اس کا۔ بہت بڑا ایکٹک ہے۔ اس کا سگار دیکھو' اس کی عینک دیکھو' اس کا سر دیکھو' شیشم جیسا جسم دیکھو۔ اس کی ذہین آنکھیں دیکھو۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی محبت اور علم دیکھو ــــ بڑی دراز قد گدرے دار شخصیت ہے۔ یہاں بہت سے آتے ہیں' میں جانتا ہوں وہ کتنے پانی میں ہیں لیکن اس کی تھاہ تو میں بھی نہیں پا سکا۔ اپنے دشمن کو بھی گلاب کی کلی کی طرح شاخ سے توڑ کر اپنے کالر کے کاج میں سجا لیتا ہے۔ بہت ہی گہرا آدمی ہے۔ بہت ہی گہرا ــــ اپنے بانکے اور دُبلے جسم کے ساتھ لندن اور پیرس کے ڈانس فلور پر ناچ چکا ہے۔ بڑا تجربہ کار آدمی ہے۔

گہرا آدمی' میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے دوسرے گہرے آدمی سے کہتا ہے "نمائش بڑی کامیاب رہی۔ میں پچھلے سال نمائشوں کے موسم میں پیرس میں تھا۔ اتنی اچھی نمائش تو میں نے وہاں بھی نہیں دیکھی۔"

دوسرا گہرا آدمی' پہلے گہرے آدمی کی طرح گہرائی جانتا ہے۔ وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے' اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ پھر اپنے پائپ کا پورا کش اپنے سینے میں اتار لیتا ہے۔ جیسے اس کے پائپ میں بہترین ولایتی تمباکو نہیں بلکہ سامنے بیٹھے ہوئے مسکراتے ہوئے پُرسکون انسان کا دماغ بھرا ہوا ہے۔ وہ دھواں آہستہ آہستہ منہ سے اگلتا ہے اور کہتا ہے۔ "ایک کینوس بھی اوریجنل نہیں تھا۔ Nothing soulful!" وہ پھر لڑکی کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کی کافی کے گلاس میں آئس کریم کو پگھلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

پہلا گہرا آدمی اسی طرح مسکراتا ہے۔ اس کے ذہن میں اب تک جرنلسٹ کلب کی باتیں گونج رہی ہیں۔ آنکھوں میں بیئر کی بوتلیں تیر رہی ہیں ــــ "امریکی سالے وہاں سے پٹ کر نکلیں گے۔ چینی بڑے بہادر ہیں تو تائیوان پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میں ہی نہیں ساری دنیا اس کو لڈوار سے اُکتا کر خودکشی کر لے گی۔"

"And then you will see

There will be nothing to see..."

"نہیں نہیں' سب یوں ہی چلتا رہے گا۔ بم بھی گرتا رہے گا۔ اور امن اور دوستی کی باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔" گہرے

آدمی کی نگاہیں، لڑکی کے دھندلے نقوش کو چوم رہی ہیں۔" Charming "ـــــ دانت سگار کو دبائے ہوئے ہیں اور اس کی آواز سگار سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"میں کہتا ہوں رجنی کا فن اوریجنل ہے۔ اس کی نمائش ہونی چاہیے"۔

دوسرا گہرا آدمی لڑکی کے شانوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور میز کے نیچے اس کے پیر لڑکی کے پیروں کو تلاش کرتے ہیں اور پہلے گہرے آدمی کے بڑے بڑے جوتوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ گہرا آدمی مسکراتا ہے۔

"فن میں اوریجنلٹی کیا ہوتی ہے بھائی۔ اور اگر اس ترازو میں تمھارے ناول کو تولا جائے تو ـــــ"

"یہ بڑا بھونڈا اکسپریشن ہے۔ ناول کو ترازو میں تولنا"۔

"ہا ہا ہا!"

لڑکی کی آنکھیں اٹھتی ہیں۔ پہلے گہرے آدمی کی نگاہیں بھنوروں کو ڈھونڈھتی رہ جاتی ہیں۔

"تم ہمیشہ ایٹرنل ویلوز اور اوریجنلٹی کی باتیں کرتے ہو لیکن . . . ."

"میں تمھاری طرح مارکس وادی نہیں ہوں۔ میں کنول کا پھول ہوں، جو پانی میں رہ کر بھی پانی کے اوپر رہتا ہے"۔

لڑکی مسکراتی ہے، آئس کریم کھاتی ہے اور اس نوجوان کی طرف دیکھتی ہے جسے اپنے ڈیلی پیپر میں نائٹ ڈیوٹی کے لیے بھاگنا ہے۔ لیکن وہ لڑکی کو ان دو گہرے آدمیوں کے پاس چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ کھلتے ہیں۔

"رجنی میں تمھیں گھر چھوڑتا ہوا پریس چلا جاؤں گا"۔

"تم جاؤ۔ ہم ابھی رجنی کے "ون مین شو" کے بارے میں باتیں کریں گے"۔

دوسرا گہرا آدمی پائپ چوستے ہوئے سوچتا ہے۔

"اگلے ناول میں رجنی کا بوہیمین کیرکٹر ابھاروں گا۔ عورتیں تو میں نے بہت دیکھی ہیں ـــــ مگر یہ عورت، یہ عورت ـــــ یہ عورت ـــــ"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ بوہیمین لڑکی اس کے پائپ کو نفرت سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے ـــــ

"مسٹر سنتوش آپ کا ہاتھ بہت بھاری ہے"۔

"یہی بات تمھارے پیروں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے"۔ گہرا آدمی مسکراتا ہے۔

"دنیا کے تمام بڑے بڑے آرٹسٹ صحت کے معاملے میں ـــــ یہ تو صرف بھوکے ہندوستان میں You have sense of himour, really."

وہ اپنے بھاری ہاتھ سے لڑکی کے شانے کو سہلاتا ہے۔ پہلا گہرا آدمی، جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے، جماہی لیتا ہے اور دوسرے گہرے آدمی کی انگلیوں کو دیکھتا ہے، جو بوہیمین لڑکی کے سانولے شانے پر تیر رہی ہیں۔

"میں کہتا ہوں ہندوستانی میوزک بھی آرکسٹرا کی سطح پر ـــــ نہیں نہیں میں چلتی ہوئی دھنوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ پیانو، ہندوستانی موسیقی کا ساتھ نہیں دے سکتا ـــــ لیکن پیانو پر دوڑتی ہوئی انگلیاں . . . . ."

شانے پر دوڑتی ہوئی انگلیاں رک جاتی ہیں۔ میز کے نیچے ناول نگار کے پیر اپنے اگلے ناول کا پلاٹ تلاش کرتے رہتے ہیں اور پہلا گہرا آدمی اپنے سگار سمیت مسکراتا ہے۔ اچانک اس کا چہرہ پُراسرار ہو جاتا ہے۔ جیسے پادری کا چہرہ جو منبر پہ کھڑا ہو . . . .

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بہت بڑا فراڈ ہوں"۔

لڑکی کی آنکھیں اس کی طرف اُٹھتی ہیں۔ نشے میں آدمی کتنا سچا ہو جاتا ہے۔ "رتن بھائی" لڑکی کی آنکھیں کھلتی ہیں اور

بھونرے اُڑ جاتے ہیں۔

"ہاں میں سچ کہتا ہوں۔ پچھلے تیس سال میں کیا لکھا ہے میں نے؟ لندن اور پیرس کی گپ ہانکنے کے سوا، مارکس اور گورکی کے اُگلے ہوئے نوالے چبانے کے سوا۔۔۔۔۔ میں بڑا فراڈ ہوں ـــــ"

"تم شراب پی کر آئیں بائیں شائیں بکنے لگتے ہو۔ تم نے نئے ہندوستان کے نئے کلچر کو ایک ڈائرکشن دیا ہے۔ میرا مطلب ۔۔۔۔ سمت ۔۔۔۔۔ افق ۔۔۔۔۔"

"Rot! I'm a fraud"

"رجنی بس میں تو رتن بھائی کے اسی بھول پن پر جان دیتا ہوں۔"

"میں بھی۔" بوہیمین لڑکی کہتی ہے، جس کے بال کانوں اور پیشانی پر جھک آئے ہیں۔

"I like this old guy!"

ایک کونے میں تین چار مغربی ڈپلومیٹ دو تین سرکاری افسروں اور ٹھیکیداروں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ایک امریکی عورت، جو کسی پریس ایجنسی کی نمائندہ ہے، اپنے پرس سے ہاتھی دانت کا سگریٹ ہولڈر نکالتی ہے، اور سگریٹ سلگاتی ہے۔

فرانسیسی ڈپلومیٹ عجیب و غریب لہجے میں انگریزی بولتا ہے اور سگریٹ ہولڈر کی تعریف کرتا ہے۔ پھر اپنا سگریٹ کیس نکالتا ہے، جو اسے کسی "مہارانی" نے دیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دانت سگریٹ نوشی کی وجہ سے پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آنکھوں کے گرد جھرّیاں پڑ گئی ہیں۔ جن سے چھن کر مسکراہٹ کی چمک آنکھوں میں تیرتی ہے۔ وہ امریکی جرنلسٹ کا ہاتھ دباتا ہے اور مسکراتا ہے۔

"زندگی کے تجربے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔" وہ کہتا ہے اور عورت کی چالاک آنکھوں میں جھانکتا ہے، جن کی پلکوں کو میک اپ نے بہت بوجھل بنا دیا ہے۔ عورت کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں لیکن سُرخ دہکتے ہونٹ ہنستے رہتے ہیں۔

یہ ڈپلومیٹ، جو دنیا کے بڑے بڑے نائٹ کلبوں سے آتے ہیں، مجھ پر جان دیتے ہیں کیونکہ یہاں انھیں پیرس کی خوش مذاقی بھی ملتی ہے اور ایشیائی تہذیب کا اسرار بھی نظر آتا ہے۔

انھیں ہمارے یہاں کا کھانا بہت پسند ہے۔ کیونکہ ہمارا باورچی ہنگرین ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں بداپسٹ سے وئنا بھاگ گیا تھا۔ یہ منچلا ہنگرین وئنا سے برلن گیا۔ برلن سے پیرس اور پیرس سے یہاں آگیا۔ انسان بھی عجیب تنکا ہے۔ ہوا میں اُڑ کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا پکایا ہوا چکن گولاش اتنا مزے دار ہوتا ہے کہ یہ ڈپلومیٹ اپنے گھٹنوں پر نیپ کن بچھاتے ہی منہ سے رال ٹپکانے لگتا ہے۔ "Smell! Isn't it?"

یہ ڈپلومیٹ کتنی بے نیازی سے، کتنی گہری اور خطرناک باتیں کرتے ہیں۔ کالی عینک والا شخص جو دو تین لفظ میں ہر سوال کا جواب دے رہا ہے اور جس کی گردن کی رگیں منہ کھولتے ہی جونکوں کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ سوپ پیتے پیتے نیپ کن سے ہونٹ خشک کرتا ہے اور میز پر گھونسہ مارتا ہے ـــــ کیمونسٹ ـــــ گیس ـــــ بم ـــــ عورت ـــــ بچے ـــــ ویٹ نام "Let them die! Let them die - The food is delicious -"

میز پر ایک رسالہ کھلا پڑا ہے جس کی تصویر میں ایک مُردہ ویت نامی ماں کے سینے کو ننھا سا بچہ ٹٹول رہا ہے ـــــ!

ہمارا ہنگرین باورچی یہ باتیں نہیں سُنتا ـــــ وہ اپنا سوپ اور گولاش پکانے میں لگا رہتا ہے۔ اس کا چہرہ گول ہے۔ ٹماٹر کی طرح سُرخ۔ جب وہ چمچے میں گرم سوپ نکال کر چکھتا ہے تو اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ترچھی سفید ٹوپی کبھی ایک طرف جھکتی ہے کبھی دوسری طرف ـــــ اور جب رات گہری ہو جاتی ہے سب یہاں

سے چلے جاتے ہیں۔ ایرکنڈیشننگ مشین بند ہوجاتی ہے اور ہر طرف سے کھانے کی گرم خوشبو جھپٹتی ہے تو وہ اپنا سفید لباس اتار دیتا
ہے اور صرف بنیان اور انڈرویئر میں اوپر چھجے پر چلا جاتا ہے اور آنکھیں میچ کر دور کی روشن کھڑکیوں کو اندھیرے میں ڈوبتے
ہوئے دیکھتا ہے۔ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔
"آزادی آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ آزادی نے مجھے باورچی بنا دیا ہے۔"
پھر وہ گنگناتا ہے ——— "آزادی ۔ آزادی ۔ آزادی ۔ چکن گولاش پکانے کی آزادی ۔ چھجے پر سونے کی آزادی ۔ گانا گانے
کی آزادی ———"
وہ واقعی گانے لگتا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ جب میری دیواروں کو اس کی آواز چھوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ
میں ایک جیل ہوں۔ رات مجھے تھپکیاں دے رہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ کیوں کہ پو پھٹنے سے پہلے میری دیواروں کے
اس قیدی کو پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا جائے گا۔ رات، قیدی، پھانسی۔
اس کی آواز سن کر چھجے کے نیچے شوفر، بیرے، سنتری وغیرہ مچھروں کو اڑاتے ہیں اور دانت پیس کر کہتے ہیں۔
"سالا پاگل ہے ۔ نہ جانے یہ ہنگرین کا بچہ سوتا کیوں نہیں!"
"ماں یاد آتی ہوگی!"
ہنگرین کو واقعی ماں یاد آتی ہے اور وہ گاتا ہے۔

رات، دھند، چاند۔
میرا شہر، میری ماں، ——— خاموشی!
شہر کا دل، دریا، خاموشی، رواں ۔
دل، دل کی زنجیر، جھنکار!
برج کے اجلے درخت، ہوا، دھند، چاند۔
ہونٹ، دھند، سانس، چاند ——— ہنگری کا چاند!
آگ پگھلتی ہوئی
سانس میں،
دھند، چاندنی اور پانی میں
گھلتی ہوئی
آگ!

بداپسٹ کی ہواؤ
تم کہاں؟

میں کہاں ہوں؟
میں بس اتنا جانتا ہوں
میں جہاں ہوں وہاں

نہ ماں ہے
اور نہ تُسکائی جیسی شراب،
جس میں نہ جانے کیسے کیسے ہونٹوں کی گہری
بالوں اور باہنوں کی خوشبو
بسی ہوتی ہے،
رات، دُھند، چاند!

ہنگرین سو جاتا ہے اور خواب میں بڑبڑاتا ہے ——
"آج میں چکن گولاش پکاتا ہوں۔ کل میں سانپ اور بچھو کا گولاش پکاؤں گا۔ کیونکہ میں آزاد ہوں، اپنے دریا، اپنی ہوا، اپنے گھنے درختوں سے دور۔

"What a silly song!"

میرے اندر صبح ہی سے شام ہے۔ لیکن اب تو باہر بھی شام ہو چلی ہے۔ اب جو دروازہ کھلتا ہے تو دھوپ کی رسل نہیں جھکتی۔ اب سُرمئی دُھندلکے میں چند سائے اندر آجاتے ہیں۔ تھکے تھکے بھی، جولاں جولاں بھی، جسم بھی آتے ہیں اور روحیں بھی۔ لچکتے ہوئے جسم، لڑکھڑاتے ہوئے جسم، مہکتی ہوئی روحیں، صراحی سے چھلکتی ہوئی، گھبراتی ہوئی، بکھرتی روحیں، ٹھنڈی فضا میں کیک، پیسٹری اور چائے، کافی کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ٹرالی ٹرے، رنگین پلیٹیں، ہاٹ ڈاگ، مٹن ہمبرگر، سموسے، پنیر ورینج اسکواشں، کوکا کولا، گولڈن فوم۔
"میں اس کی ایسی تیسی کر دوں گا —— یہ کیا اسٹائل ہے بادشاہو! لائٹ دینے میں بھی جان جاتی ہے۔ لائٹ ہی ہیں —— جس دیش میں لائٹ ہی نہ ہوگی ——" ہری کپور اپنی اندر کی جیب میں نوٹوں کی گڈی کو اُنگلیوں سے چھوتا ہے ——
"ان سالوں کا ایرکنڈیشنڈ بھی جعلی ہے۔"
ہری کپور کا سر بہت بڑا ہے اور بال کھڑے ہیں۔ اس کی ٹیری لین کی قمیص کے نیچے سے میلا بنیان جھانک رہا ہے۔ س کے ہونٹ سیاہ ہیں اور آنکھیں بھوری، جن میں ہوس کی چنگاری جل رہی ہے۔
"میں کہتا ہوں سردار تیجا سنگھ پھر چرکا دے گیا، پارٹنر۔ ہم دیکھتے رہے اور چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ اس کا سیمنٹ راکھ ہے راکھ۔ اور سرکار اسی کو ٹھیکہ دیتی ہے ——" شرما منہ بگاڑ کر کہتا ہے اور اپنی موٹی ہتھیلیوں کو رگڑتا ہے۔
"اس بار نکل گیا بادشاہو، لیکن اگلے سال کہاں جائے گا۔ بادشاہو! جتنا کھانڈ ڈالو گے لسی اتنی ہی میٹھی ہوگی ن باتوں میں کیا رکھا ہے بادشاہو۔ ادھر دیکھو۔ اس کونے میں تمہارا لونڈا کیسا کھیل کھیل رہا ہے، اور پڑھاؤ اس کو کالج میں ——"
"بھیّا کیا ہم نے کم کی ہے، میرا پھیری اپنے زمانے میں ——" ہری کپور اس کونے کی طرف نہیں دیکھتا، جہاں س کا بیٹا سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھی کی نظر اسی کونے پر جمی ہوئی ہے —— وہ سوچ رہا ہے، باپ ہو یا بیٹا —— مال اچھا پھانستے ہیں دونوں ——"

نوجوان کپور نے نہ تو اپنے باپ کو دیکھا ہے اور نہ اس کے پارٹنر کو ـــــ وہ راگنی کے گلے میں پڑے ہوئے سفید ہار کو دیکھ رہا ہے جو بلاؤز کے بڑے سے گریبان کو چھو رہا ہے۔ وہ بھی خاموش ہے اور راگنی بھی ـــــ میز پر فرانسیسی مصنف ودوا کی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ ہر طرف روشنی مدھم ہے ـــــ اسپریسو کی مشین کھانستی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ویٹر تیزی سے آرہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ موسیقی کی دُھنیں بہت اداس ہیں ـــــ راگنی کتاب کے ٹائیٹل کو دیکھ رہی ہے، جس پر ایک لڑکی کی ننگی تصویر ہے، جس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر جھول رہے ہیں ـــ میں نے آئینے میں اپنا ننگا جسم دیکھا۔ میرا جسم ایسا نہیں ہے۔ کیا تمام فرانسیسی لڑکیوں کا جسم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ترشے ہوئے چکنے کولھے، سڈول رانیں، دُبلی مگر پیاسی بانہیں۔ میرا جسم ـــــ نہ یہ خم نہ یہ اُبھار ـــــ بڑا بمبار سا۔ بڑا اوٹ پٹانگ سا جسم ہوتا ہے ہندوستانی عورت کا۔ وہ بات ہوتی ہی نہیں۔ کیوں، ایلورا کے مجسموں اور وینس دی میلو میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستانی سینے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اور کولھے، ان میں یہ Elegance، یہ تراش، یہ خم، یہ اُبھار، یہ نرمی نہیں ہوتی۔ ایک سینے وہ ہوتے ہیں جو اپنا سب کچھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو راز کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ میرا دماغ بہت سکسی ہوگیا ہے اور میں بیمار ہوں۔ Frigid! میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، ایسی عورتیں ـــــ کپور یونیورسٹی کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے، اس کا جسم جتنا بھرا ہوا ہے دماغ اتنا ہی خالی ہے۔ زندگی صرف سکس نہیں ہے۔ زندگی کو کچھ اور بھی چاہیے۔ یہ ریکھا سے جلتا ہے۔ یہ مجھے بھی یہ سُنا چکا ہے کہ یونیورسٹی کے لڑکے کہتے ہیں میں Lesbian ہوں۔ لیکن یہ جھوٹ ہے۔ ریکھا میری دوست ہے اور وہ کپور پر مرتی ہے۔ وہ اس کے چہرے پر مرتی ہے۔ چہرہ تو واقعی اس کا "مارٹر" والا ہے۔ جب بھی میں "مولاں روژ" میں اسے دیکھتی ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی ایسے فوجی کپتان کو دیکھ رہی ہوں جو سیدھا میدانِ جنگ سے بھاگا آرہا ہے۔ جہاں اس کے سارے سپاہی کام آچکے ہیں اور تمغے چھن چکے ہیں۔ چہرہ سُتا ہوا، بالوں میں خاک سی اُڑتی ہوئی اور آنکھوں میں غضب کی شکست اور انتقام کی ہوس۔ کس سے انتقام؟ کاہے کا انتقام؟ یہ میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں ـــــ کپور چپ ہے اور وہ سوچ رہا ہے کہ میں اس کی ٹانگ کے لمس کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہوں۔ کُڑھ رہا ہے۔ گدھا! اب ریکھا آتی ہی ہوگی۔ کیسا خون کھولے گا اس کا۔ نظر اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا یہ اس کی طرف۔ آج میں کپور سے کہہ دوں گی، تمھارے لیے میرے پاس ـــــ ریکھا سائے کی طرح آتی ہے۔ اس کی آواز کتنی بھاری اور سرگوشی سے بھری ہوئی ہے۔ قد، کتنا اونچا قد ـــــ لمبا کتنا چُست لباس۔ بال، کتنے گھنے بال۔ لمبے گھنے، آزاد! شہد، اس کی آنکھوں سے کیسا شہد ٹپک رہا ہے۔ یہ شہد کس کے لیے ہے۔ ہونٹوں کا یہ خم کس کے لیے ہے جسم کا یہ تھما تھما سا تلاطم کس کے لیے ہے۔ کپور اُٹھ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ جاتا ہے۔ راگنی اس کی بھری بھری ران کو اپنی ران سے دباتی ہے۔ ریکھا حیرت سے اس کو دیکھتی ہے۔

"کپور آج خودکشی کرنے والا ہے"۔ راگنی کہتی ہے ـــــ

"کیوں ـــــ" ریکھا ہنس کر کہنیاں میز پر رکھ دیتی ہے اور کپور کی طرف جھکتی ہے ـــــ "سچ؟"

کپور ہونٹ چبانے لگتا ہے ـــــ "تم کیا پیوگی؟"

"وہسکی"۔

"ایسپریسو؟"

"یس ایسپریسو وہسکی۔ نٹ، بلیک!" ریکھا آنکھ بند کر لیتی ہے۔

خاموشی چھا جاتی ہے۔ راگنی ایسپریسو مشین کی روشنی رگوں اور آنکھوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے ہیں پاس ہی سرخ میز کے گرد نوجوانوں کی دوسری ٹولی ہے۔ میز کے کونے پر کافی کی پیالی سے بھاپ اُٹھ رہی ہے۔ ایک دُبلا پتلا

چہرہ، جو درخت کی چھال کی طرح خشک ہے، عینک لگائے بھاپ کو گھور رہا ہے۔ اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ لیکن جب ہونٹ اپنی اصلی حالت پر آتے ہیں تو ان میں کوئی نمی نہیں پیدا ہوتی۔ زہریلے پھول کی کالی پنکھڑی کی طرح خشک ہونٹ تھرتھراتے ہیں۔

وہ پھر اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

"ہاہاہا! جنٹس لوگ ہمیشہ اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں تم لوگ غلط جگہ لے آئے ہو۔ اس ایرکنڈیشنڈ ریستوران میں تو طاعون پھیلنا چاہیے۔ یہ ریاکاری کا گھونسلہ ہے۔ ہر طرف سڑے ہوئے دل اور دماغ کی سڑاند اُٹھ رہی ہے۔ تم لوگوں کو کولڈ اسٹور کی چیزیں پسند ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ چیزیں ٹھنڈی ہیں۔" وہ رُکتا ہے اور کافی کا ایک گھونٹ پیتا ہے۔

میں اس شخصیت سے نفرت کرتا ہوں کیوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس گدھے کو نہیں معلوم کہ کھوٹا سکّہ گھوم گھام کر واپس آجاتا ہے۔

"تم لوگ مجھ سے جلتے ہو کیوں کہ میں اس طرح لکھتا اور سوچتا ہوں جس طرح لوگ آج فرانس میں سوچ رہے ہیں۔ کیونکہ میری کہانیاں "Washington Patriot" میں چھپتی ہیں۔ کیونکہ میں تم سب کو مداری سمجھتا ہوں اور صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ میں اکیلا پیدا ہوا ہوں۔ اکیلا جیوں گا اور اکیلا مروں گا۔"

موٹے گالوں والا نوجوان جو کسی ریستوران کے مالک کا داماد ہے اور اپنے آدم بیزار دوست کی "محبت" میں گرفتار ہے، سر اُٹھاتا ہے۔ دانت سے ناخن کترتا ہے۔ "بیٹا تم سمجھتے ہو۔ تو بڑے اوریجنل "اکیلے" ہو۔ اور سمجھتے ہو اکیلے صرف فرانس میں پیدا ہوتے ہیں اور جب غالب نے کہا تھا —— رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو —— تو کیا۔۔۔۔"

"میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ میں تم نہیں ہوں اور تم ——"

"خدا کی قسم اتنا بڑا انکشاف تو آج تک ہوا ہی نہیں تھا۔"

سب بھیڑوں کی طرح سر جھکا کر ہنستے ہیں۔ بڑے بے رحم ہیں یہ لوگ —— یہ گروہ جب کبھی میری ٹھنڈی، گہری اور اندھیری آغوش میں آتا ہے، میری روح لرز جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ سب مجھے بالکل اجنبی لگتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی باتیں کرنے والے نہیں آتے۔ جو صرف باتیں کرتے ہوں اور اپنے دماغ اور دل کا سارا زہر باتوں میں اُنڈیل دیتے ہوں۔ یہاں تو۔۔۔۔"

نوجوان کی آنکھیں اور پھیل جاتی ہیں اور آواز رُندھ جاتی ہے۔

"دیکھو اپنے چاروں طرف دیکھو —— یہ لوگ جو چیزوں کے گرد بیٹھے ہاٹ کافی، کولڈ کافی، فریش لیموں یا جنجر پی رہے ہیں۔ ذرا ان سب کو دیکھو۔ ان میں کچھ اپنی بیویوں کے ساتھ ہیں۔ کچھ دوسروں کی بیویوں کے ساتھ ہیں۔ کچھ عاشق ہیں۔ کچھ معشوق ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو سوچنے کی عادت نہیں پڑی ہے۔ یہ انسان کو، اس دنیا کو دل اور دماغ سے نہیں پہچانتے۔ اندھوں کی طرح ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ٹٹول رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو تلاش نہیں کیا ہے اور جو لوگ ——"

گروہ پر جو سکتے کا عالم طاری ہوگیا تھا، یکایک ختم ہوجاتا ہے کیونکہ ان میں سے کسی کو چھینک آتی ہے اور سب ڈر جاتے ہیں۔ جیسے ہتھوڑے کی ضرب نے برف کی سل کے ٹکڑے کر دیے ہوں۔

مجھے وہ چکنا چکنا سا ڈپلومیٹ اچھا لگتا ہے جو ہمیشہ "محفوظ" کونے میں بیٹھتا ہے۔ اس شخص نے ہمیشہ زندگی میں محفوظ جگہ تلاش کی ہے۔ جب اس کے ملک میں خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی تو وہ لاطینی امریکہ کے دورے پر تھا اور غیر ملکیوں کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کے

ہم وطن آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے کس طرح خاک و خون ہو رہے ہیں، کس طرح بچوں کو سنگینوں پر اُٹھایا جا رہا ہے اور عورتوں کے ساتھ عام شاہراہوں پر زنا کیا جا رہا ہے۔

اس کا چہرہ گول ہے۔ چکنا، جیسے اس پر پہلے پالش کی گئی ہو اور اس کے بعد استری۔ اس کی معشوقہ جو اپنے ہندستانی روایتی گھر، تابڑ توڑ بچوں، وزارتی افسروں کی خوشامد میں دن رات لگے رہنے والے شوہر، رات دن سلیقے کا طعنہ دینے والی ساس اور گھر میں آنے والے ہر عاشق پر ڈورے ڈالنے والی نندوں سے بیزار ہے۔ اس وقت سب کچھ بھول کر میٹھی میٹھی ترچھی نظروں سے اس غیر ملکی ڈپلومیٹ کو دیکھ رہی ہے، جس کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں "اڈلٹری اور دیباچری" ان مہروں کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے "شہ اور مات" کی بہت سی سیاسی چالیں طے ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا چہرہ سفید اسفنج کا بنا ہوا ہے، اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے آہستہ آہستہ دبا رہا ہے اور اس کے مساموں سے مسکراہٹ ٹپک رہی ہے۔ اگر اس کے چہرے کے نیچے بالٹی رکھ دی جائے تو منٹوں میں مسکراہٹ سے بھر جائے۔

"کبھی کبھی مجھے تمھارے شوہر پر بڑا رحم آتا ہے۔" وہ زبان سے تالو سہلاتا ہے۔

"After all he is a wonderful man.

سلمیٰ ہنستی ہے اور اپنے میک اپ کے بگڑنے کے اندیشے سے اپنی ہنسی کو ادھورا ہی چھوڑ دیتی ہے۔

"And you? You are so naughty"

یکایک اس کا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا ہے ——— "جانتے ہو کبھی کبھی مجھے کیسا لگتا ہے؟ تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو تو بتاؤں۔" ڈپلومیٹ اس کا نرم، چھوٹا اور حیرت زدہ ہاتھ اپنے معاملہ فہم ہاتھ میں لے لیتا ہے، جو صبح سے امریکی، سیلونی، پاکستانی اور فرانسیسی ہاتھوں کے لمس سے بیزار ہو چکا ہے۔ یہ ہاتھ بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کا نشہ چھلکاتے ہوئے کہتی ہے "کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں ایک بہت بڑے ریگستان میں ہوں، اکیلی۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے میرا راستہ گھیرے ہوئے ہیں، آسمان اندھیرا ہے ——— دور کہیں ایک ستارہ چمک رہا ہے۔ میں اس ستارے کی طرف اُڑنا چاہتی ہوں۔ پیاس سے میری زبان سوکھی جا رہی ہے ———"

محفوظ کونے میں، محفوظ ہاتھوں کے محفوظ لمس سے بے قرار ہو کر ڈپلومیٹ ایک محفوظ سی نظر ان سایوں اور دھندلکوں پر دوڑاتا ہے، جن کی آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پُراسرار سرگوشی بن گئی ہیں۔ پھر اس کی عینک کے دبیز شیشے، جن کا رنگ ہلکا نیلا ہے، اس کے دوست کی بیوی کے ہونٹوں پر جم جاتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں کہتا ہے۔

"بعض ہونٹ صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کو ہونٹوں سے نہیں بلکہ دانتوں سے چوما جائے۔" وہ اپنے سگریٹ کی راکھ راکھدان میں جھاڑتا ہے اور کہتا ہے۔ "یہاں سے ہوسٹل چلیں گے۔" دوست کی بیوی اس کی ہتھیلی کو دباتی ہے اور ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سپردگی کے انداز میں کہتی ہے۔ "بہت دیر ہو جائے گی۔ رات کو جب وہ گھر لوٹتے ہیں اور مجھے نہیں پاتے تو بہت Touchy ہو جاتے ہیں ———"

پھر "نہیں نہیں" اور "ہاں ہاں" کے ملے جلے انداز میں کہتی ہے۔ "میں سب سین برداشت نہیں کر سکتی ———"

ڈپلومیٹ دوست کا گول چہرہ زمین پر گرے ہوئے آئینے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کچھ سوچ کر کہتا ہے۔

"Right, I will finish my report tonight"

نوجوانوں کی میز پر گفتگو کا چڑچڑاپن اسی طرح قائم ہے۔

سوکھے چہرے والا نوجوان اَدھ جلی سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا ہے اور اس گول چہرے والے ڈپلومیٹ کی

رف دیکھتا ہے، جو اپنے دوست کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"Please for God's sake!"

"Rogne!" " نوجوان جلدی جلدی سگریٹ کے کش لگاتا ہے۔" میرا دم گھٹتا ہے یہاں —— کیوں کہ یہاں کی ہر چیز جھوٹی ہے —— یہ دُھندلکا —— یہ پرچھائیاں، یہ آنکھیں، یہ ہونٹ اور باتیں، ٹھیکیداروں کی باتیں، طالب علموں کی باتیں، ان باتوں ں کیا رکھا ہے۔ آج فرانس کے لوگ اس طرح باتیں نہیں کرتے۔ وہ چھپ کر کوئی کام نہیں کرتے جس طرح وہ ڈپلومیٹ چھپ ر کسی عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔

"I hate his hand - I hate his waist"

وہ اور زور زور سے کش لیتا ہے۔

"تم پیاسے ہو۔ تمھارا داغ اس قیدی کی دماغ کی طرح ہے جو کولھو میں جوت دیا گیا ہے۔ جب وہ پانی مانگتا ہے تو اس ے سامنے پانی کی ٹھنڈی صراحی لائی جاتی ہے اور توڑ دی جاتی ہے۔ صراحی ٹوٹ گئی ہے، پانی بہہ رہا ہے، اور تم چیخ رہے ہو، پیاسے ہو۔"

"پیاسا؟ کس چیز کا پیاسا ہوں گدھے؟"

"تم اس کمر کے پیاسے ہو، ان ہونٹوں کے، ان آنکھوں کے، ان سینوں . . . . ."

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اور وہ کافی کی پیالی اٹھا لیتا ہے۔ کئی ہاتھ صلیبوں کی طرح اٹھتے ہیں اور اس ہاتھ کو تھام لیتے ہیں۔

"یہاں نہیں —— یہاں نہیں۔"

"نہیں —— میں تو توڑوں گا۔"

"نہیں —— یہ مولاں روژ ہے۔ یہاں نہ پیالیاں توڑی جاتی ہیں نہ دل نہ سر۔"

ہڈیوں کا ڈھانچہ جسے اس کے ساتھی "سسی فس" کہتے ہیں، پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اُٹھتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے نکل جاتا ہے، دروازہ بند ہوجاتا ہے اور الو کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے چمکتی ہیں اور پھر دُھندلکے میں کھو جاتی ہیں۔

نوجوان کے ساتھی میز پر سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے۔

"نہ جانے یہ بھوت اپنی "میں" کی لاش کب تک اپنے کاندھے پر اُٹھائے پھرے گا۔"

"دیکھ لینا —— یہ بھی اپنے دوسرے دوستوں کی طرح خودکشی کرے گا۔"

"نہیں وہ سچا آرٹسٹ ہے۔ سچے آرٹسٹ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے۔"

میرا دل بھر آیا ہے —— نہ جانے کتنی باتیں سُنتا رہتا ہوں دن رات۔ اور وہ تمام باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ ے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی "میں" کے کنوئیں میں بند ہیں اور اپنے آپ کو پکار رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ شاید بھی یہاں آتا ہے۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہے، زخمی ہو کر جاتا ہے۔ اس کے دوست بڑے بے رحم ہیں۔ اپنے بارے میں اس کا پاس کانچ کے کمرے کی طرح ہے۔ وہ اپنے کانچ کے کمرے میں بیٹھ کر دوسروں کے کمروں پر پتھر برساتا ہے اور جب دوسرے پتھر برساتے تو بلبلا اُٹھتا ہے۔ یہ زندگی کتنی عجیب ہے ع

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

نیچی دیوار کے پاس اونچی گردن والا یوکریٹس (بقراط) بیٹھا ہوا ہے۔ اسے اور کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ وہ اپنا معاملہ پٹانے پر

اتارو ہے۔" اور سب باتیں چھوڑ دیجیے بس اتنا سمجھیے کہ آپ کے ملک میں کلچر کا قحط ہے۔ اور کلچر کا تعلق، گہرا تعلق، یعنی جتنا گہرا تعلق آپ سے میرا ہے، اس سے کہیں زیادہ تعلق، کلچر کا اخبار سے ہے اور میں نے اپنی زندگی اخبار کے لیے تج دی ہے۔ یہی میرا اوڑھنا، بچھونا ہے۔ میں رہائن، سین، ٹیمس، وانگا کے پانی کو گنگا کے پانی میں ملا دوں گا۔" اس کی اونچی گردن اور اونچی ہوگئی ہے اور ہونٹوں سے الفاظ اور آواز کے ساتھ جھاگ کی سفید پھواریں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ "میں انٹرنیشنل آؤٹ لک کا آدمی ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سوائی بھی انٹرنیشنل ہو سکتا ہے۔ میری نظر دنیا کے فلسفے پر ہے۔ میں قرآن پی گیا ہوں۔ میں مارکس ازم پی گیا ہوں۔ کانٹ اور نیتشے کا فلسفہ پی گیا ہوں۔ میں اقبال کا مردِ مومن ہوں۔ گم جس میں ہے آفاق۔ آفاق۔ کتنا شاندار لفظ ہے۔ ذرا اس کی گونج سنیے۔ میں زرتشت ہوں، جو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔

"Behold! I am weary of my wisdom, like a bee that has gathered too much honey-

"اچھا تو اگر میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں تو کیا آپ اخبار نکال لیں گے۔ منافع کب سے آنا شروع ہو جائے گا؟"

زرتشت کے چہرے پر تلخی کے بادل سے تیرتے ہیں۔ "اخبار اور منافع" وہ چبا چبا کر دہراتا ہے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے زیرِ لب کہتا ہے۔

"نیکی کر کنویں میں ڈال۔ اخبار نکالنا کچھ ایسا ہی دھندا ہے۔"

"جی؟"

"جی!"

دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ بقراط کی گردن کی اونچائی کچھ کم ہو جاتی ہے۔

کتنے لوگ ہیں جو یہاں صرف تھکن مٹانے آتے ہیں۔ کولڈ کافی پیتے ہیں، کچھ اسنیکس کھاتے ہیں اور سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زیادہ تر یہاں لوگ سودا کرنے آتے ہیں۔ یہ سودے طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ لاکھوں، روپے، پونڈ اور ڈالر کے ہوتے ہیں۔ دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ حُسن اور جوانی کے سودے ہوتے ہیں۔ اکثر خالی خولی اُمیدوں اور وعدوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میرے اعصاب کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ ایک دوسرے کے وعدوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں۔ میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ جب کوئی عورت سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے اگلی منزل کیا ہے اور اس نازک لمحے میں وہ تمتماتے ہوئے، کھسیائے ہوئے احمقانہ چہرے سے پوچھتی ہے۔

"کیوں آپ کا بڑا بیٹا امتحان میں پاس ہوگیا نا ــــــ؟"

اگر یہ عورت اپنے عاشق پر بھی جتانا چاہتی ہے کہ میں تو ابھی جوان ہوں۔ بہت جوان اور تم ادھیڑ ہو۔ بلکہ ادھیڑ سے بھی گئے گزرے۔ اور تمھاری گردن میں مضبوط پٹّا پڑا ہوا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ یہاں کولڈ ڈرنک پینے کیوں آتی ہے اور پھر یہی چھپا ہوا کونا کیوں چنتی ہے، جہاں بوسوں اور ہاتھوں کے لمس کو ہری بیلیں اپنے خواب ناک جال سے ڈھک لیتی ہیں۔

ان غیرملکیوں کا قد کتنا اونچا ہے۔ سب اونٹ کی طرح اونچے، شانے ذرا جھکے ہوئے۔ گریبان بے پروائی سے چاک، چہرے پر بچکانا بے فکری اور آنکھوں میں کھلنڈرا پن، سیّاحوں والا تجسس، نہ اجنبیت، نہ بوکھلاہٹ، جیسے یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ جھلملاہٹ، یہ فضا، یہ سرگوشیاں، آنکھوں کی گردش اور دلوں کی دھڑکن، ساری بیداری، ساری روشنی، سارا اندھیرا، ساری نیند ــــ جیسے یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ ان کو کچھ جاننا نہیں، انھیں کچھ سیکھنا نہیں۔ ایسے لوگ کہاں سے آتے ہیں، جنھیں کوئی چیز حیرت میں نہیں ڈالتی۔ کوئی چیز چونکاتی نہیں۔ یہ لوگ غیرملکی ٹورسٹ کہلاتے ہیں۔ بڑے بے تکلف لوگ ہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کیمرے ہیں۔ اسٹل مووی کیمرے اور دوربین ــــ یہ لوگ کیا

دیکھنے آتے ہیں، کتنی دور تک دیکھنے آتے ہیں۔ ان کی دوربین میں وہ بات نہیں جو میرے دل کی دوربین میں ہے اور یہی ایک بات ایسی ہے جس سے یہ بے خبر ہیں اور مجھے ان کی یہ بے خبری پسند ہے کیونکہ مجھے ہر وہ چیز پسند ہے جو اوروں کو احمق اور مجھے دور اندیش ثابت کرتی ہے۔

"مجھے یہ جگہ صرف اس لیے پسند ہے کہ یہ دوسری جگہوں سے مختلف ہے۔ الگ، انوکھی اور پُراسرار۔" کالی داڑھی اور کالے چہرے والا مصوّر، ہنگرین باورچی کا پکایا ہوا مزیدار سوپ پیتے ہوئے کچھ فراری انداز میں کہتا ہے۔

"ہنگرین باورچی کتنا اچھا سوپ پکاتے ہیں۔"

"اور گولاش، چکن گولاش؟" ڈراما نگار دوست، جو کچھ ہی دن پہلے امریکہ کی سیاحی کرکے لوٹا ہے، اپنے دل کش چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اور پائپ سے ہتھیلی کو ٹھونکتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہنگرین معزز قوم ہے، لیکن یہ امریکی ——— مائی گاڈ بدمذاقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"تم بڑے نمک حرام ہو، بے چاروں نے نہ جانے کتنے ڈالر تم پر بہادئے اور تم ہو کہ . . . . ." مصوّر رک جاتا ہے اور سوپ کا چمچہ ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔

"ایک بات سنو۔ میں ایک بہت بڑی تھیٹر تحریک چلانے والا ہوں"

"چلا بھی چکو۔"

"تم کیا پینٹ کر رہے ہو؟"

"Hollowness of man! یعنی کھوکھلا انسان!"

"تم سلف پورٹریٹ کے چکر سے کبھی نکلو گے بھی ——— ؟"

"ہر Creative کام میں فن کار کا "سلف" موجود ہوتا ہے۔ کیا تمھارے ڈراموں میں "سلف" نہیں ہے ———"

"میں مانتا ہوں ——— لیکن میں نے اب تک ڈراما لکھا کب ہے؟ میرا مطلب ہے "Real drama" اس کی آواز پُراسرار ہو جاتی ہے۔ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تو ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا . . . . ."

"اقبال میں کامن سنس کی کمی تھی۔"

"اقبال کامن ویلتھ کا ممبر نہیں تھا۔"

"اچھا امریکہ میں اپنے تجربے کے بارے میں بتاؤ ———" مصوّر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اس کے آگے سے سوپ کی بھری پلیٹ کھسکالی جاتی ہے۔ بیرا چمکتے ہوئے قاب سے چکن گولاش کے ٹکڑے نکال کر اس کی پلیٹ میں ڈالتا ہے۔ مصوّر سوچ رہا ہے۔ "بڑا ایڈیٹ ہے۔ ابھی میں نے سوپ ختم نہیں کیا تھا اور پلیٹ اُٹھا لے گیا۔" وہ ڈراما نگار کو جھلّائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے۔ "کچھ مزیدار باتیں سُناؤ۔"

"مزے دار باتیں! تجربہ؟" ڈراما نگار دُہراتا ہے۔ "میرے تجربے، تمھارے تجربے سے مختلف ہیں۔"

"انسان مختلف ہوں گے تو ظاہر ہے تجربے بھی مختلف ہوں گے۔ وہ آزاد افراد کا ملک ہے۔" وہ گولاش کا بڑا سا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتا ہے اور کانٹے کو دھمکی کے انداز میں ہلاتا ہے۔

"میں ملک سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میں چند افراد سے مل کر چلا آیا۔"

"لیکن امریکی قوم ———"

"امریکی قوم؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ قوم ہوتی ہی نہیں امریکہ میں۔ امریکہ تو آزاد افراد کا ملک ہے۔ عرب میں

اونٹ نہیں ہوتا اور امریکہ میں قوم نہیں ہوتی - دونوں بڑے اچھے ہیں۔"

مصوّر کھسیانی ہنسی ہنستا ہے - ڈراما نگار کے جبڑے اور اُبھرنے لگتے ہیں۔ آنکھوں سے عجیب سی بے اطمینانی جھانکنے لگتی ہے۔ اور وہ کھانا کھاتے کھاتے بڑی بیزاری کے ساتھ سر دُھنتا ہے۔

ایک لڑکی ملی تھی - آئرش نسل کی تھی - میرے ہی ہوٹل میں اس کا قیام تھا - خوب صورت وو بصورت نہیں تھی۔ جوان تھی — جوانی میں تو کتیا بھی حسین لگتی ہے۔ میں اس کو تھیٹر وٹیر لے گیا - ایک آدھ بار دریا وریا کی سیر ساتھ کی۔ کافی فلرٹ کر چکا تو میں نے سوچا —— آدم بر سر مطلب - لیکن اس نے میرا مطلب سمجھنے سے انکار کر دیا - تم جانتے ہو، تمھاری طرح میں بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں - میں جانتا ہوں لڑکیاں ایسے موقع پر مطلب سمجھنے سے انکار کر دیتی ہیں - سو میں نے ...... لیکن میں جانتا ہوں وہ لڑکی اتنی بے وقوف تھی —— بالکل بتاشہ مارکہ —— ہندوستانی لڑکیوں کی طرح رونے لگی - میں نے اس کو چاکلیٹ پیش کیا تب جاکر چپ ہوئی اور مسکرائی - میں نے ہندوستانی فلم والا نسخہ استعمال کیا - جھٹ اس کو اپنی بہن بنا لیا - اور جب میں نے اس کو بہن بنا لیا تو وہ رات کو میرے کمرے میں آئی اور اس نے مجھے Rape کیا - میرے ضمیر پر عجب بوجھ ہے۔"

مصوّر قہقہے مارتا ہے اور نیپ کن سے منہ پونچھ لیتا ہے "Really?"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"اتنے کامن پلیس تجربے کے لیے امریکہ جانے کی کیا ضرورت تھی - یہ تو یہاں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔" اس کے کندھے اُچک رہے ہیں اور مارے ہنسی کے آنکھیں بھیگ رہی ہیں -

"I, can imagine your face while being raped"

"یہ میرا چہرہ نہیں، تمھارا چہرہ ہے۔ تم سلف پورٹریٹ بناؤ - مانگے کے چہرے سے کام نہیں چلتا - ہر فن کار کے Creative کام میں اس کا اپنا چہرہ ہوتا ہے۔"

"چہرہ نہیں دل۔"

"دل ایک پمپنگ مشین ہے۔ جو پورے جسم میں خون دوڑاتی ہے۔"

"خفا نہ ہو —— تم جانتے ہو، میں تم پر جان دیتا ہوں۔" مصوّر کے کندھے پھر اُچکنے لگے ہیں - وہ پھر نیپ کن منہ پر رکھ لیتا ہے - "میں تمھارا چہرہ دیکھ رہا ہوں، اور اس لڑکی کا بھی —— اس آئرش لڑکی کا ——"

"شٹ اپ ...... اس قسم کی کوئی آئرش لڑکی نہیں تھی اور نہ اس قسم کا تجربہ ہوا - واحد یادگار تجربہ یہ ہے کہ مجھے ایک ریستوران سے صرف اس لیے نکال دیا گیا کہ میرا رنگ کالا ہے۔"

"سانولا۔"

"شٹ اپ ..... مذاق نہیں ہے - ایک کالی قوم کی عزّت کا سوال ہے۔"

میری آنکھوں میں نیند ہے - مجھے جماہی آ رہی ہے - مغربی تہذیب کے خوش لباس پتلے بھی تھک گئے ہیں - جیسے جیسے رات بھیگتی ہے تھکن گہری ہوتی جاتی ہے - ڈراما نگار اور مصوّر ایک دوسرے کی "ٹانگ" لے لے کر تھک چکے ہیں - انھیں بل کا انتظار ہے - ڈراما نگار آنکھیں بند کیے کیے پوچھتا ہے ——

"بائی دی وے، تمھاری معشوقہ کہاں ہے؟"

"کہیں ہوگی —— بائی دی وے۔"

سیّاح خوش ہیں - انھیں کھانا اچھا ملا ہے - شراب وہ باہر سے پی آئے ہیں - انھیں بیروں کی وردی بہت اچھی لگتی ہے۔

راجپوتی سپاہیوں کا لباس ہے۔ اس لباس میں رانا پرتاپ نے اکبر کی فوجوں کے چھکّے چھڑائے تھے۔

ان سیاحوں کا خیال یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی ان روایتوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان روایتوں میں مشرقی روحانی اقت چھپی ہوئی ہے —— تیاگ اور سنیاس کا سارا فلسفہ —— اگر یہ ملک بھی امریکہ کی طرح صنعتی ملک بن گیا تو بیروں سے نا پرتاپ کا یہ لباس چھن جائے گا۔ عورتیں ساڑھی پہننا چھوڑ دیں گی۔ سیتا اور دروپدی کی پاکی کے افسانے بھلا دیے جائیں ے۔ ان سے وقت کی یہ فراوانی چھن جائے گی۔ پھر گوتم بدھ کا یہ ملک بھی ستیہ اور اہنسا کے کلچر اور بھائی چارے کے اپدیش کے بائے مشین کے پرزے ایکسپورٹ کرنے لگے گا۔ پھر یہ امریکی اپنا ایکسپورٹ مال لے کر کہاں کہاں مارے پھریں گے۔ پھر وہ لوگوں وجلیبیاں کھاتے اور بلم برچھے سے لیس ہو کر چکن گولاش serve کرتے کہاں دیکھیں گے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ سیاح۔ یہ جہانیانِ ہاں گشت۔ مجھے نیند آ رہی ہے اور یہ غیر ملکی ہیں کہ جا نہیں چکتے۔ دوسرے کونے میں شادی والی پارٹی۔ یہاں سے نکلنے کا نام ہیں لے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ان کے کان پکڑ دوں اور مارواڑی نوجوان سے کہوں۔ "بیٹا شادی کی راتیں مولاں روژ میں یٹھ کر گولڈ کنٹرول کے قانون پر فضول باتیں کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ تم صرف پگھلتی ہوئی آئس کریم دیکھ رہے ہو اور یہ ہیں جانتے کہ گھر میں جلتی ہوئی شمع کی لو کتنی تیز ہے۔ عورت بھی پگھلتی ہے بھائی۔ عورت بھی۔ مارواڑی نوجوان کے سونے کے انت بھی آئس کریم کھاتے کھاتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہے۔ مدھم دھنیں ر ودیوار سے کہہ رہی ہیں۔ رات بھیگ رہی ہے۔

کچن میں اب بھی پتیلیوں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ہندوستانی باورچی جس کا سر گنجا ہے، لیکن جس کے بازوؤں، شانوں اور سینے پر گھنے بال ہیں اور پیشانی پر ان گنت شکنیں۔ گول ہرے پائے سے لگا بھاپ کی تہوں کو مٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ ہنگرین اس کی مچی ہوئی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ہندوستانی باورچی اس سے بیزار ہے۔ لیکن اس وقت ہندوستانی باورچی یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے اتنا پوچھ رہا ہے۔ "کیا چکن گولاش، روغن جوش اور نرگسی کوفتے سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے؟ کیا میری پکائی ہوئی شیرول کا کوئی جواب ہے اس ہنگرین کے پاس؟ عجیب زمانہ ہے۔ سب ہی باہر کے مال پر جان دیتے ہیں۔ چکن گولاش ہو، فلم ہو یا لباس، ہر چیز باہر کی اچھی ہوتی ہے۔ بڑا نام ہے مولاں روژ کا ہنگرین جو کھانا پکاتا ہے یہاں۔ میں چلا جاؤں گا گے لارڈ، پارک یا اشوکا میں۔ کچن ہر جگہ چھواڑے میں ہوتا ہے۔ کہیں کچن ٹھنڈا نہیں رہتا۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کے مسالوں کی بو بسی ہوتی ہے۔ ہر جگہ وہی ہلدی، پیاز، وہی ادرک، وہی دارچینی، وہی ...... —— میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہنگرین کے بچے یہ بو ہمیں تجھے مبارک۔ یہ پرچھائیاں —— یہ تیرتے ہوئے خواب، بند ہوتی ہوئی آنکھیں، بندر کے منہ کی طرح کھلے ہوئے منہ، ریچھ کی طرح ہلتے ہوئے جسم، —— یہ سب تجھے مبارک ہو۔"

میرا مالک اپنے خاص وقت پر آ گیا ہے۔ اس کی آنکھیں نشے سے سوجی ہوئی ہیں۔ لمبے بال کانوں پر جھول رہے ہیں۔ ٹیری لین کا سوٹ اس کے گورے چہرے پر عجیب سی دمک پیدا کر رہا ہے۔ اس کا بدن دن بدن زیادہ بھاری ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ پیرس سے آیا تھا اور اس نے مجھے نئی زندگی بخشی تھی تو اس کا بدن کتنا چھریرا تھا۔ آنکھوں میں کیسی ذہانت اور باتوں میں کیسی شوخی، اب یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑا فکر مند آدمی ہے۔ بمبئی اور کلکتے کی شاخوں کی فکر اسے گھن کی طرح کھائے جاتی ہے۔ اس کے دونوں بھائی اور پارٹنر بڑے عیاش نکلے۔ ایکٹرسوں کا چکر، فلمی دنیا کا چکر، اس طرح کی کوئی ذمے داری نہیں ——

بیوی بچوں کے لیے کتنا اچھا بنگلہ ہے نئی کالونی میں۔ ان کے لیے زندگی کی تمام سہولتیں ہیں۔ ایک نہیں دو کاریں ہیں۔

بنگلے کے لان میں جھولے اور گلاب ذار ہیں۔ بیوی ایک نہیں، دو دو کلب کی ممبر ہے۔ پورے وقت وہ گھر کا خیال کرتا ہے، اسے کہتے آئیڈیل وائف ـــــ شام، ہاں شام کی بات اور ہے۔ وہ تو بزنس کا گر ہے۔ مجبوری ہے۔ شراب پیتا ہے لیکن بہکتا نہیں۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ہونٹ سوج جاتے ہیں اور آواز بھرّا جاتی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اس کی زندگی کا بس ایک چھوٹا سا حصہ ہے، جو اس کا اپنا ہے۔ ایسپریسو مشین ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ مارواڑی گروپ پبلک سکٹر پر بحث کر کے کھسک چکا ہے لیکن دو چہروں کے اوپر لٹکتے ہوئے پیلے اور سرخ شیڈ اب بھی روشن ہیں۔

میرا مالک پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس کی کنپٹیاں سنسنا رہی ہیں۔ اب وہ لمحہ آ گیا ہے جب میرا کردار بدل جاتا ہے۔ جب میں ہرجائی نہیں رہتا۔ جب میں صرف اس کا ہو جاتا ہوں، اپنے مالک کا ـــــ وہ ہوتا ہے اور اس کے پارٹنر کی بیوی ہوتی ہے۔ اس کا پارٹنر کلکتے میں ہے۔ لیکن اس کی بیوی میرے مالک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دونوں جب اوپر والے کمرے میں ـــــ میرے دل کے سناٹے میں رات گئے ملتے ہیں دونوں ایک دوسرے سے ایک ہی سوال کرتے ہیں: "ہم دونوں ایک دوسرے کو شروع ہی سے کیوں نہ مل گئے؟" تھوڑی دیر کے بعد میرے مالک کو اپنی بیوی کی شروع شروع کی بات یاد آتی ہے۔ "اگر ہم ایک دوسرے کو نہ ملتے تو؟" میرا مالک آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنے پارٹنر کی بیوی کے سینے میں منہ چھپا لیتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"یہ کب تک چلے گا؟ کب تک؟"

اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب صرف وقت دے گا۔ وقت ہی واحد دانا ہے، جس کی جھولی میں ہر سوال کا جواب ہے اور وقت خوب جانتا ہے کس سوال کا جواب کب دینا چاہیے۔

میرا مالک کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرزتی ہیں، جس طرح طوفان میں درختوں کو جھرجھری آتی ہے۔

"یہ کب جائیں گے؟" منیجر کرسی سے اٹھ جاتا ہے۔

"کیا میں ان سے کہہ دوں۔ جائیے۔" مالک کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ دونوں کونوں کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں شیڈ روشن ہیں اور تھکی ہوئی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

ایک کونے میں سنجوگتا اور رنجیت ہیں۔ یہ دونوں آج تیسری بار آئے ہیں۔ میرے یہاں پناہ لینے۔ دوسری طرف نوجوان فوجی افسر ہے۔ وہ اپنی وردی میں بڑا بانکا اور سجیلا نظر آ رہا ہے۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ رنگ گندمی ہے۔ چہرے کے نقوش میں بڑا المناک سا تیکھا پن ہے۔

فوجی افسر تین گھنٹے سے بیٹھا لڑکی سے باتیں کر رہا ہے۔ لڑکی کا پتلا چہرہ بار بار رنگ بدل رہا ہے۔ اس دھندلکے میں بھی اس کے چہرے کی تھکن دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طرح کی شکست کا رنگ، سب کچھ کہہ بیٹھنے کی کیفیت۔ بڑی بڑی پیاسی اور خوف زدہ آنکھیں۔ آنکھیں جتنی جلدی اٹھتی ہیں، اتنی ہی جلدی جھک جاتی ہیں۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں جسم میں بار بار جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ میں اس لڑکی کے بھنچے ہوئے ہونٹوں اور اس نوجوان افسر کی بپھری ہوئی آنکھوں سے بہت ڈر رہا ہوں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ نہ جانے ......

دوسرے کونے میں شیڈ جلتا ہے اور بجھتا ہے، بجھتا ہے اور جلتا ہے۔

"رنجیت بس بہت ہو گیا۔ یہ ڈرامہ ختم کرو۔ صبح سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

"تو کیا اب تم ملو گی نہیں؟" لگتا ہے رنجیت کے سینے میں بندوق کی گولی پیوست ہو گئی ہے۔

"ملوں گی کیوں نہیں؟" سنجوگتا کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہے۔ "بھوکا! بیوقوف!" وہ پرس اُٹھاتی ہے اور اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ چند قدم دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور پلٹ کر دیکھتی ہے۔ رنجیت زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے فیصلہ کر رہا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ ایک ہی لمحے کے اندر خیالوں کے کئی ریلے اسے مخالف سمتوں میں لے جاتے ہیں۔ "یہ مجھ سے کھیل رہی ہے۔ بلی چوہے سے کھیل رہی ہے۔ میں چوہا ہوں، سچ مچ چوہا ہوں۔"

"Rat poison is the best way out"

وہ اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ سنجوگتا کے پیچھے چلتا ہے۔ "اب میں مولاں روڈز میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ سنجوگتا اور مولاں روڈز رہیں گے۔ مولاں روڈز وہی ہوگا۔ سنجوگتا وہی ہوگی۔ ہاں سنجوگتا کے ساتھ کوئی اور ہوگا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے ٹھیکیدار دولت سے بے ہودگیاں وہی ہوں گی۔ انٹیلکچوئل اسی طرح اپنی بڑائی ہانکیں گے۔ ڈپلومیٹ اسی طرح اپنا الّو سیدھا کرتے رہیں گے اور بین الاقوامی ایجنٹوں کے کمر میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے۔ نئی نئی فلموں پر بحثیں ہوں گی۔ کسی کی آنکھوں کی تعریف ہوگی۔ کسی کے قد و قامت کا ذکر ہوگا۔ گلاس چھلکیں گے۔ آنکھیں چھلکیں گی۔ سب کچھ ہوگا۔ میں نہ ہوں گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کل میں نہ ہوں گا۔ چاند ہوگا، آسمان ہوگا اور میں نہ ہوں گا۔ ریٹ پوائزن۔ کتنا عجیب انجام۔" دروازہ کھلتا ہے اور اُلّو کی آنکھیں اب دکھائی نہیں دیتیں۔ کیونکہ اب کاؤنٹر کے پاس مینیجر کے سر پر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ ہے یا دور کونے میں، ہری بیلوں سے پرے فوجی افسر کی میز پر۔

"تو کیا وہ سب جھوٹ تھا۔ جو تم نے نینی تال میں کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا میں نے؟" لڑکی کی نرم آواز خود لڑکی کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔

"دیکھو آج کی رات بڑی خطرناک رات ہے۔ فیصلے کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ محاذ ——— محاذ ——— محاذ"

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کہو کہہ دوں؟"

"نہیں۔ نہیں ——— وہ کہو جو تمہارا دل کہتا ہے۔"

"تو ایک بار پھر دُہراؤں جو کچھ میں تین گھنٹے سے کہتی آ رہی ہوں۔" لڑکی کی آنکھیں ستاروں بھرے آسمان کی طرح پھیل جاتی ہیں۔

"ہاں۔ آخری بار۔ رات بڑی خطرناک ہے۔ یہ زندگی اور موت کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت سے نہیں۔ تمہاری باتیں سننے کے بعد میں زندگی سے ڈر رہا ہوں۔ زندگی سے، اپنے آپ سے ——" فوجی افسر کا نوجوان چہرہ زرد ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں۔ خون کی پیاسی۔ محاذ پر جانے والی آنکھیں۔

"وہ سب جھوٹ نہیں تھا لیکن فیلنگ بدل بھی سکتی ہے۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے۔ میں تم کو خوش نہیں کر سکتی۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے نینی تال میں سچ کہا تھا۔ اور اب اس وقت مولاں روڈز میں بھی سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے یاد ہے۔ جھیل میں ستارے تیر رہے تھے، درختوں کے دھندلے سائے ہمیں بلا رہے تھے اور تم میرے کانوں میں کہہ رہی تھیں ——— "اگر ہم دونوں اس وقت ستاروں بھری جھیل میں ڈوب جائیں تو . . . . . میں نے تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور کہا تھا ہم جئیں گے۔ اسی جھیل کی طرح ستاروں کی چھاؤں میں ——— کتنی رومانی باتیں تھیں۔ میں فوجی آدمی ہوں، لیکن مجھے بھی لگ رہا تھا کہ میں شاعر ہوں۔ میں گنگنا سکتا ہوں، گا سکتا ہوں۔"

"لیکن وہ سب ختم ہو چکا ہے۔" لڑکی زخمی پرندے کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہے۔

"بھول جاؤ ——— نئی زندگی شروع کرو۔"

"نئی زندگی؟" نوجوان افسر دانت پیس کر کہتا ہے۔ "کیوں کہ فیلنگ بدل گئی ہے؟" لڑکی سر ہلاتی ہے۔ اس کی آنکھیں

ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔

وہ کاؤنٹر کے پاس مالک بپھر رہا ہے۔ اس کا ڈرائیور پارٹنر کی بیوی کو لے کر نہیں لوٹا ہے۔ وہ سر دھنتا ہے "فوجی افسر سے کہنا ہی پڑے گا۔ ساڑھے بارہ بج رہے ہیں ــــــ"

فوجی افسر اٹھتا ہے۔ "اچھا چلیں!" وہ کرسی ہٹاتا ہے۔ لڑکی کے لیے جھک کر راستہ بناتا ہے۔ لڑکی خوف زدہ اور محبت بھری آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ کوئی طاقت اسے اُٹھنے سے روک رہی ہے۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے دُھندلی پرچھائیوں کو دیکھتی ہے۔ "میں نہیں جانتی مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں اس سے نہیں تو کس سے محبت کرتی ہوں؟ یہ محاذ پر جا رہا ہے ــــ بے چارا۔ محبت کا مارا، شہید ــــ کل میں ہوائی اڈّے پر اس سے ملوں گی اور بتا دوں گی۔ سب بتا دوں گی۔ میں تیواری کے عشق میں گرفتار نہیں ہوں۔ میں لندن سے لوٹ کر آؤں گی تو۔ محاذ پر کچھ نہ ہو ــــ کاش محاذ پر کچھ نہ ہو ــــ"

فوجی افسر اب بھی سر جھکائے اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ لڑکی اُٹھتی ہے۔ اس کا ترشا ہوا، گدرایا ہوا جسم دیکھ کر تو میرے دل کی بھی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ فوجی افسر کے دل کو نینی تال کی جھیل اور ستاروں بھرے آسمان کو ــــ

لڑکی فوجی افسر کے بازو کو چھوتی ہوئی اس سے آگے بڑھتی ہے اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے نکلتی ہے۔ فوجی افسر وہیں کھڑا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے خول سے ریوالور نکالتا ہے اور ایک، دو، تین ــــ تین گولیاں، لڑکی کی گردن، شانے اور کمر میں ٹھنڈی کر دیتا ہے۔ تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ ــــ اور پھر سناٹا ــــ

میں خاموش ہوں ــــ میں سب دیکھ رہا ہوں ــــ لڑکی تلملاتی ہے۔ مڑنا چاہتی ہے لیکن چکرا کر اسی کرسی پر گرتی ہے جس پر دوپہر کو سردارنی بیٹھی چار کورس کا کھانا کھا رہی تھی۔ جس کے سینڈل کی نوک کے نیچے ایک عورت کی ہڈیاں دفن ہیں۔ بس چند فٹ نیچے ــــ

مالک پیچھے ہٹتا ہے ــــ آگے بڑھتا ہے، چکراتا ہے۔ منیجر دروازہ کھول کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سارے بیرے اور کچن والے ایسپریسو مشین کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہیں آتا تو صرف ہنگرین نہیں آتا۔ وہ ایسی تڑاخ تڑاخ بہت سن چکا ہے۔ یکایک مالک چیختا ہے۔

"روشنی! روشنی!"

کوئی سوئچ بورڈ کی طرف دوڑ رہا ہے۔

اور میں سکتے اور اضطراب کے اس لمحے میں دیکھتا ہوں۔ نوجوان آہستہ آہستہ اپنا ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھتا ہے۔ جس کی نال سے اب تک دھواں نکل رہا ہے۔ میرا دل پکارتا ہے۔ اس دیوانے کو روکو! لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ ہو کر رہے گا میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ تڑاخ ــــ!

میرا مالک اور سب اتنے خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے ہیں کہ اس "تڑاخ" کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ سب لڑکی کی لاش پر جھکے ہوئے ہیں۔ لڑکی کی ہتھیلیاں کھلی ہوئی ہیں اور آنکھیں بھی۔ بالوں کے کانٹے فرش پر بکھر گئے ہیں۔ پرس مالک کے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ لڑکی کے ہونٹ مسکرا رہے ہیں۔ پوری شام میں پہلی بار اس کی ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔

رات، پولیس، گواہیاں، لاشیں، خون!

آسمان پر صبح کے تارے جھلملا رہے ہیں۔ بیک یارڈ میں سارے بیرے، ڈرائیور، مستری، کاریگر سب جاگ رہے ہیں۔ سب چپ ہیں۔ رات کی طرح۔

دروازے پر پولیس کا پہرہ ہے اور اندر مالک آسیب کی طرح فرش پر بھٹک رہا ہے۔

"صاحب میں سارے میں ڈھونڈھ آیا۔ میم صاحب کہیں نہیں ہیں۔" ڈرائیور کانپ گیا۔

"Go to Hell" مالک پیر پٹکتا ہے۔

آسمان سے تاروں کی راکھ برس رہی ہے اور بجھے پر ہنگرین گا رہا ہے۔

میں نے بہت دیکھا ہے خون،
دلوں کا، محبتوں کا، خوابوں کا،
ایک دل اور سہی،
ایک محبت اور سہی،
ایک خواب اور سہی،

اُکھڑے ہُوئے لوگ

ـــــــ رام لعل

صبح کی پہلی گاڑی سے میں چنڈی گڑھ پہنچ گئی تھی۔ اس وقت چھ بجے تھے۔ لیکن سردیوں میں تو چھ بجے تک شمال کے ہر شہر میں خاصا اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ وہ صبح خاصی کہر آلود تھی۔ دسمبر کی آخری صبح۔ میں لمبے کوٹ کے نیچے ایک نیلا کارڈیگن بھی پہنے ہوئے تھی اور سر پر ایک ریشمی پھول دار اسکارف باندھ رکھا تھا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو حیران رہ گئی۔ میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی! لیکن میں حقیقت میں چالیس سے بہت آگے نکل آئی ہوں۔ لوگوں نے بڑے اشتیاق سے میری طرف دیکھا تو میں دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ مردوں کی ہی ایسی نظر ایک عورت کو خوشی اور خود اعتمادی کا احساس دے دیتی ہے۔ لیکن اس وقت میں قطعی دوسرے موڈ میں تھی۔

ویٹنگ روم میں جاکر چائے منگائی۔ اس وقت وہاں چائے پینے والی تنہا میں ہی تھی، ایک جنرل ویٹنگ روم ہے جو مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُجالا ہونے تک مجھے بہرحال وہاں بیٹھنا پڑا۔ سبھی مسافروں کو میری طرح دوسری بس سے شہر جانا تھا۔ وہاں ٹیکسیاں بہت مہنگی ہیں۔ ٹھیک ہے، بس کے روانہ ہونے تک دھوپ نکل آئے گی۔ ٹھٹھرن اور کہرا بھی کم ہو جائے گا۔

لیکن میں وہاں ایک ہی گھنٹہ بیٹھ کر بور ہو گئی۔ اٹیچی اٹھا کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی کئی ٹیکسی ڈرائیور میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان سے پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ میں اس قدر سویرے سترہ نمبر سیکٹر میں جانے کے لیے تیار نہیں تھی، لیکن یونیورسٹی کے ایک اسٹوڈنٹ نے جو انہی ڈرائیوروں میں گھر گیا تھا، مجھے اسکوٹر رکشا میں پارٹنر بنانے کی پیش کش کر دی تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح میں صرف ایک روپیہ میں اپنی بیٹی کے گھر سے تھوڑی دُور مین روڈ تک پہنچ گئی۔ اس وقت بھی کہرا چھایا ہوا تھا۔ دھوپ نکلنے کی کوئی اُمید نہیں تھی، کیوں کہ آسمان پر بادل آگئے تھے۔

اچانک مجھے یاد آیا، وہ ناول تو میں ویٹنگ روم میں ہی چھوڑ آئی ہوں جسے میں نے بریلی اسٹیشن پر اسٹال سے خریدا تھا۔ ناول نے راستے بھر ایک اچھے دوست کی طرح ساتھ دیا تھا۔ ایک چوتھائی پڑھنا باقی رہ گیا تھا۔ اسی نے مجھے افسردگی سے بھی دُور رکھا تھا رات بھر۔

میں تو چنڈی گڑھ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بار بار بھسین صاحب سے کہا تھا ـــــــ "آپ ہی جائیے نا!" لیکن انھوں نے اپنے بزنس، انکم ٹیکس کی تاریخ، اور نہ جانے کون کون سی مصروفیات کی پوری فہرست سُنا دی۔ لیکن میں خوب سمجھتی تھی وہ اتنے سنجیدہ ماحول میں جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ وہ ہیں بھی بے حد حساس! ایسا آدمی اس قسم کی سچویشن کا مقابلہ کیوں کر کرے گا، جس میں اس کے داماد نے اچانک ایک دوسری عورت کے ساتھ سمبندھ جوڑ لیا ہو! اور اس کی بیٹی نے اپنے ماں باپ کو ایک لمبے خط میں سارا دکھڑا لکھ بھیجا ہو وہاں تو کسی سخت یا ذہین آدمی کی ضرورت تھی، جو اس معاملے کو سلجھا بھی سکتا! میں بھسین صاحب کے

ساتھ اس بات پر پوری طرح متفق تھی کہ ہمارے پریوار میں اس قابلیت کا آدمی ایک بھی نہیں ہے لیکن اتنے گمبھیر معاملے میں کسی دوسرے پر بھروسا کیا بھی کیسے جاسکتا تھا؟ رشتے دار یا بعض دوست کتنے بھی قریب کیوں نہ ہوں، کوئی بھی اپنے آپ کو پوری دیانت داری سے انوالو نہیں کرتا ہے - معاملے کو سنوارتا کم، بگاڑتا زیادہ ہے! اسی لیے میں نے اپنے خاوند کا یہ مشورہ قبول نہ کیا کہ اشوک کو راہِ راست پر لے آنے کے لیے ہمارے فیملی فرینڈ ڈاکٹر سہگل یا پھوپھا جی کو وہاں بھیجا جائے - ان سے بہتر تو میں خود ثابت ہوسکتی تھی جس کا روم روم بیٹی کے درد میں ڈوبا ہوا تھا - لڑکی کب تک رو رو کر ہلکان ہوتی رہے گی -

شادی کے پانچ برس بعد وہ اس سنکٹ میں پھنسی تھی - سنکٹ کے لیے اگرچہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے - مرد کسی بھی لمحے دھوکا دے سکتا ہے! مرد عام طور پر گھر سے باہر کہیں نہ کہیں جھک مارہی آتا ہے، لیکن ایسا تو کوئی کوئی ہی ہوگا جو ایک خاصی چارمنگ وائف کی موجودگی میں بھی کسی دوسری عورت کو داشتہ بنالے!

اب میرا ہی آدمی ہے جو دیکھنے میں تو بڑا سیدھا سادہ ہے - دن رات اپنے ریڈیو کے دھندے میں مصروف رہتا ہے - اس نے تو میرے ساتھ بھی محبت دکھانے میں کبھی آزادی نہیں دکھائی! میرا مطلب ہے آدمی وقت بے وقت عورت کو کھینچ کر گلے لگا لیتا ہے - عورت کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوتا اور وہ اس کے ہونٹوں سے تھوڑی سی مٹھاس نوچ کر مسکراتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا ہے! ایسا کر گزرنے والا بچوں کی آنکھ بچا کر بھی کر گزرتا ہے اور عورت بے چاری ایک مصنوعی برہمی کے ساتھ اسے 'بے شرم بے شرم!' کہتی رہ جاتی ہے - میرا آدمی ایسی حرکت کبھی نہیں کرسکا - لیکن میں اس کے بارے میں پورے وشواس سے کہہ سکتی ہوں وہ سو فی صدی وفادار نہیں ہے لیکن اس بات کے لیے میں نے اس کے ساتھ کبھی جھگڑا نہیں کیا ہے - اس سے کبھی کچھ نہیں کہا - بس بڑی خاموشی سے اس کی حرکتوں اور ضرورتوں کا مقابلہ کیا ہے اور اسے ہر بار پہلے سے زیادہ محبت دینے کی کوشش کی ہے - اس کی خوشنودی کے لیے اپنی جان تک لڑا دینے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹی! محض اس نیت سے کہ وہ مجھ سے کبھی دور نہ ہوسکے! ایسا کر کے میں اپنے طور پر بے حد مطمئن بھی ہوجاتی ہوں - اب اس کے مستقل طور پر ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، کیونکہ اس نے میرے رہنے کے لیے اتنا خوبصورت اور آرام دہ مکان بنوایا ہے - میرا ہر طرح سے خیال بھی رکھتا ہے - خود کو میں خوش قسمت ترین عورتوں میں شمار کیوں نہ کروں؟ پاکستان سے آکر آخر کتنوں کو یہ عزت نصیب ہوئی ہے! ریڈیو بزنس میں ہاتھ ڈالتے ہی روپیہ پانی کی طرح بہتا ہوا سا آیا ہے - روپے کے ساتھ ساتھ پہلے ایک پرانا مکان بھی تھا گا ہے کسٹوڈین کے ذریعے - پھر اسی مکان کی نئی تعمیر بھی ہوئی - بچوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت بھی ملی اور ہم سب کو وہ ساری آسائشیں بھی ملیں جن کی متوسط طبقے میں کلپنا کی جاسکتی ہے! یہ الگ بات ہے کہ بھسین صاحب کبھی کبھی اموشنل ہو کر کہہ بیٹھتے ہیں "پتہ نہیں کیوں یہ سب مجھے اپنا نہیں لگتا! جیسے یہ سب الوژن ہو! میرا نہ ہو! میرا سب جو وہاں رہ گیا ہے وہی اب بھی میرے خوابوں میں آتا ہے - میں اب بھی کبھی کبھی وہاں اپنے بچپن کے دور میں جا پہنچتا ہوں - چھوٹی ہوئی گلیوں میں جا کر کھیلتا ہوں، اور کبھی کبھی اپنی سورگیہ ماں کو دیکھ کر اس کی گود میں سر رکھ دیتا ہوں!"

جو کچھ بھسین صاحب کہتے ہیں وہ نفسیاتی طور پر غلط تو نہیں ہے - اور بھی کئی ہیں جو اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن میں نے ایسا کبھی محسوس نہیں کیا - شاید اس لیے کہ وہاں کچھ سال ہی رہ پائی تھی! میرے ماں باپ تو سرحد کی اس اور کے تھے نا! جالندھر کے ——— اسی لیے میں اپنے خاوند کے ایسے جذباتی اُبال پر کبھی کبھی ہنس دیا کرتی ہوں - اس نے یہاں جس زمین کو میرے سامنے اپنی گاڑھی کمائی سے خریدا ہے، اس پر ڈبل اسٹوری عالی شان مکان بنوایا ہے اور اس پر اپنی سنگ مرمر کی نیم پلیٹ لگوا رکھی ہے، وہ جگہ بھلا اس کی اپنی کیسے نہیں ہے!

ہماری سروج جب کالج میں تھی وہ بھی اپنے باپ کے اس قسم کے اموشنل فٹ سے اوب کر کہہ اٹھتی تھی ——— ڈیڈی آپ بہت بور ہیں! اپنے پرانے شہر کا قصہ کیوں لے بیٹھتے ہیں! مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں ہے - بھئی ہم نے تو یہیں آکر ہوش سنبھالا ہے - ہم تو اسی شہر کے

ہیں "

یہ سن کر محسین صاحب سروج کو اور مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے- اداس بھی ہو جاتے - سوچنے سے رہ جاتے -ہم ن کی باتوں کا مطلب ٹھیک طرح سے کیوں نہیں سمجھ پاتے ! کبھی کبھی تو وہ ہمیں سچ مچ سمجھانے بھی بیٹھ جاتے' اپنے سوبھاؤ کے مطابق دنوں ہاتھوں سے ہوا میں ہی کچھ بنانے لگتے ------- "اس طرح کی ایک گلی تھی - اس کے آس پاس ایک بڑا گنجان محلہ - اس سے ملا ہوا بازار' اسکول' کالج ' میدان' کچہری' ڈاک خانہ اور ایک برادری نہیں پورا سماج - انہیں کے بیچ میں اپنا ایک گھر تھا۔ س گھر میں سچ مچ بڑا سکون تھا' جیسا کسی مضبوط قلعے میں ہی حاصل ہو سکتا ہے - سیکوریٹی کا احساس تو سمجھتے ہو ! ہم کسی جنگل میں باکر راتوں رات ایک چار دیواری بنا کر اس کے اندر پورے اطمینان سے کبھی نہیں رہ سکتے ! مجھے اپنا یہ گھر ایک جنگل کے اندر ہی بنایا والگتا ہے -تم لوگوں کو اس جنگل سے گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی ہوگی' کیونکہ تمہاری پرورش ہی اسی ماحول میں ہو رہی ہے -لیکن جس حساس کا شکار تمہارا باپ ہو رہا ہے اس سے اس کی اولاد کب تک آزاد رہ سکتی ہے ! مجھے یقین ہے تم بھی کبھی نہ کبھی ایسا ضرور محسوس روگے ! ٹھیک میری طرح نہ سہی کسی اور شکل میں بھی ایسا ہو سکتا ہے !"

سروج نے شادی ہو جانے کے بعد بڑے فخر سے ہمیں لکھا تھا ------- "ہم نے چنڈی گڑھ میں سترہ نمبر سیکٹر میں اپنا مکان بنوانا روع کر دیا ہے -سب لوگ باہر سے ہی آ کر بس رہے ہیں - پتہ نہیں ہمارے پڑوس میں کون آکر مکان بنواتا ہے ! ابھی تک تو دونوں طرف میدان خالی پڑے ہیں -ہم فی الحال تین ہی کمرے بنوا رہے ہیں - ایک کچن' ایک اسٹور اور ایک باتھ روم بھی -ایک چھوٹا گول برآمدہ بھی گا - برآمدے کے لیے ہمیں گڑھ مکتیشور کے موڑھے بھجوانے کا انتظام ضرور کر دیجیے - ان کے کناروں پر چمڑا بھی مڑھوائیے گا لیکن موڑھوں ہم پینٹ اپنی پسند کا ہی کرائیں گے !"

میں ان کے مکان میں صرف ایک مرتبہ پہلے گئی تھی - اب سے دو سال پہلے -جب اشوک اور سروج کا مارشل پیدا ہوا تھا - ان کے اتھ دو مہینے رہی تھی - اپنے ساتھ ان کی فرمائش کے مطابق چار موڑھے بھی لے گئی' جو برآمدے میں واقعی اچھے لگتے تھے - صبح صبح وہاں بیٹھ اشوک چائے پیتا ' اخبار پڑھتا - دوپہر میں دھوپ آجانے پر سروج وہیں بیٹھ کر کپڑے سیا کرتی - وہیں میں بھی اپنے ناتی کو گھٹنوں پر لٹا کر کی مالش کرتی تھی - شام ہونے لگتی اور اشوک کے دفتر سے لوٹنے کا سمے ہو جاتا تو سروج پھاٹک پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کیا کرتی - سڑک پر رتی ہوئی عورتوں کی طرف تکا بھی کرتی -کسی کسی کے ساتھ بات چیت بھی ہو جاتی تھی-

ان دو مہینوں میں رہ کر وہاں مجھے کئی باتیں پہلی مرتبہ معلوم ہوئی تھیں -سروج شادی کے بعد بہت لڑاکا ہو گئی تھی - بات بات پر اشوک ساتھ الجھ پڑتی - اس پر جا اور بے جا حکم بھی چلاتی - اگرچہ وہ بے چارہ بہت سا کام بنا کہے بھی کر دیتا تھا - اس پر بھی وہ اسے کام چور ہتی -لیکن اشوک پلٹ کر اسے کبھی کچھ نہ کہتا - اس کی ہر بات پر بس ہنس پڑتا - کبھی کبھی شکایت بھی کر دیتا تو اس انداز سے جیسے یہ بھی گھریلو ن نبھانے کی خاطر ہی کر رہا ہو ! ورنہ وہ پوری طرح مطمئن ہے - اسے اپنی خامیوں کا احساس ہے اور وہ واقعی کام چور بھی ہے -سروج جو کچھ ی ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے - اشوک کے رویّے سے میں بھی پوری طرح مطمئن تھی - وہ واقعی ایک محبت کرنے والا خاوند تھا - وج کو کبھی کبھی زچ بھی کر دیتا تھا - جب موقع پاتا اسے دبوچ کر بیٹھ جاتا - سروج گھر میں میری موجودگی کی دہائیاں دیتی رہ جاتی -میں باہر بیٹھی کی چیخیں سن کر دل ہی دل میں ہنستی جاتی - جب وہ اس کے چنگل سے آزاد ہو کر باہر بھاگ آتی تو اپنا لال بھبھوکا' جگہ جگہ دانتوں سے کاٹا ہوا رہ مجھ سے چھپاتی پھرتی -

اشوک کی ایسی بے پناہ محبت کے مقابلے میں سروج کی بد زبانی دیکھ کر میں نے اسے کئی بار ٹوکا بھی تھا لیکن اشوک ہی اسے کچھ کہنے سے ع کر دیتا اور میں اس کی اپنی بیوی کے تئیں ایسی پر جوش عقیدت دیکھ کر وہاں سے خوش خوش لوٹ آئی تھی - دو سال پہلے - مجھے وہ ڈیٹ ابھی ک یاد ہے' جب اشوک اور سروج اپنے مارشل کو ساتھ لیے مجھے سی آف کرنے اسٹیشن پر آئے تھے - ان دو برسوں میں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے !

اس بیچ میں سروج صرف ایک بار ہمارے پاس آئی تھی۔ اشوک کی بہت سی شکایتیں کرکے گئی تھی۔ وقت پر گھر نہیں لوٹتا۔ اپنے رشتہ داروں پر بہت جان چھڑکتا ہے۔ ان کی وقت بے وقت روپے پیسے سے مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ دوستوں کو گھر زیادہ بلاتا ہے۔ ان کی ناز برداریاں کرتے کرتے عاجز آجاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں ان کا ایک بھی دوست کام کا نہیں ہے! سب غرض کے بندے ہیں! اس شہر میں کوئی بھی کسی کا نہیں ہے!

لیکن میں نے سروج کی کسی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے سوبھاؤ سے واقف ہوں نا! بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اسے خوب آتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی ہی کی ہے۔ اس نے واپس جاکر مجھے کئی خط لکھے ہیں۔ ہر خط میں اشوک کی وہی شکایتیں لکھتی رہی ہے۔ لیکن پچھلے چند خطوں میں وہ سچ مچ بہت دکھی معلوم ہوئی ہے۔ اس نے رو رو کر لکھا ہے ——— "اب وہ میری بالکل پروا نہیں کرتے! کوئی عورت بھی رکھ لی ہے۔ اکثر اسی کے یہاں پڑے رہتے ہیں۔ یا تو آکر مجھے لے جائیے یا مجھے اجازت دیجیے کہ کپڑوں میں آگ لگا کر مر جاؤں!"

میں اپنے خیالوں میں ڈوبی ڈوبی مارکیٹ کے سامنے سے گزری جو ابھی بند تھی۔ پوری مارکیٹ میں میں ہی اکیلی چل رہی تھی۔ ابھی تک کوئی بھی ادھر سے نہیں گزرا تھا۔ شام کے وقت یہاں چلتے ہوئے کندھے چھلتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں آئی ہوں۔ مارشل، سروج، اشوک کسی کے لیے بھی نہیں۔ بہت جلدی میں نکلی تھی نا! بڑی پریشانی میں۔ سوچا اگر سب ٹھیک ہوا، وہیں سے خرید کر دے دوں گی۔ اشوک کو اس بار گرم سوٹ ہی دے دوں گی۔ اس کی پسند کا۔

میں نے رک کر ادھر اُدھر ایک دکان کو تلاش کیا۔ دو منزلہ فلیٹوں کے نیچے بڑی بڑی دکانوں کے بڑے پرکشش سائن بورڈ تھے۔ یہیں کہیں ایک بہت اچھی کپڑے کی دکان تھی۔ دو سال پہلے وہاں سے مارشل کے لیے کپڑے لیے تھے۔

میں آگے بڑھ گئی۔ نئی طرز کا سینما گھر اس وقت محو خواب تھا۔ یہاں ہم سب نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ ٹین کمانڈ منٹس! آگے پارک تھا۔ اس پار کے رہائشی مکانوں تک پہنچنے کے لیے میں پارک کے بیچوں بیچ پگ ڈنڈی پر سے ہو کر گزرنے لگی۔ ان ہی مکانوں کے پیچھے ایک گلی میں ان کا مکان ہے۔ مکانوں اور پارکوں کے یہ سلسلے بہت خوبصورت ہیں۔ فرانسیسی انجینئر جیسے کسی دوسری ہی دنیا سے یہ نیا نگر اپنی ہتھیلی پر اٹھائے آگیا! آڑے، ترچھے، بیضوی، تکونے، چوکور نقشے! ہر بلاک ایک نیا رنگ کا۔ ہر گھر سے نکلتے ہی ایک سیرگاہ کا آغاز۔ شاید دنیا میں ایسا اور کہیں بھی نہیں ہوتا! چیری، زرد مہر، یوکلپٹس کے پیڑوں کے طویل سلسلے۔ کچھ پیڑوں کے بدن پر لال لال انگاروں کے پیرہن ہیں۔ ان پیڑوں کے نیچے سے جانے والی سڑک پر بھی انگارے ہی بچھے ہیں۔ میں انگاروں پر بہت دھیرے دھیرے چلتی آئی ہوں ——— اُف آج میں کتنی اُداس ہوں!

چلتے چلتے میں نے اٹیچی دوسرے ہاتھ میں بدل لی۔ کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر کارڈیگن کے اوپر کے بٹن کھول دیے۔ دم گھٹتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں نے بہت سی تازہ ہوا اپنے اندر بھر لی۔ دور سے اسٹیشن کی طرف سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ شاید یہ وہی بس تھی جس سے مجھے آنا تھا۔ اچانک گلی کے موڑ پر ایک اسکوٹر میرے بالکل پاس آکر رک گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اشوک تھا۔ نائٹ کیپ لگائے، بدن پر چمڑے کی جیکٹ اور ڈرین پائپ۔ اس کی ذرا ذرا بڑھی ہوئی شیو۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان ایک سگریٹ پھنسی ہوئی۔

"ممی آپ!"

مجھے دیکھ کر وہ واقعی حیران نظر آیا۔

وہ اتنے سویرے سڑک پر کیوں گھوم رہا ہے؟ یقیناً اسے میری آمد کی کوئی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ اس کا رُخ بھی اپنے گھر کی اور ہے۔ یعنی وہ اسی عورت کے پاس سے لوٹ رہا ہے۔ میں سمجھ گئی، جیسا سروج نے لکھا تھا۔

چند لمحوں تک تو میں نے اسے کوئی جواب دینے سے خود کو روکے رکھا۔ اس کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ جب آدمی کسی بات کی شکایت

کرنے کے لیے بالکل حق بجانب ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر اچانک کافی جرأت بھی پیدا کرلیتا ہے۔ میں بھی پوری جرأت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری بیٹی میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو ان کا بدلہ لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟

"کیا سروج نے آپ کو لکھا تھا؟" وہ ابھی تک میری اچانک آمد کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

میں فوراً یہ فیصلہ کرلینے میں کامیاب ہوگئی، مجھے اشوک کے ساتھ وہ رویّہ ہرگز نہیں اپنانا چاہیے جس سے سروج کی پوری حمایت ظاہر ہو۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھا، پھر کہا ——— "میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں بیٹا۔ لیکن گھر جانے سے پہلے ہی۔ یہاں کھڑے ہوکر تو بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ کہیں چائے کی دکان نہیں کھلی ہے! میں چائے بھی پینا چاہتی ہوں۔ بہت سردی ہے نا!"

اشوک نے میرے ہاتھ سے اٹیچی لے لی اور کہا ——— "اچھا تو ممّی میرے پیچھے بیٹھ جائیے۔ ادھر بائیس میں ایک ریستوران بہت صبح کھل جاتا ہے وہیں چلتے ہیں۔"

بائیس سیکٹر میں ایک چھوٹا سا ریستوران واقعی کھل گیا تھا۔ ریستوران کا مالک خود ہی انگیٹھی سلگا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ ایک جھاڑن سے میز اور کرسیاں پونچھ دیں۔ میں نے اسے چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لے کر آنے کے لیے کہا۔ اشوک نے نئی سگریٹ سلگائی تو میں نے اس سے پوچھا ——— "تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟"

"ایکسکیوز می ممّی! تمہارے سامنے سموک کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے اجازت دے دو اب۔" وہ میز پر کہنیاں ٹیک کر مسکرایا۔ پھر سر سے کیپ اتار کر میز پر رکھ دی۔ سر کے چپکے ہوئے بال انگلیوں سے ٹھیک کرتے ہوئے بولا ——— "ممّی! تم کہنا کیا چاہتی تھیں؟"

میں پس و پیش میں پڑ گئی۔ میں ستائیس سال کے اس نوجوان کے سامنے بیٹھی ہوں، جو میرا داماد ہے۔ وہ شب بھر میری بیٹی کے ساتھ نہیں کسی دوسری عورت کے ساتھ سوتا رہا ہے۔ عورت مرد کا ایسا چہرہ تو ایک نظر میں پہچان جاتی ہے، جو صبح کی روشنی میں گزشتہ شب کا سارا قصہ کہہ ڈالتا ہے۔ یہ احساس کرکے مجھے ایک صدمہ سا محسوس ہوا۔ لیکن وہ کسی قسم کی ندامت نہیں دکھا رہا تھا۔ میں نے بھی اس پر سے اپنی نظریں ہٹائی نہیں۔ لیکن ایک شائستہ ضبط کے ساتھ اس سے کچھ کہنے کے لیے تیار ہوگئی۔ سچی سچی باتیں۔

"بیٹا! یہ تو مجھے معلوم ہے سروج بہت بد زبان واقع ہوئی ہے۔ تمہیں ہر وقت ٹوکتی رہتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار پہلے بھی سمجھایا ہے اب بھی ایسا کروں گی تمہارے سامنے اس کے ساتھ وہ کارکردوں گی کہ ——— لیکن پھر تم ہی میرا ہاتھ نہ روک لینا!"

میں پگھل کر رہ گئی۔ اندر ہی اندر پہلے سے ہی کافی پگھلی ہوئی تھی۔ اشوک مسکراتا رہا۔ اسی بیچ میں انڈے آگئے۔ ایک پلیٹ اس نے میرے سامنے سرکا دی ——— "ممّی تم بہت بھولی ہو۔ میرا خیال ہے دنیا کی بیشتر عورتیں تمہاری طرح بھولی ہوتی ہیں۔ میں نے تم سے یہ بات کی شکایت کب کی ہے کہ مجھے سروج کا زبان چلانا اچھا نہیں لگتا! وہ مجھ پر حکم بھی چلاتی ہے تو مجھے کبھی فیل نہیں ہوتا بلکہ خوشی ہی ہوتی ہے۔ کوئی عورت اس لہجے میں مجھ سے مخاطب تو ہوتی ہے!"

میں بھونچکا سی رہ گئی۔

"پھر ——— ؟ پھر سروج نے یہ سب کیوں لکھا!"

وہ زور سے ہنس پڑا۔ بولا ——— "میرا اور اس کا جھگڑا بالکل دوسری بات پر ہے، جس سے نہ وہ کانشس ہے اور نہ ہی تم سمجھ سکتی ہو ممّی!"

یہ کہہ کر اس نے چھیلے ہوئے انڈوں کے کئی ٹکڑے کر ڈالے، جن میں سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلنے لگی۔ اس نے ان پر نمک اور کالی مرچیں چھڑکیں۔ پھر ایک ٹکڑے کو کانٹے میں پھنسا کر کہا ——— "عورت مرد کا ایک ضروری انگ ہوتا ہے یعنی اس کی بہت بڑی ضرورت! لیکن مرد کے متواتر چوبیس گھنٹوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں! مجھے اپنے سیکس کے دوستوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا

زیادہ اچھا لگتا ہے۔ وہ اسی بات کے لیے کڑھتی رہتی ہے، حالانکہ میں باہر کی نسبت گھر پر کہیں زیادہ ٹائم گزارنے پر مجبور رہوں۔ رات کے آٹھ دس گھنٹے! صبح و شام کے بھی چار پانچ گھنٹے! یعنی کل ملا کر چودہ پندرہ گھنٹے تو اسی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔"

اسی بیچ میں میں نے پیالوں میں چائے انڈیل دی۔ ایک پیالہ اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا، کہا ———— "وہ میرے دوستوں کو پسند نہیں کرتی جن کے ساتھ قہقہے لگا کر میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ ٹھیک ہے، وہ سب کے سب خود غرض بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو لمحے پھر بھی ہم ساتھ گزار لیتے ہیں وہ ہم مردوں کے لیے بہترین لمحے ہوتے ہیں۔ پھر ہمیں کب یہاں ہمیشہ رہنا ہے! یہاں جی نہیں لگے گا تو کہیں اور چلے جائیں گے۔ مکان تو ہر وقت بک سکتا ہے۔ پہلے سے زیادہ ———— دوگنی چوگنی قیمت پر! جہاں جائیں گے ایک نیا مکان کھڑا کر لیں گے۔ روپیہ ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ مجھے تو بالکل اڈونچر سا لگتا ہے۔ خالص مردوں کا اڈونچر، جس میں بے پناہ خوشی بھری ہوئی ہے!"

میں منتظر تھی وہ اس موضوع کی طرف کب آتا ہے جس کے کارن مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔ اس کے لیے ایک اور پیالہ بنا کر میں نے پوچھا:

"کیا تم آج رات گھر پر رہے ہو؟"

میرے اس سوال کے لیے جیسے وہ بالکل تیار تھا۔ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ میں نے بھی یہ بات طنز سے مغلوب ہو کر نہیں پوچھی تھی بلکہ بہت نارمل ویسے ہیں۔ اس نے اسی بے تکلفی سے جواب دیا ———— "ممی! یہ تو ٹھیک ہے۔ اب میں کبھی کبھی رات کو گھر پر نہیں سوتا ہوں لیکن اس کی وجہ وہی ہے، سروج مجھ پر اپنا پورا قبضہ کیوں جمانا چاہتی ہے ————!"

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ چائے پینے لگا۔ میرے اندر بھی اچانک ایک طوفان اٹھتے اٹھتے تھم گیا۔ وہ اس قدر معصوم، سنجیدہ اور سچا نظر آیا کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا مجھے بالکل بے معنی سا لگا بلکہ بے انصافی پر ہی مبنی!

میں نے مسکرا کر پوچھا ———— "جس کے پاس تم جا کر سوتے ہو وہ نہیں ٹوکتی تمہیں ———— ؟ نہیں کہتی تم اسے چھوڑ کر کہیں اور مت جایا کرو!"

"نہیں ممی! وہ ایسی کوئی بات نہیں کہتی۔ میں دیر سے کیوں آیا ہوں! کبھی کبھی بالکل نہیں آتا! پھر کب آؤں گا! آؤں گا بھی یا نہیں! میرا جب جی چاہتا ہے وہاں چلا جاتا ہوں۔ لیکن اس نے جس دن مجھ پر پورا ادھیکار جمانے کی کوشش کی اسی دن اسے چھوڑ دوں گا!"

یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کہا ———— "ممی! مجھے دفتر بھی جانا ہے۔ ٹھیک دس بجے۔ صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ اب گھر چلیں!"

سروج نے مجھے اشوک کے اسکوٹر پر سے اترتے دیکھا تو وہ چپ سی رہ گئی۔ کچھ سمجھ نہ سکی۔ وہ مجھے کہاں مل گیا! سروج کے چہرے پر گذشتہ رات کی تنہائی کا کرب دکھائی دیا۔ وہ مجھ سے رو کر ملی۔ میرے ساتھ لپٹ کر سسکنے لگی۔ بولی ———— "ان سے پوچھا نہیں وہ سب جو میں نے تمہیں لکھا تھا!"

اشوک نے جلدی جلدی شیو کا سامان نکالا۔ خود ہی پلگ لگا کر پانی گرم کیا اور برآمدے میں لگے شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر منہ پر صابن سے بھرا ہوا برش چپٹ چپٹ تھوپنے لگا۔ صابن کا جھاگ ادھر ادھر کئی جگہ اڑ اڑ کر گرا۔ کرسی پر، فرش پر اور اس کے کپڑوں پر بھی۔ میں مارشل کو گود میں لے کر پیار کرتی رہی۔ سو، کتنا بڑا ہو گیا ہے اب! شرارتی بھی۔ چاہتا ہے باپ اسے اٹھا کر آئینہ بھی دکھائے اور اس کی بھی شیو بنا دے!

اشوک کے دفتر چلے جانے کے بعد میرا پورا دن سخت بے چینی سے گزرا۔ سروج کی باتیں سن سن کر جی پھٹتا رہا۔ اسے کوئی جواب نہیں دے سکی۔ کچھ اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آئیں وہ سروج سے بڑی ہمدردی رکھتی تھیں۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی باتیں مجھ سے کہیں جیسی سروج کہتی تھی۔ لیکن میں نے انھیں پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا تو وہ حیران سی ہو کر لوٹ گئیں۔ میری خاموشی سروج کو بھی ناگوار گزر رہی تھی۔

ں کچھ کہتی کیوں نہیں ۔ مائیں تو بیٹیوں کی تکلیف پر رو پڑتی ہیں ۔ اس نے مجھے اسی لیے تو یہاں بلایا ہے ۔

شام کو اشوک ٹھیک سے پر آگیا ۔ اس نے آتے ہی چائے مانگی ۔ سروج سے ہی مانگی اور اس کی طرف مسکرا کر بھی دیکھا ۔ لیکن سروج ے چہرے پر کسی قسم کی مسکراہٹ نہ لے آئی ۔ اس نے دن میں جو چند کپڑے دھوتے تھے اور اب سوکھ چکے تھے ۔ ان ہی کو تار پر سے اتار کر تہہ نے میں لگی رہی ۔ اس نے چائے بنانے میں کچھ توقف دکھایا تو میں ہی مارشل کو گودی سے اتار کر کچن میں چلی گئی ۔ کچھ دیر بعد سروج بھی میرے ں آبیٹھی ' ایک طرف چُپ چاپ ۔ مارشل کی فراک کے ٹوٹے ہوئے بٹن لگاتی رہی ۔ مارشل اس کی گود میں لیٹا لیٹا دودھ پیتا رہا ۔ اشوک نے ڑے میں ڈوب کر سگریٹ سلگالی ۔

وہ بار بار سگریٹ کی راکھ فرش پر گرا دیتا ۔ اس نے اپنا کوٹ جو آتے ہی پلنگ کی ٹیک پر پھینک دیا تھا وہ پھسل کر فرش پر گر گیا ۔ اس نے ٹ کو پھر سے اسی طرح پھینک دیا ۔ سروج کچن میں بیٹھی بیٹھی اس کی طرف بے زاری سے دیکھ رہی تھی ۔ میں اشوک کے لیے چائے کا پیالہ لے کر ئی تو اس نے سگریٹ کو پاؤں کے نیچے کچل دیا ۔ سروج نے مجھ سے کہا ——— "دیکھتی ہو ممی ! دن بھر کتنی محنت سے فرش کو رگڑ رگڑ کر چمکاتی ں ۔ پر یہ ہیں کہ سگریٹ ، کاغذ ' اخبار ' جوتے ' ہر چیز جہاں چاہتے ہیں پھینک دیتے ہیں !"

اشوک نے بڑے اطمینان سے چائے کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتارے ۔ ایک دو بار میری طرف بھی دیکھا ۔ شاید میرا ردِ عمل جاننے لیے ۔ پھر بڑے ضبط سے کہا ——— "سروج ! میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں ۔ یہ مکان ہم نے بنایا ہے ۔ مکان نے ہمیں نہیں بنایا ۔ ہم ں طرح چاہیں گے اسے استعمال کریں گے ۔ مکان کو یہ حق کبھی نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں استعمال کر سکے ۔"

پھر وہ میری طرف پلٹ کر بولا ——— "ممی ! تمہیں میرا ایٹی ٹیوڈ بہت ہی بوہمین سا لگ رہا ہوگا ! لیکن میں کہتا ہوں ہم اپنے ئے ہوئے مکان کے اندر پوری آزادی سے کیوں نہ رہیں ؟"

یہ سن کر میری تو ہنسی چھوٹ گئی ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا کوٹ ہینگر پر لٹکا دیا ۔ برش سے فرش پر بکھری ہوئی راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑے اف کر دیے اور کہا ——— "اشوک ! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنے ہی مکان کے ساتھ لڑ رہے ہو ! جسے تم نے خود بنایا ہے ۔"

مجھے اپنے خاوند کی بھی باتیں یاد آگئیں تو اور زیادہ ہنسی آئی ۔ میں نے دونوں کے درمیان رُک کر سروج سے کہا ——— "تجھے یاد ہ نا ' تیرے ڈیڈی اپنے مکان کے بارے میں کبھی کبھی کیا کہنے لگتے تھے ! اپنے ہی گھر میں خود اجنبی سمجھنے لگتے تھے تو ان کے ساتھ اُلجھ بھی پڑتی ں !"

میں نے سر گھما کر اشوک کو بتایا ——— "ہاں سچ یہ لڑکی تو اپنے ڈیڈی کو ڈانٹ بھی دیتی تھی ! عورتیں دراصل اپنے مکان سے ت زیادہ اُنس رکھتی ہیں ۔ انھیں اسی کی چار دیواری کے اندر ہی تو زندگی بتانا ہوتی ہے !"

من ہی من میں میں نے سوچا ' عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے قدم نکالتی ہے تو اس کے سامنے مکان یا چار دیواری کا تصور بہت ندلا سا ہوتا ہے ۔ اسے یقین بھی نہیں ہوتا وہ جس مرد کے ساتھ جا رہی ہے وہ اسے پوری حفاظت کا احساس دے سکے گا یا نہیں ! لیکن ب بار جب وہ اس کے مکان کے اندر داخل ہو جاتی ہے پھر اس مرد پر ' اس کے مکان پر مکمل اختیار بھی چاہنے لگتی ہے کیوں کہ اپنا ت کچھ دے کر ہی وہ انھیں حاصل کرتی ہے ۔

میں نے سروج کی طرف دیکھا ۔ وہ اپنے حدود کے اندر کس قدر صحیح ہے ۔ لیکن اس کے اندر اعتماد کی کمی ہے ۔ زبان پر بھی قابو نہیں ۔ قابو نہ ہونے کی وجہ سے ہی اس کا اصلی مطالبہ کمزور ہو جاتا ہے ۔ وہ اس وقت بھی منہ پھلاتے ہوئے انگیٹھی کے سامنے بیٹھی تھی ۔ ں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہ تاکا ۔ اشوک بھی ہونٹوں کے درمیان سگریٹ پھنسائے خاموش بیٹھا رہا ۔ میں بھی چُپ ہو گئی مجھے وہاں گہری خاموشی کا احساس ہوا اور میرا من ڈوبنے لگا ۔ کبھی کبھی ان ہی لمحات سے گھبرا کر اشوک گھر سے نکل جاتا ہوگا ! لیکن وہ مجھے ٹھے ہوتے بچے کی طرح لگا ۔ جسے ذرا سی خوشامد سے منا لیا جا سکتا ہو !

اچانک اس نے ہاتھ اٹھا کر سروج کو پکارا ——— "سروج! دیکھو تو میری انگلی میں کوئی کھپچ گڑ گئی ہے! دن بھر بہت تکلیف دیتی رہی ہے۔ ذرا سوئی سے نکال دو!"

"اس کے پاس کیوں نہ چلے گئے کھپچ نکلوانے!" سروج بڑبڑا اٹھی اور مارشل کا رُخ الٹ کر اُسے دوسری طرف سے دودھ پلانے لگی۔

اب میں ہی سوئی لے کر اس کے پاس جا بیٹھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا ——— "کیسی گڑ گئی؟" میں ڈر رہی تھی ابھی جھگڑا نہ شروع ہو جائے۔

"جانے کہاں سے! مجھے تو تبھی پتہ لگا جب درد ہونے لگا" اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔

ذرا سی کوشش سے میں نے اسے نکال پھینکا۔ سوئی کو اس جگہ پر رکھنے کے لیے پلٹی تو اپنے اوپر سروج کو کھڑا ہوا پایا۔ وہ غصہ سے کانپ رہی تھی۔ مارشل کو بڑی سختی سے سینے سے لگا رکھا تھا۔

میری سمجھ میں فوراً کچھ نہ آسکا، اس کی یہ کیفیت کیوں ہو گئی ہے۔ حیران ہو کر پوچھا بھی ——— "کیا بات ہے سروج؟ کیا ہوا تجھے ———؟"

"یہ بات تم اپنے آپ سے ہی پوچھو ممی!"

ہکا بکا سی رہ گئی میں — اس لڑکی کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!

"مَیں اپنے آپ سے کیا پوچھوں بٹیا! تو اپنی زبان سے ہی کیوں نہیں کہہ دیتی؟" لیکن مجھے اپنی آواز حیرت ناک طور پر کمزور اور لرزتی ہوئی سی لگی۔

سروج پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے کہتی گئی ——— "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے! تم چاہو تو واپس چلی جاؤ! ابھی اسی وقت!"

میرے قدموں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ اشوک بھی چپ سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے لگا میں کچھ ہی پلوں میں رو دوں گی۔ اپنے آپ پر سے میرا اختیار ٹوٹ رہا ہے۔ میں نے بے حد ندامت بھی محسوس کی۔ میری ہی کوکھ کی جنی نے مجھے چپت دے ماری ہے! اپنے آدمی کے سامنے! اب میں کیا کروں؟

کچھ لمحوں تک تو میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ پھر میں نے سوچ لیا۔ جلدی جلدی اپنی چیزیں اٹیچی میں رکھیں اور باہر نکل آئی۔ سروج سے ملے بنا ہی۔ اب میں اس سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے میری توہین کی تھی۔ میری خودداری نے اجازت نہیں دی کہ میں اب اس کا منھ بھی دیکھوں! اسے خود ہی میرے پیچھے پیچھے آنا ہوگا! مجھ سے معافی مانگنی ہوگی!

گلی میں چلتے چلتے مَیں خود کو پیر پٹختے ہوئے محسوس کیا! اس نے تو بچپن میں مجھے کئی بار کلپایا ہے! اس کے منھ پھٹ ہونے کے کارن ہی تو کئی بار اسے پیٹ بھی ڈالتی تھی۔ اگرچہ ایسا کر کے مجھے دُکھ بھی بہت ہوتا۔ لیکن اب تو وہ بڑی ہو چکی ہے۔ اپنے گھر بار والی بھی۔ اسے یہ گھر بار مبارک ہو! اسے میری توہین کرنے کا کیا حق ہے!

میں نیم روشن سڑک پر سیدھی بڑھتی گئی۔ اپنے قیاس کے مطابق اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ کسی سے راستہ تک پوچھنے کی خواہش محسوس نہ کی۔ کوئی سواری لینے کی بھی۔ غصے کی کیفیت میں میلوں تک چل سکتی تھی۔ ادھر ادھر کسی بھی طرف دیکھے بغیر۔ جگمگاتے ہوتے مکان، ہنستے ہوتے لوگ! میرے اندر اچانک ہی ہر چیز سے دلچسپی ختم ہو گئی۔

اچانک میں نے پیچھے پیچھے کسی کی چاپ سنی۔ جیسے کوئی بھاگتا ہوا آرہا ہو! میں اور بھی تیز چلنے لگی۔ لیکن وہ چاپ جلدی ہی ختم ہو گئی جیسے مَیں اس سے بہت آگے نکل گئی! میرا پیچھا کرنے والا ہار گیا ہو! میں نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ دُور تک۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میرا جی اور بھی دُکھا۔ لیکن مَیں نے خود کو رونے سے باز رکھا، اگرچہ میرا دل پاش پاش ہو چکا تھا۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا یہ لڑکی میرے ساتھ یہ سلوک بھی کر گزرے گی! اس کے باپ کو جاکر بتاؤں گی تیری لاڈلی نے کتنی بڑی ذلت کی ہے! اب میں اس کا منھ تک نہ دیکھوں گی!

چند لمحے رُک کر میں پھر چل دی۔ لیکن اب میں بلامقصد چلتے چلے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسٹیشن کا صحیح راستہ جان لینا چاہتی تھی۔ کوئی سواری ملتے ہی اسٹیشن پر ہی پہنچ کر دم لوں گی!

اچانک سامنے سے روشنی دکھائی دی۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی۔ آٹو رکشا کے رُکتے ہی میں اس کے اندر کود جاؤں گی۔ کرایہ چکائے بغیر۔ میرے اندر مزید انتظار کی تاب نہیں ہے!

اسکوٹر قریب آیا تو مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ رکشا نہیں تھی۔ کوئی اسکوٹر سوار ہی تھا۔ لیکن وہ میرے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ بولا —— "ممی! اس وقت کہاں جاؤگی؟"

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ وہ اشوک ہوسکتا ہے لیکن وہی اتر کر میرے پاس کھڑا ہوگیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر میری اٹیچی تھام لی۔

"میں واپس نہیں جاؤں گی بیٹا! یہ میرا فیصلہ ہے۔" اگرچہ میری آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی لیکن سخت اور فیصلہ کُن تھی۔

اشوک چُپ کھڑا رہا۔ اس نے پورے کپڑے بھی نہیں پہن رکھے تھے۔ اس قدر سردی میں صرف پینٹ اور سوئیٹر ہی پہنے ہوئے چلا آیا تھا۔ میرے چلے آنے کے بعد یقیناً سروج بھی گڑگڑائی ہوگی۔ لیکن کچھ بھی ہو میں واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اشوک نے کچھ سوچ کر کہا —— "ٹھیک ہے ممی! جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ لیکن اس وقت تو کوئی بھی گاڑی نہیں جاتی۔ پہلی گاڑی صبح سات بجے جائے گی۔ تب تک کہاں رہوگی؟"

"اسٹیشن پر ویٹنگ روم ہے۔ لیکن اب تم گھر جانے کے لیے مت کہنا۔"

"اس طرح بھی ہوسکتا ہے ممی! گھر بھی نہ جاؤ اور اسٹیشن پر بھی نہیں۔ جہاں اس وقت ممی تم کھڑی ہو نا اس کے ٹھیک سامنے میرے ایک جاننے والے رہتے ہیں۔ چلو وہیں رہ لو۔ صبح چھ بجے آکر میں تمھیں لے جاؤں گا اسٹیشن پر چھوڑ آنے کے لیے۔"

یہ تجویز میں نے رد نہ کی۔ رات بھر ان کے گھر کے قریب ہی رہوں گی! ہوسکتا ہے صبح تک سروج معافی مانگنے آجائے۔ اگرچہ میں اسے معاف نہیں کرسکوں گی۔ لیکن ایک بار اسے پشیمان ضرور دیکھنا چاہتی ہوں۔

اشوک مجھے سامنے کے بلاک میں لے گیا۔ دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ کوئی عورت اپنے بچوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اشوک نے بتایا —— "یہ میری ساس ہے۔ رات یہاں رہے گی۔"

عورت نے جلدی سے میرے لیے اسی کمرے میں ایک اور چارپائی ڈال دی۔ ایک ہی کمرہ تھا۔ اس کے پاس۔ اشوک فوراً واپس چلا گیا۔ عورت کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہ بتا گیا۔ لیکن میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی یہ وہی ہے۔ اسی کے پاس وہ آتا ہے۔ یہ میرے لیے ایک اور صدمہ تھا۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ حالات نے مجھے اپنے شکنجے میں بالکل جکڑ سا لیا تھا۔ اس کے پاس رہنا مجھے بہت عجیب سا لگا۔ لیکن میں چارپائی پر پاؤں پسار کر بیٹھ چکی تھی۔ اس پر اس نے بستر بھی بچھا دیا تھا۔ مجھ سے اٹھنا بھی مشکل ہوگیا۔

اس وقت وہ کمرے میں نہیں تھی۔ رسوئی میں اسٹوو جلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں کوئی بات تک نہیں کرسکوں گی۔ بالکل احمقوں کی طرح دیواروں پر لگے کلنڈر اور تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک تصویر کے فریم پر باسی ہار لٹک رہا تھا۔ میں سمجھ گئی اس کا آدمی زندہ نہیں ہے۔ ایک کونے میں بڑے سلیقے سے چار پانچ ٹرنک اوپر تلے رکھے تھے۔ ایک الماری میں بچوں کی کتابیں اور کاپیاں ترتیب سے لگی تھیں۔ میری نگاہ بچوں پر جا ٹکی۔ آٹھ اور دس سال کی دو لڑکیاں گہری نیند میں تھیں۔ ایک کی چوڑی دار پاجامہ پہنی ہوئی ٹانگوں سے رضائی کھسکی ہوئی تھی —— دوسری کی چوٹی پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔

اچانک وہ عورت دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آگئی۔ میرے سامنے ہاتھ بڑھا کر کھڑی ہوگئی۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔

نازک نازک ناک نقشے کی پچیس چھبیس سال کی سانولی سی! میری بیٹی سے کچھ کم ہی جاذب نظر۔ ہر ہر لمحہ اپنے وجود کے اندر ہی سکڑتی سمٹتی ہوئی سی! اس حقیقت کے احساس سے میری ہی طرح مجوب کہ ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔

وہ گلاس ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کی پیش کش کو قبول کر لینا یا ٹھکرا دینا دونوں کام میرے لیے مشکل ہو گئے۔ میں اس کے ساتھ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مجھے مجبوراً زبان کھولنا پڑی ——— "مجھے نہیں چاہیے بیٹی!"

اسے بیٹی کہہ کر میں کانپ گئی۔ اس کی ذرا سی ہمدردی نے مجھے نرم کر دیا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے میں بھول گئی کہ وہ میری بیٹی کی سوت ہے۔ دوسرے لمحے اس کی طرف دیکھنا بھی دشوار ہو گیا۔

اس نے بھی اصرار نہ کیا۔ گلاس میرے قریب ایک تپائی پر رکھ کر وہ اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اپنے بچوں کے پاس۔ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر لیٹ گئی۔ رضائی میں پوری طرح چھپ کر۔ میں ابھی تک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ بجلی کا بلب ابھی روشن تھا۔ روشنی تکلیف دہ بنتی جا رہی تھی۔ اردگرد کی ہر چیز مجھے ہنستی ہوئی سی لگی۔ میں نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔ اندھیرا ہوتے ہی جیسے کئی چہرے غائب ہو گئے۔ زندہ اور متاثر کرنے والی چیزوں کے چہرے۔ اب میں تنہا تھی۔ اپنے اندر داخل ہو کر رات کے مہیب سناٹے سے بچنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کر لیں بے اختیار دونوں ہاتھ بھی جوڑ دیے۔ ذہنی اذیت سے مکتی پانے کے لیے بھگوان کو یاد کیا۔ کیا واقعی بھگوان میری مدد کرے گا! میں اسی جگہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو جانا چاہتی ہوں۔ یہ دھرتی پھٹ کیوں نہیں جاتی! پیشتر اس کے کہ میں اس کمرے میں پھر سے روشنی دیکھوں! روشنی ہوتے ہی سارے مکروہ چہرے پھر سے سامنے آ جائیں گے۔ بھگوان کو اتنی دردمندی سے پہلے کبھی یاد نہیں کیا ہے۔ میں نے اس کی طاقت پر کبھی اعتماد نہیں کیا ہے۔ میرا وشواس ہمیشہ انسان کی نفسیاتی کش مکش میں رہا ہے۔ آدمی روشنی میں بھی سکون پاتا ہے۔ اندھیرے میں بھی۔ گھپ اندھیرا ہی میرے لیے ایک مقدس وجود بن گیا ہے۔ ہمدرد اور مہربان اور طاقت ور وجود۔ میں اس کی گود میں سر ڈال کر رو بھی سکتی ہوں!

اچانک میں نے خود کو روتے ہوئے سنا۔ بہت حیران ہوئی۔ میں سچ مچ رو رہی ہوں! دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپے اونچی آواز میں رو رہی ہوں! دن بھر تو میں نے خود کو رونے سے روکے رکھا ہے بلکہ کافی برسوں سے! میرے اختیار میں اب ضبط نہیں رہا۔ جب تک چاہوں رو سکتی ہوں۔ عام طور پر کسی عورت کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ عورت اتنی کمزور کیوں ہے! وہ اتنی مجبور تو نہیں ہے کہ بات بات پر آنسو بہانے بیٹھ جایا کرے! لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے عورت واقعی کمزور ہے۔ میں یہاں کیوں آ گئی ہوں؟ یہاں میرا کیا کام ہے؟ بیٹی کو ایک بار اس مرد کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے بعد تو میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنے مرد کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لیے لڑتی کیوں نہیں! جیسے اس نے اپنی ماں کے منہ پر تھپیڑ مارا ہے! اسی طرح اس کا حق چھیننے والے کے منہ پر بھی لگا سکتی ہے! لیکن اس کی ماں اس کی سوت ہرگز نہیں ہے! یہ اس کی بھول ہے۔

یہ سوچ کر مجھے کچھ تسکین سی ملی۔ سروج نے اپنے مرد کے لیے لڑنے کی خاطر پہلا تھپیڑ اپنی ماں کے منہ پر مارا ہے! اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے اندر کا درد کچھ کم ہوتا ہوا لگا۔ میرے آنسو بھی تھم گئے۔ میں نے سسکنا بند کر دیا۔ دوپٹے سے چہرہ پونچھ ڈالا۔ کئی گھنٹوں کے بعد آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑی تھوڑی روشنی باہر سے آ رہی تھی۔ میرے سامنے پلنگ پر وہ تینوں ایک ہی رضائی میں دبکے پڑے تھے۔ اشوک ابھی تک کیوں نہیں آیا! اس عورت کو میں پھر نہیں دیکھنا چاہتی۔

میں نے وہاں سے چلے آنے کا فیصلہ کر لیا۔ چپکے سے چوروں کی طرح کوئی آہٹ کیے بغیر میں باہر آ گئی۔ باہر آ کر یوں لگا جیسے طویل قید سے رہائی ملی ہے۔ چھ بج چکے تھے۔ آج بھی کہرا چھایا ہوا تھا۔ اشوک نہیں آیا۔ لیکن میں خود اسٹیشن پر پہنچ گئی ہوں۔

میرے قدم اسٹیشن کی طرف جانے کے بجائے ان کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی میں اسی سمت میں بڑھتی گئی۔ نیم ارادہ نیم رضامند۔ بار بار یہی سوچ کر من کو ورغلاتی گئی۔ ان کے گھر کے سامنے سے ہو کر سیدھی نکل جاؤں گی وہاں ہرگز نہیں رکوں گی! کوئی دکھائی دے گا تب بھی۔

مجھے یاد آیا سروج جب چار سال کی تھی، میرا کہنا نہیں مانتی تھی۔ بار بار فراک کو آگے اٹھا کر منہ میں ڈال لیتی۔ یہ بات مجھے بہت بُری لگتی۔ اسے کتنا منع کیا، دھمکایا اور مارا بھی! لیکن وہ بھی بڑی ضدی واقع ہوئی تھی۔ ناچار اس کے ساتھ میں نے بولنا چھوڑ دیا۔ اس سے روٹھ سی گئی۔ کتنی دیر تک اسی طرح روٹھی پھرتی رہی۔ اس نے پہلے تو اس بات کو قطعاً محسوس نہ کیا لیکن پھر سمجھ گئی۔ اپنے ننھے ننھے قدموں سے میرے پیچھے پیچھے گھومنے لگی۔ لیکن یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کب تک اس سے روٹھی رہوں گی! بچاری کو منانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ جب میں نے دیکھا اس نے دو تین گھنٹے سے فراک کو منہ میں نہیں پکڑا ہے تو مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس سے آئندہ ایسا کبھی نہ کرنے کا وعدہ بھی لے لیا۔

ان کے مکان کے سامنے پہنچ کر جی چاہا ذرا سا اندر جھانک کر بھی دیکھ لوں ان کے دروازے ابھی تک بند کیوں پڑے ہیں؟ صبح تو ہو چکی ہے۔ اس وقت دونوں بیڈ ٹی پینے کے عادی ہیں۔ کون چائے بنا رہا ہوگا! سروج یا اشوک؟

ان کا چھوٹا سا پھاٹک کھول کر میں اندر چلی گئی۔ برآمدے میں بہت سی کراکری ٹوٹی پڑی تھی۔ کئی اور چیزیں بھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل پھر ڈوبنے لگا۔ مکان میں گہری خاموشی تھی۔ جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو! سب چھوڑ کر چل دیے ہوں۔ ان کے بیڈ روم تک پہنچنے کے لیے میرے پاؤں کے نیچے کتنی ہی چیزیں آئیں۔ ایک کھڑکی کھلی تھی جس پر دبیز پردہ پڑا تھا۔

میں نے بڑی بے صبری سے ہاتھ بڑھا کر پردے کو ذرا سا ہٹا دیا۔ کمرے کے اندر بھی ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ کپڑے، کرسیاں! لیکن وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے گہری نیند سو رہے تھے۔

کشتی

انتظار حسین

باہر مینہ برس رہا تھا، اندر حبس بہت تھا، جس سے پریشان ہو کر کس کس نے سر باہر نکالا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔

"بارش کچھ کم ہوئی؟"

"بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ بارش ہے یا قیامت!"

"اندر کے حبس سے تو بہرحال بہتر صورت ہے۔"

"کوئی بہتر صورت نہیں۔ اندر حبس باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جائے؟"

"سب کچھ تو ڈوب گیا۔ اب آخر بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے؟"

"ہم جو باقی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں بس ہم ہی باقی رہ گئے ہیں، مگر ہم ہیں کتنے انگلیوں پر گن لو۔ باقی چرند پرند ہی ہیں۔"

"ہاں باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔ شاید اس لیے بھی حبس بہت ہو گیا ہے۔ جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک ہم اس طور جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔"

"ہاں پتہ نہیں کب تک۔ بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ کتنے دن گزر گئے کہ اسی ایک رفتار سے ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"شروع کس دن سے ہوئی تھی؟"

"کس دن۔ ہاں کم از کم حساب تو کرنا چاہیے کہ کس دن سے شروع ہوئی تھی اور اب کتنے دن ہو گئے۔" سب نے اپنے اپنے ذہن پر زور دیا۔ پر کسی کو یاد نہ آیا کہ وہ کون سا دن تھا اور کون سی تاریخ تھی جب برسنا شروع ہوا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب کچھ اندازہ نہیں کہ کتنے دن سے سفر میں ہیں۔" "کتنے دن سے ہم سفر میں ہیں۔ اب سوچا میں پڑ گئے کتنے دن سے، کتنے برس سے، کتنی صدیوں سے۔ بارش اور سفر میں یہی ہوتا ہے۔ لگاتار برسے تو لگتا ہے کہ برس برس سے برس رہا ہے اور برس برس برسے گا۔ سفر کے بیچ کوئی پڑاؤ نہ آئے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔"

"بہرحال جس دن بارش شروع ہوئی ہے اسی دن ہم گھروں سے نکلے تھے۔ سو اگر ہم میں سے کسی کو یہ یاد ہو کہ ہم نے کس روز گھر کو چھوڑا تھا تو . . . ."

"گھروں کو؟"

گھروں کو چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گھروں کا نام کسی کے لب پر آیا تھا۔ تو ہمارے گھر بھی تھے۔ یہ سوچ کے وہ حیران ہوئے اور چھوڑے ہوئے گھر دفعتاً ان کے تصور میں یوں ابھرے جیسے ابھی ابھی وہ انھیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔

"کاش وہ بھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ جانے اب کن پانیوں میں گھری ہوگی۔"

"وہ کون تھی؟"

"وہ جو زینے سے اترتے ہوئے سیڑھیوں کے بیچ مجھ سے ٹکرائی تھی۔" اور وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی کہ اپنے لبادے کے اندر دو بچے پھل لیے پھرتی تھی۔ اور جب ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے اسے تھاما تو لگا کہ دو گرم دھڑکتے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھی میں آ گئی ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کی گرفت سے آزاد تھی اور وحشی ہرنی کی مثال قلانچیں بھرتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ پر بعد اس کے وحشت اس ہرنی کی کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ بھری دوپہر میں ٹیلے کے پیچھے کھجور تلے وہ اس کے گرم بوجھ سے ڈھیتی چلی گئی۔

زینے، ڈیوڑھیاں، آنگن، ٹیڑھی میڑھی راہیں، ٹیلے، پھلوں سے لدے ہوئے، پرندوں سے بھرے اونچے پیڑ، ایک دم سے انھیں کتنا کچھ یاد آ گیا تھا۔

"ان گھروں کو کیا یاد کرنا جو ڈھے گئے اور بہہ گئے۔"

ہاں یہ تو انھیں ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا کہ جو پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہا ہے اس نے ان کے گھروں کو کہاں چھوڑا ہوگا۔

"مگر ہم ان گھروں کو کیسے بھول جائیں کہ ہم نے ان گھروں میں بیٹھ کر اترنے والی دلہنوں کے لیے گیت گائے اور گزرنے والوں کے لیے گریہ کیا۔"

تب سب آنکھیں ڈبڈبائیں۔ پھر ان سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور وہ روئے۔

"عزیزو، ان گھروں کی بربادی مقدر ہو چکی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

تب گل گامش دو زانو ہو بیٹھا اور یوں گویا ہوا کہ ہم سفرو، دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہو تو مجھے دیکھو کہ میں کن کن پُرشور سمندروں سے گزر کر اس اقلیم میں پہنچا جہاں اُتناپشتیم استراحت کرتا تھا۔ میں نے فریاد کی کہ اے اُتناپشتیم میں نے سنا تھا کہ حرکت میں برکت ہے اور سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ پر مجھ درماندۂ راہ نے حرکت کو بے برکت پایا اور سفر کو لاحاصل جانا جب کہ تو حیاتِ جاودانی کے مزے لوٹتا ہے اور اس بہشت بنیاد اقلیم میں آرام کرتا ہے۔ یہ سخن سن اُتناپشتیم نے تامل کیا۔ پھر یوں لب کشا ہوا کہ اے تیرہ بخت میں دیکھتا ہوں کہ رنجِ سفر نے تجھے ہلکان کر دیا ہے اور الم نے تیرے اندر گھر کر لیا ہے۔ سو تو گھڑی بھر کے لیے دم لے، پھر مؤدب ہو بیٹھ اور گوش ہوش سے سن کہ کیونکر میں نے حرکت میں برکت دیکھی اور سفر کو وسیلۂ ظفر جانا اور اس راہ حیات جاوداں پائی۔ میں نے اپنا گھر ڈھایا، پھر کشتی بنائی۔ اس پر میں حیران ہوں اور یوں بولا کہ اے بزرگ یہ میں کیا سنتا ہوں۔ کہیں کوئی اپنے ہاتھوں سے بھی اپنا گھر ڈھاتا ہے۔ اُتناپشتیم یہ سن کر افسردہ ہوا۔ پھر بولا کہ میرے خداوند کی مرضی یہی تھی۔ وہ میرے خواب میں آیا اور خبر دی کہ انلیل غصے میں ہے کہ زمین پر شور بہت ہو گیا ہے کہ یہ شور اسے سونے نہیں دیتا۔ سوائے اُتناپشتیم تری عافیت اسی میں ہے کہ اپنا گھر ڈھا دے اور کشتی تعمیر کر، تو اے گل گامش گھر اپنا میں نے خداوند کی مرضی سے ڈھایا اور کشتی بنائی۔

تب انھوں نے سوچا اور یاد کیا کہ ہوا کیا تھا۔ ہوا یوں کہ زمین آدمیوں سے بھر گئی، آدمیوں سے، نیز ظلم سے، خداوند نے تو بس آدمی کو پیدا کیا تھا۔ پر اس نے آگے بیٹیاں پیدا کر ڈالیں اور خداوند کے بیٹوں نے ان بیٹیوں کو خوبصورت پایا اور اپنی جوروئیں بنا لیا اور ان بیٹیوں نے جوروئیں بن کر مزید بیٹیاں جنیں کہ مزید خدا کے بیٹے ان پر ریجھے اور انھیں جوروئیں بنا کر اپنے گھروں میں لوٹے۔ بس اس طور زمین آدمیوں سے بھرتی چلی گئی، آدمیوں سے، نیز ظلم سے، اور ایسا ہوا کہ خداوند نے زمین پہ نظر کی اور دیکھا کہ زمین بگڑ گئی ہے۔ تب خداوند زمین پر

ان کے پیدا کرنے سے پچھتایا۔ خداوند پچھتایا اور دلگیر ہوا اور پھر یوں بولا کہ میں نے آدم زاد کو بھر پایا۔ سو میں اب انسان کو جسے میں
ملعت کیا تھا نابود کروں گا کہ زمین بہت بگڑ گئی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے۔

پھر انھیں بگڑے ہوؤں کے بیچ ایک نیک بندہ تھا کہ خداوند کے ساتھ چلتا تھا۔ اور خداوند نے اس سے کہا کہ اے ملک کے
یں تجھے بچاؤں گا۔" سو تو ایسا کر کہ ایک کشتی بنا، اور دیکھ جب طوفان اٹھے تو ہر ذی روح کے ایک جوڑے کو اپنے ساتھ لے
شتی میں بیٹھ جا اور اس بندے نے ویسا ہی کیا، جیسا اس کے خداوند نے اس سے کہا تھا۔

پر وہ بندہ بھی جورو والا تھا اور اس جورو نے بیٹے جنے جنھوں نے بڑے ہو کر خوبصورت بیٹیوں کو اپنی جورو بنایا۔ اور وہ جورو
ہر کو کشتی بناتے دیکھتی تو ٹھٹھا کرتی اور بیٹیوں کو جمع کر کے کہتی کہ تمھارے باپ نے یہ کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے کہ دن بھر اور رات بھر
ان کاٹ کاٹ کے کچھ بناتا رہتا ہے۔

یہ طعنے سن سن کر ملک کے بیٹے نوح نے آخر زبان کھولی اور کہا کہ اے میری زندگی کی شریک، ڈر اس دن سے کہ تیرا گرم
ور ٹھنڈا ہو جائے اور تو آ کر مجھے طوفان کی خبر سنائے۔ اور بھور بھئے منوجی یہ دیکھ کر بھوچک رہ گئے کہ مچھلی بڑی ہو گئی ہے اور
ن چھوٹا رہ گیا ہے۔ کل ہی تو اشنان کرتے سمے ان کے چلو میں یہ مچھلی آ گئی تھی کہ اس سمے چھنگلیا انگلی کے سمان تھی۔ وہ اسے
لنے لگے تھے کہ اس نے دہائی دی کہ پربھو شانتی۔ میں تمھاری شرن لینے آئی ہوں کہ میں چھوٹی سی مچھلی ہوں اور ندی اندر بڑی بڑی
یوں کے بیچ نہیں رہ سکتی کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ انھوں نے اسے اپنی شرن میں لے لیا اور ایک کونڈے میں جل بھر کے
اس میں ڈال دیا۔ پھر اب وہ دیکھ رہے تھے کہ کونڈا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے۔

منوجی نے مچھلی کو کونڈے سے نکال کے گھڑے میں ڈال دیا، اور پانی اس میں بھر دیا۔ پر اگلے دن بھور بھئے جب منوجی پوجا
لیے اٹھے تو دیکھا کہ گھڑا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے کہ دم اس کی گھڑے سے باہر نکلی ہوئی ہے۔ اب انھیں اور بھی
بج ہوا کہ تنک سی مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ گھڑے میں نہیں سماتی۔ مچھلی نے دہائی دی کہ پربھو کرپا کرو۔ گھڑے میں میرا
گھٹ رہا ہے۔

منوجی کی کٹیا کے باہر ایک جل کنڈ تھا۔ انھوں نے مچھلی کو گھڑے سے نکال کے کنڈ میں ڈال دیا۔ اور نچنت ہو گئے۔ پر اگلے
پھر انھیں چنتا لگ گئی۔ جل کنڈ چھوٹا رہ گیا تھا، مچھلی بڑی ہو گئی تھی کہ پونچھ اس کی جل کنڈ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ مچھلی نے پھر دہائی
کر پربھو جو تم نے اپنی شرن میں لیا ہے پر مجھے تمھارے شرن میں چین نہیں ملا۔ منوجی نے یہ سن کے مچھلی کو جل کنڈ سے نکالا اور
سے باہر تلیا میں کھسکا دیا۔ کہا کہ لے اب تو تلیا میں تیر اور چین کر۔

منوجی مچھلی کو تلیا میں چھوڑ کے ایسے آئے جیسے سر سے بڑا بوجھ اتار کے آئے ہیں۔ اس رات وہ چین سے سوئے۔ پر جب تڑکے
ان کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی رہ گئیں۔ مچھلی کی پونچھ تلیا سے نکل لمبی ہوتے ہوتے ان کے آنگن میں آن پہنچی تھی۔ وہ جھٹ پٹ
تلیا پہ گئے۔ کیا دیکھا کہ تلیا چھوٹی رہ گئی ہے، مچھلی بڑی ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی کہ تلیا کے اندر تو بس اس کا منہ تھا، باقی دھڑ اور پونچھ
باہر۔ مچھلی بولی کہ ہے پربھو تمھارے شرن میں میں تیرنے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔

منوجی نے تلیا سے مچھلی کو نکالا، کمر پر لادا اور چلے گنگا ندی کی اور، وہاں جا کے انھوں نے اسے ندی میں چھوڑا اور کہا کہ ہے
مچھلیا، میں نے تجھے گنگا میا کی گود میں دیا۔ میا کی گود میں جا ہے سمٹ جا ہے پھیل۔ پر وہ ابھی یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ اتنی
ل کہ گنگا کی گود چھوٹی رہ گئی۔ مچھلی بڑی ہو گئی۔

منوجی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ بولے کہ اری تو نرالی مچھلی ہے کہ پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ جینے کا یہ نیم ہے کہ جتنی چادر دیکھے
نے پاؤں پھیلائے۔ پر تیرے لچھن یہ ہیں کہ جتنا جل دیکھتی ہے اس سے زیادہ پھیل جاتی ہے۔ اچھا اب تیرا اپائے یہی ہے کہ تجھے

ساگر کے بھینٹ کر دوں۔ یہ کہہ کے انھوں نے مچھلی کو گنگا کی گود سے لیا اور کندھے پر لاد چلے ساگر کی اُور۔

ساگر کی اُور جاتے ہوئے منوجی کو دھیان کی لہر بہا کے بیتے سمے میں لے گئی جب وشنوجی بونے کے روپ میں پرگٹ ہوئے تھے۔ انھوں نے اس دُشٹ راجہ سے تین ڈگ دھرتی مانگی تھی۔ اس مورکھ نے سوچا کہ بونے کے تین ڈگوں میں کتنی دھرتی جاتی ہے۔ مانگ مان لو۔ یہ سوچ اس نے مانگ مان لی۔ پر وشنوجی ایک دم بونے سے دیو بن گئے۔ انھوں نے تین ڈگ ایسے بھرے کہ دھرتی اور آکاش دونوں تین ڈگوں میں سمیٹ لیے۔ اس دھیان نے انھیں چونکا دیا۔ ایک سندیہہ کے ساتھ انھوں نے مچھلی کو دیکھا۔ پر ترنت دھیان کی ایک لہر آئی۔ جی میں کہا کہ اس سمے تو دھرتی راکششوں کے چنگل میں تھی۔ سو وشنو مہاراج نے انھیں اس پرکار چَھل دیا۔ اور دھرتی کو ان کے چنگل سے نکالا۔ آج کے دُشٹ ایسے کون سے بڑے راکشش ہیں کہ وشنو مہاراج ایسا سوانگ بھریں گے۔ انھیں وہ چاہیں تو ابھی چیونٹیوں کے سمان مسل ڈالیں۔

بس یہی سوچتے سوچتے منوجی ساگر کنارے پہنچ گئے۔ مچھلی کو ساگر میں دھکیلا اور کہا کہ اب تو میرا پنڈ چھوڑ دو۔ اس وشال ساگر میں جتنا من چاہے اتنا پھیل جا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلتے پھیلتے پورے ساگر پر چھا گئی۔

منوجی نے ایک بھے کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر شردھا سے ان کا سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں موند کے کھڑے ہو گئے اور لگے کہنے، پربھو شانتی، پربھو شانتی۔ آواز آئی کہ ہے منو دھرتی ادھرمیوں کے ہاتھوں اشانت ہے۔ پر تجھے شانتی ملے گی۔ سو تو ناؤ بنا، جب ساگر اُمڈے اور دھرتی ڈوبے تو پنچھیوں پشوؤں میں سے ایک ایک جوڑا سنگ لے اور ناؤ میں بیٹھ جا۔

منوجی یہ سن کر بولے کہ ہے پربھو جب ساگر امڈے گا تو میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی بودی نیا ڈوبے گی یا تیرے گی۔ آواز آئی کہ ہے منو تو اسے میری مونچھ کے بال سے باندھ دیجو۔ بولے کہ باندھوں گا کاہے سے۔ میرے پاس کوئی رسّی نہیں۔ ترنت ایک سانپ رسّی سمان لہروں میں لہرایا۔ ہے منو، یہ رہی رسّی، اس سے نیّا باندھ لیجو۔

تب زوجہ حضرت نوحؑ کی حضرت کے پاس پہنچی۔ اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ بصد تشویش بولی کہ اے میرے والی، ہمارا گرم تندور ٹھنڈا ہو گیا ہے اور پانی اس کی تہہ میں اُبل رہا ہے۔ حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ دیکھ اب ذوالجلال کے جلال کا دن آن پہنچا ہے، تو یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پر وہ جورو یہ بولی کہ میں تندور پر طشت ڈھکے دیتی ہوں، پھر پانی نہیں اُبلے گا۔ یہ کہہ کر وہ دوڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت اُٹھا کر کے تندور پر ڈھکا اور اوپر اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھ میری ترکیب کام آئی۔ پانی اُبلنا بند ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہتی تھی کہ پانی انگنائی سے نکل کے باہر اُمڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیر رہے تھے اور اسی ساعت برابر کے گھر والی کی زوجہ ہواس باختہ آئی اور چلّائی کہ میرے گھر کے تندور سے فوارہ چھوٹ رہا ہے کہ انگنائی میری جل تھل ہو گئی ہے۔ پھر مختلف گھروں سے بیبیاں نکلیں، اس حال سے کہ ہوش ان کے اُڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے لب پہ یہ خبر تھی کہ تندور ان کے گھر کا گرم سے ٹھنڈا ہوا، اور پانی اس سے اُبلنے لگا، اور سیلاب باہر سے اُمڈے تو آگے سے روکا جا سکتا ہے، مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے، تو کیونکر اس پہ بندھ باندھا جائے۔

سو یوں ہوا کہ دم کے دم میں اس بستی کے سب تندور ٹھنڈے ہو گئے، اور وہ وقت ایسا تھا جب ابھی ابھی گھر والیوں نے اپنے اپنے تندور گرم کیے تھے۔ ہر تندور میں انگارے دہک رہے تھے اور روٹیاں پک کر گرم گرم نکل رہی تھیں کہ دفعتاً ایک تندور ٹھنڈا ہوا، پھر دوسرا ٹھنڈا ہوا، پھر کسی تیسرے تندور میں آگ بجھی اور نمی پیدا ہوئی۔ پھر ہلکا ہلکا پانی رسنے لگا۔ پھر جیسے تہہ چھٹ گئی ہو، ایک دم سے پانی اُبلنے لگا۔ پانی تندوروں سے اُبلا، انگنائیوں میں اُمڈا اور شاہراہوں میں پھیلا اور بھرے بارش شروع ہو گئی ایسے جیسے آسمانوں کے سب دریچے کھل گئے ہوں۔ تب حضرت نوحؑ نے کہا کہ بے شک خداوند کے قہر

کا دن آن پہنچا ہے، اور تب حضرت نوحؑ نے کشتی نکالی، سب جانوروں کے جوڑوں کو اس میں بٹھایا، اور زوجہ سے کہا کہ اے میری زوجہ دیکھ قہر کی ساعت آن پہنچی، تنّدور پر ڈھکا ہوا تیرا طشت پتّے کی مثال پانی میں بہہ گیا اور آنگن تیرا پانی سے بھر گیا۔ اب یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔

تس پر وہ زوجہ یہ بولی کہ "اے میرے والی اس گھر میں میں نے تیرے سنگ پانچ سو سے اوپر برس کھینچے، دن گزارے راتیں بسر کیں، یاد کر کہ ہم دونوں نے مل کر اس گھر میں کتنے دکھ دیکھے اور کتنے سکھ پائے۔ کتنی بار میں بارآور ہوئی، دودھوں نہائی، پوتوں پھلی اور پوتوں اور پڑپوتوں کی بہاریں دیکھیں۔ سوچ کہ میں کیونکر اس گھر کو چھوڑ دوں۔"

تب نوحؑ نے فرمایا کہ "اے مری رفیقہ، خانۂ ہستی بے بنیاد ہے۔ اور گھر کہ آدم کے بیٹوں نے بنائے بودے ہیں، اور وائے خرابی میری کہ میں نے گھر بنایا بیچ ان لوگوں کے جن کے ظلم سے زمین بھر گئی اور ٹیڑھی ہو گئی۔ سو ڈھینا اس گھر کا مقدر ٹھہرا۔ سو اس سے پہلے کہ دیواریں اس کی بیٹھ جائیں اور چھت اس کی آن پڑے، تو یہاں سے نکل اور کشتی میں بیٹھ کہ زمین و آسمان کے بیچ وہی ایک پناہ گاہ ہے۔"

پھر زوجہ ان حضرت کی ڈھیٹ ہو کے یہ بولی کہ اگر میرا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو پھر مجھے کہاں پناہ ملے گی۔

تب حضرت اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ اے مرے بیٹو، تمھاری ماں نے تو زمین پکڑی ہے اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئی ہے۔ تم باپ کی سنو اور جلد کشتی میں بیٹھ جاؤ مبادا تم بھی نافرمانوں میں شمار کیے جاؤ اور ہلاکت کے گھیرے میں آ جاؤ۔

یہ سن سب بیٹے کشتی میں سوار ہوئے سوائے بڑے بیٹے کنعان کے کہ اس نے ماں کی راہ کو اپنایا اور باپ سے کہا کہ اے مرے باپ میں کیونکر اس گھر کو جس میں مری نال گڑی ہے چھوڑ کر اور کیوں کر اس مٹی سے جس نے مجھے رس اور جس دیا ہے منہ موڑ کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤں جس میں تو نے ہر رنگ کا جناور جمع کر لیا ہے۔

حضرت نے بیٹے کی بات سن کر کہا کہ اے مرے بیٹے دیکھ یہ قہر کا دن ہے۔ سو انسان اور حیوان سب ایک کشتی میں سوار ہیں کہ طوفان بے امان ہے اور زندگی کی ضمانت اس کشتی کے سوا کہیں نہیں ہے۔

بیٹا بولا اے مرے باپ تنہائی کی موت ہجوم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے، اور گھر کے اندر پانی میں غرق ہو جانا اچھا ہے، بہ نسبت اس کے کہ آدمی اجنبی پانیوں میں جانوروں کے ساتھ بسر کرے۔

تب حضرت نوحؑ اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹے سے مایوس ہوئے کہ انھوں نے زمین پکڑی اور نافرمانوں میں شمار ہوئے اور کشتی رواں ہوئی اور حضرت نے کہ سلام ہو ان پر ہمارا، مڑ کے بعد یاس اس گھر کی جانب دیکھا جسے وہ چھ سو برس تک رس بس کر چھوڑ رہے تھے اور انھوں نے دیکھا کہ ان کے باپ کا بنایا ہوا بڑے پھاٹک والا وہ گھر کہ کل تک شاد آباد تھا۔ اب امڈتی موجوں کے بیچ خالی ڈھنڈار پڑا تھا، اور ان کی زوجہ نے اور ان کے بیٹے نے برستے آسمان کی چھت پر پناہ لی ہوئی تھی۔ پھر یوں کہ وہ گھر آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور پانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

مینہ ایسے برسا جیسے آسمان کے سب دروازے اور دریچے چوپٹ کھل گئے ہوں۔ مینہ دن برسا، رات برسا، دن دن برسا، لگاتار برسا کہ دن اور رات کا، صبح اور شام کا، دن اور دن کا فرق مٹتا چلا گیا، اور زمین نظروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے تھی ہی نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ کوّے کو کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے بکلی ہوئی، اس نے پر پھڑپھڑائے اور کائیں کائیں کرتا باہر اڑ گیا، مگر چکر کاٹنے کے بعد پھر واپس آ گیا، اور اس کی واپسی اعلان تھی کہ اب کہیں خشکی نہیں ہے کہ پنجے لگائے جا سکیں۔

پھر چوہوں کے جوڑوں کو بیکلی ہوئی۔ انھوں نے پوری کشتی کا چکر کاٹا کہیں کوئی بل ملے اور وہ اس میں لٹک جائیں۔ پر انھوں نے کشتی میں کوئی بل نہ پایا، مگر بل تو ہونا چاہیے کہ وہ اس میں لٹک سکیں، یہ سوچ انھوں نے کشتی کے پیندے کو کترنا شروع کیا۔ کشتی کے جانوروں نے یہ دیکھا اور ہراساں ہوئے۔ یہ سوچ کر کہ مبادا کشتی میں چھید ہو جائے اور اس میں پانی بھر جائے اور وہ غرق ہو جائے۔ تب انھوں نے فریاد کی حضرت نوح سے اور افسوس کیا حضرت نوح نے کہ وائے خرابی میری کہ میں نے کشتی میں سوار کیا۔ چوہوں کو جن کا شیوہ یہی ہے کہ کترو اور سوراخ کرو۔ حضرت نے انھیں اس فعل سے باز رہنے کی ہدایت کی، مگر وہ باز نہ آئے۔ تب حضرت نے تنگ آ کر شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا کہ ہاتھ پھیرتے ہی نکلی اس کے نتھنوں سے ایک بلی کہ جھپٹی چوہوں پر اور چٹ کر گئی انھیں دم کے دم میں۔

تب کشتی کے سب جانوروں نے شادمانی کی اور بلی پر آفریں بھیجی کہ اس نے انھیں آنے والی تباہی سے بچا لیا۔ پھر یوں ہوا کہ اسی ساعت کبوتری نے پر پھڑپھڑائے اور کشتی سے باہر نکل اڑ گئی، اور دیکھا انھوں نے کہ مینہ تھم گیا ہے اور کبوتری زیتون کی پتی چونچ میں دبائے واپس آ رہی ہے۔ اور وہ شادماں ہوئے یہ سوچ کر کہ پانی اترنے لگا ہے اور خشکی نمود کرنے لگی ہے۔ مگر پھر انھوں نے یہ دیکھا کہ جونہی وہ زیتون کی پتی سمیت کشتی میں اتری تو نہی بلی اس پر جھپٹی اور اسے چٹ کر گئی۔ یہ کیا ہوا۔ انھوں نے دیکھا اور دم بخود رہ گئے۔ ساتھ میں زیتون کی پتی بھی عجیب بات ہے۔

"اب ہم بیچ پانیوں میں ہیں، اور کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ خشکی کہاں ہے۔"

مینہ بے شک تھم گیا تھا۔ بادل کی گرج کتنی دیر سے سنائی نہیں دی تھی، مگر پانی کی دھار اسی شور سے گرج رہی تھی اور اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی۔ کسی کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا — "پانی بہت ہے۔"

اندر حبس بہت تھا اور بلی بیٹھی تھی۔ باہر پانی گرج رہا تھا اور زمین و آسمان ملے نظر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و زمان لگتا تھا کہ ایک زمانہ ہو گیا انھیں گھروں سے نکلے ہوئے اور ایک زمانہ ہو گیا انھیں پُرشور پانیوں کے بیچ ڈولتے ہوئے۔

"کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے؟"

"کہاں؟"

"اپنے گھروں کو۔"

اپنے گھروں کو؟ ایک بار پھر انھیں حیرانی نے آ لیا۔ گھر۔ ایک بار پھر گھروں کی یاد نے انھیں ایسے آ لیا جیسے کوئی بڑا جھکڑ پیڑوں کو آ لے اور انھیں ہلا دے۔

"عزیزو، کون سے گھر۔ باہر جھانک کے دیکھو۔ کوئی بستی کوئی دیوار و در کہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ کیا تم نے گل گامش سے نہیں سنا کہ اُتناپشتیم نے گھر ڈھا کر کشتی بنائی تھی۔"

"اُتناپشتیم نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں مگر اُتناپشتیم کے خداوند کی تو تسلی ہو گئی کہ اب زمین پر پانی کے شور کے سوا کوئی شور نہیں ہے کہ اس کی نیند میں خلل ڈالے۔"

مارکنڈی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ چاروں اور گھور اندھیرا تھا۔ اندھیرا اور سناٹا اور جل کی گرجتی دھارا۔ پرم آتما نیند میں تھی اور اننت ناگ کے پھن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سر اندر کر لیا۔ نارائن، نارائن، نارائن۔ گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ او

خداوند کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ پانی جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا۔ پانی کی گرجتی دھار میں ازل اور ابد کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور زمین اور زمان گھل مل جاتے ہیں۔ انھیں کچھ یاد نہیں تھا کہ کب سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور کب سے پرشور پانیوں میں بہہ رہے ہیں تنکوں کی طرح۔ اور کوا پھر بیکل ہوا۔ پر پھڑپھڑائے۔

کوا اڑ گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ انھوں نے باہر جھانک کے دیکھا۔ مینہ بے شک تھم گیا تھا، مگر پانی اسی طرح امڈا ہوا تھا اور گرج رہا تھا۔ کوے کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی اترنا شروع ہوگیا ہے اور کہیں نہ کہیں زمین کا کوئی ٹکڑا خشک ہوگیا ہے کہ کوے کو پنجے ٹکانے کی جگہ مل گئی اور وہ لوٹ کے نہیں آیا۔"

"مگر وہ خشکی کی خبر لے کر آنے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔"

"کوا سیانا جانور ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

"خیر یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ کہیں نہ کہیں خشکی ہے۔ سو ہماری کشتی بھی کسی نہ کسی کنارے جا ہی لگے گی۔ سوائے ہمارے رب ہمیں برکت کی جگہ اتاریو اور تحقیق تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔"

"ہم سفرو، برکت کی جگہ کہاں ہے۔ ہم گہرے پانیوں کے بیچ میں ہیں اور کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ خشکی کہاں ہے اور برکت کی جگہ کون سی ہے۔ ہاں اگر نوح ہمارے بیچ میں ہوتا تو۔۔۔۔۔"

"نوح؟۔۔۔۔۔نوح یہاں نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

سب نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نوح کہاں ہے۔ تب حاتم طائی نے زبان کھولی اور یہ کلام لب پہ لایا کہ "اے ہم سفرانِ عزیزو، اے عزیزانِ باتمیز، صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔ دیکھتے رہو کہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ مجھے دیکھو کہ میں نے بھری ندیوں کے بیچ ایسی کشتیوں میں سفر کیا ہے جن کا کوئی کھویا نہیں تھا۔ کان دھر کر سنو کہ کوہ ندا کی مہم میں مجھ پر کیا بیتی۔ حیران و سرگرداں، چلا جاتا تھا کہ ایک پہاڑ بلند عظیم الشان نظر آیا۔ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تین دن کے بعد اس کے نیچے جا پہنچا، اور جس پتھر کو اٹھا کر دیکھا اس کے تلے لہو بہتے پایا۔ فکر کرتا تھا کہ کوئی یہاں نہیں ہے جس سے اس کے احوال پوچھوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بڑے زور و شور سے بہہ رہا ہے اور اس کا اور چھور بھی نہیں ملتا نہایت متفکر ہوا۔ دل میں کہا کہ یا الٰہی اب اسے کیونکر پار اتروں اتنے میں ایک ناؤ نظر پڑی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ جانا میں نے کوئی ملاح لینے آتا ہے۔ جب کنارے آ لگی تو اس پر کسی کو نہ دیکھا۔ متعجب ہوا پھر شکر خدا کا بجا لا کر سوار ہولیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دسترخوان میں کچھ لپٹا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی، فوراً ہاتھ بڑھا کر کھولا، تو دو گرم گرم نان اور کباب۔ حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ گرم نان کس تندور سے آئے ہیں۔ دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ پرائے کا حق کھانا خوب نہیں اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا کہ اے حاتم یہ روٹیاں اور کباب تیرا ہی رزق ہے شوق سے کھا۔ کچھ اندیشہ جی میں نہ لا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار گئی۔ میں حیران کہ کشتی کون لایا۔ کباب روٹی کون دھر گیا۔ مچھلی کون تھی؟

"مچھلی؟" سب چونک پڑے۔ مچھلی تو ان کے دھیان سے اتر ہی گئی تھی۔

"مچھلی کون تھی؟ ہاں پہلے تو پرجاپتی بھوچک رہ گئے تھے پر پھر اس کی مونچھ کے بال سے انھوں نے ناؤ کو باندھا۔"

سب نے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر چاروں اور گھور اندھیرا اور اندھیارا اور گرجتے جل کی دھارا۔ مانو بھوساگر امڈا تھا۔ پر مچھلی کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

"مچھلی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

"متر و اسے ڈھونڈو۔ اس کے بال سے تو ہم بندھے ہیں۔"

سب نے باہر دور تک دیکھا۔ بس لہرائی رسّی دیکھائی۔ مچھلی کہیں نہیں تھی۔ "متر و رسی تو ہے کہ سانپ سمان ناؤ کے چاروں اور لہرا رہی ہے۔ پر مچھلی نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت چنتا کی بات ہے۔"

سوچ چنتا نے انھیں گھیرا اور سندیہہ نے آن پکڑا۔ دور دور کی بات دھیان میں آئی پر گتھی نہ کھلی۔ ناؤ ڈول رہی تھی اور چاروں اور جل کی دھارا گرج رہی تھی۔

سوا نیزے پر سورج

عابد سہیل

میری بڑی بیٹی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
میں نے پوچھا "کھیل چکیں؟"
"کیا کھیلیں؟" اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں جھلا دیے۔
"کیرم کیوں نہیں کھیلتیں؟"
"آپ تھوڑی دیر بعد کہیں گے تم لوگ شور کرتے ہو —— اور پھر شگوفہ کھیلنے بھی تو نہیں دیتی —— تھوڑی دیر بعد سب گوٹیں گڑبڑ کر دیتی ہے۔ خود تو کھیلنا آتا نہیں ہمیں بھی نہیں کھیلنے دیتی۔"
"بچّی ہے۔" میں نے کہا "اپنی چھوٹی بہن کا خیال تو کرنا ہی چاہیے"۔ میں نے اپنے حساب سے سارا جھگڑا چکا دیا۔
"تو ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہم بھی تو بچے ہیں۔" فوزیہ نے سادگی اور بھولے پن سے کہا۔
میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی ابھی تو وہ بھی بچّی ہی تھی۔ اس سے یہ امید کرنا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کے جھگڑے چکائے، چھوٹی بہن کیرم کی گوٹوں کو کھیل کے درمیان بار بار بگاڑ دے تو غصّہ ہونے کے بجائے انھیں پھر سے اپنی جگہ رکھ کر اسے سمجھائے اور منائے۔ اس کے ساتھ ذرا زیادتی ہی تھی —— اس لیے میں نے کہا ——
"تو تم دونوں لوڈو کیوں نہیں کھیلتے۔"
"صبح تو کھیلا تھا۔"
"تو اور کھیلو۔"
"اور کیا کھیلیں؟" وہ منمنائی "صبح جب سیف ہارنے لگے تو خفا ہو کر الگ بیٹھ گئے۔ بولے آپ ہمیشہ ہرا دیتی ہیں ضرور بے ایمانی کرتی ہیں۔"
"تو ایسا کرو۔" میں نے ایک ترکیب نکالی —— خود تو چار گوٹوں سے کھیلو اور اس کو دو گوٹوں سے کھیلنے دو۔"
"اس سے کیا ہوگا؟" فوزیہ نے پوچھا۔
"ہوگا یہ کہ تم اچھا کھیلتی ہو۔ تم تو جیتو گی ہی۔ اس طرح ممکن ہے کبھی سیف بھی جیت جائے۔ اس کی بھی خوشی

پوری ہو جائے گی۔"

"اس میں اچھا کھیلنے کی کون سی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ تو قسمت کی بات ہے۔ پانسے میں جو بھی نمبر آجائے — بڑے چھوٹے سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا ابو؟ — وہ پانسہ ڈالیں تو گن کر ان کی گوٹ بھی آگے بڑھاؤ۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ ان کی گوٹ نہ پٹنے پائے۔ اس پر بھی ہار جائیں تو منہ پھلا کر بیٹھ جائیں۔"

سچ پوچھیے تو فوزیہ کی دلیل میں وزن تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ اتنے میں سیف میاں دوسرے کمرے سے آگئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو مجھے دیکھتے ہی بہہ نکلے۔ فوزیہ نے جب ذلیل کو آنسوؤں سے ہارتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں بھائی بہن پھر ایک جگہ مل جل کر کھیلنے لگے۔ کھڑکی سے جھانک کر میں نے دیکھا تو آنگن کے دوسری طرف باورچی خانے کے پاس والے دالان میں ان کھلونوں کی، جو امتحانات ختم ہونے کے بعد دوبارہ بچوں کے قبضے میں آگئے تھے، بارات سجی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں کو چولہا بنایا گیا تھا جس پر ایک چھوٹی سی پتیلی میں کھانا پک رہا تھا۔ سامنے گڈے گڑیوں کا صوفہ سیٹ سجا تھا، بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ صوفوں پر آمنے سامنے گڈے گڑیا بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ٹین کی پھولدار پلیٹیں رکھی تھیں، جن میں بسکٹ اور ککڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے تھے۔ ٹین کی رنگین کیتلی اور چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طشتریاں قرینے سے میز پر سجی تھیں۔ فوزیہ نے پتیلی پر سے طشتری اٹھا کر چمچے سے ایک آلو نکالا اور اسے دو انگلیوں سے دبا کر دیکھا اور بولی "ابھی کچے ہیں" تو شگوفہ نے گڈے گڑیا کی طرف دیکھ کر کہا — "ابھی کھانے میں تھوڑی دیر ہے۔ آپ لوگ جب تک ناشتہ کیجیے۔"

میں اپنی ہنسی بمشکل ہی ضبط کر سکا۔ وہ اپنے کھیل میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں ورنہ فوزیہ وہیں سے کہتی "ابو اللہ آپ اندر آجایئے۔ دیکھیے ہم تو آپ کا کھیل نہیں دیکھتے ہیں۔"

میں مطمئن ہو کر کمرے میں چلا آیا۔ بیوی کسی عزیزہ کے یہاں گئی ہوئی تھیں جو یکایک شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ اس گھر میں دو بچوں کے خسرہ نکلا تھا اس لیے تینوں بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ ان عزیزہ کا گھر کافی فاصلے پر تھا۔ آنے جانے میں تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی — میرے لیے تینوں بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس لیے شروع میں تو گھبرایا تھا، کچھ الجھا بھی تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ میری پریشانی بلا سبب تھی۔ ویسے بھی اب بیوی کو گئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے اور اب وہ واپس آتی ہی ہوں گی۔

یہ سوچ کر میں نے پلنگ پر دراز ہو کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں بمشکل دو تین خبریں ہی پڑھ سکا تھا کہ سیف میاں روتے ہوئے آئے۔

"ابو گڑیا آپا بڑی خراب ہیں اپنی گڑیا کو دو دو پیالیاں چائے پلاتی ہیں اور میں نے کہا کہ ہمارے گڈے کو بھی ایک پیالی اور بنا دو تو بولیں جانتے ہو شکر کتنی مہنگی ہے۔ آپ تو کل کہہ رہے تھے کہ شکر سستی ہو گئی ہے۔"

میں ہنسی بڑی مشکل سے روک سکا۔ پھر میں نے فوزیہ کو آواز دی — "فوزیہ!"

"جی ابّو۔"
"سنو۔"
"آئی" کہتی ہوئی وہ آبراجی۔
"کیوں جی تم سیف کے گڈے کے لیے چائے کی دوسری پیالی کیوں نہیں بنا دیتیں؟"
"ابّو آپ جانتے نہیں۔ یہ بڑے حضرت ہیں۔ پہلے بولے ہمارا گڈا بسکٹ اور گلگڑی زیادہ کھائے گا۔ اسے بھوک لگی ہے۔ تم اپنی گڑیا کو دو پیالی چائے پلا دینا۔ میں نے بسکٹ اور گلگڑی کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا اپنی گڑیا کو دیا اور باقی سب ان کے گڈے کو دے دیا۔ اب چائے بھی دوسری پیالی مانگ رہے ہیں۔"
"لیکن گڈے گڑیا تو کچھ کھاتے نہیں وہ بسکٹ اور گلگڑی ہوئے کیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہوئے کیا — ؟ خود کھا گئے۔" فوزیہ بولی۔
"اور تم نے نہیں دوسری پیالی چائے پی لی — اور بسکٹ اور گلگڑی بھی تو کھائی تھی تم نے —" سیف رو دیا۔
اسی لمحہ شگوفہ ایک ہاتھ میں کھلونے والی طشتری، پیالی اور دوسرے میں بسکٹ اور گلگڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی کہ اگر ذرا بھی تیزی سے چلی تو چائے کی پیالی چھلک جائے گی۔
"ابّو یہ آپ کا حصہ ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور دھیرے سے پیالی اور طشتری تخت پر رکھ دی۔ چھوٹے سے ٹین کے ڈھکنے سے پیالی میں، جو بالکل خالی تھی، شکر ملانے لگی۔
"بھئی اس میں چائے تو ہے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔
"جھوٹ موٹ" کہہ کر اس نے پیالی میرے منہ سے لگا دی۔
"بڑے مزے کی ہے۔" میں نے کہا تو فوزیہ بھی مسکرا دی لیکن مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ سیف اب بھی رو ہانسے تھے۔
اصل میں یہ لوگ صبح سے کھیلتے کھیلتے تھک چکے تھے۔ آخر کھیلنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے۔ شروع میں تو ان لوگوں نے خوب مزے لیے، رنگ برنگی تصویروں کی ہندی، اردو اور انگریزی کی جو بہت سی کتابیں میں نے منگا کر رکھی تھیں انھیں دو دو نہیں چار چار بار پڑھ ڈالا۔ پھر کئی دن بغیر لڑے جھگڑے کھیلتے رہے۔ اب کئی دن سے ان سے ہر روز پوچھا جا رہا تھا کہ اسکول کھلنے میں کتنے دن باقی ہیں اور ہر کھیل کا خاتمہ بھی لڑائی پر ہو رہا تھا۔
ایک دم مجھے خیال آیا کہ ملحقہ مکان کی بچی نازو بہت دنوں سے نظر نہیں آتی اور یہ لوگ بھی اس کے یہاں نہیں گئے۔ میں نے کہا — "اب تم لوگ نازو کے ساتھ نہیں کھیلتے۔"
"جب سے جھگڑا ہوا ہے ان کی دادی آنے ہی نہیں دیتیں ہمارے یہاں۔" فوزیہ نے کہا۔
"تو تم لوگ چلے جایا کرو۔"
"امّی نے منع کر دیا ہے۔"
خالی چرخی ہاتھ میں تھی اور پتنگ آسمان پر — میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو میں نے کہا "اچھا اب تم لوگ سو جاؤ۔"
"امّی کب آئیں گی؟" شگوفہ نے پوچھا۔
"اب آتی ہی ہوں گی۔" میں نے تسلّی دی۔
"جب امّی آجائیں گی تب سوئیں گے مزے سے۔"

"نہیں"۔ میں نے نہیں کی 'ی' کو ذرا کھینچ کر مصنوعی غصّے سے کہا —"بس لیٹ جاؤ۔ لُو چلنے لگی ہے۔ اب دالان میں کوئی نہیں کھیلے گا۔"

میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر تینوں لیٹ گئے۔ فوزیہ اور سیف تخت پر اور شگوفہ میرے پاس مسہری پر۔

"آنکھیں بند"۔ میں نے کہا تو تینوں بچوں نے آنکھیں بند کرلیں اور میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھُسر پھُسر کی آواز سن کر میں نے اخبار آنکھوں کے سامنے سے ہٹایا تو فوزیہ اور سیف شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"سوجاؤ —" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

دونوں نے خوب کس کے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن شریر مسکراہٹ ان کے چہروں پر اب بھی کھیل رہی تھی۔ پھر میں اخبار پڑھنے لگا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو تخت خالی تھا۔ مسہری پر شگوفہ بھی نہ تھی۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح بستر پر لیٹا رہا۔ شاید اسی انتظار میں کہ کسی کی آواز سنائی دے تو بلاؤں، لیکن نہ کسی بچے کی آواز سنائی دی نہ یہ اندازہ ہوا کہ وہ کہاں ہیں۔

میں دھیرے دھیرے بستر سے اٹھا۔ سامنے والا دالان خالی پڑا تھا، کھلونے، صوفہ سیٹ سب اسی طرح سجے تھے۔ اب مجھے ذرا تشویش ہوئی۔ لیکن صدر دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میری تشویش کچھ کم ہوگئی۔ دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دراز سے جھانکا۔ تینوں بچے کمرے میں موجود تھے۔

شگوفہ فرش پر دراز تھی۔ اس کا کرتا اوپر تک اٹھا تھا اور پیٹ پر پٹی بندھی تھی جس میں سے خون کی چھینٹیں جھانک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا لیکن پاس والی میز پر لال روشنائی کی دوات اُلٹی پڑی اور سارا میز پوش رنگا دیکھ کر میری گھبراہٹ تو دور ہوگئی لیکن معاملہ کیا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ شگوفہ کے پاس ہی ترکاری کاٹنے والی چھری ایک پھٹے سے کپڑے پر رکھی ہوئی تھی۔ کپڑا جگہ جگہ سے سرخ ہوگیا تھا۔ سیف لکڑی کی ایک کھپچی جس کے ایک سرے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا، ہاتھ میں پکڑے کھڑا ہوا تھا اور فوزیہ سے کہہ رہا تھا —

"مٹی کا تیل تو اسٹو میں ہے اور اسٹو مل ہی نہیں رہا ہے۔"

"وہیں ہوگا کچن میں، الماری کے نیچے دیکھو۔"

"اچھا" کہہ کر سیف نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور پھر فوراً ہی کمرے میں پلٹ گئے۔ میں بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر شگوفہ بھی فرش پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فوزیہ نے میری طرف دیکھا اور پلک جھپکائے بغیر بولی "ہم لوگ شیعہ سنّی لڑائی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

پنجرے کا آدمی

رتن سنگھ

وہ پتھر کی نوکیلی سل پر یوں بیٹھا تھا جیسے اپنے اردگرد پھیلی کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح وہ اُگ آیا ہو۔ اس کے عین سامنے
ں کے تاروں کا کھمبا گڑا تھا جس پر ہوتے ہوئے دو تار حدِ نظر تک نظر آرہے تھے۔ کھمبے پر سے گزرتے ہوئے تاروں پر
پرندے بیٹھے تھے۔ اوپر والے تار پر بیٹھے پرندے کا رنگ سفید تھا اور نیچے والے تار کے پرندے کا ہرا۔

ابھی وہ ان پرندوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک پہاڑ گیند کی طرح اُچھلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا
ا جیسے وہ پہاڑ اس بچّے کی طرح اچھل کود رہا ہو جو سر کے بل قلابازیاں کھا کر خوش ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اس پہاڑ کو اپنی
پر کودتے پھاندتے دیکھ کر ہی خوش ہو رہا تھا کہ پہاڑ نے چلنا شروع کر دیا۔ پھر تو ایک کے بعد دوسرے آسمان کی
ی کو چھونے والے پہاڑ اس کی نظروں کے سامنے کودتے، پھاندتے، ناچتے ہوئے گزرنے لگے۔ جیسے ہی وہ پہاڑ جھومتے
، کی چوٹیوں پر اُگے لمبے لمبے درخت، ان کی کوکھ میں بسے ہوئے چھوٹے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے کھیت یوں جھوم جاتے
ے کوئی دوشیزہ اپنی جوانی کے بوجھ سے دوہری ہو رہی ہو اور پھر پہاڑوں کے جھکتے ہی لاکھوں من پانی برف یوں نیچے کی
ت گر جاتی جیسے کوئی ڈاکو چاندی کے سکّوں سے بھرا ہوا بوجھ زمین پر بے پروائی سے ڈھیر کر دے۔

پتھر کی جس سل پر بیٹھا وہ یہ نظارہ کر رہا تھا اس کی تیکھی نوکیں اس کے جسم میں گڑی جا رہی تھیں اور اردگرد پھیلی ہوئی کانٹے دار
اڑیوں نے اس کے جسم کو جکڑ سا رکھا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس جسمانی تکلیف سے بچنا ممکن نہیں۔ اس لیے جسمانی درد
، بے نیاز وہ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں محو تھا۔ جہاں ایک پہاڑ نے تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی پہاڑی کو یوں اپنے
د میں اٹھا لیا تھا جیسے سڑک پر باپ اپنے بچّے کو گود میں اُٹھا لے۔

جب اس طرح ناچتے ہوئے پہاڑ آگے بڑھ گئے تو اس نے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے دونوں پرندوں کو دیکھا پہلے
ید رنگ والا پرندہ اوپر کے تار پر بیٹھا تھا، پھر سفید رنگ والے پرندے نے اپنی جگہ سے اُڑ کر نیچے کے تار پر ہرے پرندے
، جگہ لے لی۔

اب اس کے سامنے ایک پتلی سی ندی آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی ہونے لگی۔ پھر اس نے تیز تیز دوڑنا شروع کر دیا۔
ی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے کنارے اُگے ہوئے پیڑ پودے اور بسے ہوئے گاؤں قصبے اور شہر بھی دوڑنے لگے۔ گاؤں
ے بعد شہر اور شہر کے بعد گاؤں اس کی نظر کے سامنے سے گزرتے رہے۔ پھر کچھ جانا پہچانا سا ماحول اس کے سامنے آیا۔ ایک

چراگاہ جس کے بیچ میں ایک آم کا پیڑ تھا۔ اس کے سامنے سے بڑی آہستگی سے گزری، پھر اس کچّے راستے کی رفتار اور کم ہوگئی، جس کے کنارے وہ چراگاہ تھی۔ وہ جب تھوڑا اور آگے بڑھا تو ایک کنواں آیا جو چاروں طرف سے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس نے پہچان لیا یہ اس کا اپنا کنواں تھا، جہاں وہ بچپن میں روز صبح و شام ننگا نہایا کرتا تھا۔ اس نے چاہا کہ چیزوں کے چلنے کی رفتار رک جائے۔ لیکن کہاں؟ قبل اس کے کہ وہ اپنے کنویں پر اُگے ہوئے اس آم کے پیڑ کو دیکھ سکے جس کی شاخ پر وہ بچپن میں روز صبح و شام لیٹ سا جایا کرتا تھا۔ کنواں پیچھے رہ گیا تھا اور اب اس کے سامنے سے اس کا گاؤں گزر رہا تھا۔ پھر اس کا گھر آیا۔ جہاں کبھی اس نے اس دنیا کے اندر آنکھ کھولی تھی۔ گھر کو دیکھ کر خود بخود اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تاکہ بھاگ کر اپنے گھر جا سکے لیکن بھاگنا تو درکنار اس کو تو اپنی جگہ سے ہلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے جھاڑیوں سے کتنے ہی کانٹے اس کے جسم میں یوں چبھ گئے جیسے کہہ رہے ہوں "ہم سے بھاگ کر کہاں جا سکو گے؟" اس کا جسم درد کی شدّت سے کراہ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں درد بھر کر سامنے دیکھا جیسے کسی کی مدد حاصل کرنا چاہتا ہو لیکن وہاں تو پانچ اجنبی اپنی بندوقوں کا رُخ اس کی طرف کیے ہوئے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں "خبردار اپنے گھر کی طرف آنے کی کوشش کی۔ اس لکیر کے پار آنا منع ہے۔" اس کا گاؤں اس کی نظروں کے سامنے سے کب کا گزر چکا تھا۔ لیکن وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسے گھر جانے سے کیوں منع کیا گیا ہے، بچپن میں اس نے دیکھا تھا کہ دن ڈھلے بھینسیں چراگاہ سے واپس آکر سیدھے اپنے اپنے گھر جاتی تھیں کیا وہ ان گائے بھینسوں سے بھی گیا گزرا ہے۔

جب اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے سامنے دیکھا تو اس کے سامنے سے کئی آدمی، عورتیں، بچّے، بوڑھے گزر رہے تھے۔ لیکن اس بار پریشانی یہ تھی کہ جن لوگوں کے لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ چلتے چلتے ذرا اس کے پاس رُکیں، اس سے دو باتیں کریں وہ تیزی سے اس کی طرف دیکھے بغیر یا اس کی پروا کیے بغیر آگے نکل جاتے اور جن لوگوں کو وہ نہیں چاہتا تھا ان کو اس سے جیسے کوئی خاص دل چسپی تھی وہ اس کے پاس کتنی دیر رُکے رہتے اور بیکار سوال پوچھتے رہتے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جہنّم کے، تم سے مطلب؟"

"یہاں کب تک یوں ہی بیٹھے رہو گے؟"

"جب تک دم میں دم ہے تب تک تو بیٹھنا ہی ہوگا۔"

"یہ تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے کیا تمھارے پالتو ہیں۔ اگر پالتو نہ ہوں تو ہم لے لیں!"

اس کی آنکھیں غصّے سے لال ہوگئیں "میں تو اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہا۔ ان پرندوں کو تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی جگہیں بدلتے ہوئے دیکھنے دو۔"

پھر اس نے غصّے میں آکر سامنے دیکھنا ہی بند کر دیا۔ اور جہاں تک اس کی نظر جا سکتی تھی اس نے پیچھے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ ایک شہر کو آگ لگی تھی۔ لوگ چیخ و پکار کر رہے تھے، مدد کے لیے فریاد کر رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل تو نہیں سکتا تھا لیکن لوگوں کی چیخ و پکار سُن کر چلّایا "ارے اس شہر کو جلنے سے بچاؤ۔"

اس کے چلّاتے ہی کوئی زور سے ہنسا۔

"کیا پگلا ہے۔ جو شہر ہزاروں سال پہلے جل چکا یہ اس کی آگ بجھانے کے لیے آج پکار رہا ہے۔"

وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس آدمی نے ایسا کیوں کیا، کیوں کہ اس کی نظر اب ایک صلیب پر ٹکی ہوئی تھی، جس پر کسی نورانی چہرے کو لٹکا کر لوگ خوش ہو رہے تھے وہ پھر بے بس ہو کر چلّایا "لوگو! اس آدمی کو ان درندوں سے بچاؤ۔" اب پھر کوئی زور

سے ہنسا۔ "یہ کون ہے جو ہزاروں سال قبل صلیب پر لٹکے ہوئے آدمی کو بچانا چاہتا ہے؟ بھلا اب تک وہ زندہ بچا ہوگا!"
اب کی وہ پریشان ہوگیا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے اپنے سامنے گزرتے ہوئے لوگوں کی پروا نہ کرکے ان سے پرے دیکھنا چاہا جہاں کچھ لوگ بھوک سے بلک رہے تھے۔ وہ ان کی پریشانی نہ برداشت کر سکا اور چلّایا "ارے ان بھوکے لوگوں کو مرنے سے بچاؤ۔ انھیں کچھ کھانے کو دو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ساتھ کتنے ہی کانٹے اس کے جسم میں مضبوطی سے گڑ گئے۔ جب وہ درد سے نڈھال ہو رہا تھا تو اس کے کانوں میں کسی کی ہنسی کی آواز پڑی۔ "کیسا پگلا ہے جو آدمی ہزاروں سال بعد پیدا ہوں گے ہم ان کو بھوکا مرنے سے کیسے بچا سکتے ہیں۔"
یہ سنتے ہی اس کا دماغ چکرا گیا اور مارے درد کے بے ہوش ہوتے ہوئے اس نے اپنا سر پتھر کی نوک پر یوں ٹکا دیا۔ جیسے ابدی نیند سونے کی تیاری کر رہا ہو۔
اب وہاں جھاڑیاں ہیں، پتھر ہیں اور کچھ نہیں، جیسے ان جھاڑیوں اور پتھروں کے کانٹوں اور نوکوں نے اسے نگل لیا ہو۔ اسے وہاں نہ پاکر تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ آدمی کہاں گیا جو ان جھاڑیوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔



FOLLOW THE NIRJET TRAIL.
It's the take-off to a world of high fashion... excitement.
Nirjet. With the unique selvedge — the distinctive mark of a fabric that stands out from the rest. And keeps you way ahead in fashion.
See the fabulous range of Nirjet fabrics, today.
Nirjet — a jet age range of suitings, shirtings and dress materials.
Nirjet
NIRFABRICS LIMITED
Inkspub NIR/13 77

مالکن

قاضی عبدالستار

۱۹۵۰ء میں جو سیلاب آیا تھا، اس نے سیتا پور سے لے کر لکھیم پور کھیری تک کے سارے "گانجر" کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیوں کو بتا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کو ٹھنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہاتوں کو زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہو گئی۔ رونق پور پہلے ہی خالی ڈھابلی کی طرح ننگا پڑا تھا۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اکا دکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آ جاتے تھے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کے بڑے چھتے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچی تھی لیکن کوئی سو برس سے گھنگھور برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر بہاری پلنگ بچھائے جا سکتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک نوسکھیا چور رونق پور کے نجیب الطرفین کا مہمان ہوا۔ رال ٹپکاتی نظروں سے حویلی کو دیکھ کر ہتھیلیاں کھجلانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھلانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ میزبان کو دل لگی سوجھی۔ اس نے کچھ اتا پتا بتا کر آدھی رات کو رخصت کر دیا۔ مہمان ایک دیوار پر سابرے کر جٹ گیا۔ کھودتا رہا یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ دیوار اسی طرح کھڑی تھی۔ اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بے چارہ نامراد واپس ہوا۔ لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی، "جل بھون" نہیں بنایا تھا۔ اوپر سے "ہتھیا نکھت" برستا تھا اور نیچے بر جھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا، پھر دیوان خانہ، جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے، تب چودھری کے نمک حلالی کو غیرت آئی ـــــ علاقے بھر کے نامی نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی نوج بنائی اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اتر گئے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

"حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے ـــــ حکم دیجیے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھا لاؤں۔ اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں، تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ گھاگھرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی بھیانک آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب نے آہستہ سے پھر کہا تو آواز آئی ـــــ "تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب۔ خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے، یہیں جہاں حویلی کھڑی ہے، یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔ اسی گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں، ان سے آگ برستی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہو گیا تھا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے؟ ہم آج پھر مٹ جائیں گے!!"

چودھری کھڑے رہے اور مالکن کے ہیجان کی کڑکڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی کی بیوہ پر رونق پور کی "مالکن" پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا؟ اور انھیں کچھ چھوڑنے کو پڑی ہی کیا تھی، نہ آل نہ اولاد۔ ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائداد۔ مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ برسوں کی مسلسل اور لکھ لٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا ہے کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان ہی گئے ہیں۔ وہ رات۔ عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جانماز پر بیٹھی رہیں۔ ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے لٹس مچ گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اور باغ ودرخت سب کھٹیا بتاشے کی طرح بٹ گئے۔ جیسے بندوق کا فائر ہوتے ہی پرندوں کے غول اڑ جائیں مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری۔ چودھری گلاب کو ہدایتیں دے دے کر ان گنت مقدمے لڑاتی رہیں۔ جیسے حضرت محل نے غدر میں فوجیں لڑائی تھیں۔ شکست تو حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن کو بھی ہوئی لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن نے شکست مانی نہیں۔ مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی بکھرنے لگے۔ عورتیں نکلنے لگیں۔ آخر آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم کر دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تیرے میرے کے مقدمے لڑانے لگے۔ ہولی دیوالی پر آتے۔ پاؤ آدھ سیر مٹھائی کا دونا نذر میں بھیجتے اور اس طرح وضعداری کو نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے۔ اور مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اندر سے باہر تک سب اجڑ گیا۔ گائے، بیل، شامیانے، جھولداریاں، جاجمیں، قالین، دیگ، پتیلے، کرسی، میزیں، پلنگ پیڑھی سب باورچی خانے کو زندہ رکھنے کے لیے جل گئے۔

پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھ کر اٹھیں، مونج کی پٹاری کے پاندان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دو ڈلے اور پتی کی تمباکو کا پھنکا لگایا۔ اور کھنڈر کے اس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے جو ان کے پیٹ کی طرح خالی تھے۔ گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں، جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی لنگڑاتی ہوئی نگاہیں اس سنسان ویران لق ودق کھنڈر میں رینگتی رہیں، جس کی چھتیں گر چکی تھیں۔ دھنیاں جل چکی تھیں، دروازے بک چکے تھے اور جس کے در و دیوار خدمت گزار انسانوں کی مؤدب پرچھائیوں کے رنگوں کو ترستے تھے اور شاید ترستے ترستے بھول چکے تھے، ان کی بھوکی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور پیوند لگے ہوئے موٹی تنزیب کے کیسلے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر انھوں نے ایک انجانی آہٹ محسوس کی اور کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کانپنے لگیں لیکن کانوں سے ٹکراتی ہوئی اس مقدس آواز کو سنتی رہیں، جس سے ممتا کا رس ٹپک رہا تھا۔

"زیب النساء بیگم ...... ! تم ان اشراف زادیوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی تقدیریں لکھی ہیں اور تخت و تاج کے فیصلے کیے ہیں۔ تم ان درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے قرآن شریف نقل کیے ہیں اور پیٹ بھرا ہے۔ تم تلوار نہیں ہلا سکتیں..... تم قلم نہیں اٹھا سکتیں ...... لیکن تم سوئی تو چلا سکتی ہو۔ تمھارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے "چھتر منزل کلب" کی میموں کے ساتھ ڈنر اڑائے ہیں، لنچ کھائے ہیں ..... کیا کہا تم نے؟ اب انگرکھے کون پہنتا ہے؟ ...... اب انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہوگا ...... تم کو یاد ہے؟ میں نے لکھنؤ کے کٹاؤ کے جو کرتے سلوائے تھے ان کی سلائی اس سستے زمانے میں کیا تھی؟ ..... پانچ روپیہ فی کرتا ..... تم ویسا کرتا دو دن میں سی سکتی ہو؟"

جب وہ اٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آچکا تھا۔ جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اٹھی ہوں —— جیسے سارے دن کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہی تھیں کہ اس طرف سے آواز

آئی جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے دوپٹے کو اس طرح ہٹا کر اوڑھا کہ تمام پیوند اِدھر اُدھر ہو گئے اور چٹّیاں کچّے آنگن میں آہستہ آہستہ رکھتی ہوئی اس ویران پکھّے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں جو کبھی ڈیوڑھی کے گرانڈیل منقش دروازے کا سہارا تھا۔

"میں ہوں مالکن . . . . گلاب لال۔"

"اچھے ہو . . . . . چودھری گلاب؟"

"مالکن کی کرپا ہے . . . ."

"کیسے آ گئے؟"

"ایک سندیسہ آیا ہے۔"

"کیا؟"

"پاکستان سے خان صاحب آئے ہیں . . . . وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔"

"ہاں ہاں متّے خاں . . . . جن کا بھتیجہ ہمارے یہاں سپاہیوں میں تھا۔"

"جی ہاں، جی ہاں وہی۔ ان کے تو بڑے رُتبے ہیں پاکستان میں۔ سب لڑکے ان کے بڑی بڑی جگہوں پر ہو گئے ہیں۔"

"اچھا — !"

"جی ہاں . . . . موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضل مرزا صاحب جو آج کل کراچی میں بڑے کمشنر ہیں۔ انھوں نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ چلی آویں۔"

"افضل مرزا میرا بھائی تھوڑی ہے موا . . . . . میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔"

"تو انھوں نے آپ کو بلایا ہے . . . . . بلکہ خان صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو پاسپورٹ بھی انھوں نے اس لیے بڑی دوڑ دھوپ کر کے دلایا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آویں۔"

"مجھ کم بختی کی ماری پر ایسے بپھری وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایروں غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤں گی۔ اس سے کہنا کہ اپنے پوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائے اپنے ساتھ پاکستان کو . . . . مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے۔ جب تک حکم نہیں آتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔"

"وہ کہہ رہے تھے . . . . ."

"گولی مارو چودھری گلاب . . . . کہنا سُننا کا ہے کا . . . . ."

"جی بہتر ہے . . . . !"

"ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔"

"حکم۔"

"یہاں رونق پور میں یا . . . . . کسی اور گاؤں میں کوئی . . . . ."

"جی —"

"میں نے کہا سرکار میں کچھا نہیں؟"

"کوئی کُرتے پہنتا ہے؟"

مالکن نے ایسی بھرّائی ہوئی . . . . چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سُن کر پھٹ پڑی ہو۔ بوڑھا چودھری گلاب اس عجیب و غریب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

پیٹر تے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں، تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب۔ تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو۔ تم تو حویلی کی دائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چرانا۔ آدمی حق سب چلے گئے ـــــ عورتیں ادھر اُدھر ہو گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوّے ہنکایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گزر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں۔ ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی کُرتا اُرنا ہوتا تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔"

حویلی کے بوڑھے راز دار کے تخیل کی آنکھیں بھوکی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

"تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب۔"

"نہیں مالکن ـــــ میں شام تک آجاؤں گا۔"

"مگر دیکھو ـــــ کسی ایسے ویسے کا کُرتا نہ لے آنا میرے پاس۔"

"نہیں مالکن ـــــ"

"میرا نام نہ لینا کسی سے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مالکن؟ میں کوئی آج حویلی میں نوکر ہوا ہوں۔"

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا۔ اور سوار ہو کر بغیر خان صاحب سے ملے ہوئے تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک بیٹھک کے تخت پر بیٹھے سلفہ گُڑگُڑاتے رہے۔ جب سورج سر پر آگیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر چوکے کے تیار ہونے کی خبر دی وہ اونگھتے ہوئے اُٹھے۔ آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے کچے کنوئیں کی چبوتریا پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکائے چوکے پر بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک سینک کر رکھتی جا رہی تھیں۔ مگر وہاں پہلا نوالہ ہی ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

"کا تمرا کچھ جی ماندہ ہے۔"

"ہاں۔"

"تو تھوڑا بہت تو کھا لیو۔"

"تمرے پاس کتنے روپے ہیں؟"

"روپے؟ موئے پاس تو ایک چھدام نا ہیں ہے۔ بڑے بھیّا کے کچھ دام دھرے ہیں۔"

"کتنے ہیں بھلا؟"

"ہیں کوئی دس گھاٹ پچاس۔"

"لے آؤ۔"

"ابھیں۔"

"ہاں۔"

"پہلے روٹی کو کھا لیو۔"

"پہلے لے آؤ۔"

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کے کاغذ نکال کر گنے اور تھالی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے

ں پھاڑے دیکھا کیں پھر بکنے جھکنے لگیں۔ لیکن چودھری گلاب نے ان کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار کر
دھوتی بنا کر باندھی، ٹوپی سر پر اور انگوچھا کندھے پر رکھ کر چلے آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔
ے ہوئے تھان کے باہر لائے اور سوار ہو گئے۔ بھوٹو اپنی چال پھر چل رہا تھا لیکن چودھری گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے
کی انجن دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے لیکن ان کے مرتے ہی جب حویلی اجڑنے
ر بڑے چھوٹے مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی تلاش میں حویلی سے اڑ گئے، تب مالکن نے اپنے ایک ایک
ں باقاعدہ دیکھ بھال چودھری گلاب کے سپرد کر دی تھی۔ چودھری ان لوگوں میں تھے جو حال کی جیب سے آنے والے برے دنوں
بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا بر
ڑ گیا۔ ان کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور دوسرا نہر میں چپراسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس
لن چودھری کی لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا اور نہ پٹرول۔ مجبوراً انھوں نے چپراسیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ
دن منہ کھولے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ لیکن چودھری خود ہی کھکھ بیٹھے تھے۔ ان کا بھرنا کہاں سے بھرتے۔ اس
گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ بڑکو اتنا گرہست اور سگھڑ کب سے ہو گیا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ یہی سب کچھ
سوچتے ہوئے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دکان پر انھوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تنزیب
ان پر رکھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے —— دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چھمن لال کی
ی ہوئی ساری فارسی کا آموختہ پڑھ کر مالکن سے مخاطب ہوئے اور ان کو یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ جیت پور
ا کر گھنشیام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا حلق سوکھ گیا۔ کانٹے سے پڑنے لگے۔ ساری جان پسینے
گئی۔ ان کی مٹھی میں دبی ہوئی پچیس روپوں کی پڑیا بھیگ گئی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس
ے مالکن کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے وجود کا منوں بار گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے
ی دکان پر آ گئے۔ رام پرشاد گدی پر بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے مالکن کا حساب
ا پتہ چلا کہ وہ سو سے اوپر ہے۔ اسی لیے تو رام پرشاد نے ان کا سودا بند کر دیا تھا۔ اسی لیے تو مالکن کا باورچی خانہ ٹھنڈا
تھا۔ وہ رام پرشاد کی دکان کے تختے پر بیٹھے ہوئے اپنے پچیس روپوں کی پڑیا کو نہارتے رہے بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اپنے ٹٹو
ر ہو گئے، جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لیے جھلنگا کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انھیں پہلی بار عرفان ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لیے صرف ہاتھ کافی اور آنکھوں
شنی ہی کی نہیں، سوئی اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جتنے میں سوئی تاگا آتا ہے اتنے میں ایک وقت کا آلو اور دو
کے چنے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی اور ان کی ناون ناخن کاٹنے آ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے خیالوں
ں نیند سے چونک پڑیں اور ناون سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں جیسے لہجے میں وہ اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوتیں تو
ارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈھورا پیٹ آتی۔

"ارے اے قادر کی دھی!"

"جی، بی بی!"

"میرا ایک کام کر دو گی اتنے وقت؟"

"بتائیے!"

"ذرا لپکی ہوئی رام پرشاد کی دکان چلی جاؤ اور ایک مہین سوئی اور چھوٹی پیچک لے آؤ۔ لیکن اس حرامزادے سے میرا نام

نہ لینا نہیں تو ٹکا سا جواب دے دے گا۔ کل میں نے دو پیسے کا نمک، خیر چھوڑو . . . . . تم ذرا چلی جاؤ۔"

وہ اپنی داہنی کنپٹی پر پکھا ٹوٹتی ہوئی آنگن پار کرنے لگی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں۔ جب نائن سوئی تاگا لے آئی تو اسی سے اس کی قینچی منگوائی اور کرتے بیونتنے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے انھیں خیال آیا کہ چودھری جیت پور کے ٹھاکر کی ناپ تو لائے ہی نہیں۔ کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصا تین چار میل دور تھا۔ اب ایسا آدمی کہاں جڑتا جو اسی وقت چودھری کو بلا کر کہتا۔ پھر انھوں نے دیوار پر چڑھتی ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور منگل کو رونق پور کی بازار ہوتی ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر آجائیں بازار کرنے۔ اپنے اس وہم پر ایمان لاکر وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اٹھیں، وضو کے بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا۔ وضو کیا اور نماز کے لیے وہ چٹائی بچھائی جس پر کپڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ چھوٹا سا وظیفہ پڑھ کر لمبی سی دعا مانگی کہ اے پروردگار عالم اپنی رحمت کے صدقے میں جیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں نیکی ڈال دے کہ وہ آکر اپنے کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر کرتا سی سکوں۔ وہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے نڈھال ہوگئیں۔ اسی جانماز پر دہری ہوکر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ مہترانی ہمیشہ کی طرح دردتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی امید سے تازہ دم ہوکر اٹھ بیٹھیں۔

"بانکے کی بہو۔"

"بی بی!"

"بانکے ہیں گھر پر؟"

"ہیں بی بی۔"

"ذرا جلدی سے جا کے بلا لا . . . . کوئی کام نہیں . . . . بس ایک بات پوچھنا ہے۔"

وہ اُلٹے پیروں چلی گئی۔ پھر دروازے پر صدا بلند ہوئی۔

"سرکار کی بڑھتی ہو۔ راج پاٹ بنا رہے۔"

"بانکے!"

"سرکار۔"

"جیت پور تمھاری ججمانی میں ہے؟"

"ہاں حجور۔"

"ٹھاکر گھنشیام کو پہچانتے ہو؟"

"ان کا سرکار کون نائیں پہچانت ہے . . . دور دور تک ان کا نام باجت ہے۔"

"بازار تو آتے ہوں گے؟"

"برابر مالک . . . . . برابر۔"

"تو تم ذرا خیال کر کے ان کو میرے پاس بلا لانا۔ مجھے ایک کام ہے ان سے۔"

"بہت نیک مالکن۔ ابھین لیو آپ . . . . . کا کچھ دور تھوڑے ہے۔"

بانکے تو اپنا چمرودھا جوتا بجاتا اور رٹی ہوئی دعائیں دیتا چلا گیا۔ لیکن اپنی آواز کی رراکی پر مالکن پچھتاتی رہیں، شرماتی رہیں اور بیٹھی دعائیں مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ اپنا کرتا بھجوا دیں، ورنہ میں اُن سے کس طرح بات کروں گی۔ میں کیا کہوں گی، وہ کیا کہیں گے، یا اللہ کچھ ایسا ہو کہ مرنے والے کے سامنے میری آنکھیں نیچی نہ ہوں۔

بانکے نے اپنی بکری کے سوپ بیٹھ پر باندھے اور بازار کے ایک نکڑ پر بیٹھ رہا جہاں ادّھے کھولے جاتے تھے، تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگھرو بجاتا اور دھول اڑاتا ٹھاکر کا ادھا آگیا، وہ اپنے سوپ سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک بھاند پڑا، اس نے گاہک کو ٹالنے کے لیے بڑی بُری زبان میں بات کی لیکن اس نے پیچھا نہ چھوڑا، آخر پیسے گنتا ہوا وہ ٹھاکر کے پیچھے بھاگا، ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دکان پر پہنچے، رام پرشاد نے جلدی سے کھڑے ہو کر سلام کیا اور دو ایک گاہکوں کو ہٹا کر دکان کے باھری پٹرے پر دری ڈال دی۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولیے سے اپنا منہ پونچھا، پھر اسی سے چیزوں کی گرد جھاڑی۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

"کا ہے رے۔"

"ایک اُجر (عذر) ہے۔"

"ہاں۔"

"مالکن آپ کا بُلائن ہے۔"

"مالکن؟"

"ہاں..... یہاں کے سرکار کی مالکن۔"

"اچھا..... کا ہے بلائن ہیں..... کچھ اتا پتا ہے بھلا۔"

"یو سرکار آپ جان سکت ہو..... ہم کا نائیں معلوم۔"

ٹھاکر جیت پور کے نمبری زمیندار تھے اور میر محمد علی بیگ مرحوم کے ہوا خواہوں میں تھے۔ مرحوم کے ایک ایک فاتحے میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ادھر بھول کر بھی نہ گزرے تھے، اب آج اس اچانک پیام سے گھبرا گئے تھے پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، تھوڑی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب سے ملاقات ہوئی۔ چودھری گلاب سنگھ نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن ٹھاکر نے دبوچ لیا۔

"ارے چودھری، ای مالکن کا ہے بلائن ہیں ہم کا۔"

چودھری کا خون خشک ہو گیا، لیکن بازوؤں پر انگوچھا پھیلا کر بولے۔

"وہ..... وہ..... دراصل ٹھاکر صاحب مالکن نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں انھیں میری ضرورت تھی اور آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے نکلتی ہی ہے اسی لیے آپ کو....."

"اچھا..... میں کہوں کہ ایسی کیا بات آپڑی۔ پھر ٹھیک ہے..... تو مطلب یہ ہے کہ اب وہاں جانے کی چنتا تو ہے نہیں۔"

"اب آپ کیوں تکلیف کریں گے۔ میں تو آ ہی گیا۔"

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں جو سنلائٹ صابن سے بھینچا گیا تھا اور سنلائٹ صابن کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ جب دولت پور پر یہ بیتی ہے تو جیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ تو گزری ہی ہوگی۔ پھر اسی وقت کرتا کاٹنے بیٹھ گئیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہو گیا اور ان کو سوئی نظر آتی رہی وہ اسی طرح پرنم آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں اور روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد بھبھک اٹھتی تھی جیسے مالکن کے دکھ پر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی ہوں۔ دکھتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے رنجور آنکھوں سے کپڑا بھڑائے سیتی رہیں، اپنے دسترخوان کے چاک کو بھرتی رہیں، اپنے تار تار جیب کو رفو کرتی رہیں۔ جھاگ ایسی سفید تہذیب کے ویرانے میں مکڑیاں بنتی رہیں۔ ارہر کی دال چنتی رہیں اور

موتی ایسے صاف گیہوں کے اُجلے اُجلے آٹے کو گوندھنے کا سامان کرتی رہیں۔ پھر سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سُدھ ہو کر بانس کے جھلنگے پر ڈھیری ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں مہین سلائی کے پھول ایسے شبنم کی کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی، ویسے ویسے ان کے چہروں پر جھریوں کا جال اور گہرا ہوتا گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے۔ جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں اُبال کر تھالی میں ڈال دیے گئے ہوں۔ گھر پر سوگ سا چھا گیا۔ گھر والی نے پہلے خود چودھری کو سمجھایا پھر لڑکوں کو ان کے حلقوں سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہابھارت چھیڑ دی۔ جیسے جیسے بات بڑھتی گئی خون گرم ہوتا گیا چھوٹے نے، جو تاڑی کی ایک ہی ہتی میں بولایا تھا، کڑک کر کہا۔

"ارے اماں تم کا جانو..... یو بڈھا اس بڑھیا مالکن سے پھنسا ہے۔"

بوڑھے چودھری گلاب نرائن، جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، اس الزام، اس بھیانک الزام کو سُن کر دیوانے سے ہو گئے۔ وہ کھڑے ہوئے چوکھی لڑ رہے تھے۔ وہیں زمین پر دھب سے بیٹھ گئے یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے۔ چھوٹا لڑکا ثبوت دے رہا تھا۔

"جب بھیا (سیلاب) آئی رہے اوئی سال تو ای جان پر کھیل کے اوکا بدمعاش کا بچا وے گئے رہیں..... گئے رہیں کہ نائیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں"۔

چودھری گلاب نرائن کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پرچھائیں دیکھ لی۔ گویا شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فائر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنے وجود کی لاش اٹھا کر اٹھے اور کڑھتے ہوئے دروازے سے نکلے ——— اپنی چوکھٹ..... اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں ڈالی ہوئی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے چوما اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے، بغیر آنکھوں سے ایک آنسو بہائے اس پختہ کنوئیں پر چڑھ گئے، جس کی جگت آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آ کر جہازی گھڑے کی رسّی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ سارا تھان گاؤں ہل گیا۔ گاؤں کا گاؤں اُلٹ پڑا آدمی کنوئیں کے اندر اتر گئے۔ چودھری گلاب نرائن نکال بھی لیے گئے۔ لیکن وہ تو اسی وقت مر گئے تھے جب اپنے کے منہ سے اپنا مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سُنی تھی۔

کہانیوں سے..... چٹ پٹی کہانیوں سے انسانوں کو..... گاؤں کے ان انسانوں کو جن کے حواس ہر طرح کی بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں..... جو پیدائشی محبت ہوتی ہے..... جو قاتل محبت ہوتی ہے" اس محبت نے چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر لیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن..... تو چودھری گلاب نرائن پر میر محمد علی بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں ان کے مرنے کے بعد تو اور کھل کھیلیں۔ منّے خاں نے کتنا کتنا کہا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں پاکستان جانے پر۔ جہاں لوگ اپنی آل اولاد اپنے محل، دو محلے اپنے گاؤں گرام تک چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر اُنگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی راتیں عاشقوں کے بوسوں چراغوں سے جگمگا چکی تھیں۔ وہ مالکن کو گھور رہی تھیں۔ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی۔ ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح ان کی پیشانی پر جھولتی رہتی۔ نازک خدوخال کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے ڈال دیے تھے لیکن برسوں کی حکومت امارت کی بخشی ہوئی تاب، اب بھی جب وہ پلکیں اٹھا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو مخاطب کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پُرانے کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر تو ایسی جھوٹی کہانی بھی سچی معلوم ہوتی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی، بکھری ہوئی، ٹوٹی ہوئی عمارت کی یادگار میں وہ محرم کی ایک "روشن چوکی" کی طرح

یاکرتیں۔ دل ہلا دینے والی یادوں کے مؤدب قافلے ان کی کم نور آنکھوں کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتے رہتے۔ جیت، بیساکھ
بلتے تپتے دن، ساون بھادوں کی کلموہی راتیں .... سب کھوٹے سکوں کی طرح ان کے وجود کی "گولک" میں کھنکھنایا کرتیں،
ڑہ ان کی بے فیض "جھناجھن" سے بے نیاز چھوٹی چھوٹی مادّی کلفتوں کے ناقابلِ بیان بوجھ میں دبی کراہا کرتیں۔

ایک دن جب وہ چودھری گلاب نرائن کا انتظار کرتے کرتے سوکھ چکی تھیں اور ان دنوں کا، ان بھیانک دنوں کا انتظار
نے لگی تھیں جو ان کے لیے فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی ہوئی
دوں کو پھلانگ کر ان کے کچّے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی، قہقہے لگانے لگی، ان کے منہ پر تھوکنے لگی، رونق پور کی
ن کے اس منہ پر تھوکنے لگی جس منہ کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ اٹھ کر بغیر دروازوں
و ٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر دو زانو ہو کر اس خدائے قہار کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے بندوں
اپنے پیارے بندوں پر اس لیے مصیبتیں نازل کرتا ہے تاکہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔ ان کے ایمان پر صیقل ہو سکے۔ پھر
دن رونق پور کی بتیس سال کی زندگی میں پہلی بار انھوں نے چودھری گلاب نرائن کو مردے کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے
اکر حویلی کے اندرونی حصّے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی
یوں پر فرش قالین پڑے ہیں۔ ایک طرف چوکے کے مسند پر گاؤ تکیے سے لگے ہوئے میر محمد علی بیگ مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں۔ دور
نے میں سلگتی ہوئی، مہکتی ہوئی سٹک کی کامدار نے ان کے زانو پر پڑی ہے، جس کی گنگا جمنی مہنال سے ان کی انگلیاں
ل رہی تھیں —— نگاہیں دیوارگیری پر جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھی دانت کے نازک کام کی بھاری سی میز ناشتے
پلیٹوں کا بوجھ اٹھائے خوب صورت کنیز کی طرح دو زانو ہے۔ وہ اپنی مسہری سے اٹھیں۔ ایک ہاتھ میں فرشی پائجامے کے بھاری
ینچے لیے دوسرے ہاتھ سے استنبولی بیل سے جھولتے ہوئے دوپٹے کا پلّو سنبھالا۔ موٹے موٹے زیوروں سے ہلکی ہلکی زرّیں جھنکار
ر اکرتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی ملی دلی آستین پر انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے مرصع ہاتھ
ہ کر بولیں۔

"تم اتنے اداس کیوں ہو......؟"

"اداس.... نہیں تو۔"

"نہ تم نے غسل کیا...... نہ ناشتہ کیا...... کتنی دیر سے اسی طرح بیٹھے ہو۔"

"ہوں۔"

"ایک بات کہوں؟"

"ہوں۔"

"غصہ تو نہ کرو گے؟"

"آہ۔ ہوں۔"

"حکیم ڈاکٹر دوائیں کرتے ہیں۔ نصیبے نہیں بناتے.... مجھ کوکھ جلی کے مقدّر ہی میں اولاد نہیں ہے تو حکیم ڈاکٹر کیا کرلیں گے
.... میری مانو تو.... دوسری شادی...."

"چُپ رہو۔"

وہ اتنی زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے۔ کتنی ہی دیر تک ویسی ہی بھیانک
ماموشی مسلط رہی۔ پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی آ کر تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مالکن نے اشارے سے پوچھا

"کیا ہے؟"

"تھان گاؤں والا گلاب نرائن ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"

"بلاؤ۔"

دالان کے پردے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں ——— تھوڑی دیر کے بعد ایک اوسط قد کا سوکھا ساکھا سا آدمی آکر کھڑا ہو گیا ——— اس کے کُرتے کے ایک مونڈھے پر پیوند لگا تھا۔ نسبتاً اجلی دھوتی پر گھٹنے کے پاس پھانک سلی ہوئی تھی ——— دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں گرد میں اَٹی ہوئی تھیں، پنجے جوتے میں بندھے ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ٹوپی میں میل کی گوٹ سی لگی تھی۔ وہ سہما ہوا کھڑا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔

"دوا لے آئے؟"

"ہاں سرکار۔"

اس آدمی نے گڑگڑا کر کہا ———

"دے دو۔"

اس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اسی طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہے اور اس میں لبالب عطر بھرا ہوا ہے .... پھر آواز آئی ———

"اس کو، گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلوا دو!"

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔

جب وہ اپنے آپ کو ملیں تو دھوپ آنگن میں اُترنے لگی تھی اور ذہن میں آئے ہوئے جان دینے کے سارے منصوبے دیوالی کے چراغوں کی طرح بجھ چکے تھے وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر ٹوکرا رکھے ہوئے اور ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے بانکے کی بہو آ گئی۔

"ارے تم جیت پور جاؤ گی؟"

"ہاں بی بی۔"

"تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ شام کو اگر بازار آئیں تو مجھ سے مل لیں۔"

"بہت اچھا۔"

مالکن اتنا کہہ کر باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھیں کہ دروازے پر کچھ تند آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اُچھلنے پھاندنے لگیں

مالکن کا اشارہ پاکر مہترانی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لانبی دُبلی عورت کے ساتھ واپس آئی جو لال کنارے کی سفید دھوتی پہنے تھی۔ مہترانی نے اس عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ———

"ای تھان گاؤں والے چودھری گلاب کیری چھوٹی بہو ہیں..... بیلا دھر کی دُلہن۔"

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے اعصاب کو سنبھال کر یہ سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا مدارات کریں کہ اس نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کُرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر ہر جذبے سے خالی آواز میں منمنائی ———

"ای کرتا آپئے دھریو۔"

جملہ پورا کرتے ہوئے وہ تیر کی طرح آنگن ختم کر کے ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی دیواروں کے پیچ وخم میں غائب ہو گئی۔ ذرا دیر تک نرائی نے ان کا جائزہ لیا اور دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔

مالکن پھول سے کورے کُرتے داہنے ہاتھ میں اُٹھائے آنگن میں کھڑی رہیں —— جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور بیٹوں کے فاتح لشکر کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے مالکن کہہ رہی تھیں ——

"اپنے کُرتوں کی تنزیب تو آپ بھیجتے رہیے گا۔ لیکن پہلے میرے یہ چاروں کُرتے بکوا دیجیے۔"

GUFTUGU-TARAQQI PASAND ADAB No 534

اَدّو

جیلانی بانو

آج اَدّو اچانک بہت بڑا اور سب سے اہم بن گیا تھا جیسے پتھر اینوں سے کٹ کر خدا بن جاتا ہے۔

اَدّو کو بھی آج دنیا کی ہر چیز حقیر اور قابلِ تسخیر نظر آ رہی تھی، کیونکہ آج وہ اپنے آپ کو صاحب کی طرح اونچا محسوس کر رہا تھا۔ آج اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا۔ سچ مچ کا ایک روپیہ۔ اسی لیے تو جیب کی طرف سے وہ ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز اپنے آپ بغیر کسی ڈور کے سہارے آسمان پر کیسے اُڑ سکتا ہے۔ صاحب کی موٹر کیسے زن سے چل نکلتی ہے اور سرکس میں پہلوان کیسے ہاتھی کو اپنے سینے پر کھڑا کر لیتا ہے۔ "یہ سب پیسے کا کس بل ہے میاں۔" اس کا چچا مستان ٹھیک کہتا تھا۔

اسی وجہ سے آج اَدّو بھی بازار میں یوں چل رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں دو بانس اوپر ہو گئی ہوں اور وہ نیچے کی غریب مخلوق کو روندتا ہوا گزر رہا ہو۔

فٹ پاتھ کے ہر خوانچہ فروش سے اس نے پوچھا "گاجریں کتنے میں کلو دو گے! سیتا پھل روپے کے کتنے دو گے؟ ایک روپے والی آئس کریم ہے؟"

ان سب چیزوں کا نام پوچھ کر اس کے دل میں ایسی ٹھنڈک ہو گئی جیسے اس نے ایک روپے والی آئس کریم کا پورا گلاس کھا لیا ہو — اکثر جب بیگم صاحبہ کے ساتھ بازار جاتا تھا تو اسے سخت تعجب ہوتا کہ اتنے سنترے، آئس کریم، چاٹ اور مٹھائیاں بک رہی ہیں، مگر پرس میں روپے رکھنے کے باوجود بیگم صاحبہ کا دل کیوں نہیں چاہتا کہ یہ سب چیزیں کھا لیں۔ وہ بھی ایک روپے میں دنیا کا ہر ذائقہ چکھ سکتا ہے ہر چیز خرید سکتا ہے۔ پھر بے صبرا پن کیوں کرے —؟ پہلے وہ بھی تمام ندیدے بچوں کی طرح سوچا کرتا تھا کہ کہیں سے ایک روپیہ مل جائے تو منٹ بھر میں کھا پی ڈالے گا۔

مگر دولت بُردباری بھی سکھا دیتی ہے۔ اسی لیے روپیہ جیب میں تھا تو بڑا مطمئن سا ہو گیا تھا۔

روز کی طرح آج بھی بیگم صاحبہ نے لات مار کر اسے اٹھایا تو اَدّو کو کیا معلوم تھا کہ آج کا سورج اس کی قسمت بدلنے والا ہے۔ یہ سب جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے پر اس نے کبھی جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ اپنے دل سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی چوری نہ کرے گا۔ جب کبھی اس کا دل کسی چیز کے لیے للچاتا تھا تو وہ دھڑکتے دل سے الف، لام، میم کا سیپارہ اٹھا کر چوم لیتا۔ بس فوراً سکون مل جاتا۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جنت کے دروازے چوری نہ کرنے والوں کے لیے کھلے رہیں گے۔ وہ جنھوں نے چوری نہیں کی، جھوٹ نہیں بولے۔ اَدّو کے پسینے اور میل میں

ڈوبے ہوئے کپڑوں سے اچانک جنت الفردوس کے عطر کی خوشبو بھینی بھینی آنے لگتی۔ یہ دنیا تو سرائے فانی ہے۔ جو بھی تکلیفیں ہیں پل بھر میں ختم ہو جائیں گی اور پھر نیک دل انسانوں کے لیے فرشتے جنت کے دروازے کھول دیں گے۔ جب صدیق اور شفیق، مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو اُدّو دور بیٹھا مولوی صاحب کی ساری باتیں اپنے دل میں اُتار لیتا تھا۔ حالانکہ صدیق اور شفیق کو مولوی صاحب کی باتیں یاد رہیں اور نہ سبق۔ کتنی بار خوانچوں میں رکھے ہوئے پھلوں نے اسے اشارہ کیا۔ میز پر رکھی ہوئی مٹھائیوں نے اسے بلایا۔ بیگم صاحب کے پاندان سے اٹھنّی چونّی گر گئی تو اس نے جھاڑ دیتے ہوئے یوں اُٹھائی جیسے جلتا ہوا انگارہ چھو لیا ہو۔ بھلا ایک چونّی کی خاطر دوزخ کا عذاب کون مول لے گا!

رات کو جب تھکن کے مارے نیند نہ آتی تھی تو وہ سوچتا —— عید کب آئے گی۔ عید کے دن صاحب ایک اٹھنّی ضرور دے دیں گے۔ بیگم صاحبہ تو چونّی سے زیادہ کبھی نہیں دیتیں۔ شاید چھوٹے میاں بھی ایک چونّی دے دیں! ایک روپیہ ہو جائے گا۔ آٹھ آنے کی آئس کریم، دس پیسے کے چنے، چار آنے کا شربت —— ارے نہیں اتنا چٹورپن ٹھیک نہیں ہے۔ وہ روپیہ میں آپا کی منّی کو دے دوں گا۔ آپا بیچاری سسرال میں کتنی دُبلی ہو گئی ہے! ایک بار وہ پانچ میل پیدل چل کر آپا کے گھر گیا تھا تو آپا اسے دیکھ کر بالکل خوش نہیں ہوئی۔ ایک کونے میں لے جا کر بولی:

"اُدّو تو یہاں مت آیا کر۔ میری ساس طعنے دیتی ہے کہ ماموں کیا لایا ہے منّا کے لیے؟"

بس تو اب کی عید پر منّے کو ایک روپیہ دے آؤں گا۔ آپا خوش ہو جائے گی۔ مگر روپے کی بھنک کان میں پڑتے ہی اماں سر پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ بہت رونے دھونے پر شاید دس پیسے دے دے۔

بہت دن ہو گئے صاحب نے کہا تھا کہ اُدّو کو ایک چونّی دیں گے کیوں کہ وہ روز صبح ان کی کار کو آدھے میل تک دھکّا دیتا تھا۔ پھر کار کے اسٹارٹ ہوتے ہی وہ زن سے چلے جاتے اور چونّی کی بات دوسرے دن پر ٹل جاتی تھی۔

آج بھی جب صاحب کی کار کو ڈھکیلتے میں ہانپ رہا تھا تو سوچا کہ آج چونّی کی بات کیا صاحب کو یاد دلا دوں! مگر صاحب کو شاید خود ہی یاد آ گیا۔ انھوں نے پرس نکالا اور ایک چونّی ڈھونڈی۔ نہ ملی تو پرس بند کر کے پھر جیب میں رکھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اپنے میلے ہاتھوں کو دباتے میں اُدّو ہانپنے لگا۔ روز کار ڈھکیلنے سے اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ گیٹ کی طرف مُڑتے ہی اس کی نظر زمین پر گئی اور وہ تیزی سے ادھر جھپٹا اس کی مٹھی میں ایک روپے کا کرارا نوٹ تھا —— سچ مچ کا نوٹ۔ خوف اور خوشی کے مارے وہ کانپنے لگا۔ روپے کا نوٹ اتنا وزنی تھا کہ وہ روپے سمیت ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکا۔ جن کے پاس بہت سے روپے ہوتے ہیں وہ جانے کیسے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اُدّو نے بڑے دُکھ سے سوچا۔ اب صاحب کی کار چوراہے سے مُڑ چکی تھی اور کھلے ہوئے گیٹ کے باہر کوئی نہیں تھا۔ روپیہ ہاتھ میں آتے ہی اُدّو خطروں اور اندیشوں میں گھر گیا۔ وہ ایک روپے کی دولت سمیٹے اکیلا تھا اور ساری دنیا لٹیروں سے بھری ہوئی تھی۔ بوجھل پیروں کو گھسیٹتا ہوا وہ آہستہ آہستہ بازار کی سمت جانے لگا۔ اور پھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر غور سے روپے کو دیکھنے لگا۔ اسے دبا دبا کر تہ کیا، ایک کاغذ میں لپیٹا اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب اس میں ایک دولت مند انسان کی سوجھ بوجھ آ چکی تھی۔ اب اس کے منہ میں نہ جانے کتنی چیزوں کا ذائقہ گھل رہا تھا اور خوف کی دُھند چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

چاؤش کی دوکان پر ایک لڑکی ناریل خرید رہی تھی۔

"مجھے بھی ایک روپے کا ناریل دے دو۔" مگر گاہکوں کی بھیڑ میں چاؤش نے اس کی بات نہیں سنی۔ اچھا ہی ہوا۔ اگر وہ اس روپے کا ناریل کھا لیتا تو قیامت کے دن اللہ میاں اس کے ہاتھوں پر انگارے رکھیں گے، انگارے کی جلن سے گھبرا کے اس نے ہاتھ کھینچا تو روپیہ نیچے گر گیا۔ جلدی سے اٹھا کر اس نے ایک بار پھر نوٹ کو غور سے دیکھا۔ روپے پر تین شیروں کی تصویر بنی

تھی جیسے وہ شیر پہرہ دے رہے ہوں کہ اس روپے کو کوئی بے ایمان چُرا نہ لے۔

پاس سے ایک آدمی گزرا تو اس نے بڑے غور سے اَدّو کو دیکھا جیسے پہچان لیا ہو کہ وہ چور ہے۔ کہیں پولیس کو اطلاع نہ دے دے! ہتھکڑی پہن کر تھانے جانا پڑے گا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔

اللہ میاں مجھے بچالے۔ میرے مولا بلالو مدینے مجھے ——— مگر چوری کرکے مدینے جائے گا بے شرم۔ لعنت ہے تجھ پر ——— اَدّو کے بچے ——— یہ لو ——— یہ تو گھر والی گلی آگئی۔ امّاں پوچھے گی روپیہ کہاں سے آیا! جھوٹ بولنا پڑے گا ——— چوری اور جھوٹ ———؟ خوف کے مارے وہ لرزنے لگا۔

لو ——— گیارہ بج گئے، بیگم صاحب چلّا رہی ہوں گی کہ آج اَدّو کہاں مرگیا۔ گوشت، ترکاری کون لائے گا۔ جھاڑو کون دے گا ——— کپڑے کون دھوئے گا ——— بچّوں کا ٹفن لے کر اسکول کون جائے گا! وہ یوں سرپٹ بھاگا جیسے بیگم صاحب کی آواز سُن لی ہو۔ لے کر اچھا خاصا نام بگاڑ دیا۔ اس کا نام تو آدم علی خاں تھا ——— مگر انسانوں نے آدم کے نام کی جس طرح تذلیل کی ہے اَدّو بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اس کے نام کے بھی سارے پھول پتے جھڑ گئے اور وہ ترا ٹھنٹ اَدّو رہ گیا۔ اب میں یہ روپیہ آپا کی منّی کو دے آؤں۔ آپا خوش ہوجائے گی۔ ممکن ہے دال چاول بھی کھلا دے۔ اب تو بھوک لگ رہی ہے۔ آدھا دن گزر گیا۔ آج ناشتہ بھی نہیں کیا۔ مگر آپا کی سسرال پانچ میل دور تھی۔ پاؤں دُکھ جائیں گے۔

پھر بھی وہ چلتا رہا منّی کو روپیہ دینے کی خوشی میں۔ گرم سڑک پر پاؤں جل رہے تھے۔ اس روپے کی چپّل خرید لوں۔ پُرانی چپلیں موچی ایک روپے میں دے دیتا ہے مگر پھر آئس کریم کیسے کھاؤں گا؟

ایک ٹھیلے میں پکّے پکّے موز بک رہے تھے۔ بہت دنوں سے اس کا جی چاہ رہا تھا موز کھانے کو جلدی سے اس نے ایک موز خرید لیا۔ پھر جب ٹھیلے والے نے ایک اٹھنّی اور چونّی واپس کی تو اَدّو کا دل دھک سے ہوگیا۔ اب روپیہ ختم۔ صرف ایک اٹھنّی اور ایک چونّی رہ گئی۔ "نہیں چاہیے مجھے موز۔" اس نے جلدی سے موز ٹھیلے میں رکھ دیا اور اپنا روپیہ مٹھی میں دبالیا۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا ایمان بچ گیا۔ اگر موز کھا لیتا تو اٹھنّی امّاں چھین لیتی اور قیامت کے دن کوئی ماں اپنے بچّوں کو نہیں پہچانے گی۔ ہر شخص کے گناہوں کا بوجھ اسی کی گردن پر ہوگا۔ امّاں بھی اٹھنّی کے چاول لاکر پکالے گی اور دوزخ کے سانپ بچھو مجھے کاٹیں گے۔ اب آپا کا گھر سامنے نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی منّی کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی۔

منّی کو سامنے دیکھ کر وہ خوشی کے مارے دوڑنے لگا۔

مگر روپیہ منّی کو دے کر بھی تو دوزخ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

وہ ٹھہر گیا، پیاس اور بھوک کے مارے حلق خشک ہورہا تھا۔ سامنے ہوٹل کے اوپر بہت بڑی فنٹا کی بوتل بنی ہوئی تھی۔ جس میں سے میٹھے میٹھے شربت کی دھار ٹپک رہی تھی۔ کتنا مزا آئے گا یہ شربت پی کر۔ اَدّو نے مٹھی میں دبا ہوا روپیہ غور سے دیکھا۔ مگر وہ روپیہ آئینہ بن گیا جس میں دوزخ کے شعلے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

نڈھال تھکا ہوا ——— دوزخ کی آنچ میں سُلگتا ہوا، بھوکا پیاسا اَدّو آہستہ آہستہ لوٹنے لگا۔ آپا اور منّی سے ملے بغیر ———

"اے او اَدّو کے بچے۔ آج صبح سے کہاں غائب ہے تو۔ تیری بیگم صاحب خفا ہورہی ہیں۔" پڑوس کی ماما نے اسے دیکھ کر پکارا۔ گھبرا کے اَدّو روپیہ جیب میں ڈالنے لگا تو وہ قریب آئی۔ "کیا تو بنگلے سے کچھ چُرا کر بھاگا ہے آج؟" وہ ماما اسے تشویش بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں تو ——— میں چوری کیوں کروں گا!" اس نے ماما کو تو ٹال دیا مگر آنسو دب کر ٹلنے کو تیار نہیں ہوئے، کہیں

بیگم صاحب کو بھی معلوم ہوگیا کہ وہ روپیہ چُراکر بھاگا ہے تو وہ پولیس کو بلالیں گی۔ لوگ اسے چور چور پکاریں گے۔ وہ ابھی جاکر روپیہ بیگم صاحب کو دے دے گا۔ بیگم صاحب خوش ہوجائیں گی۔ سارے محلّے میں اس کی ایمان داری کے چرچے ہوں گے۔ محلے کے دوسرے نوکروں کو اس کی مثالیں دی جائیں گی اور پھر جنّت کے دروازے اس کے سامنے کھُلنے لگے۔ مرے مرے قدموں سے وہ پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس کی آمد کی اطلاع گھر میں پہنچادی گئی تھی اور سارے محلّے کی لونڈیاں بیگم صاحب کی عدالت میں اس کے مقدمے کا فیصلہ سننے کو اکٹھی ہوچکی تھیں۔

"صبح گیٹ کے پاس پڑا ملا تھا۔" میل اور پسینے میں بھیگا روپیہ اس نے بیگم صاحب کے سامنے رکھا۔ وہ ورانڈے میں کرسی پر لیٹی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ اخبار رکھ کر انھوں نے ادّو کو گھورا اور دھم سے اس کے منہ پر ایک تھپّڑ مارکر بولیں:

"چوٹٹے۔ سچ سچ بتا۔ تونے آج اور کتنے روپے چُرائے ہیں جن سے سارا دن گلچھرّے اُڑاتا رہا ہے؟"

خالی پٹاریوں کا مداری

اقبال متین

اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا —— ابا!
تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا؟
"آنسو مٹی میں گرے کہ دامن میں جذب ہو۔ پلکوں سے چھوٹنے کے بعد نہ کنکر ہے نہ موتی۔"
کیسی کیسی راحتیں تج کر عمر کی کشتی میں ڈولتے ہم کتنی مسافتیں طے کر لیتے ہیں۔ نہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہ یاد ہی کر لینے کا یارا۔

آج کوئی دامن پکڑ کر پوچھتا بھی تو نہیں جو شرم سے گردن جھک جائے اور کتنے ٹھسّے سے میں گردن اٹھا کر چلتا ہوں۔ سر افراز سربلند۔ لیکن سچ پوچھو تو ہم کہاں کہاں جا کر اس بیسوا زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں۔

راحت کی عمر ہوگی چودہ برس۔ بالی سی عمر، گڑیا کھیلنے کے دن۔ کچھ سوچے بغیر نیند کی آغوش میں اپنا آپا تج دینے کی راحتیں اور یہ لڑکی مجھے عمر کی اس منزل پر ملی جہاں ابھی ابھی میری مسیں بھیگی تھیں اور اس کے لیے درخت پر چڑھ کر پکے شہتوتوں سے اس کا دامن بھر دینا میرے لیے فخر کی بات ہوتی۔

"اللہ یہ کچی کچی املیاں"۔ راحت کا جی میرے ہوتے بھلا یوں ترس سکتا تھا۔

پتھر اٹھا کر درخت پر دے مارا اور لدی املیاں میں نے اس کے قدموں میں بکھیر دیں۔

اور ہم نے کتنی ہی کچر کچر چبا کر تھوک ڈالیں۔

برسات سے جل تھل ہوتے ہوئے میدان میں ایک دوسرے کو چھونے اور پکڑنے کو بھاگنا اور پھر ایک دوسرے کی دسترس سے بچنے کے لیے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر جانا —— پانی کے چھینٹے اڑا کر کھیلنا اور پھر غور سے ایک دوسرے کے گیلے کپڑوں میں سے چھنتے ہوئے بدن کو جھانکنا۔

پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی گھنی سیاہ اور بھیگی زلفوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹ لینا۔

وہ گر رہی تھی اور جب میں نے اس کو پہلی بار سنبھالا تھا تو جسم کے کتنے ہی خطوط، کتنے ہی زاویے، کتنی ہی قوسیں میری آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔

سنبھلنے کے لیے مجھ سے چمٹی ہوئی جب وہ کنارے تک پہنچی تو گویا وہ بھی بہت دور نکل آئی تھی۔ میں بھی بہت دور اسے

لے آیا تھا اور اب میں اسے راحت کے بجائے رات پکارنے لگا تھا۔

اب میں اس کی گڑیوں کے گھروندوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ان پٹاریوں تک جا پہنچا تھا جس میں جانے کیا الم غلم وہ سوسو جتن سے چھپائے رکھتی تھی۔

پھر جیسے سب کو چھوڑ کر اس نے گھروندوں میں . . . مجھے بسا لیا۔ ان پٹاریوں میں مجھے چھپا لیا۔

کرکٹ کا بلاّ گھما کر جب میں نے گیند پر بہت زور سے ہٹ لگائی تو یہ گیند مٹی کے اس گھروندے کو توڑ کر نکل گئی جو راحت نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی، نہ ہی میرا دل دکھا۔

میں ڈر کر اس کے قریب گیا۔ گیند کو میں نے پرے پھینک دیا تو ہم دونوں مل کر دوسرا گھروندا بنانے میں منہمک ہو گئے۔

گھروندے بناتے، مجھے ان میں بساتے، پٹاریوں میں پہلے میرے تحفے پھر جیسے خود مجھے چھپاتے۔ میری چوکھی گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے۔ جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گئی تو میں نے گرا گرا کر سنبھالتے ہوئے کنارے پر لا کر اس سے پوچھا ایک بالکل نیا کھیل کھیلوگی؟

وہ شرما گئی

پھر میں نے زیادہ چاؤ سے شہتوت اس کے دامن میں بکھیر دیے۔

کچی کچی املیوں کی پونگیں اس کے منہ میں ٹھونسیں تو اس نے زیادہ مزے لے لے کر کچر کچر چبا ڈالیں۔ ہم نے یہ نیا کھیل جاری رکھا۔ اس کی آنکھوں کے راستے میں اس کے دل میں اترتا گیا۔ پھر اس کے بدن ہی کا ایک حصہ ہو کر رہ گیا۔ کہتے ہیں حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

اپنی چھوٹی سی عمر کی مختصر سی پونجی لے کر وہ جتنی تیزی سے میری زندگی میں داخل ہوئی اتنی ہی تیزی سے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر کے مجھ سے جدا بھی ہو گئی

جب وہ اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا رہی تھی، اس وقت نہ ہی میں نے جنم جنم کے لیے اس کا ہو رہنے کی قسمیں کھائیں، نہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا کہ اب اسی طرح اس کے قدم بہ قدم زندگی کا سفر پورا کر لوں گا۔

ہمارے بنگلے کے پیچھے ایک عالی شان محل تھا جس کے احاطے میں ایک خوب صورت سا چمن تھا جو اپنی رعنائی آہستہ آہستہ کھو رہا تھا، اس محل کے ایک حصے میں راحت اور اس کی ماں رہتی تھی۔ بنگلے کا تین چوتھائی حصہ مقفل تھا۔ احاطے کے باغ میں بیرونی کمرے بنے ہوئے تھے البتہ ایک مالی ایک مالن اور اس کے بچے رہتے تھے۔ چمن کی دیکھ بھال اور راحت اور اس کی ماں کے احکام کی تعمیل ان کے ذمے تھی۔ اس کی ماں اسی بڑے گھرانے کی پروردہ تھی۔ گھر کی بیگم صاحبہ کو خوش کرنا۔ اپنی الٹی سیدھی باتوں سے ان کا دل بہلانا۔ اداس ہوں تو ہنسانا۔ ہنس رہی ہوں تو قہقہے لگوانا۔ قہقہے لگائے جائیں تو عمر بھر خوش رہنے کی دعائیں مانگنا۔ بس یہی کبھی اس کے فرائض تھے لیکن اب وہ بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں، نہ ان کو ہنسانے کے جتن کرنے والے۔ راحت کی ماں بھی اپنی دی ہوئی دعاؤں میں اثر ڈھونڈتی رہ گئی اور آہستہ آہستہ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

راحت کی ماں نے بھی اچھے دن دیکھے تھے۔ ان کے میاں صاحب کے مصاحب تھے اور یہ تھیں بیگم صاحبہ کی منہ چڑھی۔ راحت کے ابا کو اللہ کو پیارے ہوئے کوئی تین سال ہو گئے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے وہ دن نہ رہ گئے تھے کہ انھیں خوش رہنے کی دعائیں دی جاسکتیں۔

راحت کی ماں کو ماہ بہ ماہ پنشن برابر ملتی تھی۔ جاگیروں کی ضبطی کے بعد حکومت نے ان وظائف کو یک لخت مسدود نہیں کیا تھا جو پہلے ہی سے منظور تھے۔ سو انھیں ماہ بہ ماہ پنشن مل جاتی۔ اس کے علاوہ ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل بہت مرغوب

ہو گیا تھا۔ راحت کی ماں نے اپنی لاڈلی ہی کے نام سے جب یہ چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تو اسے کافی منافع ہوا اور واقعی ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل گھر گھر میں تھا۔ ہمارے گھر میں نہ صرف امّی وہی لگاتی تھیں بلکہ تحفے کے طور پر ہمارے چند رشتے داروں کو جب انھوں نے شیشیاں شہر بھجوائیں تو پھر ہر ماہ بھجوانے کا انتظام بھی انھیں کرنا پڑا۔

راحت کی ماں کہتی تھیں کہ شیشیوں کے لیبل پر جس لڑکی کی تصویر ہے' وہ راحت ہی کی ہے۔

یہ دعویٰ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا' نہ ہی میں نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہیر آئیل کی تصویر میں اگر کوئی چیز راحت سے مشابہ تھی تو بس لمبی لمبی زلفیں تھیں۔ چہرہ تو بالکل جدا تھی۔ اچھی خاصی بھرپور عورت کا۔ لیکن مجھے ان تصویروں سے بھلا لینا دینا ہی کیا تھا۔ میں تو راحت کی ان لمبی لمبی گھنی زلفوں میں منہ چھپا کر جو راحت ہیر آئیل سے معطر رہتیں' ان سے کہا کرتا:

"تم خدا کے لیے یہ تیل مت لگایا کرو راحت۔ تمھاری زلفوں میں جب منہ چھپاتا ہوں تو تمھارا یہ تیل میرے گالوں پر میرے سارے چہرے پر لگ جاتا ہے۔ سوچو تو بھلا اگر میرے چہرے پر یہ لمبے لمبے بال اُگ آئیں ــــ پھر تو تم ہی ڈر کر میرے قریب نہیں آؤ گی۔ تب میں کیسا اکیلا اکیلا پھروں گا۔ بن رات کا چندا کہیں بھایا ہے"۔ اور اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر میں ریچھ بن بن کر اسے ڈراتا۔ گدگداتا۔ اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے میرے ہاتھ ملا کر انھیں زنجیر کر دیتی۔

کیسے کیسے کھیل اس مختصر مدّت میں ہم نے رچا ڈالے۔ اپنا دامن پھیلائے وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے بغیچے کے سبھی شاداب اور رنگین پھول توڑ ڈالے اور اس کا دامن بھر دیا۔ ان پھولوں کا جب اس نے ہار بنا کر مجھے پہنانا چاہا تو میں نے جھپٹ کر اس سے ہار چھین لیا اور اس کی لمبی سیاہ راتوں جیسی زلفوں میں گوندھ کر جیسے ستارے ٹانک دیے۔

پھر انھیں سیاہ راتوں میں چھپ چھپ کر انھیں ستاروں کی چھاؤں میں کتنی ہی بار اس کا ہو ہو گیا اور وہ میری۔ ایک دن اس نے سر جھکا کر مجھ سے کہا:

"مجھے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ میرا جی اوبتا رہتا ہے۔ مجھے وہ کچّی املیاں توڑ دو نا"۔ اس سے پہلے کہ میں پتھر لے کر لدے ہوئے املی کے درخت پر دے مارتا۔ میں نے راحت کا کرتا اٹھا کر اس کے پیٹ کو سہلایا۔ پھر جھک کر چٹاچٹ پیٹ کو چومنے لگا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟"

میں نے خوشی خوشی اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے کہا "اس میں میرا بچّہ ہے پگلی"۔

اس کی آنکھیں پل بھر کو جگنوؤں کی طرح چمک اٹھیں۔ پھر صرف اس کی زلفوں کی سیاہ رات رہ گئی اور آنکھوں کے جگنو جانے کہاں جا بسے۔ میں ابھی خوش ہی تھا کہ وہ اس قدر اداس ہو گئی۔

میرے سینے پر سر رکھ کر جب وہ سسکنے لگی تو سسکتے سسکتے اس نے پوچھا "اب کیا ہوگا؟"

اور میں سوچنے لگا واقعی اب کیا ہوگا۔ میں تو اس قدر خوش ہو رہا تھا۔

راحت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک اٹھے تھے لیکن شاید یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہی نہ تھی۔

میں نے اس کو دلاسا دیا۔ جھوٹ موٹ تسلیاں دیں۔ بہلایا منایا اور جب وہ کچھ مسکرا سکی تو اس کو گدگدا کر ہنسایا اور اپنی محبتیں جھوم جھوم کر اس پر نچھاور کیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ میں اور راحت اب کچھ اور دنوں تک ایک دوسرے کے نشے میں چور نہ رہ سکیں گے۔ اب نہ میں اس کا دامن شہتوت سے بھر سکوں گا نہ چمن کے شاداب پھولوں سے۔ اب نہ ڈھیر سی املیاں اس کے حکم پر مجھے توڑ لانا ہے نہ وہ اب

میری باہوں میں جھومتی ہوئی انھیں کچر کچر چبا کر تھوکتی رہے گی۔

پانی برسا کرے گا۔ میدان بھی جل تھل ہوں گے۔ سوکھے ڈبرے پھر سے بھر جائیں گے۔ ہریالی دور دور تک مخمل کی طرح بچھی رہے گی۔ بوندیاں بجیں گی۔ خالی جھولا اس گھنے نیم کے پیڑ پر ہوا سے ہلکورے کھاتا رہ جائے گا۔ مینڈک ہر شام ٹرٹر کرنے لگیں گے۔ میں اکیلا گھر سے نکلوں گا تو راحت قدم قدم پر راستہ روکے گی۔ ہنستی، دوڑتی، اچھلتی، بھاگتی، مجھ سے چمٹی میری باہوں میں جھولتی۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی زلفوں سے زنجیر کرتی، قہقہے لگاتی۔ پھر وہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ جائے گی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جگنو دم بھر کو جھلکیں گے۔ پھر وہ گردن جھکا کر اداس ہو جائے گی۔ پھر وہ سسکنے لگے گی۔ میں اپنے تصورات کی دنیا میں اس کو کب تک اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔ ایک دن، دو دن پھر میں بھی شہر چلا جاؤں گا۔

دو دن گزر گئے۔ راحت نہیں آئی۔ جب میں ہر شام اپنے مخصوص راستوں سے ہو کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے باغیچے کے پھول رو رہے تھے۔ کانٹے ہنس رہے تھے۔ عمارت کے اس حصے میں جہاں وہ رہتی تھی، مالن دیا جلا کر رکھ رہی تھی۔ مالی نے مجھے بتایا راحت بی بی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی ماں بہت پریشان تھی اس کو علاج کے لیے شہر لے گئے ہیں۔

میں لوٹنے لگا تو راحت جیسے کرتا اٹھائے اپنا ننگا پیٹ میرے سامنے لیے کھڑی تھی۔

"اس کو چومو اس میں تمھارا بچہ ہے۔"

راحت کی ماں امی کی بڑی چہیتی تھی، اس کی خوش طبعی، اس کے آداب و تمیز، اس کے رکھ رکھاؤ کی امی دلدادہ تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے امی سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا۔ میں نے کرید کرید کر امی سے پوچھنا چاہا لیکن انھیں تو اس کا بھی علم نہیں تھا کہ راحت اور اس کی ماں شہر چلے گئے ہیں بمشکل آٹھ دن گزرے ہوں گے کہ راحت کی شادی کے دعوت نامے ہمیں ملے۔ امی نے ٹیلیگرام کے ذریعے راحت کی امی کو مبارکباد دی اور انھیں نیک تمنائیں بھیجیں۔

میں چپکے سے اس کے باغیچے میں پہنچ کر بہت سا وقت وہاں گزار آیا۔

کالج کھل گئے تو میں بھی داخلہ لینے کے لیے شہر چلا گیا کیونکہ ہائی اسکول میں پاس کر چکا تھا۔

کچھ ہی دن بعد ابا کا تبادلہ اس ضلع سے ہو گیا اور اس طرح راحت سے ملنے، اسے دیکھنے، اس سے صرف ایک بار بات کر لینے کی تمنا بھی پوری نہ ہو سکی اور اس سے پہلے کہ یہ تمنا حسرت بن کر دل میں جاگزیں ہو جاتی، اپنی موت آپ مر گئی اور وہ اس طرح کہ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

میں "رات" کو بھول بھال گیا۔ عمر کی اس منزل میں جب کہ کالی راتیں جگمگاتے دنوں سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں میں راحت کی سیاہ زلفوں میں اپنے ہاتھوں کو کب تک زنجیر رکھ سکتا تھا۔ کالج کے دن رات ہماہمی، چہل پہل، گہما گہمی۔

ہاں ایک ننھی سی یاد تھی جو دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپ کر سہمی، سمٹی بیٹھ گئی تھی۔ لرزاں لرزاں، ہراساں ہراساں، سپیرے کی پٹاری میں چھپی اسی ناگن کی طرح جس کا زہر چھین لیا گیا ہو۔ پھن کھول کر سر نکال لینا تو آئے، پر ڈس کر تڑپا لینا بس میں نہیں۔

اور یہ بے ضرر ناگن کبھی کبھی اپنا پھن پٹاری سے باہر اس وقت نکال لیتی ہے جب میرے خاندان میں کسی کو پہلونٹی کا بچہ ہوتا ہے — اور پھر خود ہی اپنا سر اندر کر کے چھپ رہتی ہے اور وقت اس پٹاری کا منہ پل بھر میں ڈھک دیتا ہے۔ راحت مجھے اس وقت بھی یاد نہیں آئی جب میں نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ الٹا۔ میں تو پلکیں جھپکا کر چودھویں کی اس چاندنی کا ہو رہا تھا جو میرے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک دن جب میری بیوی نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے بتایا کہ جی اچھا نہیں ہے۔ وہ مضمحل مضمحل سی ہے — اسے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ تو جھٹ کسی لڑکی نے کرتا پیٹ پر سے اٹھا کر مجھ سے کہا "اسے چومو اس میں تمھارا بچہ ہے۔"

مجھے راحت سے جدا ہونے کے بعد پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مداری کی پٹاری میں چھپی ہوئی بے ضرر ناگن کچھ اس طرح لہرا کر میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے ڈس لے گی۔ پتہ نہیں کس نے اس کو اس کا زہر لوٹا دیا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کے گال چوم لیے۔ اس کا پیٹ نہ چوم سکا۔

تب میں نے اس ناگن کا سر کچل دینا چاہا۔ لیکن وہ بہت تیزی سے اپنی پٹاری میں جا چھپی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے ننھے کو چوما تو اس ناگن نے لہرا کر پھر ایک بار سر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے پٹاری کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ناگن مر گئی اور میں بھول گیا کہ کوئی خالی پٹاری میں نے اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔

آج بھرے میلے میں جب میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا تو کسی عورت نے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دور پر وہ کسی دکان پر کھڑی اپنے بچوں کو کھلونے دلا رہی تھی۔ میری بیوی کسی سہیلی سے جو اسے ابھی ابھی ملی تھی، بڑی پیاری پیاری باتیں کرنے میں مگن تھی۔ آیا میرے بچوں کو پاس ہی کی ایک دکان سے کھلونے دلا رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے پھر اس عورت کو دیکھا جو مجھی کو دیکھ رہی تھی۔

کسی اضطراب کا اظہار کیے بغیر خراماں خراماں جب میں اس کے قریب پہنچا تو کوئی مانوس سا چہرہ اپنی چھب دکھلا کر سامنے آتے آتے چھپ گیا۔ پھر کسی لڑکی نے اپنا دامن پھیلا کر آہستہ سے کہا "اسے پکے پکے شہتوتوں سے بھر دو" اور جب میں نے دامن بھر دیا تو اس نے سارے شہتوت میرے قدموں میں ڈال دیے اور اپنی سیاہ لمبی رات جیسی زلفوں سے میرے دونوں ہاتھ ملا کر زنجیر کر لیے۔ "اوہ۔ راحت۔"

وہ میرے پہچان لینے سے خوش ہوگئی۔

"لیکن راحت تمھاری زلفیں" — بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

اس نے دھیرج سے کہا — "بے چاند کے کالی رات بھیانک لگتی تھی مجھے۔" وہ راحت ہیرآئیل کے لیبل کی اس بھرپور عورت سے بہت مشابہ ہوگئی تھی جس کو کبھی اس کی ماں، راحت ہی کی تصویر کہا کرتی تھی اور آج اس کی وہی سیاہ زلفیں نہ رہی تھیں جو اس تصویر سے کبھی اس کی وجہ مشابہت تھی۔

میں نے حال احوال پوچھا۔

اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔

پاس کھڑے ہوئے سات آٹھ سالہ بچے کی بانہہ پکڑ کر میرے مقابل کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس کو پہچانتے ہیں آپ؟"

البم میں محفوظ اپنے بچپن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جسے دیکھ کر میری بیوی نے کہا تھا اس وقت بھی آپ اتنے ہی شریر رہے ہوں گے جتنے آج ہیں۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ راحت نے پھر پوچھا۔

"نہیں پہچانا آپ نے؟"

تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بچے کو چمٹا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "انھیں سلام کرو۔" ننھا سا سر خم ہوا۔ ننھا سا ہاتھ پیشانی تک اٹھا۔

اور میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

میری بیوی اپنی سہیلی سے رخصت ہو کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے راحت کا تعارف اس سے کرایا "ابا کے زمانۂ ملازمت میں یہ اور ہم ایک ہی ضلع میں تھے۔ امی میں اور ان کی والدہ میں بڑا بہناپا تھا۔"

دونوں جانب سے ہاتھ اُٹھے۔
میری نظریں تو وہیں اس ننھے پر اُٹھتی رہیں۔
میری بیوی نے جب اس کو دیکھا تو اس کی نظریں بھی اسی کے چہرے پر جم کر مرکوز ہوگئیں۔ اس نے بڑی مخصوص نظروں سے مجھ کو دیکھا۔ پھر بچے کو دیکھ کر قریب کرتے ہوئے کہنے لگی "کتنا پیارا سا ہے۔"
میں نے اس کی باتوں سے بوکھلاتے ہوئے کہا "چلو چلیں اب۔"
جب ہم جدا ہونے لگے تو میں نے راحت پر بس اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لی۔ اس سے نظریں چار نہ کرسکا اور نہ بچے ہی کو دیکھا۔
جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے کسی نہ کسی بہانے پلٹ کر بچے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اور ایسے میں اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا "ابا" تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا!
راحت کی آنکھیں لیکن میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔
میری بیوی نے کہا "وہ بچہ واقعی کتنا پیارا ہے۔ آپ کے بچپن کی وہ شریر سی تصویر ہے، ہو بہو اسی طرح۔"
"اچھا؟" — میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا — " تم نے وہیں بتایا ہوتا۔"
وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ "بھلا ایسی بات میں وہاں کیسے کہہ سکتی تھی —"
مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی میرے دل میں چھپی ہوئی بند پٹاری کھول رہی ہے اور میں جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام رہا ہوں کہ اس میں ناگن ہے ڈس لے گی۔
لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔
اس میلے میں، اس چہل پہل میں، اس گہما گہمی میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری خاموش پکار سنتا کہ میں خالی پٹاریوں کا مداری ہوں۔ کوئی ہے جو میرا تماشا دیکھے۔

کونپل

انور سجاد

بھرے بھرے چہرے پر جابرانہ انداز میں کھنچی کھنچی آنکھیں بھنچے ہونٹ سیاہ نکٹائی کی امریکی گرہ میں پھنسی دوہری گردن، سیاہ کوٹ کی دائیں طرف سینے کی جیب میں ریشمی رومال جس کا سرخ رنگ وقت کے ساتھ ساتھ فیڈ ہوتا اب پیازی سا معلوم ہوتا ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے دیوار پر کیل سے لٹکی اس پورٹریٹ کے فریم کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں پڑتا ہے۔ تصویر لمحہ بھر کے لیے لرزتی ہے۔ کوٹ کے کالر کے کاج پر ایک سنہری پتنگا بیٹھا ہے جو بلب کی روشنی میں بالکل کسی تمغے کی طرح لگتا ہے۔ چھپکلی اس کی گھات میں وہیں جم جاتی ہے۔

دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ، پتنگا ایک ہی حقیقت کے انگ دکھائی دیتے ہیں۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس، اس علاقے کا انچارج میز پر جھکا، بے ضابطے کی کارروائی سرکاری سیاہی سے چوس پر سرکاری سیاہی سے تحریر کرتا ہے۔ سیاہی چوس پر پہلے ہی سے بنے چند اور کیڑے مکوڑوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کی گردن اور بھی تن جاتی ہے۔ اسے وہاں کھڑے جانے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ اسے ہلنے تک کی اجازت نہیں۔ اس کے بالکل پیچھے ایک قدم ہٹ کے دو سیاہ پوش دائیں بائیں بید لیے کھڑے ہیں۔ جب بھی وہ تھک کر اپنا پورا بوجھ دونوں میں سے کسی ایک ٹانگ پر ڈالنا چاہتا ہے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے بید زناٹے سے ہوا کو چیرتے ہیں۔ اس کی مضبوط پنڈلیوں پر پڑ کے اچھلتے ہیں۔ جبڑوں کے تمام پٹھے تن جاتے ہیں، نظریں سامنے کوٹھری کے دروازوں کی سلاخوں سے پار، تاریکی کو چیر کے کھڑکی کے راستے راہ پاتی ہیں۔

"میں ابھی لوٹ آؤں گا۔"

وہ اپنے بچے کو سینے سے ہٹا کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ بیوی گم سم اسے دیکھتی ہے، بچہ بھاگ کر صحن میں چلا جاتا ہے۔

"تم نے کیا جرم کیا پُتر؟"

اس کی ماں کے سفید بال صحن سے آتی ہوئی سرد ہوا سے کانپتے ہیں۔

"ہمارے خاندان میں آج تک کوئی۔ تم نے کیا کیا ہے؟"

بیوی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، بچہ سردی سے بے پروا بے حد خوش چوکڑیاں بھرتا صحن سے واپس آتا ہے۔

"ابا۔ ابا وہ، وہ"

بچہ باہر کی طرف اشارہ کرتا ہے، اُسے بتاتا ہے کہ جو بیج اس نے اپنے بیٹے کو بونے کے لیے دیا تھا اس کی کونپل

پھوٹ پڑی ہے۔

کچے صحن کے عین وسط میں چھوٹے سے دائرے کی صورت چنے کنکروں کے درمیان گوڑی شدہ زمین میں ایک ننھی مُنی کونپل منوں مٹی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے چیر کے اُبھری ہے۔

"ہاں بیٹے وہ، اس میں ایسے ایسے موہنے لکتے سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں کھلیں گے۔" وہ بچے کو پھر سینے سے لگا کر بھینچتا ہے، الگ کرتا ہے، بیوی کو بھرپور نظروں سے دیکھ ماں کو یقین دلاتا ہے۔

"ماں میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ جانے مجھے کیوں بلانے آئے ہیں۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔"

پھر یکدم مُڑتا ہے۔

"باہر سردی ہے بیٹے، سوئٹر پہن لو۔"

بچہ چارپائی پر کھڑا ہے۔ بیوی کا ہاتھ اسے روکنے کے لیے اُٹھتا ہے۔ دروازے کا سہارا لے کر ماں کا دل سسکتی میں رکتا ہے۔ وہ ان سب کو ٹابلو میں چھوڑ کر تیزی سے قدم اُٹھاتا باہر سڑک پر آجاتا ہے۔ دو سیاہ پوش عملاً اسے اُٹھا کر جیپ میں پھینک دیتے ہیں۔ جیپ چل پڑتی ہے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ انچارج بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے چار سیاہ پوشوں نے اپنے گھٹنوں کے درمیان رائفلوں کو جیپ کے فرش پر کھڑا کر کے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا ہے۔ وہ ان کے درمیان پھنسا بیٹھا اس قدر وی، آئی، پی ٹریٹ منٹ پر حیران ہوتا ہے۔ جیپ تیزی سے شاہراہوں پر گہری ہوتی ہوئی شام کی سیاہی پھیلاتی بھاگنے لگتی ہے۔ آسمان پر پھیلے تاریک بادل ونڈ اسکرین کے فریم میں مہیب صورتوں میں اُٹھتے ہیں۔ اسے فوراً خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو بتا کر کیوں نہیں آیا کہ تند ہوا تیز بارش اس کی کونپل کے لیے قاتل ہیں۔ جب تک کہ یہ کونپل درخت نہیں بن جاتی اور اس پر موہنے ہکتے، سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں نہیں جھومتے تب تک ——— ——— مجھے اس کو بتا کر آنا چاہیے تھا۔

اس کی نظریں کوٹھڑی کی کھڑکی سے پلٹتی ہیں۔ پورٹریٹ کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں اسی طرح جما ہے۔ آنکھیں پتنگے پر گڑی ہیں۔ چھپکلی کی دُم کا آخری سرا دیوار پر ایک ملی میٹر سرکتا ہے۔ پورٹریٹ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دیوار کی کیل پر تنی رسی جس سے یہ پورٹریٹ لٹکی ہے، ذرا سی تنتی ہے۔ کیل پر محیط رسی کے نچلے زنگ آلود، بوسیدہ حصے کے چند تاگے ٹوٹتے ہیں۔

انچارج اپنی کلائی گھما کر وقت دیکھتا ہے، سردی کو دونوں ہاتھوں میں رگڑتا ہے، دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ ایک کونے سے مبہم سی آواز آتی ہے۔

وہیں اسی جگہ کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں خود بخود کونے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اس کا لہو اس کے جسم میں رُک جاتا ہے۔ آنکھیں وہیں گڑ جاتی ہیں۔ پتلیاں پھیل جاتی ہیں۔ اس کونے میں بنچ پر بیٹھی اس کی ماں اور بیوی اس کو تکے جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا ہے ساتھ ہی اس کا قدم ان کی جانب بڑھنے کے لیے اُٹھتا ہے۔ شاڑ شاڑ۔ بید ہوا کو چیرتے اس کے جسم پر برستے ہیں۔ وہ پھر وہیں جم جاتا ہے۔ اسے ملنے کی اجازت نہیں۔

"انھیں یہاں کون لایا ہے"۔

اسے کوئی جواب نہیں دیتا۔ انچارج اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر پورٹریٹ کو دیکھنے لگتا ہے۔

پورٹریٹ مزید دو سوت نیچے سرک چکی ہے۔ پتنگا کوٹ کے کاج پر اسی طرح جما بیٹھا ہے۔ چھپکلی کے دونوں اگلے پیر

اب فریم کو پار کر چکے ہیں۔ اس کا بایاں پچھلا پیر فریم کے کونے کے قریب ہے۔ دائیں ٹانگ دُم کی سیدھ میں کھنچی ہے۔
—— بچے کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں۔
وہ بیدوں کے پے بہ پے وار سہتا، بنچ پر بیٹھی عورتوں سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھتا ہے۔
—— اس کے پاس ماسی کو چھوڑ ——
—— میں نے کہا تھا تم بولوگی نہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بھی بولا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔
—— انچارج کی نظریں پتنگے کے پیروں کا سونا چاٹنے کی خواہش میں، پلٹ کر بڑی بے دردی سے کاٹتی ہے۔ ماں، بیوی سہم جاتی ہے۔
—— یہ بڑی زیادتی —— ان شریف عورتوں کو یہاں کیوں ——
—— شریف عورتیں؟
انچارج کے گلے میں قہقہوں کا جھاگ اُبلتا ہے۔ وہ چاروں اور ماں بہنوں کی گالیاں تھوکنے لگتا ہے۔
—— تمہاری ماں بہن شریف عورتیں؟
اس کے بدن کے لہو میں طوفان آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔ وہ بڑھ کر انچارج کو ——
لیکن دونوں سیاہ پوش اسے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ تیسرا ایک نیم روشن کونے سے برآمد ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس کی قمیص کو گریبان سے پکڑ کر پھاڑ دیتا ہے۔ پھٹی قمیص سے اس کے صحت مند تندرست سینے پر سردی کی سنسناہٹ پھیلتی ہے، اس کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔
انچارج سر سے اشارہ کرتا ہے۔
تیسرا سیاہ پوش اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے باقی دونوں اسے دھکیلتے ہیں۔ ماں بیوی اسے دیکھتی ہیں پر چپ ہیں۔ تینوں سیاہ پوش اسے کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس لاتے ہیں، ان میں سے ایک اس کی قمیص کے رہے سہے چیتھڑے بھی اُتار پھینکتا ہے۔ کھڑکی سے آتی تیز تند ہوا اس کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر سر اُٹھاتی ہے۔ وہ جسم سے اُٹھتی کپکپی کو جسم میں دبا دیتا ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں ہتھیلیاں جما کر سینہ پھلاتا ہے۔ لمبا سانس بھرتا ہے۔ اب آسمان پر بادل پوری طرح جم چکے ہیں۔ مدھم مدھم کومل سُرمئی سی روشنی جو تاریک سے تاریک رات میں بھی کہیں سے آجاتی ہے۔ کڑکتی، کوندتی برق کے سامنے ہر لحہ غائب ہوتی ہے۔ ان لمحوں کے بیچ کے لمحے میں پھر آسمان کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس درمیانی لمحے کو وہ اپنے سارے وجود میں سمیٹ کر مسکراتا ہے، پلٹتا ہے۔ نظروں ہی نظروں میں ماں اور بیوی کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔
—— آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟
وہ بے صبری سے پلٹ کر سوال کرتا ہے۔
—— آپ مجھے جانے دیں گے یا نہیں۔ میرا بچہ گھر میں تنہا ہے۔
ایک سیاہ پوش ہاتھ میں پلاس لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ یکایک اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر پینترا بدلتا ہے۔
اس کا بازو اپنی بغل میں لے کر سختی سے دبا لیتا ہے۔ باقی سیاہ پوش اس کی طرف جھپٹتے ہیں۔ اسے زمین پر گرا کر اپنے قابو میں لے لیتے ہیں۔ پلاس والا اس کی شہادت کی انگلی کا ناخن پلاس کے دانتوں میں دبا کر آہستہ آہستہ کھینچتا ہے، کھینچتا ہے۔ حتیٰ کہ ناخن جڑ سے اُکھڑنے لگتا ہے۔ درد کی تمام حسیات سمٹ کر اس کے ناخنوں میں آجاتی ہیں۔ اس کے اندر کا ایک ایک خلیہ تناؤ میں جھنجھنا اٹھتا ہے، لیکن وہ اپنے چہرے پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں آنے دیتا۔ انچارج غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

وہ خود دل ہی دل میں حیران ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے کبھی جسمانی اذیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کیسی شناسائی سے اذیت اجنبی محسوس نہیں ہوتی۔ شاید جسم اور دماغ کے ہم آہنگ ہونے پر دونوں حقیقتیں دونوں اذیتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ انچارج سیاہ پوش سے پلاس چھین کر دیوانہ وار اس کا ہر ناخن کھینچتا ہے، کھینچتا ہے۔ اس کے ناخنوں کے کناروں پر خون کی لکیر ابھر کے محیط ہو جاتی ہیں۔ انچارج تھک کر لرز جاتا ہے پلاس تان کر اس کے پیٹ پر مارتا ہے، گالیاں دیتا ہوا سیاہ پوش کے ساتھ کانفرنس کرنے کے لیے پرے ہٹ جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں سُن کر ماں، بیوی کے سر اور بھی جھک جاتے ہیں۔

وہ اپنے اذیت رساؤں کو مصروف دیکھ کر یک دَم کروٹ بدلتا ہے۔ فرش پر پنجوں اور ہتھیلیوں کے بل چپکے سے چلتا اور بیوی کے قدموں میں جا پہنچتا ہے۔

ـــــ بچہ تو محفوظ ہے نا؟ بوڑھی ماسی اس کا کیا خیال ـــــ

ماں اور بیوی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔ وہ کولہوں کے سہارے بیٹھ کر جلدی سے اپنے ہاتھ بغلوں میں داب لیتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں جلتے پانی کی لکیر دوڑ جاتی ہے۔

ـــــ بچہ تو محفوظ ـــــ

عین اسی وقت آسمان سے بارش کے پہلے قطرے کا فائر ہوتا ہے۔ بارش مشین گنوں سے جلتی گولیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بچہ اپنے لحاف کو ذرا سا اُٹھا کر دوسری چارپائی کی اُور دیکھتا ہے۔ بہتّر سال کی بوڑھی ماسی لحاف میں دُبکی میں غائب غلا ہے۔ بچہ بہت محتاط، چارپائی کی چرچراہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے بس میں کرتا ہے۔ دبے پاؤں چل کر دیوار سے لگا کر اسٹول اُٹھاتا ہے۔ بند دروازے کے سامنے رکھ کر اس پر چڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ کنڈی کھولتا ہے۔ دوسری چارپائی پر قبر سی بنی لحاف کی نیند میں غائب غلا بہتّر سال کی ماسی کو دیکھتا ہے۔ کنڈی کھول کر وہ جلدی سے نیچے اتر کر اسٹول کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکتا ہے۔ دیواروں سے اچھلتی بوچھاڑ اس پر ہے۔ ٹھنڈی تخ بستہ ہوا اس کی ناک کی پھننگ سے ٹکراتی ہے۔ بچہ بڑی مشکل سے چھینک کو دباتا ہے۔ اُسے صحن میں کونپل نہیں آتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تیز بارش کا پردہ ہے۔ کارپوریشن کے پر جلتے بلب کی روشنی نے بارش کی چادر پر پھیل کر اسے اندھا شیشہ بنا دیا ہے۔ بچے کے جسم میں سردی کی سنسنی پھیل ہے۔ اسی کو چھینک آ ہی جاتی ہے۔ دوسرے بستر پر بنی قبر میں جنبش ہوتی ہے۔ بچہ روہانسا ہو کر فوراً اپنے بستر میں جاتا ہے۔ لحاف کی اوٹ سے ماسی کو دیکھتا ہے۔ ماسی پھر اپنی نیند میں قائم ہو چکی ہے۔

بچے کا دل مسلسل دھڑکے جاتا ہے، جانے باہر تیز بارش، تند ہوا میں اس کے ننھے نویلے بوٹے کا کیا حال ہوگا اس بوٹے کو کچھ ہو گیا تو؟ اس سے رہا نہیں جاتا۔ وہ بے چینی میں اٹھ کر اپنی تمام حرکات دُہراتا ہے۔ دروازے پر ہو کر اندھے شیشے سے پار دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ دیواروں سے ٹوٹتی پھُوار اسے شرابور کر دیتی ہے۔

اب ہوا کا رُخ کھڑکی کی طرف ہے۔ جہاں اسے پھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ تیز ہوا اس کے جسم پر بارش کی چاند ماری ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے جسم کے انچ انچ کو کٹے ہوئے بلیڈ چھیدتے رہتے ہیں۔ پھر جلد ہی اس کے جسم اور دماغ کی حقیقتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے سُن جسم پر بلیڈوں کے وار سہتا ہے۔

ماں اور بیوی میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں۔ ان دونوں کی نظریں پورٹریٹ پر گڑی ہیں۔ ان کے چہروں پر نفرت حقارت، غم و غصے کے تاثرات ہیں۔ چھپکلی پوری کی پوری پورٹریٹ کے فریم کے شیشے پر آ چکی ہے۔ سنہری بتنگا کالج پر تمغہ ہے

رفتہ رفتہ چلتا ہوا سر کے اس حصے پر آکر رُک گیا ہے، جہاں سے بال چھدرے ہوتے ہوتے ماتھے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چھپکلی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ اگلا دایاں پاؤں بڑھائے، پچھلی بائیں ٹانگ دُم کی سیدھ میں تان کر گھات لگاتی ہے۔ کیل کے اوپر بوسیدہ زنگ آلود رسّی کے چند اور تاگے ٹوٹ جاتے ہیں۔ پورٹریٹ چار سوت کشش ثقل کی طرف کھسکتی ہے۔

اذیت خانے کا داخلی دروازہ کھٹکے سے کُھلتا ہے۔ انچارج اور تمام سیاہ پوش اٹنشن ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی کھڑکی سے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص برساتی اوڑھے، کار سے اُتر کے دو سیاہ پوشوں کی معیت میں داخل ہوتا ہے۔ برساتی اُتار کے ایک سیاہ پوش کو تھما دیتا ہے۔ کوٹ کی جیب سے پائپ نکال کر منہ میں دباتا ہے۔ اس کے سامنے چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر گیس لائٹر سے پائپ سلگاتا ہے۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے بادل اس کے منہ سے نکلتے ہی کھڑکی سے آتی ہوا میں منتشر ہوجاتے ہیں۔

کونے سے رونے کی دبی دبی آواز آتی ہے۔ اس کی بیوی اپنے رومال کو منہ میں ٹھونسے، تھک ہار کر چھلکتے صبر کے پیمانے کو چھلکنے سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ پائپ والا منہ سے پائپ نکال کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔

——گڈ——

انچارج بڑے فخر سے اپنی کارگزاری سُناتا ہے۔ پائپ والے کا چہرہ مطمئن ہے۔ وہ پائپ والے کی طرف لپکتا ہے۔ دو سیاہ پوش فوراً بڑھ کر اسے پکڑ لیتے ہیں۔

——میرا جُرم——میرا جُرم؟ یہ لوگ——

انچارج کی تیز زبان اُسے کاٹتی ہے۔ ماں بہن کی گالیاں۔ ماں بیوی کے سر زمین پر جھکے اٹھ نہیں پاتے۔ انچارج کے اشارے پر ایک سیاہ پوش کونے میں پڑے کڑوے تیل کے کنستر میں ڈوبا کوڑا نکالتا ہے۔ دو بڑھ کر اسے گھسیٹ کے تاریک کوٹھری کے جنگلے کے ساتھ اس کی کلائیاں اور پیر باندھ دیتے ہیں۔ کچھ اس انداز میں جیسے یسوع مسیح کو سولی پر باندھا گیا تھا۔

سیاہ پوش کوڑے سے زائد تیل نچوڑ کر پائپ والے کو اجازت طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ پائپ والا منہ میں پائپ رکھ کر کش لیتا ہے۔ سیاہ پوش کوڑا لہراتا ہے۔

پہلا وار——

اس کے دانت اور آنکھیں بھنچ جاتے ہیں۔ پشت کے ریشے لمحہ بھر کے لیے سُن ہو کر تڑپتے ہیں۔ وار کے بعد اس کا منہ کُھلتا ہے۔ آنکھیں جنگلے کے باہر کوٹھری کے اندھیرے میں شعلے پھینکتی ہیں۔

دوسرا وار، تیسرا، چوتھا——

اب اس کی پیٹھ کے پٹھوں کے تمام ریشے مسلسل تناؤ میں ہیں۔ اس کی آنکھیں مسلسل بھنچی ہیں، جن کے سامنے مرکز سے سرخ نقطہ ابھرتا ہے، افق سے افق تک تنتا ہی چلا جاتا ہے۔ چیخیں ہر وار پر اس کے گلے میں آ کے اٹک جاتی ہیں۔ پائپ والا حیران ہے کہ اتنی اذیت کے باوجود یہ چیختا کیوں نہیں۔ اس کی ماں اور بیوی اس منظر کی تاب نہ لا کر بنچ پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں میچ لیتی ہیں۔ ماں، دوسرے ہاتھ سے اپنی گرم چادر کے دامن میں اپنی بہو کے سر کو بھی چھپا لیتی ہے۔

کوڑے مارنے والا ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس کے پٹھوں کا تناؤ ختم ہوجاتا ہے۔ آنکھیں کُھلتی ہیں۔ وہ جس طرف دیکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے مرکز سے اُبھرتا سُرخ نقطہ تاریکی کو روشن کرتا، افق سے افق تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔

وہ تھکاوٹ سے چور، جنگلے سے بندھا، لٹک جاتا ہے۔

پورٹریٹ تین سوت اور نیچے لٹک گئی ہے۔ دو ایک تاگوں کے سوا رسّی کے زنگ آلود حصے سے تمام تاگے ٹوٹ گئے ہیں۔ پورٹریٹ کے ماتھے پر چھپکلی اور پتنگے کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

ایک سیاہ پوش بڑھ کر اس کی کلائیوں اور ٹخنوں سے رسّیاں کھولتا ہے۔ وہ بے جان، فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انچارج اپنے فل بوٹ کی نوک اس کی پیٹھ سے لگا کر زور سے دھکیلتا ہے۔

پائپ والا پلٹ کر اسٹول پر پڑی دہکتی کوئلوں کی انگیٹھی پر، جو اس عرصے میں ان میں سے ایک لا کر رکھ گیا ہے، اپنے ہاتھ سینکتا ہے۔ انچارج میز سے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے کرتا ہے۔ پائپ والا پائپ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتا، کاغذات کا سرسری مطالعہ کرتا ہے۔ انچارج کو شاباشی دیتا ہے۔ انچارج سیلوٹ کرتا ہے، اس کا جی باربار سیلوٹ کرنے کو چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ صاحب بُرا نہ مان جائے ایک ہی سیلوٹ پر اکتفا کرتا ہے۔

—— یہ لوگ مجھے بلاوجہ گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔

پائپ والا اسے مڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ فرش پر گھسٹتا اس کے قریب آتا ہے۔ چند قدم پرے رُک کر ہانپنے لگتا ہے۔ انچارج اور سیاہ پوش اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پائپ والے کے ہاتھ کے اشارے سے رُک جاتے ہیں۔

—— بہت ڈھیٹ ہے۔

انچارج کے لہجے میں خفّت ہے۔ پائپ والا خاموشی سے فرش کو دیکھتا ہے۔

—— آپ۔ آپ۔ پڑھے لکھے ہیں۔ افسر تو بعد میں بنے۔ مجھے یاد ہے طالب علمی کے زمانے میں آپ بھی ——

—— شٹ اپ، تم میرے بارے میں اتنا جانتے ہو!

پائپ والے کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ پیٹ کا سارا لعاب پل بھر کے لیے پھنس جاتا ہے۔ پائپ کا کش لے کر وہ اس کیفیت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے وہ دیوانہ وار قہقہے میں فرش پر جھک جاتا ہے۔ پائپ والے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔

—— خاموش ——

—— جی اچھا۔ بہت بہتر، بہت مناسب —— یہ بتائیے، میں چور ہوں، بدمعاش، غنڈہ، جواری، زانی، شرابی، قاتل، ڈاکو یا اسمگلر ہوں، جو مجھے یہاں لایا گیا ہے؟

پائپ والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ بات اس کی ذات پر پھیلتی خود ہی سمٹ گئی ہے۔

—— یا میں اپنے وطن کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوں جو آپ مجھے اذیتیں دے کر سازش کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

انچارج ایک طرف کھڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ صاحب خواہ مخواہ اسے بکنے کی اجازت دے رہے ہیں، وہ ابھی ایک سیکنڈ میں اس کی زبان بند کر سکتا ہے۔ لیکن پائپ والا اپنے ہر حکم کا جواز دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ جواز نہ بھی دے تو بھی اس شخص کو جو فرش پر بیٹھا اپنے آپ کو شریف اور معزز شہری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

—— میری ماں، میری بیوی کی بے حرمتی ----

وہ تقریباً روہانسا ہو جاتا ہے۔

—— تمھارا صرف ایک جرم ہے۔ تم کسان ہو۔ مزدور، کلرک ہو، شاعر ہو، خطرناک قسم کے بلڈی پوئٹ۔

—— میں بیک وقت یہ سب کچھ؟

—— ایک عرصے سے تم یہ سب کچھ ہو۔ تمھاری فائل کہتی ہے۔ آج دوپہر تم نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔

—— میں نے کچھ ثابت نہیں کرنا چاہا تھا۔

—— تو پھر تم ہجوم کے درمیان چبوترے پر کھڑے کیا بک رہے تھے؟

آواز کی آرزوئیں، وہ خواہشیں، وہ خیال، وہ لفظ جنھیں میں نے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا، آج ان کی نجات کا دن تھا۔ اور میں ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔ ہم آزاد ہیں، غلام نہیں۔

—— تم واقعی خطرناک شاعر ہو۔

—— میں یہاں ایک ہوں۔ اگر خواہشوں، خیالوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے تو باہر سارا ہجوم، سارا شہر، سارا ملک، ساری کائنات خطرناک ہے۔ انھوں نے اپنے مقدر پر لگی جبر و استبداد کی مہریں توڑ ڈالی ہیں۔

پائپ والا بڑے اضطراب سے پائپ کو منہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جماتا ہے۔

—— آپ کی بدنصیبی ہے کہ آپ نے مہریں لگانے والی مشین کا پرزہ بننا پسند کیا۔

پائپ والا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ وہ میز کا سہارا لے کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے۔ میز کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔

—— تم بہت بولتے ہو۔

پائپ والا جلدی سے پلکیں جھکا کر کہتا ہے۔ سر کے اشارے سے انچارج کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ انچارج کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھتا ہے۔

دو سیاہ پوش اسے وہیں میز کے پاس فرش پر پھر سے گرا دیتے ہیں۔ دو اور ساتھ مل کر اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ انچارج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کو اس کے جبڑوں کے دونوں طرف جما کر پوری قوت سے دباتا ہے۔ وہ مدافعت کرتا ہے، لیکن اسے منہ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ پائپ والا ایک چھوٹا سا دہکتا ہوا انگارہ بیسٹڈ کے کلپ میں انگیٹھی سے اٹھا کر اس کے قریب لاتا ہے۔ انگارے کی حدت اور سرخی سے اس کی آنکھوں کو سکون پہنچتا ہے۔

—— تم واقعی بہت بکواسی ہو۔

پائپ والا اس کے کھلے منہ کے راستے دہکتا انگارہ اس کی زبان پر رکھتا ہے۔ کونے میں گرم چادر کے نیچے ماں اور بیوی ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔ وہ سیاہ پوشوں کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے۔ چیختا ہے۔ ماں بیوی کان میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ پائپ والا انگارہ اٹھا کے پھر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے منہ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پرے پھینک کر بڑے اطمینان سے اٹھتا ہے، سوچتا ہے — اب یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا۔

عین اسی وقت پورٹریٹ کی رسی کا ایک اور تاگا ٹوٹتا ہے۔ پورٹریٹ چند سوت اور کشش ثقل کی جانب سرکتی ہے۔ اب صرف ایک تاگا رہ گیا ہے جس کے سہارے پورٹریٹ کیل پر ٹنگی ہے۔ چھپکلی اگلا دایاں پاؤں اٹھائے، ماتھے کے تمغے سنہری پتنگے پر اب جھپٹا ہی چاہتی ہے۔ وہ فرش پر لیٹا اپنے جسم کے تشنج پر قابو پا کر حواس مجتمع کرتا ہے۔ اجتماع میں بھڑکتی جلی زبان سے ان تمام لفظوں کا سیلاب امڈ آتا ہے، جو آج دوپہر ہجوم کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے تھے۔ درد، اذیت اور غصے میں جلتی زبان سے لکنت میں ابھرتے الفاظ، پائپ والے اور دیگر سیاہ پوشوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔

یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا۔ اپنی دانست میں ان بے معنی آوازوں کو سنتے ہوئے پائپ والے اور اس کے حواریوں کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔

قہقہے، کونے سے ابھرتی ماں اور بیوی کی سسکیاں، اس کی جلی ہوئی لکناتی زبان سے دیوانہ وار نکلتے لفظ اور باہر کڑکتی بجلی، سرد ٹھنڈناتی ہوا پر تیز بارش کا ممتاثر۔

کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے، اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچّے کو یکدم ترکیب سوجھتی ہے۔
وہ دروازے سے ہٹ کر، جلدی سے مڑتا ہے۔ پل بھر کے لیے دوسرے بستر پر تنفس سے ابھرتی، ڈوبتی رضائی کی قبر کو دیکھتا ہے۔ اپنی چارپائی کے پاس آکر جلدی جلدی جوتا پہنتا ہے، اپنی پوری قوت سے اپنے بستر کا لحاف اٹھاکر اوڑھتا ہے۔ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ صحن کے عین وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس ننھی منی کونپل کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیتا ہے، جو منوں مٹی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے چیر کے ابھری ہے۔ اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے موہنے مہکتے، سرخ سرخ پھول، فانوسوں کی صورت جھولیں گے۔

دو بھیگے ہوئے لوگ

اقبال مجید

بالکل اچانک بارش شروع ہوگئی۔ گرد آلود زمین پر انتہائی موٹی موٹی بوندیں، اتنی تیزی سے یلغار کرنے لگیں کہ لوگوں کو جسم پر ان کی چوٹوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ بارش ہوگی، نہ تو موسم ہی تھا اور نہ ایسے آثار ـــــ خلاف توقع کوئی بڑی تبدیلی ہمیں سب سے پہلے چونکاتی ہے اور پھر ہمارے معمول میں خلل پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے سڑکوں اور چوراہوں کا سارا انتظام درہم برہم کر دیا تھا۔ لوگ گھروں سے نہ تو برساتیاں لے کر نکلے تھے اور نہ چھاتے۔ اپنے اپنے بچاؤ کے لیے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے یہاں کسی چیز میں استحکام نہیں ـــــ تڑا تڑ بوندیں گرنے پر میں بھی سٹپٹا گیا۔ فوری طور پر میں نے بھی وہی فیصلہ کیا جو اس وقت عام طور پر دوسرے لوگوں نے کیا تھا۔ میں بھی اس وقت سڑک پر چل رہا تھا۔ جیسے ہی بارش شروع ہوئی میں نے بھی بھاگ کر سب سے پہلی چھت کے نیچے پناہ لی۔ ابھی میں چھت کے نیچے پہنچ کر اپنی جگہ پر سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ گرتا پڑتا ایک آدمی میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایک بار دیکھا۔ پھر دونوں اپنی اپنی سانسوں پر قابو پانے میں لگ گئے۔ میں نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا۔ قمیص اور پتلون پر ایک نظر ڈالی اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھلا بتائیے کون کہہ سکتا تھا کہ بارش ہونے لگے گی!"

میرے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے سلسلہ شروع کیا۔ میں اس وقت قطعی کسی راہ و رسم کو بڑھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جواب میں کھڑا رہا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

خیال تھا کہ بے موسم کا چھینٹا ہے دو چار پل میں کس بل نکل جائے گا۔ لیکن ایک بار آسمان پر جو نظر پڑی .... تو سمجھ میں آیا کہ اتنے بہت سے بادل اس قدر آس پاس چھپے ہوئے تھے اور ہم میں سے کسی کو ان کی خبر تک نہ ہوئی ـــــ دیکھتے دیکھتے موسلا دھار پانی گرنے لگا۔ گھٹائیں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ سامنے سڑک پر ہجوم تھا، ایک پرنالے کی طرح بہنے لگی تھی۔ میں ابھی پہلو بدل کر ان حالات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سر اور کندھوں پر ٹھنڈی ٹھنڈی کچھ بوندوں کے گرنے سے چونک پڑا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمارے سروں کے اوپر آسمان کے بجائے چھت تھی۔

شاید میرے قریب کھڑے ہوئے آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ یکبارگی ہم دونوں نے دوسری بار ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ساتھ ہماری نگاہیں اوپر اُٹھ گئیں۔

ہم جس پناہ میں کھڑے تھے وہ ایک پرانا سائبان تھا جو کسی پرانے مکان کے صدر دروازے کے سامنے نکلا ہوا تھا اور جس کی لمبائی مشکل سے پانچ فٹ اور چوڑائی دو گز رہی ہوگی۔ ہماری پشت پر صدر دروازہ تھا جس میں تالا لگا تھا۔ سائبان کی چھت پرانی وضع کی تھی جس کی بوسیدہ دھجیاں نیچے کو جھکی پڑ رہی تھیں اور ان پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے یہ بوندیں موٹی ہوتی جاتیں، اور جب اپنا وزن سادھ نہ پاتیں تو پکے ہوئے آم کی طرح ٹپ سے گر پڑتیں۔ یکبارگی ہوا نے بڑی بے رحمی کے ساتھ ہماری سمت رُخ کیا اور ایک بہت ہی دبیز سا چھینٹا ہم دونوں کو گھٹنوں تک بھگوتا چلا گیا۔ میں تلملا کر پیچھے ہٹا۔ میرے قریب کھڑا ہوا آدمی تو جیسے اچھل پڑا۔ حالانکہ پیچھے اب گنجائش نہ تھی لیکن وہ آدمی کچھ اس طرح کی کوشش کر رہا تھا جیسے دروازے کی دیوار اس کی مزاحمت پر قدرے پیچھے ہٹ جانے کو تیار ہو جائے گی۔ ہوا کا جھونکا تو آیا اور چلا بھی گیا لیکن سائبان کی دراڑوں اور دھجیوں سے بوندوں کا سلسلہ تیز تر ہو چکا تھا۔ میرا ساتھی اب بار بار پہلو بدل رہا تھا اور اپنے آپ میں سکڑتا جا رہا تھا۔

میں نے سامنے کھلی ہوئی سڑک پر نظر ڈالی۔ کبھی کبھی کوئی موٹر تمام شیشے چڑھائے چھپاچھپ کرتی گزر جاتی۔ اکا دکا سائیکل سوار دانتوں پر دانت جمائے سامنے جسم سے شرابور پیڈل پر زور مارتے دکھائی دیتے۔ ان سائیکل سواروں نے بارش کو جس نقطۂ نظر سے دیکھا تھا وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اکتا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کرتا اور پاجامہ پہنے تھا۔ کرتے کے مونڈھے پوری طرح بھیگ گئے تھے۔ چھت سے گرنے والی بوندوں نے اس کے سر، پیٹھ اور بانہوں کو اچھی طرح بھگو دیا تھا۔ اس کے پاجامے کی دونوں مہریاں گھٹنوں تک بوچھار کی چوٹ سے پہلے ہی زخمی ہو چکی تھیں ــــ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں ایک ہی حمام میں تھے۔ اپنا یہ انجام دیکھ کر میں جھنجھلا اُٹھا۔

"کبھی یہ بارش تو اب رُکنے کی نہیں۔" میں نے پہلو بدل کر کہا اور اپنے ساتھی کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس سے اپنی پچھلی برتی ہوئی بے رُخی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

"جی ہاں بادل گھر گئے ہیں۔"

"اور یہ بھی جگہ کچھ محفوظ نہیں دکھائی دیتی۔" یہ کہہ کر میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی دیکھا اور ایک بار پھر ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ دراصل میں اب اکتانے لگا تھا۔ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگوں۔ مجھے سڑک پر اکا دکا لوگ اس پانی میں جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی میں اُلجھ ہی رہا تھا کہ میرے سر پر پھر کچھ بوندیں گریں۔ میں نے جلدی سے پہلو بدلا، لیکن ساری چھت ہی شاید ٹپک رہی تھی۔ جس طرف بھی میں سکڑتا بوندیں میرے تعاقب میں لگی رہتیں۔ یہی حال اس اجنبی کا بھی تھا۔ وہ بھی بہت تیزی سے اس مختصر سی جگہ میں کئی بار اپنی پوزیشن بدل چکا تھا۔ جھنجھلا کر اس سے مخاطب ہوا "آیئے ہم لوگ نکل نہ چلیں!"

جواب میں اس نے میری طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور پھر ایک کونے میں سکڑ گیا۔ شاید اسے میری بات اس حد تک مضحکہ خیز لگی تھی کہ اس نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

لیکن میری اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے اب شاید گھٹن سی ہونے لگی تھی۔ چھت سے مسلسل ٹپکنے والی بوندیں تیروں کی طرح میرے جسم کو چھید رہی تھیں۔ میرے تلووں کے نیچے کی زمین اب کیچڑ میں تبدیل ہو چکی تھی اور آس پاس کے ننھے منے گڑھوں میں اتنا پانی آنے لگا تھا کہ جتنا لاڈلے اور ضدی بچے پیالوں کی تہوں میں دودھ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف قدرے غور سے دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر اس اکتاہٹ اور بے زاری کا کہیں نام ونشان نہ تھا، جو میں محسوس کر رہا تھا اور پھر میں نے انتہائی کینہ توز نظروں سے اس کے ارادوں کو بڑی ہوشیاری سے ٹٹولنا شروع کیا کہ شاید اس نے سڑی گلی چھت کے نیچے کھڑے رہنے کے سلسلے میں اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ لیکن مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ

ڈھیٹ بنا کھڑا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور اس بار قدرے ترش روئی سے مخاطب ہوا۔
"کیا آپ سمجھتے ہیں یہاں کھڑے رہنے سے آپ اپنے کو بھیگنے سے بچالیں گے؟"
"مشکل نظر آتا ہے۔" اس نے بے دلی سے کہا۔
"کیا آپ کے خیال میں یہ بارش اگلے دس پانچ منٹ میں رک سکے گی؟"
"آثار تو ایسے نہیں ہیں۔" اس نے پھر الفاظ چبا چبا کر جواب دیا۔
"تو پھر یہاں جھک مارنے سے فائدہ؟ جب بھیگنا ہی ہے تو پھر اتنی بے بسی کے ساتھ کیوں بھیگیں!"
"اور تھوڑا دیکھ لیتے ہیں ممکن ہے تھم ہی جائے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ اور اپنی بھیگی ہوئی قمیص کے دامن سے جواب بدن پر کھال کی طرح چپکا ہوا تھا چہرہ پونچھنے لگا۔

میں نے اپنی اندرونی الجھن و گھٹن دور کرنے کے لیے ایک لمبی سانس لی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ بارش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اسی تیزی اور تندی کے ساتھ پانی ہر طرف ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہا تھا۔ میں نے بڑی بے چینی کے ساتھ اپنے دائیں بائیں ایک بار پھر نظر دوڑائی۔ دور دور تک کوئی بھی ایسا مقام نظر نہیں آیا جہاں بھاگ کر پناہ لی جا سکتی۔ کچھ دور پر ایک پٹرول پمپ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کے بعد ایک رہائشی عمارت کے کمپاؤنڈ کی چہار دیواری تھی جو کچھ دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس مکان سے واقف تھا۔ اس میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی جس کے پھاٹک پر اس کی نیم پلیٹ سے بھی بڑے ایک بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "کتوں سے ہوشیار۔" ابھی میں اپنے دائیں بائیں جھانک تانک میں لگا ہوا تھا کہ ایک کتے نے ہماری چھت کے نیچے آکر اپنے کان پٹپٹائے۔ ہم دونوں نے بیک وقت اس کو وہاں سے بھگا دیا۔

"دیکھیے اس طرح کھڑے رہنا حماقت ہے۔" اس درمیان میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔
"تو پھر کیا کریں؟" وہ اپنے کندھے ڈانتا ہوا بولا۔
"ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔"
"مگر بارش بہت تیز ہے۔"
"تو کیا ہوا؟" مجھے غصہ آ گیا۔ "ہم لوگ تو ویسے بھی سر سے پیر تک بھیگ چکے ہیں۔ آپ کو اب بھی یہ خوش فہمی ہے کہ اس چھت کے نیچے آپ محفوظ ہیں؟"
"لیکن پھر بھی ..... " یہ کہہ کر وہ تذبذب میں پڑ گیا۔
"خیر صاحب میں تو اب یہاں ایک منٹ بھی نہ رکوں گا۔ میں تو چلتا ہوں۔"
"جیسی آپ کی مرضی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو اور سکیڑ لیا۔

اس کے جواب پر میں دل ہی دل میں اور بھی جزبز ہوا۔ میں سمجھا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کچھ مشترک تھا۔ سفر کا ارادہ، یکبارگی بارش میں پھنس جانا، ایک ایسی چھت کے نیچے سر چھپانا جس کی رگ رگ چھدی ہوئی تھی اور پھر ایک ہی کیفیت میں دونوں کا لگاتار بھیگنا۔ اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ ایسے حالات میں ہم دونوں کی سوچ بھی کم و بیش مشترک ہوگی لیکن وہ ایسی حماقت آمیز حرکتیں کر رہا تھا جن کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے سینہ تان کر اپنا ایک پیر زمین سے اوپر اٹھایا اور اپنے بھیگے ہوئے پتلون کی مہریوں کو سمیٹ کر اوپر چڑھانے لگا۔ مجھے الجھن تھی، غصہ تھا، اپنے اندازے غلط ہوتے دیکھ کر ایک طرح کی جھنجھلاہٹ تھی۔ ہم دونوں کی سوچ میں بڑا فرق تھا۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ ہمارے نفع نقصان کے پیمانے بھی میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ ٹپکتی ہوئی چھت سے دھیرے دھیرے، تھوڑا تھوڑا

کر کے بھیگنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا پورا جسم شرابور ہوجاتا لیکن پھر بھی وہ چھت اس کا پیچھا نہ چھوڑتی، اس کو بھگوتی رہتی۔ رستے رستے کر بوندیں گرتی رہتیں۔ بالوں پر گر کر کنگھی سے ہوتی ہوئی پیٹھ پر رینگتی ہوئی ایڑی کے آخری سرے تک پہنچ جاتیں بھیگنے کا یہ عمل آہستہ اور سست رفتاری سے تھا لیکن وہ اتنا بھی بے وقوف نہیں تھا کہ اس کے انجام سے واقف نہ ہو، پھر کیوں وہ اس چھت سے چمٹا ہوا تھا۔ شاید اس نے قناعت کرلی تھی جو کچھ پہلی کوشش میں ہاتھ آگیا تھا بس اسی کو بہت جانا تھا

کاہل ــــ

کوڑھ مغز ــــ

پست ہمت اور مُردہ ــــ

میں نے زمین پر تھوکا اور والہانہ انداز میں دوڑ پڑا۔ ہوٹل سے باہر سینہ تان کر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہوا کے تیز جھونکوں اور بوچھاروں کے تیز طمانچوں نے میرا استقبال کیا۔

کاوش ــــ

ــــ EXPLORATION

تلاش ــــ

یہی زندگی ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ زندگی اور موت کی سوچ میں بڑا فرق ہے۔ چھت کے نیچے دھیرے دھیرے اب بھی ٹپک رہی ہے، دھیرے دھیرے بھیگنا اور بھیگے ہوئے بدن پر دھیرے دھیرے ہوا لگتے رہنا تو اور بھی نقصان دہ ہے۔ اسے ضرور ٹھنڈ لگ جائے گی۔ مجبوری ہے ہم سب ہی اپنی پسند کی موت مرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اپنے اپنے سلیکشن ہیں۔ ہر آدمی کینسر سے مرنا پسند نہیں کرتا جس طرح ہر آدمی ریل سے کٹ کر مرنا پسند نہ کرے گا لیکن اگر اسے ٹھنڈ لگ گئی اور ڈبل نمونیہ اور وہ مر گیا تو سب کیا کہیں گے۔

بے وقوف! ایک ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے سالہا سال کھڑا رہا اس امید پر کہ شاید بارش تھم جائے۔

کام چور، بدخصال اور ناکارہ لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ سوچ کا فرق ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم زندگی کو کیسے دیکھتے ہیں؟ مرنا تو سب کو ہے یہ اتنا اہم نہیں، اہم یہ ہے ہم کس طرح مرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اس پر بات کی جاسکتی ہے۔ ایک اچھا موضوع ہے۔ کافی ہاؤس پہنچ کر پنکھے کے نیچے کھڑا ہو جاؤں گا۔ ٹیریلین کی قمیص پتلون ہے، پانچ منٹ میں سوکھ جائے گی تب میں ان لوگوں سے پوچھوں گا جو میرے ساتھ تھے وہ کس کے لیے مرنا پسند کریں گے۔ کس طرح یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن کس مقصد کے لیے موت انھیں قبول ہوگی؟ کیا ایک ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے ڈبل نمونیہ کا شکار ہوکر مرنا ایک عظیم مقصد ہے۔ میں جانتا ہوں وہ لوگ میری بات سنیں گے۔ مجھ سے کہیں گے کہ تم میں ۱۹۶۰ء کے بعد کی چیتنا بول رہی ہے تب میں ان سے کہوں گا کہ ہاں تم لوگ ٹھیک کہتے ہو، یہی بڑا فرق ہے، سوچ کا فرق اور پھر میں انھیں بتاؤں گا کہ اب بھی ایک آدمی اس چھت کے نیچے کھڑا ہے جو کھلے آسمان کی بارش کے نیچے بھیگنا پسند نہیں کرتا لیکن بھیگ رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں آیا لیکن میں کھلے آسمان کے نیچے بھیگتا ہوا آیا ہوں۔ پوری بارش میرے اوپر سے گزر گئی ہے۔ میں نے پوری بارش کو اپنے بدن پر جھیلا ہے۔ تب کافی ہاؤس کی آرام دہ کرسی اور مضبوط چھت کے نیچے پہنچا ہوں۔ میں نے ایکسپلور کیا ہے، اسرٹ کیا ہے۔ تلاش کے لیے بوچھاروں کے طمانچے کھائے ہیں۔ مجھے پانی سے ڈر نہیں تھا، لگاؤ تھا۔ لگاؤ ــــ وہ لوگ اس لفظ پر ضرور چونکیں گے۔

بوچھاروں کی موٹی موٹی یلغار نے میرے اندر حیرت جگائی تھی جستجو کے لیے اکسایا ہے۔

حیرت اور جستجو! وہ لوگ ان لفظوں کو بھی سنبھال کر رکھ لیں گے تو میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ میرے اندر پوری قوت کے ساتھ یہ عقیدہ موجود تھا کہ اس بارش سے پیار کرکے اس کے ساتھ بہہ کر میں ضرور ایک نئی اور بہتر صورت حال تک پہنچوں گا۔

عقیدہ ـــــ وہ اس لفظ کو بھی جلدی سے اپنے قبضے میں کرلیں گے۔ اور پھر وہ اس بھیگتے ہوئے آدمی کی طرف سے لاپرواہ ہوکر مجھ سے چھینے ہوئے چاروں لفظوں کو کنجوس کی طرح دھیرے دھیرے نکالیں گے۔

لگاؤ ـــــ

حیرت و جستجو ـــــ

اور عقیدہ ـــــ

پھر ان سب کی آنکھیں طوطے کی طرح ہوجائیں گی اور وہ دھیمے دھیمے لہجے میں مجھے بتائیں گے کہ رگ وید کے انسان کے پاس یہ چار عظیم چیزیں موجود تھیں۔

لگاؤ، حیرت و جستجو اور عقیدہ ـــــ

ہمارے پاس ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا اور یہی ساری الجھن ہے۔ ہم لوگ وید نہیں لکھ سکتے لیکن تم اس بھیگتے ہوئے آدمی کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟؟

لیکن بارش ـــــ سڑک پر چلتے چلتے یکبارگی مجھے احساس ہوا جیسے پانی برسنا تھم گیا ہو۔ ذہن کا سارا تناؤ جیسے ڈھیلا پڑگیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل تیزی سے بھاگ رہے تھے اور بوندیں گرنا نہ جانے کب بند ہوگئی تھیں۔ کافی ہاؤس ابھی دور تھا، بھیگی ہوئی لمبی سڑک پر میرے ٹخنے اپنے آپ لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔ میری قمیص اور پتلون دونوں کھال سے چپکی ہوئی تھیں۔ اندر کے بنیائن کے کٹاؤ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میری جیب میں چارمینار کی ڈبیا میں صرف ایک سگریٹ تھی۔ ڈبیا نکال کر میں نے سڑک کے دونوں طرف دیکھا۔ کچھ قدم آگے سڑک کے ایک کنارے چائے کی ایک دکان دکھائی پڑی جس کی بھٹی کے کوئلے پانی کی بوچھار پاکر اور سرخ ہوگئے تھے ہوا اب بہت ٹھنڈی تھی۔

سرخ سرخ انگاروں والی بھٹی کے پاس کھڑے ہوکر میں نے ڈبیا سے سگریٹ نکالی جو پوری بھیگ چکی تھی۔ سگریٹ ہونٹوں سے لگاکر میں بھٹی کے قریب کھڑا ہوکر اپنے کو نچوڑنے لگا۔ ماچس لے کر سگریٹ جلائی اور دو چار کش لیے ہی تھے کہ سگریٹ کا کاغذ اپنے آپ ہی گھلتا چلا گیا اور ہونٹوں پر تمباکو کے بہت سے ریشے چپک گئے۔ سگریٹ تھوک کر میں نے چائے والے سے ایک کپ چائے مانگی اور بھٹی سے اپنے آپ کو سکھانے لگا۔ پانی تھمتے ہی سڑک پھر سے چل چکی تھی۔

"تو صاحب اب کپڑے سکھائے جا رہے ہیں۔" کوئی میرے پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہی اجنبی ہنستا ہوا چائے خانے میں داخل ہو رہا تھا۔

"آیئے چائے پئیں۔" ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں قریب ہی بیٹھ گیا۔ ہوا بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ میرے کپڑے کی نمی اب قدرے کم رہ گئی تھی۔

"آپ نے جلدی کی دس منٹ بعد بارش تھم ہی گئی۔" اس نے اپنی قمیص کا دامن نچوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی طرف بے دلی سے دیکھا اور بڑبڑایا۔

"اور اگر نہ تھمتی؟"

"مجبوری تھی۔"

مجھے اس کے اس جواب پر افسوس ہوا، قیمتی لفظوں کا بے محل استعمال اتنا ہی افسوسناک ہوتا ہے جتنا ایک شکاری کے لیے شیر کی گولی سے چڑیا کا شکار کرنا۔

"آپ ایک معمولی آدمی ہیں۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"اچھا؟" یہ کہہ کر اُس نے سوالیہ نشان بنایا "کیسے؟"
"جیسے کہ اور سب معمولی لوگ ہوا کرتے ہیں۔"
وہ میری بات پر قطعی دُکھی نہیں ہوا۔ صرف ہنس دیا اور جب چائے آئی تو اپنی پیالی میں مزے سے چمچہ چلانے لگا۔
"میں یہ بات سنجیدگی سے کہنا چاہوں گا کہ آپ یا آپ جیسے لوگ خود اپنی جگہ پر ایک مجبوری ہیں۔"
وہ پھر غمگین نہیں ہوا بلکہ میری بات پر ہنس دیا اور میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا "میں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو شاید آپ اس پر ناراض ہیں۔"
"بے تکی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں"۔ اب مجھے غصہ آگیا۔ "آپ میرا ساتھ کیا دیتے کوئی میں نپولین تھا۔ جو واٹرلو کو فتح کرنے جا رہا تھا اور مجھے ساتھی درکار تھے۔ میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کہی تھی۔"
"کون سی بات؟"
"یہی کہ بھیگنا تو یوں بھی ہے آیئے نکل چلیں۔ میں پوچھتا ہوں آپ بھیگنے سے بچ گئے؟"
جواب میں اس نے میری قمیص کی طرف غور سے دیکھا۔
"یہ کپڑا شاید پولی اسٹر فیبرک کہلاتا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"جی ہاں! لیکن بھیگتا یہ بھی ہے۔" میں نے طنز کیا۔
"پتلون بھی اسی کپڑے کا ہے شاید۔" اس نے میری پتلون کو نظروں سے ٹٹولا۔
"جی ہاں۔"
"آپ کی قمیص میں جیب تو ہے نہیں؟"
"جی نہیں۔"
جواب پا کر چپ ہوگیا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اس بار ذرا اونچی آواز میں کہنے لگا "ویسے مجھے اس بات کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتائیں کہ کپڑوں کے علاوہ آپ کے ساتھ اس وقت کیا اور کوئی چیز ہے؟"
"کیا مطلب؟" میں نے بات کی وضاحت چاہی۔
"میرا مطلب ہے کہ آپ کی پتلون کی جیبوں میں اس وقت کون کون سی چیزیں ہیں، میرا مطلب ہے جیسے روپیہ پیسہ۔"
"ہاں کچھ ریزگاری پڑی ہے۔"
"کوئی نوٹ؟"
"نہیں ہے۔"
"کوئی تصویر ـــــ ایسی تصویر جسے آپ رکھنا چاہتے ہوں جو آپ کو بہت عزیز ہو۔"
"نہیں ہے۔"
"کوئی ایسا کاغذ یا کوئی مسودہ جو آپ کے لیے بہت قیمتی ہو، یا کم سے کم جس کی حفاظت آپ کے لیے ضروری ہو۔"
"نہیں ہے۔"
"کوئی ایسی دوا میرا مطلب ہے گولیاں یا کیپ سول جو قیمتی خواہ نہ ہوں لیکن اس لیے اہم ہوں کہ انھیں ایسے بیمار کو دیا جاتا ہے جو اسے اگر جلد مل جائیں تو وہ بچ سکتا ہے۔"
"نہیں ایسی بھی کوئی چیز نہیں۔"

"کوئی تعویذ کہ جس پر آپ کو بھروسہ ہو کہ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا فتح و کامرانی آپ سے منہ نہیں موڑے گی۔"
"یہ سب کیا بکواس ہے؟"
"یعنی نہیں ہے۔"
"ہاں نہیں ہے۔"
"آپ کے پاس ایک پتلون، قمیص، ایک جوڑا جوتا اور کچھ ریزگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس وقت؟"
"نہیں۔"
"میری قمیص سے پہلے آپ کی قمیص سوکھے گی کیونکہ پولی اسٹر فیبرک ہے۔"
"جی ہاں۔"
"اسی طرح سے میری پتلون سے پہلے آپ کا پتلون سوکھے گا۔ ٹھیک؟"
"ٹھیک۔"
"تو پھر۔" وہ مسکرایا۔
"تو پھر کیا؟"
"آپ کے پاس جوتے، قمیص، ریزگاری کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لیکن میرے پاس ہے، آپ کے لیے اگر جوتے، قمیص، پتلون اور ریزگاری بھی بھیگ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میں جوتے اور قمیص اور پتلون کے بھیگ جانے پر بھی اس چیز کو بچانا چاہتا ہوں۔"
"کس چیز کو؟" میں طیش میں آکر چیخ پڑا۔
"وہی جو میرے پاس ہے آپ کے پاس نہیں۔"
"آخر کیا ہے آپ کے پاس؟ وکیلوں کی طرح پھانسنے کی کوشش مت کیجیے۔" مجھے غصہ آگیا "دنیا میں کچھ ضروری نہیں یہ سب بکواس ہے۔"
لیکن وہ کچھ نہیں بولا آرام سے چائے والے کو پیسے دیے اور باہر نکل کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "جب آپ کی جیب میں کوئی ایسی چیز ہو کہ جس کی حفاظت آپ کرنا چاہیں تو آپ بھی باہر بھیگنے کے بجائے چھت کے نیچے بھیگنا پسند کریں گے اور اس وقت وہ آپ کی مجبوری ہوگی۔"
اور وہ چلا گیا۔ میرے جسم پر پولی اسٹر فیبرک پورا سوکھ چکا تھا۔

بجوکا

سریندر پرکاش

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت سے ابھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے جو اب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا۔ اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے۔ بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا ـــــ اور ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلے میں مارے جانے والے کے۔ اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنوئیں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اس کی بڑی بہو کنوئیں سے پانی نکال کر ان پر باری باری انڈیلتی جا رہی تھی۔ اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اچھال رہے تھے ـــــ چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی۔ اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ ان کے قریب ہی رکھی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

"سب تیار ہیں؟" اس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بابو ـــــ" سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلو درست کیے اور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا ـــــ سب جھوٹ بول رہے تھے ـــــ اس نے سوچا۔ یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ ان کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے، پوتیاں اور بہوئیں ـــــ ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے ہوئے کٹائی کے اوزار نکالے۔

اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

ان کا کھیت لہلہا اُٹھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا ــــ کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے۔ نہ اہلمد کی دھونس نہ بنیے کا کھٹکا۔ نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمین دار کا حصہ ــــ اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اُٹھے۔

"چلو باپو!" اس کے بڑے پوتے نے اس کی اُنگلی پکڑ لی۔ باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آ گئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے ــــ جو جیب گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے تھے۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب کسان کی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کتا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ دور طویلے میں کچھ گائیں بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے ــــ ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دور جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا جس میں جھونا پک کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔

وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے سوکھی گھاس پر رینگ رہے ہوں ــــ وہ سب اپنے کھیت کی طرف جا رہے تھے جس کے آگے تھل تھا۔ دور دور تک پھیلا ہوا، جس میں پاؤں رکھتے ہی آدمی دھنس جاتا تھا ــــ اور مٹی یوں بھربھری ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا جب تک بچے جوان ہوں، وہ تھل اس کے کھیت تک نہ پہنچے اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصہ بن چکا ہو گا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں....

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اَٹ گئے۔ کئی اردگرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی بہنے کو نہ تھا۔ اندر ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے ــــ اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا ــــ فصل کٹے گی تو ان کا آنگن بھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھری اناج سے۔ پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ ان سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری کو اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

"ابے کون ہے ..... رے ..... رے ــــ؟"

اور پھر سب نے دیکھا ان کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے ــــ اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلایا۔

"ابے کون ہے رے ــــ بولتا کیوں نہیں ــــ کون فصل کاٹ رہا ہے میری ــــ؟"

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آچکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سراپ سراپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

"کون ہے حرام کا جنا ــــ بولتا کیوں نہیں؟" اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی درانتی سونت لی۔

اچانک کھیت کے پرلے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا ابھرا اور جیسے مسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو ــــ پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"میں ہوں ہوری کاکا ــــ بجوکا" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ ان کے رنگ زرد پڑ گئے۔ اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی ــــ کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے ــــ وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ ــــ اس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصے سے کانپتی ہوئی آواز نہ سنی۔ انھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

"تم ..... بجوکا ..... تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا ــــ بانس کی پھانکوں سے۔ اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر کی بیکار ہانڈی سے بنا تھا اور اس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پتلا میری فصل کاٹ رہا ہے؟"

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا ــــ جیسے اس پر ہوری کی کسی بات کا اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے۔ انھوں نے دیکھا ــــ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ درانتی اس کے پاس کہاں سے آئی ــــ وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا تھا ــــ مگر آج ــــ وہ آدمی لگ رہا تھا ــــ گوشت پوست کا ان جیسا آدمی ــــ یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے زوردار دھکا دیا ــــ مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا ــــ سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا ــــ سب نے اسے سہارا دیا اور اس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو ــــ تو مجھ سے ــــ بھی طاقت ور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے ــــ؟ جس نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ــــ اپنی فصل کی حفاظت کے لیے۔"

بجوکا حسب معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا "تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا۔ میں نے تو صرف اپنے حصے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی ــــ"

"لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کے حصے لینے کا ــــ تم کون ہوتے ہو ــــ"

"میرا حق ہے ہوری کاکا ــــ کیونکہ میں ہوں ــــ اور میں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے۔"

"لیکن میں نے تو تمھیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ــــ یہ تمھارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی؟"

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو ــــ اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو؟"

"لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی ــــ؟ میں نے تو نہیں دی تھی!"

"یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی ــــ جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں، انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بیکار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منہ بنایا تھا ــــ اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی۔ اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا۔ اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں آہستہ آہستہ نکلتی رہی ــــ اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن میں نے تمھاری امانت میں خیانت نہیں کی ــــ میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو ــــ" بجوکا نے آہستہ آہستہ سب سے کہا ــــ تاکہ ان سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ سب سازش ہے۔ میں تمھیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلاوا ہے۔ میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ میں تمھیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا ــــ" ہوری چیخا، اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی ــــ پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجوکا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت کو اپنا فیصلہ سُنانا تھا۔ مقدمے کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا ــــ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا اسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس نے پنچایت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھا حصہ بجوکا کو دینا منظور کرلیا۔ اور پھر کھڑا ہوکر اپنے پوتوں سے کہنے لگا۔

"سنو ــــ یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی ہَل کھیت سے کچھ دوری پر ہے ــــ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں اپنی فصل کی حفاظت کے لیے کبھی بجوکا نہ بنانا ــــ اگلے برس جب ہل چلیں گے ــــ بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا ــــ تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا ــــ بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمھاری فصلوں کی حفاظت کروں گا جب تک ہَل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا۔ اور تمھارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہوجائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں ــــ وہیں رہنے دینا ــــ تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا ــــ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا ــــ آپ سے آپ اسے زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اسے درانتی تھما دیتا ہے اور اس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہوتا ہے۔"

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے اور پوتیوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا ــــ اور باقی سب لوگ یہ تماشا دیکھتے رہے ــــ بجوکا نے اپنے سر پہ رکھا شکاری ٹوپا اُتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

چوراہے پر ٹنگا آدمی

انور قمر

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر تختوں سے۔ گلے میں رسّی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چوراہے پر جھول رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ٹیری کاٹ کی سفید قمیص اور ٹیری وول کی سلیٹی رنگ کی پتلون غیر شکن آلود تھی۔ سیاہ جوتے پر پالش بھی خوب چمک رہا تھا۔ نائلون کے ذرا سے نظر آتے موزوں کا لاسٹک بھی کسا ہوا تھا۔ اس لیے موزے اپنی جگہ پر چست بیٹھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑا محتاط شخص ہے۔

اس کے پیچھے کو بندھے داہنے ہاتھ میں اٹیچی لٹک رہی تھی، جو کھُل چکی تھی۔ اس میں بنے خانوں میں ایک بال پین اور ایک پین ٹنکا ہوا تھا۔ دوسرے سے ایک ڈائری کا اوپری سرا جھانک رہا تھا۔

جب بحیرۂ عرب کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تھا تو اس کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کو اُڑنے لگتے۔ کھُلی ہوئی اٹیچی میں سے بھی اکّا دکّا کاغذ اُڑ پڑتے اور وہ اس رسّی پر ٹنگا ٹنگا اِدھر اُدھر جھول جاتا۔ جھولنے کے عمل کے دوران ہر مرتبہ اس کی سیاہ فریم والی عینک ناک سے ذرا نیچے کھسک آتی اور اب ہر لحہ کی ٹک پر اس کی ناک سے گر پڑنے والی تھی۔

چرچ گیٹ اسٹیشن کے حلق سے اُگلے ہوئے تمام لوگ اس کے داہنی طرف جمع تھے۔ مرین ڈرائیو کی طرف سے آنے والے اس کے سامنے کی طرف جمع اور اس کی بائیں طرف وہ لوگ جمع تھے جو اِدھر اُدھر کی درمیانی سمتوں سے چلے آئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا لیڈر، کوئی مہاپُرش، کوئی مہاتما یا کوئی پیغمبر ان سے خطاب کرنے والا ہو اور یہ سب کے سب بڑی عقیدت سے اس کا خطبہ سننے چلے آئے ہوں۔

وہ سب کے سب ایک دوسرے کی صورتوں سے واقف تھے۔ اُن سبھوں کو معلوم تھا کہ انھیں کپڑے کیوں ڈستے ہیں! جوتے کیوں کاٹتے ہیں! کھانا کیوں بدمزہ لگتا ہے اور پانی کیوں نمکین لگتا ہے!

دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ان میں موجود ہر شخص چوراہے پر جھولتے اس شخص کو اپنی شبیہہ سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود چوراہے پر لٹک رہا ہے۔

اسٹیشن کے پورٹیکو کے اوپر نصب گھڑی نے دس بجائے۔

نیلکو (Nelco) کی سکنڈ، منٹ اور گھنٹے میں وقت بتاتی گھڑی نے دس بجائے۔
یونیورسٹی ٹاور کے کلاک نے دس بجائے۔ اور تمام لوگوں کی رسٹ واچوں نے دس بجائے۔ لیکن آج جو دس بجے تھے وہ کل کے سے نہیں تھے اور ممکن ہے کہ آیندہ کل کے سے بھی نہ ہوں۔ کیوں کہ ان تمام لوگوں کو اس وقت اپنے اپنے آفسوں میں اپنے اپنے ٹیبلوں کے پیچھے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود ہونا تھا لیکن یہ سب کے سب آج اس چوراہے پر ٹنگے اس آدمی کے گرد جمع تھے۔

سب کے سب خاموش! سب کے سب موشن لس (Motion Less) غیر متحرک! ان کی تو آنکھیں بھی مجسموں کی آنکھوں کی طرح پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور دل! وہ بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

"کچھ کہو۔ ۔ ۔ ۔ کچھ کہو——"

وہ سب یک زبان ہو کر بولے۔

"میں کیا کہوں؟ میں کیا کہوں؟—— میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہیں! اور پیر حرکت کرنے سے معذور! میں تو اشاروں میں بھی بات نہیں کرسکتا اور نہ یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہوں۔"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟—— تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

ان سبھوں نے اس چوراہے پر لٹکے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ—— تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اس نے وہی سوال ان سے کر دیا۔

"ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے قہقہہ لگایا—— "ہا—— ہا—— ہا' جب تمھیں خود ہی نہیں معلوم—— اور تم سبھوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو' تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟ اپنے آپ ہی سے پہلے پوچھ لیتے——!"

"تم مہان ہو!" وہ سب بولے۔

"اس لیے کہ چوراہے پر لٹک رہا ہوں؟"

"نہیں—— تم وہاں کھڑے ہو جہاں سے ہم سب نظر آرہے ہیں—— اور ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

"ہر بلندی سے نیچے کی چیز نظر نہیں آتی۔ اونچائی اتنی ہی ہو کہ جہاں سے سب کچھ نظر آسکے۔"

"تو کیا تم بہت اونچائی پر لٹک رہے ہو؟" ان سبھوں نے کہا۔

"ہاں——!"

"کیا تمھیں ہم نظر نہیں آرہے ہیں؟"

"مجھے تمھارے سروں کا کالا سمندر نظر آرہا ہے—— اور کچھ نہیں!"

"تو کیا تم کچھ نیچے نہیں آسکتے؟"

چوراہے پر ٹنگے اس آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہا—— ہا—— ہا' تم جانتے ہو کہ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ میرے پیر بھی

حرکت کرنے سے معذور ہیں ـــــ تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی جگہ سے کیسے جنبش کروں ؟..... البتہ تم چاہو تو مجھے نیچے اُتار سکتے ہو۔ تم چاہو تو مجھے کم بلندی پر ٹانگ سکتے ہو۔ اور تم چاہو تو مجھے اور زیادہ بلندی پر بھی اُٹھا سکتے ہو !"

"ہم تمھیں نیچے اُتارنا چاہتے ہیں"۔ ان سبھوں نے کہا۔

"میں تیار ہوں"۔

"ہم تمھیں مناسب اونچائی پر ٹانگنا چاہتے ہیں"۔

"مجھے منظور ہے"۔

"ہم تمھیں بہت زیادہ اونچائی پر اُٹھا دینا چاہتے ہیں"۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے"۔ چوراہے پر لٹکے ہوئے آدمی نے کہا۔

"یہ کیا بات ہے کہ تم تینوں حالتوں میں رہنے کو تیار ہو ؟" انھوں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں ان تینوں حالتوں میں تم سبھوں سے الگ رہوں گا۔ اس لیے خوش رہوں گا۔ بہت زیادہ اونچائی پر بھی ـــــ کم اونچائی پر بھی ـــــ اور زمین پر بھی"۔

"وہ کیسے ؟ زمین پر تم ہم سب سے الگ کیسے رہ سکتے ہو ؟"

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے پھر قہقہہ لگایا ـــــ

"ہا ـــــ ہا ـــــ ہا" اب میں کبھی صبح اخبار نہیں پڑھوں گا ـــــ کبھی چائے نہیں پیوں گا ـــــ کبھی بوٹ پالش نہیں کروں گا ـــــ کبھی داڑھی نہیں بناؤں گا ـــــ کبھی ریڈیو نہیں سُنوں گا ـــــ کبھی کام پر نہیں جاؤں گا ـــــ کبھی راہ چلتے اشتہار نہیں پڑھوں گا ـــــ کبھی کسی کو تھینک یو نہیں کہوں گا........ کیوں کہ میں اپنی زندگی کے پہیے کو گھماتے گھماتے بور ہو گیا ہوں۔ بے زار ہو گیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ وہ پہیا جس محور پر گھوم رہا ہے وہ اپنی جگہ ہی پر قائم ہے۔ جب محور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا تو پہیا کیوں کر حرکت کرے گا ـــــ میں وہیں ہوں جہاں تھا۔ اور اگر محور اب بھی نہ بدلوں تو سالہا سال تک وہیں رہوں گا۔ اس لیے اب محور ہی کوئی اور ہوگا۔ نیا ـــــ انوکھا ـــــ اچھوتا ـــــ !"

دو آدمی دائیں طرف کے درخت پر چڑھ گئے۔ اور دو بائیں طرف کے درخت پر ! آناً فاناً انھوں نے رسّے کی گرہیں کھولیں اور بڑی آہستگی سے رسہ چھوڑتے ہوئے اس آدمی کو نیچے اُتارا ـــــ

اس آدمی نے زمین پر قدم رکھتے ہی بڑی اجنبیت سے اس جمِ غفیر کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان تمام کا اس سے جو اجنبی سا رشتہ قائم ہوا تھا ـــــ وہ اس کی اجنبی نظروں نے توڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی طرف بڑی گرم جوشی سے بڑھے۔ تاکہ اسے گلے لگالیں، اور پوچھیں کہ اب اس کا نیا محور کون سا ہوگا ؟ کیوں کہ وہ سب کے سب اپنی زندگی کے پہیے کو ایک ہی غیر متحرک محور پر گھماتے گھماتے بور ہو گئے تھے، بے زار ہو گئے تھے ـــــ تھک گئے تھے ـــــ اور اس نے وہ جو تازگی، فرحت اور کشادگی کی بات کہی تھی، انھیں بہت پسند آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے تو ادھر اُدھر نظر دوڑائی ـــــ اس کے بیگ کے تمام کاغذات دور دور تک بکھرے پڑے تھے۔ اس نے انھیں جمع کیا۔ بیگ میں رکھا اور بیگ بند کر دیا ـــــ جیب سے کنگھی نکالی۔ بال بنائے۔ چشمہ ناک پر دُرست کیا اور رومال سے منہ صاف کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک سمت کو چل پڑا ـــــ وہ سب کے سب اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ عمارت کا داخلی دروازہ مقفل تھا۔
وہ بڑبڑانے لگا — "کیا آج چھٹی ہے؟"
"کیا آج میں گھر سے جلدی چلا ہوں؟"
"کیا آج کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟"

دوسرے روز حسب معمول اُس نے اپنے چائے کے پہلے پیالے کے ساتھ اخبار دیکھا اور یہ خبر پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ کل فلورا فاؤنٹن کے چوراہے پر ایک شخص نے اپنے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی — جس کی لاش دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے — اور وہ لوگ اُس وقت تک جمع رہے تھے جب تک چوراہے پر ٹنگے اس شخص کی لاش نیچے نہیں اُتاری گئی۔

سخی

کلام حیدر

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے، جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں، وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوئے ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے، میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینے میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے، کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، میں نہیں جانتا، کیا کرتا ہے، یہ بھی نہیں جانتا، منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے، صرف میں جانتا ہوں —— بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین بیڑی دکان، پورنیہ ——

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگالی ہے، اور بالائی ہونٹوں سے اُلجھ رہی ہے، میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ، ایک سیٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اُترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواسکتا ہے —— پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لیے اس کا پتا پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا —— "معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجیے"۔ چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اُٹھائی ہے اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج ہوگی، میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے، میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے، جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے، آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دُھندلا ہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی اُنگلی کا ناخن نکیلا

اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رُک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایک کے سر پر "دلی والوں" جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال اُلجھے اُلجھے ہیں۔ دونوں اندر آجاتے ہیں۔

اور میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے۔ اچانک وہ زور سے لڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھنڈی ہاتھوں پر رکھے کسی اُردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا، چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورہ کرنے کے بعد دو شیرمال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے جیسے اُسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو، میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، جس اخبار کے اڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی، اب وہ اڈیٹر نہیں آیا، جس نے مجھے ترجمے کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں، میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھیپ سکوں۔

دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیرمال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سُرخی مائل حصّہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اُٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ اڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے، اور میں سوچ رہا ہوں، مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اور اُس کے کوئی بچّہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں کہ اس کے کوئی بچّہ ہے یا نہیں۔

میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دلی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اُس کا ساتھی آدھی سے زائد شیرمال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اُٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ اڈیٹر اب نہیں آئے گا، اور میں نے چار دن یونہی بے کار گنوا دیے ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی، آفسوں کے چکر لگائے جا سکتے تھے، دکانوں کے کج خلق مالکوں سے نوکری کی درخواست کی جا سکتی تھی، کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی، مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچّہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا، اور تب میں سوچتا ہوں، یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتے دار وغیرہ ہوگا یا پھر دوست ہو سکتا ہے اور سکینہ .....

اب یہ کیا تک ہے کہ اڈیٹر وعدے کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے، شرافت حسین اور سکینہ کی

رشتے داری کی نوعیت کی فکر ہے، مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیر مال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں، اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کرنے کے بعد میں نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی ۱۳ تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے، ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے۔ اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلاہٹوں میں ہے وہ فراقِ یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جدا ہو جانے کے بعد اڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا ——— سوچ رہا ہوں یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کر چکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل پر سے اٹھایا نہیں ہے، تو یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کر دے گی اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر اور یہ زکریا اسٹریٹ اور یہ دلکشا ہوٹل۔

دل سے مانتا ہوگا مولا بخش سکینہ کو جبھی تو ———

اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور اب وہ میرے قریب آگیا ہے اور کہہ رہا ہے "ہم کل آئیں گے جی ——— آپ رہیں گے نا؟ ———"

میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا........

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوا ہوں، میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیے سے دبے پڑے ہیں اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی سی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہے جس پر ایک امریکن عورت ہوائی جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے میں امریکن کلینڈر...... میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں، بھوک لگ رہی ہے، بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ ڈوری پر ٹنگا ہوا پینٹ پہن لیتا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا، کچھ سہارا ہو جائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا اور تب سوچتا ہوں، انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں۔

اور میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے اور میں اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں، بی بی سکینہ۔ معرفت شرافت حسین بیڑی دکان پورنیہ.... مولا بخش معرفت...... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ساتھ ہی کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آگیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ

مجھے فرصت ہے، وہ کہے تو منی آرڈر لگا دوں۔

"آپ —— ؟" وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے، ایک کام ہی اس کا کر دوں گا تو چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہو گئی ہے اور میں دلکشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال، قورمہ اور سیخ کباب لاکر رکھا ہے اور میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آرہی ہے۔

میرے ذہن میں اس اڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمے کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اور اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے، کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا۔ ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سینما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا ہے۔

میں شیرمال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اتر رہا ہوں —— پانچویں منزل سے اترتے ہوئے میرے پاؤں دُکھنے لگے ہیں اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن دور کر رہا ہوں۔

میری جیب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رُخ کولوٹولہ کی طرف کر دیا ہے، چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آگیا ہوں جو جاپانی بم باری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آگیا ہوں جہاں اُردو رسالوں کی دکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ سکینہ کا خیال مجھے آتا ہے۔ پھر مجھے اس کو بھی کا خیال آتا ہے جو تھیٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لیے آج شام کو بُلایا گیا ہے۔ کیا پتا آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے، وہی زکریا اسٹریٹ اس کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔

"ایک غریب مر گیا ہے، کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجیے۔"

میں قریب جاتا ہوں، میں چونک جاتا ہوں، میں پھر قریب جاتا ہوں —— فیتے سے بند ہونے والی گھنی ایک کان کی کٹی ہوئی لو۔

مولابخش ــــــ ! میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں ــــــ سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں "یہ کیسے مرا؟"

"ٹرک سے کچل کر۔"

نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکّر آنے لگا ہے۔ ناخدا مسجد ہے، مولابخش ہے، جس کے کفن دفن کے لیے ایک آنے، دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے۔

کالے ناگ کے پُجاری

سلام بن رزاق

”شہر کے سارے پھاٹک بند ہو چکے تھے اور فصیلوں پر سیاہ پوش سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے لمبے لمبے نیزوں کی انیاں آسمان کی جانب اٹھی ہوتی تھیں۔ بعض سپاہی اپنے اپنے چلّوں پر تیر چڑھائے چوکس نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ اگر انھیں ایک متنفس بھی فصیل کی طرف یا دروازے کی سمت بھاگتا دکھائی دیتا تو فوراً دو چار تیر ایک تیز سنسناہٹ کے ساتھ چلّوں سے نکلتے اور مفرور شخص کے جسم میں پیوست ہو جاتے۔ اگر کوئی سخت جان ان تیروں کی زد سے بچ جاتا تو شہر کے پھاٹکوں پر کھڑے سپاہی اپنے بڑے بڑے جال ان پر پھینکتے اور اسے فوراً گرفتار کر کے ایک مخصوص قسم کے بورے میں بند کر دیتے اور وہ سر بہ مُہر بورا کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ شہر کی سڑکیں صبح سے شام تک سیاہ سپاہیوں کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سے گونجتی رہتیں اور عجیب پُراسرار قسم کی جھنکاریں فضا میں سرسراتی رہتیں جیسے ہوائیں کسی اندرونی کرب سے سسکیاں بھرتی گزر رہی ہوں۔ ایک عجیب ماتمی کیفیت شہر کے طول و عرض پر مسلّط تھی۔ فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔“

داستان گو بوڑھا ایک لمحے کو رُکا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈبّے میں صرف چھ سات مسافر باقی رہ گئے تھے اور بوڑھا داستان گو اپنے پُراسرار وجود کی بنا پر اساطیری کہانیوں کا کردار لگ رہا تھا۔ مسافروں کی خوف اور حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں بوڑھے کے جھُرّیوں دار چہرے پر گڑی تھیں۔ بوڑھا چند لمحوں تک اسی طرح خاموشی سے کھڑکی کے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر کھنکار کر بولا:

”شہر میں صرف دو قسم کے لوگ رہتے تھے۔ ایک وہ جو کالے ناگ کے پجاری تھے اور دوسرے وہ جو صرف کالے ناگ کے لیے چارے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ کالے ناگ کے پجاری مضبوط آہنی دیواروں کے پیچھے بڑی محفوظ اور پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ جب کہ باہر لوگوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔

”سڑکیں، فٹ پاتھ اور گلیاں، ہر جگہ سڑے گلے انسانی جسموں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ جو محض اس لیے زندہ معلوم ہوتے تھے کہ ابھی ان کی سانسیں چل رہی تھیں۔ لوگ ہر وقت جنازے اور ارتھیاں اٹھائے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر سے گزرتے نظر آتے۔ جھکی ہوئی گردنیں اور لٹکے ہوئے چہرے لیے لوگ دھیرے دھیرے اسی طرح قدم اٹھاتے جیسے انھیں موت کی سزا سُنا دی گئی ہو۔ یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا۔ شہر کی ساری سڑکیں قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں کے دروازے پر جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ جن کے پھاٹکوں پر جلی حروف میں ”خوش آمدید“ لکھا ہوتا تھا۔ بازاروں اور دوکانوں میں کٹے پھٹے انسانی اعضا سجاتے جاتے تھے۔ قہوہ خانوں میں خون سے لبریز پیالیاں کھنکتی رہتیں۔ دوائی اور انجکشنوں کی ہر شیشی پر سرخ حروف میں لکھا ہوتا تھا —— ”موت“

”سب کچھ اس طرح الٹ پلٹ گیا تھا کہ لوگ ہمیشہ یہ محسوس کرتے رہتے جیسے وہ سڑکوں پر سر کے بل چل رہے ہوں۔ لوگ جب زندگی کے

عذاب کو جھیلتے جھیلتے تھک جاتے تو سکون کی خاطر ایسی عبادت گاہوں میں پناہ لیتے جہاں سارے اصول کھنڈر بن چکے تھے اور محرابوں پر مکڑیوں نے جالے تان دیے تھے۔ قریب قریب سبھی انسانوں کے منہ پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اگر دو چار لوگ کوشش کر کے آپس میں بولتے بھی تو ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی:

"لفظوں کے ملبے میں معنی تلاش کرنا فضول ہے۔

"بے معنویت کا زہر زندگی کی رگ رگ میں پھیل چکا ہے۔

"ساری قدریں سر کے بل کھڑی ہیں۔

"انسان نے ہمیشہ نفرت بوئی ہے، نفرت ہی کاٹے گا" وغیرہ

داستان گو بوڑھا ایک بیک خاموش ہو گیا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی ہی خاموشی کے بوجھ تلے دبے، بوڑھے کی طرف متجسسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب تھوڑی دیر تک بوڑھا کچھ نہ بولا تو ایک شخص نے بھرائی آواز میں پوچھا ——

"بابا! کیا یہ سب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

بوڑھے نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی۔ چند لمحوں تک اس شخص کو خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر بولا ——— "ہاں میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

بوڑھا کھڑکی سے باہر اندھیرے میں نظریں گڑائے اپنے آپ بڑبڑا رہا تھا۔

"آج بھی وہ سارے مناظر میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ٹرین کی پٹری پر یہاں سے وہاں تک بے شمار انسانوں کو لٹا دیا گیا ہے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ آنکھوں پر پٹیاں کسی ہوئی ہیں۔ اتنے میں سیاہ رنگ کی ایک ٹرین جس کے انجن پر کالے رنگ کی تصویر بنی ہے، دندناتی ہوئی آتی ہے اور انسانی جسموں پر سے اس طرح گزر جاتی ہے کہ تمام انسان دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کٹے پھٹے اعضا سے خون کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں اور خون کے ایک ایک قطرے سے ایک نیا آدمی جنم لیتا ہے۔ انتہائی لاغر اور مرا مرا سا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف سے دیوپیکر ٹرک گھڑگھڑاتے آدھمکتے ہیں جن میں ویسے ہی سیاہ پوش سپاہی تیر کمان اور تھیلے لیے بیٹھے ہیں جیسے قلعہ کی فصیل پر پہرہ دینے والے تھے۔ پھر وہ لوگ ٹرک میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک عجیب و غریب چھڑی نکالتے ہیں جو مچھلی پکڑنے کی بنسی سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے ایک سرے پر ایک دھاگا لٹک رہا ہے جس میں ایک پرزہ پھنسا ہوا ہے۔ پرزے پر لکھا ہے ——— "ضرورت ہے" پرزے کی تحریر اندھیرے میں روشنی کی طرح چمکتی ہے۔ لوگ اس تحریر کو پڑھتے ہی پرزے کی طرف لپکتے ہیں اور جو بھی اس پرزے کو چھوتا ہے اسی سے چپک جاتا ہے۔ پھر سیاہ پوش سپاہی انھیں پکڑ کر اپنے مخصوص قسم کے تھیلوں میں بند کر دیتے ہیں۔ اور تھیلا ٹرک میں ایک طرف لڑھکا دیتے ہیں۔ جب ٹرک بھر جاتا ہے تو ڈرائیور اسے ایک دم سے اسٹارٹ کر کے لوگوں کی بھیڑ کو روندتا کچلتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کرب ناک چیخوں سے چاروں دشائیں کانپنے لگتی ہیں۔"

بوڑھا یکبارگی چپ ہو گیا۔ پر لوگوں سے زیادہ دیر تک چپ نہیں رہا گیا۔ ایک شخص نے بے حد مضطربانہ انداز میں پوچھا:

"وہ ٹرک کس کے ہوتے تھے؟"

بوڑھے کی سفید گھنی پلکیں آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھیں اور اس کے ہونٹ ہلے۔

"ان ٹرکوں پر انسانی کھوپڑی کا نشان بنا ہوتا تھا اور کھوپڑی کے اوپر کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا۔"

"ان مریل آدمیوں کو کہاں لے جایا جاتا تھا؟"

انھیں آہنی دیواروں کے اس پار لے جایا جاتا جہاں کالے ناگ کے پجاریوں کا مسکن تھا۔ کالے ناگ کے پجاری مہر بند تھیلوں کو دیکھ

کر بہت خوش ہوتے اور ٹرک والوں کو ان کی خدمات کے عوض قیمتی تحائف پیش کرتے ۔ تحائف لے کر ٹرک والے تو لوٹ جاتے، پھر کالے ناگ کے پجاریوں کے اشارے پر مہر بند تھیلے کھولے جاتے جن میں سے وہی مریل آدمی برآمد ہوتے جنھیں دیکھ کر کالے ناگ کے پجاری کافی محظوظ ہوتے۔ پھر ان کے اشاروں پر ایک ایک آدمی کو سامنے ایک بڑے سے پنجرے میں دھکیل دیا جاتا ۔ جس میں ایک قوی الجثہ کالا ناگ پھنکارتا رہتا۔ جوں ہی مریل آدمی کو پنجرے میں پھینکا جاتا ۔ کالا ناگ اس آدمی پر ٹوٹ پڑتا اور دل دوز چیخوں سے فضا تھرانے لگتی اور کالے ناگ کے پجاری اپنی موٹی توندوں پر ہاتھ پھیرتے بڑے پُرسکون انداز میں گردنیں ہلاتے رہتے گویا جو کچھ ہو رہا ہے ان کی توقع کے عین مطابق تھا۔

کالے ناگ کی پھنکاریں تیز سے تیز تر ہوتی جاتیں اور وہ اچھل اچھل کر اس مریل آدمی کی طرف لپکتا اور اپنی تیز زہریلی زبان سے اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کو چاٹ کر پلٹ جاتا ۔ رفتہ رفتہ مریل آدمی کی چیخیں مدھم پڑتی جاتیں ۔ اس کا مچلنا تڑپنا بھی بند ہو جاتا اور اس کے ہونٹوں سے صرف کراہیں نکلتی رہتیں ۔ کالا ناگ اس کے جسم سے برابر خون چُوسے جاتا۔ پھر اس کی رفتار بھی سُست پڑتی جاتی ۔ غالباً اس کا پیٹ بھر چکا ہوتا ۔ پھر یوں ہوتا کہ کالا ناگ کنڈلی مار کر ایک طرف بیٹھ جاتا ۔ اس کی آنکھیں شکم سیری کے خمار سے مندتی جاتیں ۔ دوسری طرف اس کا شکار اب صرف گہری گہری سانسیں لیتا رہتا ۔ پھر کالے ناگ کے پجاری اپنے غلاموں کو اشارہ کرتے ۔ غلام مریل آدمی کے نیم مردہ جسم کو گھسیٹ کر پنجرے کے باہر نکالتے اور سڑک پر پھینک آتے ۔ جہاں وہ اپنے ہی جیسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا۔

"اس کھیل کے بعد کالے ناگ کے پجاریوں کے چربیلے چہرے اذیت کوشی کی مسرت سے تمتمانے لگتے ۔ ان کی آنکھیں اس شریر بچے کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتیں، جس نے ابھی ابھی اپنی غلیل سے کسی ننھی سی فاختہ کو نشانہ بنایا ہو ۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا پھر خاموش ہو گیا ۔ اس کا چہرہ کسی پتھر کی سل کی طرح سخت اور سپاٹ تھا ۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا ۔ ایک شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا:

"بابا ! کیا اس شہر میں کوئی قانون نہیں تھا ؟"

"قانون !" بوڑھا دھیرے سے بولا ——— "قانون ہمیشہ زبردست کی لاٹھی کی طرح ہوتا ہے جس سے طاقت ور اپنے سے کمزور لوگوں کو بھیڑ بکری کی طرح ہانکتا رہتا ہے ۔ اس شہر میں صرف کالے ناگ کے پجاریوں کا قانون چلتا تھا جس کی حفاظت سیاہ پوش سپاہی کرتے تھے ۔"

"تو کیا وہ کروڑوں لوگ، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر اسی طرح سسک سسک کر مرتے رہتے ؟"

"ہاں ——— موت ان کا مقدر بن چکی تھی اور زندگی ان کے لیے عذاب سے کم نہیں تھی ۔ کبھی کبھی وہ مریل اور لاغر ہڈیوں کے ڈھانچے غول در غول کالے ناگ کے پجاریوں کے مسکن پر دھاوا بول دیتے تھے مگر آہنی دیواروں کے گرد تعینات سیاہ پوش محافظ انھیں نیزوں اور برچھیوں پر رکھ لیتے اور خندقوں کو لاشوں سے پاٹ دیتے ۔ پھر ایک عرصہ تک کوئی ان آہنی دیواروں کا رُخ نہ کرتا ۔"

بوڑھے نے خاموش ہو کر اپنے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی ۔ نیم اُجالے نیم اندھیرے میں سبھوں کے چہرے خوف و دہشت سے زرد پڑ گئے تھے ۔ بوڑھا تھوڑی دیر تک غور سے ایک ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا ۔ پھر دھیرے سے بولا:

"مگر کالے ناگ کے پجاریوں کا کاروبار زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور ایک دن وہ خود بھی کالے ناگ کا شکار ہو گئے ۔"

"کیا ——— !" ڈبے میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگ مسرت سے چیخ پڑے ۔ "کالے ناگ کے پجاری مارے گئے ؟"

"ہاں ———" بوڑھے داستان گو کی پُراسرار بھاری آواز کسی اندھے کنوئیں کی بازگشت کی طرح سنائی دی ——— "کالا ناگ شہر کے سارے لوگوں کا خون پی چکا تھا اور اس کی پیاس روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی ۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن سیاہ پوش سپاہی کالے ناگ کے لیے تازہ دم شکار مہیا نہ کر سکے ۔ تب کالے ناگ نے اپنی شیطانی پیاس سے پریشان ہو کر اپنے پجاریوں پر حملہ کر دیا اور اپنے تیز زہریلے دانت ان کی گردنوں میں گاڑ دیے ۔ پجاری ہاتھ پیر پٹکتے رہے اور کالا ناگ ان کا خون پیتا رہا ۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ پجاریوں کی موت کے بعد کالا ناگ بھی آہنی دیواروں سے اپنا سر پٹک پٹک کر ختم ہو گیا ۔ اس طرح اس شہر کے کروڑوں لوگوں کو اس بھیانک کھیل سے نجات

مل گئی۔"

بوڑھا اتنا کہہ پایا تھا کہ ٹرین کی تیز وسل سنائی دی اور سناٹے کا کلیجا دور تک چھدتا چلا گیا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رک رہی تھی۔ بوڑھا چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہو! مجھے اسی اسٹیشن پر اترنا ہے۔" اس نے جلدی سے اپنا میلا جھولا بغل میں دبایا اور ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے رخصت ہو کر پلیٹ فارم پر اتر گیا ——— مسافروں کے چہرے پر دوبارہ مسرت اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ لوگ بوڑھے کی داستان پر آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

میں چپکے سے اٹھا اور اس بوڑھے کے پیچھے ہی گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

باہر چاروں طرف سناٹا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت اور پلیٹ فارم یہاں سے وہاں تک اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بوڑھا سر جھکائے ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے بوڑھے کو آواز دی ——— "بابا!"

بوڑھا ٹھٹکا، ٹھٹک کر مڑا ——— میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پھر اس کی چبھتی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس کے میلے جھولے پر نظریں گڑاتے پوچھا ——— "دراصل بات یہ ہے بابا! ——— کیا کالے ناگ کے پجاری سچ مچ مارے گئے؟"

بوڑھے نے چونک کر گردن اٹھائی۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد دھیرے سے پوچھا:

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے آپ کے آخری بیان پر شبہہ ہے!"

اچانک بوڑھے کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ کرب جھلکنے لگا۔ اس نے انتہائی مایوس کن لہجے میں جواب دیا:

"تمہارا شبہہ درست ہے۔ میں نے محض ڈبے میں بیٹھے لوگوں کا خوف دور کرنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا۔ ورنہ حقیقتاً کالے ناگ کے پجاری آج بھی زندہ ہیں اور ان کا خونی کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ بوڑھا مڑا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں اندھیرے میں مدغم ہوتی اس کی پُراسرار شبیہہ کو گھورتا رہا۔

میں نے غور کیا۔ فضاؤں میں پُراسرار قسم کی پھنکاریں اب بھی سرسرا رہی تھیں۔

ڈار سے بچھڑے

سیّد محمد اشرف

شروع جنوری کے آسمان میں ٹکے ستاروں کی جگمگاہٹ کہرے کی موٹی تہہ میں کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی دو موٹی موٹی متوازی لکیریں آگے بڑھ رہی تھیں۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ سنّاٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا یا پھر جیپ کے انجن کی آواز اور سڑک کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سرگوشیاں۔ یکایک بھیگی ہوئی ہوا کے کئی جھونکے بند جیپ کے اندر گھس آئے۔ میں نے بندوق ٹانگوں پر رکھ کر شکاری کوٹ کی بیلٹ کو مزید کسا اور گردن کو مفلر سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی، جاڑا تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہوائیں کچھ دیر کو تھمیں تو میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

گاڑی لاہور کی حدوں سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

"غلام علی!" میں ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

"جی حضور!"

"اور کتنی دور ہے شاہ گنج؟"

"بس صاحب تیس بتیس میل اور چلنا ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے چڑیا اُڑ جائے۔"

"کیا وقت ہوا ہوگا صاحب؟" ——— اس نے جیپ کی رفتار تیز کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور چنگاری کی روشنی میں گھڑی دیکھ لی۔

"ساڑھے چار ہو چکے۔"

"تب تو آپ بے فکر رہیے۔ ساڑھے پانچ چھ تک پہنچ جائیں گے ——— سات بجے کے قریب جا کر پو پھٹتی ہے ——— چڑیا اس کے بعد ہی اُٹھتی ہے۔"

پھر وہی سنّاٹا ———

"شاہ گنج سے تمھارا گھر کتنی دور ہے؟"

"شاہ گنج سے پہلے مغل بادشاہ کی بنوائی ایک مسجد سڑک کے کنارے پڑتی ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک کچا راستہ جاتا ہے۔ ناک کی سیدھ دو میل چلیں تو ہمارا گاؤں نظر آ جاتا ہے۔"

"کیا نام ہے تمھارے گاؤں کا؟" میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"خیراں والا۔"

کیا بات کروں اس پنجابی ڈرائیور سے ـــــ پھر وہی خاموشی چھا گئی۔

سردیوں کی اندھیری رات کے پس منظر میں سڑک کے کنارے بوڑھے درختوں کے دُھندلے خطوط آپس میں مخلوط ہو گئے تھے۔ اور کہرے کے غبار میں مل کر سناٹا اتنا گاڑھا ہو گیا تھا کہ میں جیپ سے باہر ہاتھ نکال کر اُسے چھو سکتا تھا۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر میں نے سگریٹ باہر اچھال دیا۔ چنگاری زمین پر گر کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی اور چھوٹی چھوٹی بہت سی چنگاریاں ملگجے اندھیرے میں اِدھر اُدھر کھو گئیں۔

"صاحب آپ کو شکار کا شوق کب سے ہے ؟"

"بچپن سے غلام علی۔"

"کیا ہندوستان میں شکار کھیلنے دیتے ہیں ؟" گردن موڑے بغیر اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں بھئی سینتالیس سے پہلے تو کھیلا جاتا تھا۔ اب نہیں معلوم۔ اور اب تو یہ بھی خبر نہیں کہ جن دیواروں کے بیچ ہم پلے تھے وہ ڈھے گئیں کہ سلامت ہیں۔"

"آپ تو یو پی کے تھے صاحب۔"

"ہوں۔" میں نے اسے دھیرے سے جواب دیا۔ میں نے چاہا کہ غلام علی سے منع کر دوں کہ ایسی کوئی بات نہ کرے کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آ جائے۔ لیکن میں چُپ رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری اس کمزوری کو جان سکے۔ ورنہ اے غلام علی یہ جو تم نے ابھی پوچھا تھا کہ آپ یو۔پی کے تھے تو اس لفظ "تھے" پر میں تم سے گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ کیا پاکستان آنے کے بعد میرا اس خطۂ زمین سے کوئی ناطہ نہیں رہا۔ جہاں میرے بچپن نے ممتا کی لوریاں سُنی تھیں، جہاں میرے لڑکپن نے چھوٹے چھوٹے جذبوں سے محبت کرنا سیکھا تھا۔ جہاں میرے عقل و ہوش کے بال و پر نکلے تھے۔

لیکن یہ سب کیسے کہتا ـــــ یہ غلام علی کیا سمجھتا ان باتوں کو ـــــ اور غلام علی ہی کیا اب تو میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا اور سمجھتا بھی کیسے۔ تقسیم کی موٹی موٹی لکیروں کے نیچے ان سارے جذبوں کے نقوش چھپ گئے تھے۔ وہ جذبے جو صرف وہیں کا خاصہ ہوتے ہیں جہاں انسان پہلی بار آنکھ کھول کر دیکھتا ہے۔

ہوائیں مزید تیز ہو گئیں تھیں اور کہرے کی چادر ویسی کی ویسی دبیز تھی۔

"تو صاحب آپ پھر کبھی ہندوستان نہیں گئے ؟" غلام علی نے پوچھا تھا ـــــ سڑک کے سناٹوں نے درختوں کی سرگوشیوں سے خاموشی کی بھیک مانگی لیکن جب جاندار بےحس ہو جائیں تو درخت تو بے جان ہی ہوتے ہیں۔

"سرکاری افسر اتنی آسانی سے نہیں جا پاتے اور سرکار پوچھتی ہے کس سے ملنے جا رہے ہو ؟"

"کیا کوئی رشتہ دار وہاں نہیں ہے ؟"

"سب بُزدل تھے یہاں آ بسے۔ میں بھی بُزدل تھا لیکن چھوٹا بُزدل۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال تھی شاید۔ ہاں اٹھارہ ہی سال کا تھا میں۔"

"بُزدلی کی کیا بات ہے صاحب، وہاں نہیں رہے یہاں آ گئے۔" غلام علی نے جیسے مجھے دلاسہ دیا۔ لیکن میں بھلا دلاسوں سے بہلتا !

"یہ بہت لمبا چوڑا فلسفہ ہے غلام علی۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جیسے میں نے اس کی بے عزتی کر دی ہو۔ "میری بیوی کے ماں باپ بھی بھارت ہی کے تھے

صاحب۔ مجھ سے بہت ضد کرتی ہے کہ ایک بار ہندوستان دکھا دوں۔ میں نے درخواست دی تو پوچھا گیا کہ وہاں رشتہ داروں کے نام پتے لکھواؤ ــــ وہاں کوئی رشتہ دار ہی نہیں ہے صاحب۔ بس اسے اپنے گاؤں اور ضلع کا نام یاد ہے ــــ"

سناٹا ہم دونوں پر خاموشی سے گزرتا رہا۔

"غلام علی؟" میں اس سے مخاطب ہوا۔

"جی!" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"تمھاری بیوی کہاں کی رہنے والی تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

"ہردوئی ضلع کی صاحب۔"

"ہوں ــــ یو۔پی کی ہے تمھاری بیوی۔"

"جی حضور۔" میں نے اندھیرے میں بھی محسوس کر لیا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

"میں نے جان لیا تم اس وقت کیوں مسکرائے غلام علی۔"

"صاحب ایک بات کہوں آپ سے۔ میری بیوی کو معلوم ہے کہ آپ یو۔پی کے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمھارا صاحب یو۔پی کا ہے، میرے وطن کا، مجھے اس کے پاس لے چلو۔ وہ میرا پرمٹ بنوا دے گا ــــ تو حضور اسے معلوم ہے کہ آج آپ شکار کھیلنے آ رہے ہیں تو گھر پر بھی تھوڑا سا رکیں گے۔ وہ آپ سے کہے تو ذرا سختی سے منع کر دیجیے گا کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا۔"

"کیوں غلام علی ایسا کیوں کہوں میں۔ پاسپورٹ تو میں اس کا کسی نہ کسی طرح بنوا ہی سکتا ہوں۔"

"پاسپورٹ کی بات نہیں صاحب۔ آدمی کی زندگی میں ایک ہی جھنجھٹ تھوڑی ہوتا ہے۔ اسے تو بیکار کا شوق ہے بھارت جانے کا۔ اس کا شوق پورا کرنے میں میرے چارپان سو اٹھ جائیں گے۔"

"ہوں۔" میری سمجھ میں نہ آیا اسے کیا جواب دوں ــــ غلام علی نے میری خاموشی سے فائدہ اٹھایا۔

"صاحب میرا ایک دوست ہے وزیرالدین۔ اس کی بیوی بھی بھارت ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے چوری چھپے پرمٹ بنوا لیا اور پھر کانوں کا زیور بیچ کر وزیرالدین سے اجازت مانگی۔ وزیرالدین کو معلوم ہوا تو اسے اچنبھا ہوا اور غصہ بھی آیا ــــ اس نے اوپری دل سے اجازت دے دی اور رات کو اس کے تکیے سے پرمٹ نکال کر جلا دیا۔ صبح اٹھی تو پرمٹ غائب۔ اس نے بڑا فیل مچایا اور وزیرالدین سے کہا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ وزیر نے پہلے تو بہانے ملائے ــــ اور پھر صاحب ڈنڈا لے کر جٹ پڑا کہ حرامزادی تین چار مہینے تک کیا تیری اماں مجھے روٹی پکا کر کھلائے گی؟"

غلام علی نے سڑک سے نظریں موڑ کر میری طرف ایسے دیکھا جیسے اپنے دوست کی بہادری اور دانش مندی کی داد چاہتا ہو۔

میں خاموش رہا ــــ اندھیرے میں وہ مجھے صاف صاف نہیں دیکھ سکا، سمجھا کہ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا ہوں۔

اس نے میری طرف سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا اور جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ رفتار بڑھی تو ہوا کچھ اور تیز محسوس ہونے لگی۔

مجھے ابھی ابھی پھر بھی محسوس ہوا کہ جیپ کے باہر سڑک پر اور درختوں پر ہوائیں بہت تیز ہو گئی ہیں ــــ اور درخت کے پتوں سے کچھ ایسی آوازیں پھوٹ رہی ہیں جو ماحول کو بے حد پُراسرار بنا دیتی ہیں۔ باہر کے اس پُرشور ماحول میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیپ میں بے پناہ خاموشی ہے۔ جیسے بپھری ہوئی موجوں کے سمندر میں کوئی اکیلا جہاز چلا جا رہا ہو جس کے عملے کو بحری قزاقوں نے قتل کر دیا ہو۔ میں نے بدن کچھ اور سکوڑ لیا اور سوچا ــــ

غلام علی ــــ تم بہت کمینے ہو اور بہت بھولے ہو ــــ تم اور تمھارا دوست نہیں جانتے کہ اس جگہ سے بچھڑ کر انسان کی کیا حالت ہوجاتی ہے جہاں اس نے پیدا ہوکر ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا ہو اور باپ کی شفیق انگلیوں کا لمس اپنے سر پر محسوس کیا ہو ــــ تمھیں نہیں معلوم کہ انسان کو وہ جگہ کتنی پیاری لگتی ہے جہاں اس کا بچپن لڑکپن سے گلے ملا ہو۔ تمھیں اس کا علم ہی نہیں غلام علی کہ انسان ان لموں کو کتنا عزیز رکھتا ہے جن لموں میں اس کا بھولا بھالا ذہن، معصوم، سر پھرے اور خود سر جذبوں کو خون پلا پلا کر پالتا ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ کچھ بھی نہیں۔ اسٹیرنگ کا گول پہیہ گھماتے گھماتے تمھارا دماغ بھی گھوم گیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اتنا سوچنے کے بعد مجھے ایکا ایکی غلام علی سے نفرت ہوگئی۔

میرے اندر سے کوئی بولا۔ تم غلام علی سے نفرت نہیں کر رہے ہو۔ تم وہی کر رہے ہو جو پچھلے تیس سال سے کرتے چلے آرہے ہو۔ تمھیں اپنی محرومیاں نظر آگئیں نا! تم غلام علی جیسے ہر اس فرد سے فوراً نفرت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہو جو تمھاری محرومیوں کی عمارت میں ایک چھوٹی سی اینٹ رکھنے کا بھی خطا دار ہو ــــ اس بیچارے نے کیا کیا؟ صرف اپنی بیوی اور اپنے دوست کی بیوی کے متعلق بتایا تھا۔ بس تھوڑی دیر کو انجانے میں یہ احساس دلا دیا یا یوں کہو کہ تمھیں یاد دلا دیا کہ تم ہندوستان کبھی نہیں جا سکتے۔ اس لیے تم اس سے نفرت کرنے لگے۔ اپنی محرومیوں کی آڑ لے کر اس بیچارے پہ کیوں بگڑ رہے ہو۔

میرا اندر والا بہت خود سر ہوگیا۔ کچھ عرصے سے ۶۵ اور ۷۱ کی لڑائیوں کے بعد تو یہ کچھ اور بھی بے باک ہوگیا ہے۔ ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتا ہے کہ جواب نہیں بن پڑتے۔ جیسے موت کی سزا کا فیصلہ سننے کے بعد مجرم من مانی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس سے بڑی سزا ممکن نہیں ویسے ہی یہ بھی ہر خوف ہر خطرے سے آزاد ہوگیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے ہر بات کرگزرتا ہے۔ اب کیا جواب دوں اسے؟

مجھے محسوس ہوا کہ اب دماغ میں سوچنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جیسے ذہن کے تالاب سے سوچ کی ساری مرغابیاں اُڑ گئی ہوں۔ میں نے سر پیچھے ٹکا لیا۔

"صاحب" غلام علی نے دبی دبی آواز میں مجھے پکارا ــــ اتنے دھیمے کہ اگر میں ذرا بھی نیند میں غافل ہوتا تو نہیں سُن پاتا۔ شاید اس کا بھی یہی مقصد ہو۔

"ہوں ــــ" میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کچھ اجنبی سی ہوگئی ہے۔

"صاحب آپ سو گئے تھے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ــــ کیوں کوئی خاص بات؟"

"نہیں حضور ــــ ویسے آپ نے دیکھا جب سے لڑائی کے بعد راستے کھلے لوگ کتنے خوش خوش بھارت جا رہے ہیں اور وہاں والے کتنے ہنستے بولتے پاکستان آرہے ہیں" ــــ راستے کھلے کتنے ہی دن ہوگئے مگر اب تک تانتا سا لگا ہے۔

خاموشی ــــ میں خاموش رہا جیسے ایک لفظ بھی بولا تو پھٹ پڑوں گا۔

"صاحب او صاحب آپ نے سنا میں نے کیا کہا؟"

میں نے چپکے سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا جو پیچھے بھاگتی چلی جارہی تھی۔ بالکل تاریک اور سنسان ــــ

میں نے اندھیرے میں آنکھیں جمادیں اور سوچا ــــ

تم نے پھر اپنی کمینگی کا ثبوت دیا غلام علی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان راستوں کے کھلنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں اب بھی وہاں نہیں جا سکتا۔ تم کیوں جان بوجھ کر میرے زخموں کو کرید رہے ہو ــــ

غلام علی مجھ سے مایوس ہو کر ڈرائیو کرتا رہا۔

مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ میں تو خیر ایسے عہدے پر فائز ہوں کہ ہندوستان جا ہی نہیں سکتا —— لیکن غلام علی اور وزیرالدین کی بیویوں پر کیوں اتنی مجبوریاں لاد دی گئی ہیں۔ انھیں اس سرزمین کو دیکھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی جس کے تصور کے بغیر ان کی زندگی کی تاریخ ادھوری ہے۔

غلام علی یہ جو تم خاموشی سے بیٹھے ڈرائیو کر رہے ہو تو اتنے بھولے تو نہیں ہو —— تم سال میں مجھ سے تین مرتبہ چھٹیاں لے کر اپنے والدین سے ملنے کراچی تو جا سکتے ہو۔ ہردوئی نہیں جا سکتے۔ ہردوئی بھی تو لاہور سے اتنا ہی دور ہے جتنا کراچی —— کیا کراچی جانے میں تمھارے پیسے نہیں خرچ ہوتے۔ کیا کراچی کا ٹکٹ مفت ملتا ہے —— لیکن میں تم سے یہ سوال کیوں پوچھوں۔ مجھے کیا حق ہے اور مجھے تو یہ پوچھنے کا بھی حق نہیں ہے کہ تمھارا دوست وزیرالدین کیا تین چار مہینے ہوٹل کی روٹی نہیں کھا سکتا کہ ان تین چار مہینوں میں اس کی بیوی تیس برسوں کی محرومی کے بعد اس آب و ہوا میں جا کر سانس لے سکتی ہے جہاں اس نے اپنے بچپن کو تھپکیاں دے کر سلایا تھا۔ جوانی کو آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا تھا مجھے ان سوالوں کے پوچھنے کا حق اس لیے اور بھی نہیں ہے غلام علی کہ سوال وہ پوچھتے ہیں جن کو جواب نہیں معلوم ہوتے۔ میں تیس سال سے سوالات تخلیق کرکے جوابات گڑھ رہا ہوں۔ میں اس معاملے کی ہر نزاکت سے واقف ہو گیا ہوں —— لیکن ہر جواب ادھورا ہے غلام علی کیونکہ جس دن میں نے خود کو صحیح جواب دے دیا اس دن یہ سوال کرنے کا مشغلہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ غلام علی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بھیانک جواب میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں فوراً کوئی ٹیڑھا سا سوال کر دیتا ہوں اور تب تک سوالات کرتا رہتا ہوں جب تک وہ خوف ناک جواب مبہم ہو کر —— میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے —— مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے صحیح جوابوں سے ——

"صاحب مسجد آ رہی ہے۔" غلام علی نے مجھے بتایا —— "ابھی پوچھنے میں بہت دیر ہے۔ میرے گھر چلنا پڑے گا آپ کو۔ نہیں تو جمیلہ غم کرے گی ——"

"ٹھیک ہے وقت ہو تو ضرور چلو۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم پہلے تالاب پر جائیں پھر تمھارے گھر جائیں ——"

جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی —— ہوائیں جو چلتی ہوئی گاڑی میں بہت پُر شور اور ٹھنڈی تھیں ایکا ایکی مدھم پڑ گئیں۔ سڑک کے بائیں طرف وسیع اندھیروں کے پس منظر میں کہرے میں لپٹے ہوئے مجھے ایک مسجد کے دھندلے خطوط نظر آئے۔ مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک الاؤ جل رہا تھا اور اس کے گرد تین آدمی کھڑے تھے۔ اتنے حصے کے اندھیرے کو الاؤ نے نگل لیا تھا اور ان آدمیوں کے گرد ایک روشن حلقہ کھنچ گیا تھا —— میں نے غور سے دیکھا۔ دو آدمیوں کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں —— جیپ رکنے پر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے ——

غلام علی بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر آیا ——

میں سمجھ گیا غلام علی کیوں بڑبڑایا۔ دوسرے شکاریوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ ایسے ہی ناراض ہو جاتا ہے ——

بندوق ہاتھ میں سنبھالے میں نیچے اتر آیا —— ٹھنڈی ہوائیں میرے کپڑوں میں گھس گئیں اور کہرے کی نمی کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ ان آدمیوں نے ایک طرف سمٹ کر الاؤ کے قریب جگہ بنائی جیسے مجھے خاموش دعوت دے رہے ہوں —— غلام علی کو پیچھے آنے کا اشارہ کرکے میں الاؤ کی طرف بڑھ گیا۔

ان کی جیپ بھی قریب ہی اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں ایک ڈرائیور کی وردی پہنے ہوئے تھا اور دو شکاری کوٹ لادے ہوئے تھے —— الاؤ کے قریب دیر سے کھڑے رہنے کے باعث ان کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا —— ان میں ایک صورت مجھے

جانی پہچانی سی لگی —— حافظے کی غیر مرئی لہروں پر ایک چہرہ تھرتھرا رہا تھا۔ لیکن وہ صورت اتنی مبہم اور غیر واضح تھی جیسے پرائمری اسکول کے زمانے کی لکھی ہوئی کلاس کی کاپیاں جو بڑے ہونے کے بعد پہچانی بھی نہ جاسکیں اور بھلائی بھی نہ جاسکیں —— الاؤ کی سرخ آنچ میں وہ چہرہ دہک رہا تھا —— وہ صورت مجھے پھر جانی پہچانی لگی —— وہ شخص بھی مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا —— میں نے اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔ اس نے اپنے ہاتھ الاؤ کے سامنے گرم کیے اور انھیں گالوں پر رکھ لیا —— یادوں کی آنچ سے حافظے پر جمی ہوئی برف پگھلی اور میرے ذہن میں ماضی کے آئینہ خانے سج گئے۔ میں نے اس ایک لمحے میں تیس برس کا سفر طے کر لیا اور اتنی خاموشی سے یہ سفر کیا کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب میں یہاں سے وہاں پہنچ گیا —— میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی بجلیاں چمکیں اور بہت سے خاکے بن گئے اور ان خاکوں میں میرے حافظے نے بڑی سبک دستی سے بچپن کی امنگوں، لڑکپن کی جستجو اور شروع جوانی کے ولولوں کے بے حد خوشنما رنگ بھر دیے۔ میں نے یوپی کے گنگا جمنا کے دوآبے میں بسے اس قصبے کو بالکل واضح شکل و صورت میں اپنے ذہن کے پردے پر چمکتا ہوا دیکھا —— وہاں کی مسجدیں دیکھیں وہاں کے مندر دیکھے —— وہاں کے سارے محلے ساری گلیاں دیکھ ڈالیں۔ قصبے کے سارے کچے پکے گھر دیکھ ڈالے۔ اپنا مکتب دیکھا پھر اسکول دیکھا۔ سارے بزرگ اور تمام ماسٹر شفیق چہرے لیے اپنے سامنے کھڑے دیکھے۔ میلوں کی دھوم دھام دیکھی اور دیہات کی جوان اور خوبصورت عورتوں کو نیلے پیلے اور سرخ گھاگھروں میں ہنستے بولتے میلے کی طرف بڑھتے دیکھا —— گیہوں کے کھیتوں کے طویل سلسلے دیکھے اور دور دور تک آم کے باغ بور میں لدے ہوئے نظر آئے۔

اس ایک لمحے میں بچپن کی ساری شرارتیں نظر آگئیں۔ مئی جون کے تپتے ہوئے موسم میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے اپنے آپ کو دیکھ لیا —— گرم لو سے اپنا بدن جھلستے ہوئے دیکھ لیا۔ اپنے سارے عزیز قطار اندر قطار کھڑے نظر آئے۔ کچھ ان میں وہیں سو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ اب صرف رشتہ دار رہ گئے تھے عزیز نہیں۔

آئینہ خانے میں ایک عکس اور چمکا —— دو لڑکے ہاتھوں میں ایر رائفل لیے چلے جارہے ہیں۔ سورج جھک آیا ہے اور دن بھر کی حدت اب صرف زرد روشنی بن کر رہ گئی ہے۔ بیر کے باغ میں تیتر بول رہے ہیں —— ان لڑکوں میں سے ایک بیر کے باغ میں گھس گیا ہے اور دس منٹ بعد جب باہر آیا تو فاتحانہ انداز میں ہاتھ میں لٹکے ہوئے تیتر کو دکھا رہا ہے۔ دوسرا لڑکا جو ہاتھ پیچھے کیے کھڑا تھا ہاتھ آگے کر دیتا ہے جس میں ایک ذبح کیا ہوا خرگوش الٹا لٹکا ہوا تھا۔ دونوں ہنس پڑتے ہیں، دونوں نے اپنے اپنے حصے کا شکار کر لیا تھا —— پھر ایک عکس اور سامنے آیا —— اب یہ لڑکے کچھ اور بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایر رائفل کی جگہ بندوقیں آگئی ہیں —— رمضان میں سحری کا ناشتہ کرنے کے بعد یہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آبی چڑیوں کے شکار کو جارہے ہیں۔ دوپہر کو روزہ توڑنے کے لیے ماؤں نے تھیلوں میں افطار کا سامان بھر دیا ہے۔ پوس کی چاندنی رات میں برفیلی ہواؤں سے بدن بچاتا ہوا یہ قافلہ بڑھتا چلا جارہا ہے —— فضا میں سائیں سائیں کی آوازیں مسلط ہیں۔ سب دل ہی دل میں تمنا کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ چڑیاں میرے ہاتھ سے شکار ہوں —— اس بات پر سب بے حد خوش ہیں کہ گھر والوں کو بے وقوف بنا کر روزہ گول کر دیا ہے۔ اب یہ قافلہ نہر کی پٹری سے اتر کر تالاب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تالاب سے دو فرلانگ دور بیٹھ کر اسکیم بنائی جارہی ہے کہ کہاں سے کیسے فائر کرنا ہے —— یہ انداز لگایا جارہا ہے کہ چڑیا تالاب کے کس حصے میں ہوگی —— اندھیرا چھٹا، پو پھٹی، سورج نے کہرے کا مفلر اتار کر چہرہ دکھایا تو معلوم ہوا کہ تالاب بالکل چاندی جیسا پڑا ہے۔ سب ایک دوسرے پر ملامت کر رہے ہیں اور یہ توجیہہ پیش کر رہے ہیں کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ چڑیاں نہیں صرف سارس بول رہے ہیں۔ پھر فاختائیں اور بگلوں جیسے بہترین پرندوں کو چن چن کر مارا جارہا ہے۔ سہ پہر کو لوٹتے وقت مٹی کے ڈھیلوں سے رگڑ رگڑ کر ہونٹوں کو خشک کیا جارہا ہے تاکہ گھر والے جان نہ پائیں روزہ

بھی ذبح کر دیا ہے۔ راستے میں تھکن کی وجہ سے گفتگو کرنا تک محال ہو رہا ہے۔ لڑکپن کی کچی ہڈیوں پر جسم کا بوجھ سنبھالے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ سامنے بستی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ دور سے قصبے کی دھندلی سرحدوں پر مسجدوں کے سیاہ کائی زدہ گنبد اور مینار خاموش کھڑے ہیں۔ کسی کو اچانک یاد آگیا اور فاختاؤں اور بگلوں کے پر ادھیڑ دیے گئے تاکہ جب یہ گھر میں داخل ہوں تو ہریل اور بڑے چھوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا جائے۔

ایک کے بعد ایک ایسے ہی بہت سے عکس نظروں کے سامنے چھپاکے مارتے ہوئے گزر گئے جن میں بچپن سے لے کر شروع جوانی تک سارے منظر تھے اور ہر منظر میں دونوں لڑکے ساتھ ساتھ ہیں

"صاحب ـــ اب چلیے گاؤں کی طرف ـــ" آئینہ خانوں میں غلام علی کی آواز نے پتھر مارا اور سارے آئینے چھن کے ٹوٹ گئے۔ سارے مناظر آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

میں نے غلام علی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے حساب لگایا کہ یادوں کی کتنی چڑیاں ابھی میرے ذہن کے پنجرے میں بند ہیں اور سامنے کھڑا یہ شکاری میری کتنی یادوں کا حاصل جمع ہے۔

اس نے پھر ہاتھوں کو گرم کر کے چہرے پر رکھا۔ نواب بھی تو ایسا ہی کرتا تھا۔ اور اب مجھے یقین کامل تھا کہ آئینہ خانے کا وہ لڑکا اپنی عمر میں ایک دم تیس برس جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہے۔

یکایک ہوا بالکل خاموش ہو گئی ـــ الاؤ میں جلتی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں چٹاچٹ بولیں، چنگاریاں فضا میں اڑنے لگیں۔ دور کسی سوئے ہوئے تالاب میں کوئی سارس زور سے چیخا ـــ

میں نے آہستگی سے الاؤ کی طرف ایک قدم بڑھایا اور اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"آپ . . . . تم . . . . تم نواب ہو ـــ"

اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں ایک ثانیہ کو سکڑ گئیں۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔ اس کی آنکھوں سے اتنے آنسو بہے کہ چہرے کے پسینے کو بھی بہا لے گئے ـــ جذبوں کی شدت اور آنچ کی حدت سے اس کا چہرہ انگارہ ہو گیا ـــ اس نے بندوق کندھے سے اتار کر اپنے ساتھی کو تھمائی اور الاؤ کا پورا چکر کاٹ کر میرے قریب آیا اور میرے گلے سے لپٹ کر خاموش ہو گیا۔

"اب تم ہرگز مت بتانا کہ تم کون ہو۔" تیس سال کے بعد میں نے وہ آواز سنی جو لگاتار سولہ سترہ سال تک سنی تھی۔

"نہیں میں نہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں ـــ میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ خدا جانے کب تک ہم یوں ہی کھڑے رہے ـــ الاؤ کی آگ مدھم پڑنے لگی اور پتوں کی راکھ ہوا میں بکھر گئی۔

کہرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا ـــ غلام علی اور اس کے دونوں ساتھی بت بنے حیرتی کھڑے ہمیں تکتے رہے ـــ محبت کا ایک عالم ہم پر گزر رہا تھا ـــ جب ایک عرصہ بیت گیا تو میں نے اس کا سر ہاتھوں میں تھام کر پینتالیس چھیالیس برس کے اس پندرہ سالہ لڑکے کی پیشانی کو چوم لیا۔

"غلام علی اب اتنا وقت نہیں ہے کہ تمھارے گھر جایا جا سکے۔ ایک بار تالاب پر ہو لیں پھر چلیں گے تمھارے گھر ـــ"

میں نے نواب کو بتایا کہ یہ میرا ڈرائیور غلام علی ہے۔ غلام علی نے اسے جھک کر بندگی کی ـــ

نواب نے بتایا کہ ایک اس کا ڈرائیور ہے اور دوسرا اس کی فیکٹری کا منیجر سلیم اللہ ـــ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا ـــ وہ تیس بتیس برس کا ایک خوش رو نوجوان تھا ـــ جیپیں شاہ گنج کے تالاب کی طرف موڑ دی گئیں

نواب مجھے بتا رہا تھا کہ ہندوستان سے آکر اس نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور کس طرح پلاسٹک کی چپلوں کی یہ فیکٹری

ا سکا —— اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ابھی اسے پچھلے دنوں یہ معلوم ہوا تھا کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوگیا ہوں اور میرا تبادلہ لاہور ں ہوا ہے۔

"تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے پھر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ واقعی تم ہی ہو گے۔ بس نام سُنا تھا۔"

وہ مجھے بتا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ شخصیتیں کتنی بے نشان ہوگئی ہیں کہ نام موجود ہونے کے باوجود نہیں پہچانی جاتیں —— بن اس میں اکیلے نواب کا دوش نہیں ہے۔ میں بھی تو اخباروں میں "نواب اینڈ سنس" کا اشتہار دیکھ کر چونکا تھا —— لیکن پھر سوچ کر چپ ہو رہا تھا کہ کیا خبر یہ کوئی اور نواب ہو —— ہم سب ایک سے گنہ گار ہیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایک دوسرے ر الزام لگائیں۔

"تم کراچی سے کیا شکار کھیلنے آئے ہو صرف؟" میں نے اس سے پوچھا ——

"نہیں بھئی —— فیکٹری کے کام سے لاہور آیا تھا —— ہلین کا ٹکٹ کل کا ہے۔ سوچا ایک دن ملا ہے شکار کھیل لوں۔"

جیپ کے باہر گیہوں کے سلسلے دور دور تک چلے گئے تھے۔ اور ان کھیتوں کے پرے غیر واضح درختوں کی آڑ میں صبح کاذب دم ڑ رہی تھی اور صبح صادق کی دُھندلی دُھندلی چمک درختوں کے پس منظر میں آہستہ آہستہ نکھر رہی تھی —— آسمان پر بہت ی بھیڑیں چر رہی تھیں۔ قائیں قائیں کی گھٹی گھٹی آوازوں سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کسی تالاب کے قریب ہیں۔ میں نے ا منے دیکھا۔ ایکھ کے کھیتوں کے ادھر مٹیالے اجالے میں دور دور تک پانی چمک رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا تالاب کے س حصے میں ہے۔ تھوڑا اجالا اور ہو تو چڑیا کی موجودگی کا اندازہ کیا جا سکے۔

غلام علی نے جیپ روک دی ——

"حضور اس سے آگے گاڑی گئی تو چڑیا انجن کی آواز سے بھڑک جائے گی ——"

"ظاہر ہے" کہتا ہوا نواب نیچے کود گیا —— میں بھی اُتر آیا۔

ابھی ابھی اترتے وقت میں نے سوچا کہ آج تیس سال کے بعد نواب میرے ساتھ ہے۔ آج بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ سورج نکلے تو معلوم ہو کہ چڑیا تالاب میں ہے ہی نہیں —— میں نے محسوس کیا کہ یہ سوچتے وقت میں بے ساختہ مسکرا اُٹھا ہوں ——

"سُنو" —— نواب نے مجھے مخاطب کیا۔ "تمھیں یاد ہے ایک بار جب ہم تالاب پر گئے تھے تو تالاب نے کیسا دھوکا دیا ھا —— اُجالا ہوتے پر معلوم ہوا تھا کہ جن آوازوں کو ہم چڑیا کی آواز سمجھ رہے ہیں وہ چڑیا نہیں بلکہ . . . وہ کچھ کہتے کہتے رُک یا —— اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ بہت غور سے —— شاید اسے علم ہوگیا تھا کہ میں بھی وہی سوچ رہا ہوں جو ہ سوچ رہا تھا۔

اس نے مفلر سے اپنی گردن کو اچھی طرح ڈھکا۔ اور بندوق میں کارتوس لگا کر میرے بہت قریب آکر پُراسرار انداز سے رگوشیوں میں پوچھا ——

"کیا تمھیں بھی وہی یاد آرہا تھا اس وقت؟"

میں نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں کو اچانک اپنی محرومیوں کا احساس ہوا ہے۔ بے محابا۔ ڈھیٹ ر وحشی یادیں پھر میرے دماغ میں چاند ماری کرنے لگیں۔

دوسری جیپ پیچھے آکر رُکی بسم اللہ بندوق لے کر نیچے اُتر آیا۔

"چڑیا کو کافی بول رہی ہے۔" اس نے دُھندلے دُھندلے تالاب پر نظریں جما کر کہا۔

غلام علی ایکھ کے کونے پر گیا۔ اور تھوڑی دیر تک چڑیا کی آواز سے اندازہ کرتا رہا کہ کس جگہ بول رہی ہے اور پھر واپس آگیا۔ دیسے صاحب یہ بڑا تالاب ہے۔ دن بھر چڑیا پڑی رہتی ہے لیکن صبح کی ہون میں زیادہ ہوتی ہے اور غافل بھی ہوتی ہے۔ اسی وقت تو یہ چارا کھاتی ہے۔" غلام علی نے اپنی معلومات سے ہمیں مستفیض کیا۔

میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ تالاب کے اس کنارے پر سیاہی مائل گدلے آسمان میں روشن جھلکیاں پڑنے لگی تھیں اب کسی بھی وقت فائر ہو سکتا تھا ـــــ ہم لوگوں نے فوراً اپنی اپنی جگہ منتخب کرلی۔ میں اور نواب جوتوں سمیت کیچڑ میں گھس گئے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچ کر ایک اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے جو تین طرف سے ایکھ سے گھری ہوئی تھی۔ سلیم اللہ بندوق لے کر آگے بڑھ لیا اور غلام علی اپنی ایک نالی سنبھالے ہوئے تالاب کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔

ہم دونوں اس منڈیر پر خاموش بیٹھے رہے۔ جب تک کہرا چھٹ نہ جائے۔ کسی قسم کی نقل و حرکت سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سورج نکلنے کے بعد فائر ہو سکتا تھا۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں لمبے لمبے گلابی لہریے پڑنے لگے تھے ـــــ سورج نکلنے ہی والا تھا۔

"یہ سلیم اللہ بندوق کیسی چلاتا ہے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"بہت عمدہ ـــــ اچھا خاصا شکاری ہے۔" نواب نے میرے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے بتایا۔

یکایک تالاب کے دوسرے کنارے پر سارس زور زور سے بولے اور چڑیا کی تیز تیز سرگوشیاں بند ہوگئیں ـــــ شاید چڑیا کو شبہ ہو گیا تھا۔

میں نے بندوق میں کارتوس لگا لیے۔

"نواب!" میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں!" اس نے میری طرف دیکھا۔

میں خاموش رہا۔

"کیا بات ہے کچھ کہہ رہے تھے تم؟"

"ہاں ..... میں کہہ رہا تھا کہ کیا پاکستان آنے کے بعد کبھی دل نہیں چاہا کہ گھر واپس جاؤ۔"

بڑا بھیانک سناٹا تھا جو ہم دونوں کے درمیان منہ پھاڑے بیٹھا تھا ـــــ وہ بالکل خاموش رہا ـــــ مجھے یہ محسوس ہوا کہ سارس کی آوازیں سیکڑوں میل دور سے آرہی ہیں، تالاب کا پانی ساکت ہو گیا ہے اور صبح کی تیز ہوائیں بالکل چپ ہو گئی ہیں۔

میں نے سوچا ـــــ نواب! تم گھبرا گئے ـــــ واقعی بڑا تلخ سوال پوچھ لیا میں نے۔ لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اس کا جواب ان تلخیوں کو اور بوجھل کر دے گا ـــــ لیکن مجھے اس کا جواب چاہیے۔ میں تو خیر مجبور ہوں ـــــ تمہارے آگے کون سی رکاوٹ تھی ـــــ وہاں کی گلیاں، محلے، میلے ٹھیلے، کھیت کھلیان، گھر، اسکول، سب بھول گئے کیا۔ کچھ بھی یاد نہیں ـــــ وہاں کے تالاب کیا تمہارے ذہن میں سوکھ گئے ـــــ وہاں کے درخت کیا تمہارے حافظے نے جلا دیے ـــــ میری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی رہیں اور وہ نظریں بچاتا رہا۔

پھر بڑی مشکل سے بولا ـــــ "میں کراچی سے اگر ایک دن باہر رہوں تو دو ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جاؤں تو کم از کم چالیس پچاس ہزار کی چوٹ پڑے گی۔"

یہ جواب دے کر وہ ایک دم بے خوف ہو گیا ـــــ مجھے اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوا جیسے وہ پوچھ رہا ہے۔"

"کیوں دوست! تم بھی تو یہ نوکری چھوڑ کر ہندوستان جا کر سب کچھ دیکھ سکتے تھے ——— تم کیوں نہیں گئے ——— بولو اب میری باری ہے۔"

مجھے اس کی آنکھوں سے بڑا خوف محسوس ہوا جیسے وہ میری ذات کی گہرائیوں میں اندر گھس کر کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی ہوں جو میں سامنے لانا نہیں چاہتا۔

لیکن نواب نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا ——— میں نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا مگر اس نے مجھ پر رحم کیا۔

ہم دونوں نے ایک لمحے کے بعد صرف ایک ہی بات سوچی کہ ہم لوگ بہت بے اختیار ہیں اور بہت لاچار ہیں اور بہت مجبور ہیں اور بہت بے بس ہیں۔ میں اگر ایک بار ہندوستان جانے کے لیے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دوں تو گھر والوں کی زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی ——— اور نواب تم اگر فیکٹری چھوڑ کر بیس دن کو بھی پاکستان چھوڑ دو تو چالیس پچاس ہزار کا نقصان کون بھرے گا ——— سچ مچ ہم بہت بے بس ہیں۔

تالاب کے اس کنارے پر ایکھ کے ادھر ایک پیلا دائرہ آسمان کے دھندلے پس منظر میں اوپر اٹھا ——— اس کا نچلا حصہ کچھ بے ڈول تھا ——— آہستہ آہستہ وہ دائرہ مکمل ہوا اور دھیمے دھیمے سرخ ہو گیا۔

دور تالاب کے کنارے کھڑے درختوں پر غنودہ پرندوں نے بیٹھی بیٹھی بوجھل آواز میں پکار کر ایک دوسرے سے کہا کہ پھر سورج نکل آیا۔ پچھم کے کسی گاؤں کے ایک بے خواب کتے نے روتے ہوئے اعلان کیا کہ صبح ہو رہی ہے ——— آسمان میں پرچھائیوں جیسے کچھ پرندے سورج کے آگے ہو کر نکل گئے ——— صبح کا وقت عموماً اتنا غمگین اور اداس نہیں ہوتا لیکن آج تھا کیوں کہ ہمارے دکھوں کا تعلق ماحول سے یا وقت کی کیفیتوں سے نہیں ہوتا بلکہ ہمارے دلوں سے ہوتا ہے اور آج ہمارے دل بہت اداس تھے۔

کہرا چھٹا اور تالاب کا پانی آہستہ آہستہ صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ آبی پرندوں کا جھنڈ سلیم اللہ کے کنارے کی طرف ہے۔ دور سے تالاب میں مرغابیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کھیت میں مٹی کے ڈھیلے پڑے ہوں۔ ایک طرف کنگنی کی قازیں پڑی تھیں ——— چھوٹے چہوں کا ایک تیرا تالاب پر سرسرا رہا تھا ——— اور تالاب کے دوسرے کنارے پر دو سارس خاموش کھڑے تھے۔

یکایک میں نے محسوس کیا کہ چڑیا ہوشیار ہو گئی ہے ——— یک لخت 'قیں قیں' کی بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ غلام علی کی طرف سے پہلا فائر ہوا۔ مرغابیاں سرسر کرتی ہوئی اٹھیں اور اس حصے کا پانی ٹیڑھی لکیریں بنانے لگا۔ سلیم اللہ کی طرف سے دو فائر ہوئے اور دو مرغابیاں ڈھیلے بن کر زمین پر آ رہیں۔ سائیں سائیں کرتے ہوئے سیخ پر تالاب پر چکرا رہے تھے ——— قازوں نے ایک تکونی صف بنائی اور پورب کے کسی تالاب کی طرف دھواں ہو گئیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں چڑیاں آسمان پر چھائی ہوئی تھیں لیکن ہماری بندوقوں کی پہنچ سے دور تھیں۔

"اگر یہ نالائق غلام علی فائر نہ کرتا تو چڑیاں ہمیں موقع دیتیں۔" میں جھنجھلایا ———

"نہیں۔" نواب مسکرایا۔ چڑیا پر تولنے ہی والی تھی جبھی غلام علی نے فائر کیا۔ دراصل زیادہ تر بیچ تالاب میں پڑی تھی۔ اگر کنارے پر ہوتی تو ہماری طرف سے ضرور اڑان بھرتی ——— چلو یہی غنیمت ہے کہ دو مرغابیاں ہاتھ لگ گئیں۔

تب مجھے سلیم اللہ کی ماری ہوئی مرغابیوں کا دھیان آیا۔ میں نے دیکھا سلیم اللہ بندوق ہاتھ میں اوپر اٹھائے کمر کمر پانی میں چڑیوں کے پیچھے جا رہا ہے۔ مجھے سلیم اللہ بہت لمبا چوڑا دیوزاد سا لگا جو ہاتھ آگے پیچھے کرتا ہوا پانی کاٹتا، چلنے کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

دوسرے کنارے سے غلام علی بندوق ہاتھ میں اٹھائے اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑا۔

"میں آرہا ہوں صاحب ـــــ گھیرے رہنا ـــــ اُڑ جائیں گی ـــــ پانی کے اوپر تیرتی ہوئی اس کی آواز ہم تک آئی۔

"نہیں گھبراؤ مت ـــــ ان کے پر ٹوٹ گئے ہیں یہ اڑ نہیں سکتیں ـــــ" سلیم اللہ کی یہ آواز پانی کی شڑپ شڑپ سے زیادہ مہیب اور بھیانک تھی۔

میں نے غور سے دیکھا ـــــ مرغابیاں پانی کی سطح پر پھڑک رہی تھیں اور زور زور سے پیر چلا رہی تھیں۔ واقعی دونوں کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔ اچانک سلیم اللہ کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے مرغابیاں دبوچ لیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پورے ماحول میں ایک بے محابا سناٹا چھا گیا ہو ـــــ میں نے نواب کو دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا ـــــ اور ہم دونوں نے پاکستان، ہندوستان، چین اور منگولیا کے اوپر سائبیریا کے برفیلے میدانوں میں برف چوستے ہوئے ہزاروں معصوم پرندوں کو دیکھا۔ رنگ برنگے ہزاروں بھولے بھالے پنچھیوں کو دیکھا جو میدانوں میں بارہ سنگھوں کے اوپر قطار اندر قطار اڑ رہے ہیں۔ برف سے زیادہ شفاف جذبوں میں مگن ہیں، اور ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھر پھرا کر اپنی الفت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اچانک برف باری شروع ہوگئی ہے اور برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے ہیں۔ برف میں گھلی ہوئی ہوائیں شدت اختیار کر گئی ہیں۔ موسم ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اور تمام پرندے اپنے انڈے برف میں دبا کر صفیں بنا کر نشیب کے ٹھکانوں کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ اس گرمی کی تلاش میں جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو الوداع کہہ رہے ہیں جو انڈوں کے خول میں بند برف میں دبے ہوئے ہیں۔ پھر یہ پرندے گرم آب و ہوا کے ٹھکانوں تک آتے آتے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ہیں۔ راستے الگ ہو گئے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ وہی منزل جہاں زندہ رہنے کے قابل گرمی میسر آسکے اور اس سے بھی آگے کی وہ منزل جب پھر اپنے برفیلے میدانوں میں سورج کی گرمی سے برف پگھلے اور سردی کم ہو اور موسم خوشگوار ہو جائے تو واپس برف چوسنے اور بارہ سنگھوں کے جھنڈ پر پرواز کرنے کے لیے اپنے گھر واپس آسکیں ـــــ اور پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ ان معصوم پرندوں کے پر توڑ دیے گئے ہیں۔

سلیم اللہ ہم دونوں کے سامنے مرغابیاں دبوچے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا شاید نواب بھی دیکھ رہا ہو کہ ان بھولے بھالے پنچھیوں کی آنکھوں میں برفانی میدانوں سے زیادہ وسیع، تالابوں سے زیادہ گہرے اور ان کے پروں سے زیادہ خوشنما رنگوں کے سپنے سجے ہوئے ہیں ـــــ آنکھیں جو تھوڑی دیر بعد بند ہونے والی ہیں کہیں دور تک رہی تھیں۔ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی گول گول پتھرائی ہوئی آنکھوں میں بہت سے منظر دیکھے جو وہ آنکھیں اب کبھی نہیں دیکھ سکیں گی ـــــ میں نے ان کی آنکھوں میں جو منظر دیکھے اس میں نیکلی پتیوں والے بہت سے دیو قامت درخت تھے جو برف سے ڈھکے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے بہت سے پرندے تھے، جو معصوم جذبوں اور امنگوں میں سرشار تھے۔ نیلے، ہرے اور زرد پتوں والے بہت سے ساتھی تھے جن کی رفاقت انھیں میسر تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا ـــــ الوداع ـــــ اے معصومو الوداع ـــــ ان رفیقوں کو بھول جاؤ۔ ان سرمستیوں کو فراموش کردو۔ نیکلی پتیوں والے درختوں کی بدمست شوخیوں کو دل سے نکال دو۔ ان عزیزوں کو یاد کر کے اپنا دل مت دکھاؤ جنھیں انڈوں کے خول میں بند کر کے تم برف میں دبا آئے تھے۔ اب سب بھول جاؤ۔ تمھارے پنکھ ٹوٹ گئے ہیں نا۔ اب تم کبھی وہاں نہیں جاؤ گے ـــــ کبھی نہیں۔

غلام علی پہنچ چکا تھا۔ اس نے اور سلیم اللہ نے مل کر دونوں کو ذبح کیا۔ میں نے نواب کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف منھ پھیرے کھڑا تھا۔

"صاحب ـــــ اب دوپہر کو پھر آئیں گے۔ اس وقت تو چڑیا اُڑ گئی۔ دوپہر کو پھر پڑے گی۔ تب تک گھر چلیے۔ کچھ

ناشتہ پانی کر لیجیے۔

میں نے تالاب کی طرف ایک نظر دیکھا ـــــ پانی کفن کے کپڑے کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا ـــــ بالکل خاموش اور گمبھیر۔

سڑک پر سناٹا تھا اور جیپ میں خاموشی ـــــ ایسے ہی ہم غلام علی کے گھر تک پہنچے۔

"یہ میرا جھونپڑا ہے۔" غلام علی نے جیپ روک دی۔ ایک پرانا پکّی اینٹوں کا مکان تھا جس کا آگے کا چبوترہ کچّا تھا ـــــ دروازے کے پیچھے بڑے گھیر کی شلوار پہنے دو ٹانگیں آکر کھڑی ہوگئیں۔ غلام علی نے چبوترے پر پلنگ نکال کر ہم لوگوں کو بٹھایا۔ اور اندر جاکر واپس لوٹ آیا۔ میرے ذہن کو اتنا یارا ابھی نہیں تھا کہ اس سے منع کر سکوں کہ زیادہ تکلف سے کام نہ لے۔

غلام علی نے مجھ سے کہا۔ "صاحب! آپ ذرا اندر چلیں۔ جمیلہ سے مل لیں۔ وہ ضد کر رہی ہے۔"

میں نے نواب کو بتایا کہ اس کی بیوی ضلع ہردوئی کی ہے۔ اسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں بھی یو۔پی کا ہوں۔ شاید پاسپورٹ کے لیے کچھ کہے۔

نواب مجھے دیکھتا رہا ـــــ

دروازے سے داخل ہوکر میں اندر آنگن میں آگیا ـــــ غلام علی نے پکارا تو ایک اڑتیس چالیس سال کی عورت باہر آئی ـــــ نازک ناک نقشے کی دُبلی پتلی سی وہ عورت بڑے گھیر کی شلوار پہنے ہوئی تھی ـــــ میں نے سوچا غلام علی نے اسے بالکل پنجابی بنا دیا ہے ـــــ وہ بے جھجک میرے پاس آکر بھولے پن سے زمین پر بیٹھ گئی کہ میں بوکھلا گیا۔

"بھیّا ـــــ سلام۔" اس نے مجھے سلام کیا مجھے محسوس ہوا جیسے میری کسی بہن نے مجھے آواز دی ہو ـــــ

"تم ..... تمھیں جمیلہ ہو۔" میں نے سلام کا جواب دے کر اس سے پوچھا۔

"ہاں" وہ ایسے خوش ہوئی جیسے کسی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ڈرائیور کی بیوی یہ جان کر خوش ہوسکتی ہے کہ صاحب اس کا نام جانتے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اپنے کمینے پن کا احساس ہوا وہ تو ایسے مسرور تھی جیسے کوئی یہ جان کر کھل اُٹھے کہ اس کا کوئی ہم وطن ناآشنائی کی دیوار کے پرے رہ کر بھی اسے جانتا ہے۔

"میرا پرمٹ بنوا دو بھیّا ـــــ میں ضلع ہردوئی جاکر اپنا گھر دیکھوں گی۔ میں نے ان سے کہا تھا لیکن یہ ان کے بس کا نہیں ہے۔ کہتے ہیں میں صاحب سے بات کروں گا۔ اب تو میں خود تم سے بنوا کر رہوں گی اپنا پرمٹ۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنا کام تم سے خود کرا لوں گی ـــــ" وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کر گئی جیسے شہر کو جاتے ہوئے باپ سے بیٹیاں چھوٹی چھوٹی فرمائش کرتی ہیں۔

میں نے غلام علی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہی اسرار نظر آیا جو رات جیپ میں اس کی آواز میں تھا۔ صاحب! اس سے سختی سے منع کر دیجیے کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا ـــــ میرے چار پانچ سو اُٹھ جائیں گے اسے تو بلا فائدے کا شوق ہے بھارت جانے کا۔

غلام علی کی آنکھیں میری آواز سے بھیک مانگ رہی تھیں اور اس کی بیوی مجسّم کشکول بنی میرے پاس بیٹھی تھی۔

میں پھر بدحواس ہوگیا ـــــ کیا میں اس سے اتنا بڑا جھوٹ بول سکوں گا ـــــ کیا اتنا بڑا ظلم میری زبان کر سکے گی ـــــ کیا میرا ضمیر اس کی اجازت دے گا ـــــ

غلام علی کی آنکھوں نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

"سنو جمیلہ،" میں اس سے مخاطب ہوا —— "تمھارا پاسپورٹ نہیں بن پائے گا — تم گھر نہیں جا سکو گی بہنو۔" مجھے اپنے ذہن میں شیشے کی کرچیں سی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جمیلہ کے معصوم چہرے پر ہزاروں پرچھائیاں آ کر گزر گئیں۔

"کیوں ...... کیوں بھیا ...... کیوں نہیں بن سکتا۔ آپ بھی نہیں بنوا سکتے۔ آپ تو سب سے بڑے دروغہ ہیں۔" وہ تم سے بات کرتے کرتے ایک دم آپ پر آگئی جیسے میں اس ایک لمحے میں بہت اجنبی ہو گیا ہوں۔

"ہاں —— دیکھ لو، سب سے بڑا دروغہ خود اپنا پرمٹ نہیں بنوا سکتا تو تمھارے لیے کیسے بنوا پائے گا۔" میں نے یہ کہہ کر جبڑے اتنی سختی سے بھینچ لیے کہ جبڑے ٹیس کرنے لگے۔

"لیکن وزیر الدین بھائی کی گھر والی نے تو اپنا پرمٹ بنوا لیا تھا۔" وہ بولی جیسے مایوسی کے عالم میں یہی ایک حوالہ اس کا سہارا رہ گیا ہو۔

"ہاں۔" میں نے پھر اپنے ضمیر کی چھاتی پر بندوق داغی۔ "بنوا تو لیا تھا لیکن غیر قانونی تھا جبھی تو وزیر الدین نے جلا دیا۔"

اس سیدھی سادی عورت نے اپنے کمین اور ذلیل بھائی کی گود میں سر رکھ کر اپنے وطن کے حساب میں شاید آخری آنسو بہائے۔

غلام علی یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا —— وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک دیا —— اچھا ہے رو دھو کر صبر کرلے۔ روز روز کے رونے سے تو نجات ملے گی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا۔ اس کے بالوں کو برابر کیا۔ گم سم کھڑے اس کے گول مٹول بچے کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل آیا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد میں نے نواب کو یہ سب باتیں بتا دیں۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا —— اور سب کچھ سن کر ایسے مسکرایا کہ انسانوں پر اور انسانوں کے افعال پر اس انداز سے نہیں مسکرایا جاتا۔ ایسا تبسم تو صرف ناہموار معاشرے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ایسی تلخی کی تاب انسان کہاں سے لا سکتا ہے۔ میں بھی نہیں برداشت کر سکا۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ باقی لوگ ناشتے میں مصروف رہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نواب کی تلخ مسکراہٹ پیچھے سے تیز چھری کی طرح میری پیٹھ میں داخل ہو رہی ہے۔

میں نے سوچا —— تم خود کو کون سا بڑا سورما سمجھتے ہو۔ تم اگر میری جگہ ہوتے تو کیا اپنے ماتحت کی پیسہ پیسہ جوڑی ہوئی کمائی کو اس کی بیوی کے بے ہنگم شوق میں تباہ کرنے کے روادار ہوتے ——

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ہر قسم کے جذبے سے اس کا چہرہ عاری تھا —— شاید وہ خود بھی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔

تالاب پر جانے کے لیے جیپیں دوبارہ چل پڑیں —— گاؤں کے بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے آگئے تھے —— غلام علی نے بہت مدبرانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر گاؤں والوں کو خدا حافظ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو —— مجھے معمولی آدمی مت سمجھو —— میرے گھر پر سپرنٹنڈنٹ پولیس ناشتہ کرتے ہیں —— میں نے اس کے انداز پر مسکرانے کی کوشش کی —— میں نے مڑ کر دیکھا —— غلام علی کے گھر کی چھت پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ضلع ہردوئی کی ایک لڑکی جو یہاں آکر بڑے گھیرے کی شلوار پہننے لگی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور دوپٹہ ہوا میں زور زور سے ہل رہا تھا۔

میں نے نواب کو دیکھا اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں نے اس پنکھ ٹوٹی مرغابی کو دیکھا۔

پرندے تیرے پر ٹوٹ گئے تو اب واپس برف کے میدانوں میں نہیں جا سکتا۔

خدا حافظ اے معصوم عورت ـــــ تو بھی اس سرزمین کو نہیں دیکھ سکے گی، جہاں تیرا شعور بیدار ہوا تھا ـــــ جہاں تو نے لوک گیت سنے تھے۔ جہاں تو نے ساون کے جھولے جھولے تھے، جہاں تو نے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہنڈ کلیاں پکائی تھیں۔ جہاں مرغی کے دربوں میں چھپ چھپ کر تو نے آنکھ مچولیاں کھیلی تھیں۔ جہاں تو نے شوخ امنگوں کے رنگ سے رنگے ہوئے ست رنگے دوپٹے اوڑھے تھے۔ جہاں تو نے اپنے ننھے سے دل میں نرم نرم جذبوں کو مٹھی میں پکڑ کر بند کر لیا تھا۔ سب بھول جا میری پیاری بہن ـــــ وہاں کے نام پر بہائے گئے تیرے آخری آنسو میرے شکاری کوٹ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ بس یہ آخری آنسو ہیں۔ اب کوئی آنسو نہ بہے کہ کچھ اور لوگ بھی بے حد اداس ہیں۔ کہیں ان کی اداسی بھی بے قیمت پانی کی طرح آنکھوں سے نہ بہہ جائے تالاب کی سطح پر پھڑکنے سے فائدہ کیا ـــــ آڑ میں چھپے شکاری نے تیرے پر کب کے توڑ دیے ـــــ اب کیا دھرا ہے۔

میں نے گردن موڑ کر سیٹ سے ٹکالی ـــــ

جیپ کچے دگڑے پر دھول اڑاتی بھاگتی رہی۔

"تم نے شادی کرلی ـــــ؟ میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا" نواب کی آواز جیپ کے انجن سے زیادہ پُرشور تھی۔ حالانکہ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔

ایک انجانے خوف کے باعث میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ صرف اس کا ہاتھ دبا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بچے کتنے ہیں؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"تین" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اور اب نواب تم جو پوچھو گے وہ مجھے معلوم ہے ـــــ پوچھ لو کوئی بھڑاس نہ رہ جائے تمہارے دل میں ـــــ آج ساری حسرتیں پوری کرلو ـــــ

"ان کا کوئی خط آیا کبھی؟" نواب نے پوچھا۔

شاباش میرے دوست ـــــ زندہ رہو ـــــ میں نے کہا تھا نا کہ ابھی میرے پورے زخم کہاں ہرے ہوئے ہیں سو تم نے وہ آخری زخم بھی کرید دیا ـــــ "کس کا خط" میں نے آنکھیں کھول کر نواب کو یوں دیکھا جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

نواب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے سپاہی چور کو دیکھتا ہے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا ـــــ کیوں کہ میں چور تھا اس لیے میں نے اس سے نظریں نہیں چار کیں ـــــ اور آنکھیں بند کرلیں۔ دوپہر کے سورج کی چمک آنکھوں پر براہ راست پڑ رہی تھی اور آنکھوں کے پپوٹوں کو وہ حرارت بہت خوش کن محسوس ہو رہی تھی ـــــ باہر میں نے ابھی دیکھا تھا کہ کہرا بالکل چھٹ گیا تھا اور کھیت بہت اُجلے اُجلے نظر آرہے تھے ـــــ تالاب دور تھا۔ اور ماضی کے آئینہ خانے کا سب سے رنگین عکس میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ وہ عکس جس کے ایک جلوے کے لیے میری آنکھیں خود اپنی سوغات پیش کرسکتی ہیں وہ عکس جس کی تعبیر میں صرف لفاظی کام نہیں دیتی بلکہ اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے خونِ جگر کی آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ میری محبت کا عکس میرے سامنے چمک رہا تھا۔

پیدا ہونے سے لے کر نبض رکنے تک یہ جذبہ کتنے روپ بدلتا ہے۔ لیکن اس کا ہر رُخ خوش گوار ہوتا ہے۔ ماں کے دودھ سے محبت ہو یا باپ کی شفیق گود سے، بھائی کی محبت ہو یا بہن کی چاہت، دوست سے محبت ہو یا محبوبہ سے ـــــ اس کا ہر رنگ دل کش ہے۔ اور میری زندگی کی البم کی حسین اور سب سے معصوم تصویر میرے سامنے آگئی۔

گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں ہوائیں اپنی گود میں انگارے بھرے ہوئے اونچے اونچے درختوں سے ٹپک رہی

ہیں۔ ایک لق و دق مکان کے کچے، سیلے اور ٹھنڈے دالان میں ایک برہمپتر جیسی بپھری اور ہمالیہ جیسی خود سر جوان لڑکی کھڑی ہے ـــــ اور وہیں ایک ستون کے سہارے ایک بے باک لڑکا کھڑا ہے۔ اس نے ابھی ابھی لڑکپن سے دامن چھڑا کر جوانی کے کارزار میں قدم رکھا ہے اور وہ اتنا ہی گستاخ ہے جتنا اس عمر میں ہونا چاہیے۔" تو بھیا معلوم یہ ہوا کہ آپ مجھ سے محبت فرماتے ہیں؟" اس لڑکی نے مذاق اڑانے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

وہ لڑکا خاموش رہا ـــــ

"کب سے عشق فرما رہے ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہوں۔ تمھیں معلوم ہے میں تم سے بڑی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"تو یہ اپنے ہاتھ میں تھوڑے ہی ہے ـــــ" لڑکے نے منہ کھولا۔

اس معصوم توجیہہ پر وہ مسکرائی تھی۔

باہر لو کے جھونکے انھیں دیکھ کر چپ چاپ ٹھہر گئے۔

اور معلوم نہیں کیسے اس لڑکی نے جسے مغرور، بددماغ اور خود پرست جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، جسے یہ فخر حاصل تھا، اگر یہ چیز فخر کے قابل ہے تو، کہ اس کی جوانی کے دامن پر ایک بھی داغ نہیں تھا، آگے بڑھی اور اس لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی برہم پتر جیسی جوانی کو باہوں میں بھر کر اس کے ہمالیہ جیسے سر کو اپنی محبت کے زور سے نیچا کر دے۔ وہ لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اپنے بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی کے اس طویل عرصے میں پہلی بار کسی جوان جسم کے گداز کے لمس کو محسوس کیا اور ان پاک ہونٹوں کو چوم لیا جس کی تقدیس خود اس کے دل میں تھی۔

ایک سال تک دونوں انھیں معصوم جذبوں میں کھیلتے رہے

پھر سینتالیس آیا ـــــ منہ پھاڑے، دانت نکالے، تقسیم کا حکم نامہ ہاتھ میں لیے ـــــ کوہ ندا سے یا اخی یا اخی کی آوازیں آئیں اور جس دن وہ لڑکا سب کچھ چھوڑ کر ایک انجان دیس کو جا رہا تھا اس دن وہ اس لڑکی سے ملا ـــــ دل بھی قابو میں تھا، جذبات بھی قابو میں تھے، صرف قدم بے قابو تھے جو بلا سوچے سمجھے نامعلوم بے نشان منزل کی سمت اٹھنے والے تھے۔

"تو آپ چل دیے۔" اس نے پوچھا تھا۔

اس لڑکے کے پاس جواب دینے کو الفاظ تو بہت تھے پر ہمت نہیں تھی۔

"وہاں جا کر مجنوں نہ بنا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں والدین کہیں شادی کر لینا سمجھے۔"

وہ لڑکا لڑکیوں کی طرح رونے ہی والا تھا کہ اس لڑکی نے مردوں کی طرح اسے دلاسا دیا۔ کھوکھلے دلاسے ـــــ کہ تم دو چار سال بعد آنا اور مجھے بیاہ کر لے جانا۔

دونوں جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو اطمینان دلاتے رہے کہ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔

تو پھر یوں ہوا کہ برف باری ہونے لگی۔ برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے۔ ہوائیں شدت اختیار کر گئیں۔ موسم ناقابل برداشت ہو گیا ـــــ اور پرندوں کا وہ جھنڈ زندہ رہنے کے قابل گرمی حاصل کرنے کے لیے دوسری سرحدوں میں چلا گیا ـــــ انڈوں کے خول میں بند اپنی عزیز چیزوں کو برف میں دبا کر، دوبارہ واپس آنے کی امید میں صفیں کی صفیں پرے کے پرے دوسرے دوسری بستیوں میں پرواز کر گئے۔

اس لڑکی کا اسے کوئی خط نہیں ملا کیوں کہ جس گھرانے کی وہ لڑکی تھی وہاں کا دستور نہیں تھا کہ غیر لڑکوں کو خط لکھے جائیں وہ بھی دوسرے ملک میں

پاکستان آنے کے بعد وہ لڑکا اس دریا کے کنارے بیٹھ کر ریت پر ایک عرصے تک محل بناتا رہا جس کا پانی دونوں ملکوں میں بہتا ہے۔ محل جب بن کر تیار ہوتا تو دریا کی تند اور ظالم لہریں اس کے محل کو تباہ کر دیتیں کیونکہ دریا کا پانی دوسرے ملکوں سے بہہ کر آتا تھا ـــــ اگر دوسرے ملک میں اسی دریا کے کنارے پر کوئی اور لڑکا محل بناتا اور لہریں اسے برباد کر دیتیں تو وہ لڑکا بھی یہی سوچتا کہ پانی دوسرے ملک سے بہہ کر آرہا ہے۔

محبت کے محل بنتے بگڑتے رہے لیکن دریا کی روانی نے تو بڑے بڑوں کو پسپا کیا ہے۔ اس لڑکے کی کیا حقیقت تھی اور پھر ریت تو ریت ہی ہوتی ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟" نواب کی آواز نے مجھے واپس بلالیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

نواب نے مسکرا کر میرے جھوٹ کو تھپکی دی۔

میں پھر سوچنے لگا۔

مجھے ہندوستان سے آنے کے بیس سال بعد معلوم ہو سکا تھا کہ بیگم کی شادی کسی شرابی اور دق زدہ آدمی سے کر دی گئی تھی کہ ہمارے ہاں شریف اور ستم رسیدہ خاندانوں میں لڑکیوں کی شادیاں ایسی ہی دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔

"سنو" نواب نے مجھے پھر پکارا۔

"ہوں" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

بیگم بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کے شوہر کو ٹی بی کا عارضہ تھا نا اور اس پر شراب۔ تمھیں معلوم ہوا تھا یہ؟ نواب نے میری سماعت میں زہر بھر دیا۔ میرے کانوں کے قریب ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے تیر سائیں سائیں کر رہے تھے جن کی نوکیں بہت تیز اور چمکتی ہوئی تھیں۔

آنکھیں مکمل کھول کر میں نے باہر دیکھا۔ جیپ تالاب کے قریب پہنچنے ہی والی تھی۔ باہر گیہوں کے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے پودوں پر دھوپ برس رہی تھی۔ دور کے درختوں کی چوٹیوں پر ہوائیں بلاؤں کی طرح چلا چلا کر ناچ رہی تھیں۔ سرد کائنات بہت اداس تھی۔

"اے خدا! آج ماحول پر اتنا دکھ کیوں چھایا ہوا ہے؟" میں اس سے سوال کر رہا تھا جو عام انسانوں کو کچھ نہیں بتاتا جس سے کچھ پوچھنے کے لیے پیغمبر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

"نواب ـــــ بیگم بیوہ ہو گئیں؟" میں نے نواب سے ایسے پوچھا جیسے اس سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بیگم کیوں بیوہ ہوئیں؟

"تمھیں اب معلوم ہوا ہے۔ انھیں تو بیوہ ہوئے بھی برسوں گزر گئے۔ تو تمھیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ میری غزالہ بھی مر گئی ـــــ"

اف .... خوب چرکے لگالو آج ـــــ یہ خبر ہی کون سی کم تھی کہ بیگم بیوہ ہو گئیں کہ تم نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہرنی کی طرح معصوم اور چنچل تمھاری غزالہ بھی مر گئی ـــــ نواب میں تم سے ہرگز یہ نہیں پوچھوں گا کہ غزالہ کیسے ختم ہوئی اور بیگم بیوہ ہو کر کیسے جی رہی ہیں ـــــ خدا جانے تمھارے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہوں۔

جیپیں رک گئیں۔ سب سے آخر میں ہم دونوں اترے۔
غلام علی نے قریب آکر کہا
"صاحب اس بار چڑیا اس کنارے پر ہے اور کچھ بیچ میں پڑی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ کیسے داؤ لگے؟"
سورج کی تیز کرنیں تالاب پر براہِ راست پڑ رہی تھیں اور پرندوں کے خوشنما رنگ چمک اٹھے تھے۔
"میں ادھر ایکھ کے کنارے پہلی والی جگہ پر بیٹھوں گا۔ تم نواب ذرا ہٹ کر ان جھاڑیوں کی آڑ پکڑ لو۔ اور سلیم اللہ صاحب آپ اور غلام علی دوسرے کنارے پر جا کر بیٹھ کر فائر کریں ـــــ چڑیا اٹھے گی تو لامحالہ ہمارے سروں پر سے جائے گی تبھی داب لیں گے ـــــ" یہ ہدایتیں دے کر میں اپنی جگہ پر آگیا۔

غلام علی اور سلیم اللہ اپنے کنارے کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے ـــــ میں نے کونے میں ایک جگہ بنالی۔ نواب بندوق میں چمکتے ہوئے نئے کارتوس لگا کر جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

چڑیا بالکل غافل تھی کیوں کہ اس کنارے سے بہت دور تھی۔ میں نے بندوق تیار کرلی۔

یکایک میرے سر پر سرسراہٹ ہوئی اور سیخ پر کا ایک پرا آگے جا کر پانی میں پر توڑ کر گر پڑا ـــــ تھوڑی دیر تک کچھ شور رہا ـــــ پانی کی لہریں بنیں اور بگڑیں اور پھر وہی خاموشی اور تالاب کا سکوت ـــــ

ابھی ابھی جب یہ سیخ پر آکر پانی میں گرے تو میں نے محسوس کیا ـــــ صرف محسوس کیا کہ ان پرندوں کی آنکھوں میں بھی تو وہی سپنے ہیں جو صبح ان پرندوں کی آنکھوں میں تھے جن کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے ـــــ وہ ... دیس واپس جانے کے سپنے ـــــ وہی شفاف برف چومنے کے سپنے ـــــ کتنی دیر اور ہیں یہ خواب ان کی آنکھوں میں۔

تالاب کے ادھر کھیتوں میں کہیں کہیں ایکھ کے پودے غیر معمولی طور سے حرکت کر رہے تھے ـــــ غلام علی اور سلیم اللہ فائر کرنے کے لیے کھیتوں میں چھپے ہوئے آہستہ آہستہ پرندوں کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کبھی محسوس ہوتا پانی ساکت ہوگیا ہے۔ کبھی لگتا پرندے بے حرکت ہوگئے ہیں ـــــ دیر تک پانی پر نظریں جمائے رہنے سے سکوت اور حرکت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ سب ایک جیسا ہوجاتا ہے۔ ہاں ہر فرق مٹ جاتا ہے اور آج اس تالاب پر بیٹھے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ پانی ہی نہیں، کائنات کی ہر چیز ساکت ہوگئی ہے ـــــ بالکل بے حرکت ہوگئی ہے ـــــ اگر حرکت ہے تو صرف ان سپنوں میں جو ان پرندوں کی گول گول بھولی بھالی آنکھوں میں چمک رہے ہیں۔ اگر زندگی ہے تو صرف اس امید میں کہ ہم واپس گھر جائیں گے۔ اگر گرمی ہے تو صرف اس جذبے میں کہ ہم دوبارہ برف چومیں گے۔ اگر جوش ہے تو صرف اس امنگ میں کہ ہم اپنی چھوڑی ہوئی عزیز چیزیں واپس پائیں گے جو انڈوں کے خول میں بند ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

نواب تم اس وقت دور بیٹھے ہو۔ تھوڑی دیر بعد میں تمھیں بتاؤں گا۔ ہاں مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ تمھیں بتاؤں ہم لوگ پنکھ ٹوٹے پرندے ہیں۔ وزیر الدین کی بیوی اور غلام علی کی بیوی کے بھی پنکھ ٹوٹ گئے ہیں اور ہمارے تمھارے پنکھ بھی توڑ دیے گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں بچا کہ وہاں جا کر اپنے ہونٹوں سے شفاف برف چوم سکے۔ نواب احمد۔ ہم ان پرندوں سے بھی زیادہ لاچار اور بے بس ہیں کہ کم از کم وہ اپنے پنکھ ٹوٹ جانے کے بعد ذبح تو کر دیے جاتے ہیں۔ اور ہم لوگ ـــــ ہم لوگ تو لمحہ لمحہ ذبح ہو رہے ہیں۔ ہماری امنگیں لمحہ لمحہ قتل کی جارہی ہیں۔ ہمیں سسکا سسکا کر تڑپایا جا رہا ہے۔ ہمارا شکار ایک دفعہ میں نہیں ہوتا بلکہ دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ ہم اس تالاب میں صرف پھڑک سکتے ہیں، جان نہیں دے سکتے۔ تھوڑی دیر بعد تمھیں سب کچھ بتاؤں گا۔

اچانک دوسرے کنارے پر فائر ہوا اور میں دہل اُٹھا۔ محسوس ہوا کہ دھوپ اور تالاب کا پانی بالکل سُرخ ہو گئے ہیں۔ پوری فضا بالکل گہری سُرخ ہو گئی ہے۔ جانے کتنے تالاب میں پھڑک کے جانے کتنوں کے پنکھ ٹوٹے۔

چڑیانے اڑان بھری۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر پرواز کرنے لگی۔

نیچی اڑان کرتا ہوا ایک پرا میرے سر پر سے گزرا۔ میں نے بندوق اُٹھائی تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر خون لگا ہوا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنا چمکتا ہوا خوش رنگ لہو کسی جان دار کا نہیں ہو سکتا ـــــ یہ تھکی ہوئی جاگتی آنکھوں کے خوابوں کا خون تھا۔ برف کے میدانوں میں واپس جانے کی امنگوں کا خون تھا۔ ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھر پھرا کر الفت اور رفاقت کا اظہار کرنے کے جذبوں کا خون تھا۔

خدا جانے کیسے بندوق نیچے جھک گئی۔

پرندے نواب کے سر پر سائیں سائیں کر رہے تھے۔

غلام علی چلا رہا تھا ـــــ ہم دونوں سے کہہ رہا تھا ـــــ "حضور داغو ـــــ حضور داغو ـــــ اوپر آ گئی ہیں اوپر ـــــ

میں نے اپنے ہاتھوں کو جن پر خون چمک رہا تھا، قریب لا کر پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ میں کس سے پوچھوں کہ بیگم اب کیسے جی رہی ہیں اور جی بھی رہی ہیں یا کسی کچی قبر میں اپنے ارمانوں کی قبر میں لیٹی سو رہی ہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ غزالہ کیوں مر گئی ـــــ وہ بزرگ اور ماسٹر اب وہاں ہیں یا ان کے شفیق چہرے وقت کی دھول میں اَٹ کر کہیں کھو گئے ـــــ وہ گھر اب گھر ہے یا کھنڈر ہو گیا۔ جہاں ہم نے تاج محل سے زیادہ حسین محل بنائے تھے ـــــ وہاں کے نوعمر لڑکے اب بھی مئی جون میں اپنے کومل بدن دھوپ میں جھلساتے ہیں یا نہیں۔

لیکن ہاتھوں پر اب خون کہاں تھا۔ وہ تو بس اسی وقت جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا جب پرندوں پر میں نے بندوق اٹھائی تھی۔

میں نے پرندوں کی ایک صف کو پورب کی طرف دھواں ہوتے دیکھا۔

میں نے ان سے چپکے سے کہا ـــــ

"دیکھو پرسلامت تو نے کر جا رہے ہو لیکن اتنا کرنا کہ ہندوستان پر سے گزرو تو ان لوگوں کا ماتم کر لینا جو یہاں سے جا کر بے وطن ہو گئے تھے ـــــ دیکھو، جرمنی کی طرف بھی ایسے ہی تھے ہیں۔ وہاں سے اگر گزرو تو تھوڑے اداس ہو جانا ـــــ ہمیں تو تم نے دیکھ ہی لیا ـــــ لیکن ہم اکیلے تھوڑے ہی ہیں ـــــ وزیرالدین کی بیوی ہے، غلام علی کی بیوی ہے، نواب ہے۔ ہر جگہ تم کو ایسے کتنے ہی شکستہ پر ملیں گے جہاں کسی کو دیکھنا تو سمجھ لینا کہ یہ بھی برف چومنے کے سپنے دیکھ رہا ہے، بس وہیں تم بھی ذرا دکھی ہو لینا ـــــ جاؤ اب پہاڑوں کے پیچھے اپنے وطن واپس چلے جاؤ ـــــ وسیع میدان، نکیلی پتیوں والے دیو قامت خوبصورت درخت اور برف میں دبی ہوئی انڈوں کے خول میں بند تمھاری عزیز چیزیں تمھارا انتظار کر رہی ہیں ـــــ الوداع ...... خدا تمھاری پرواز کا حافظ ہے۔

پرندوں کا آخری پرا بھی آسمان کی وسعتوں میں دھوئیں کی لکیر بن چکا تھا ـــــ تالاب چاندی جیسا شفاف ہو چکا تھا ـــــ غلام علی اور سلیم اللہ ہاتھ ہلا ہلا کر کسی بات پر بحث کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے ـــــ ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔

میں ایکھ سے باہر آ گیا ـــــ میں نے جوتوں کی کیچڑ جھٹکی۔ سامنے سے نواب آ رہا تھا۔

"تم نے فائر کیوں نہیں کیا؟" اس نے دور سے ہی پوچھا۔

تمام ماحول بے حد پُر اسرار ہوگیا —— درختوں اور کھیتوں کی سرسراہٹ بھی بالکل خاموش ہوگئی —— کنارے پر بیٹھا سارس کا جوڑا بھی چپ ہوگیا —— پانی کی شررشرر بھی بالکل معدوم ہوگئی۔

"وہ ..... نواب ..... پرانے کارتوس تھے۔ دغا دے گئے، سب مِس ہوگئے ——" میں ایک ساتھ اتنے جھوٹ بول گیا۔

"لیکن ستو" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں —— کیا ہے" اس نے چور نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"تم نے فائر کیوں نہیں کیا —— ایک آدھ چڑیا تو گرا ہی لیتے کم از کم۔ بالکل تمھارے سر پر اُڑ رہی تھیں ——"

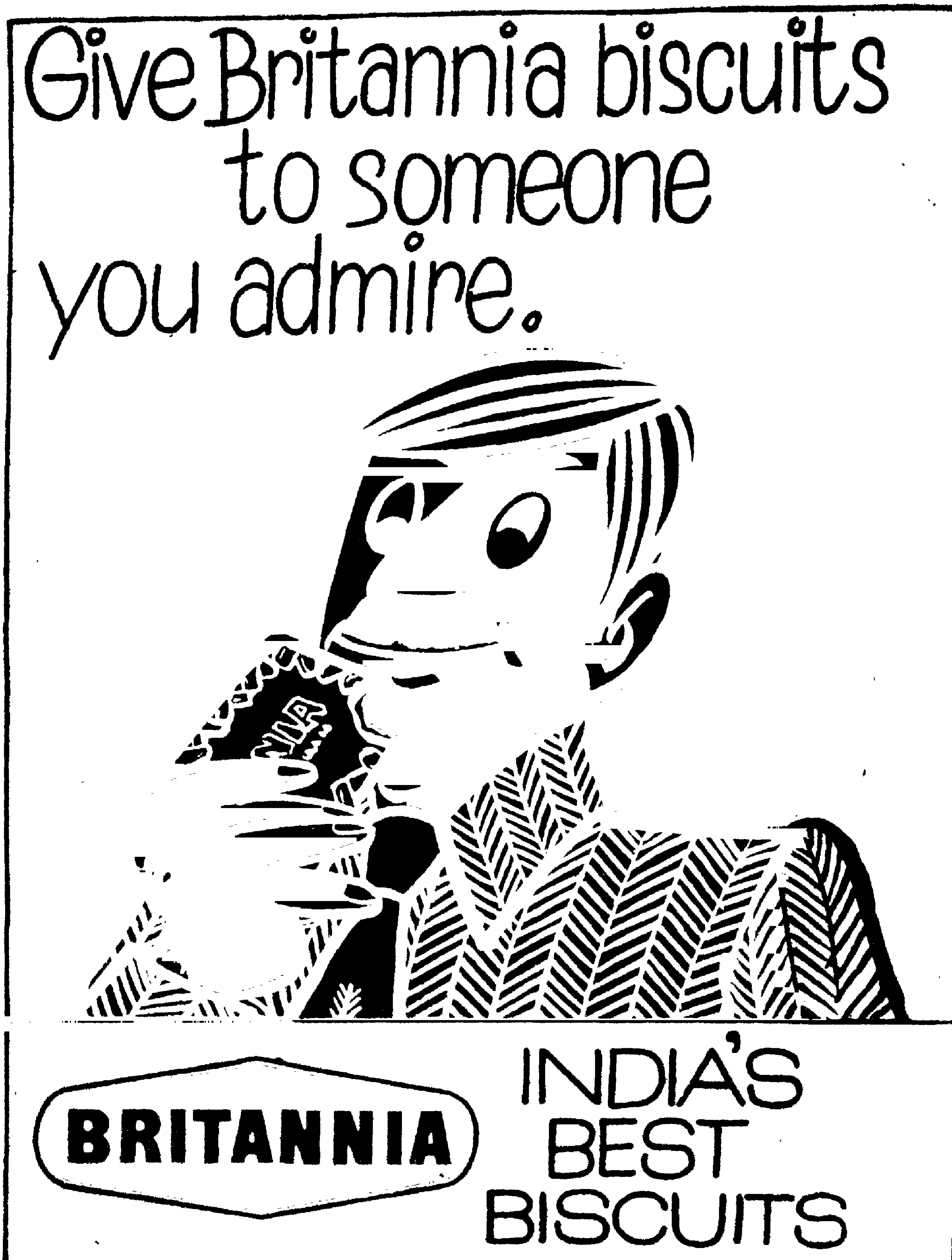
وہ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا —— اتنا خاموش کہ مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگنے لگا۔ پھر وہ میرے بہت قریب آکر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا ——

"میرے ساتھ بھی وہی سب کچھ ہوا تھا۔ جو تمھارے ساتھ پیش آیا"

ہم دونوں کی بندوقوں نے ایک ساتھ چار فائر کیے —— کنارے بیٹھا سارس کا جوڑا اُڑ گیا —— غلام علی اور سلیم اللہ چونک پڑے —— غلام علی بلا سوچے سمجھے روتا چلاتا ہماری طرف بھاگا ——

حیران کھڑے نواب کے ڈرائیور نے ہمارے ہاتھوں سے بندوقیں سنبھال لیں۔

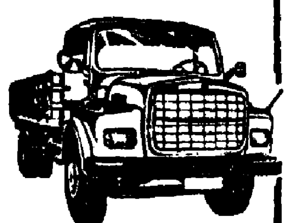
میں اور نواب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، دیر تک ایک دوسرے کو سمجھتے رہے۔ اور پھر معلوم نہیں کیسے ہم دونوں نے ایک ہی فیصلہ کیا —— ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خاموش ہوگئے۔ اور اتنی مشکل سے اپنے پہ ضبط کیا کہ بس مزہ آگیا —— ہم پانچوں خاموش تھے —— ہوائیں بہت تیز ہوگئی تھیں۔ اور تالاب کا پانی کناروں سے چھلک آیا تھا۔

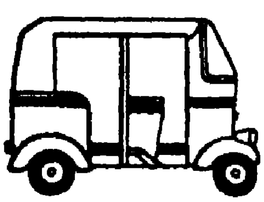

Give Britannia biscuits to someone you admire.
BRITANNIA
INDIA'S BEST BISCUITS

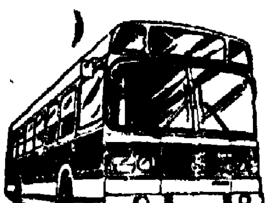

Teddy Bear is
dear but...
Ravalgaon Toffee
is more dear to them.
Very tasty and sweet.
It puts 'em up in spirits—
full of energy and vigour.
THE RAVALGAON SUGAR FARM LTD.
Construction House,
Walchand Hirachand Marg,
Bombay 400038.

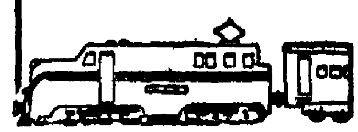
RAMON-DEMM India's chosen one OE and replacement gears

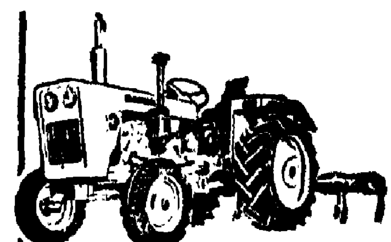
















Leading manufacturers of automotive vehicles, tractors, 3-wheelers and hydraulic pumps use the gears they know they can rely upon-gears made by Ramon & Demm. Because Ramon & Demm have what it takes to make the finest gears going...

Super Material

Being well aware of the load, speed and nature of duty our gears are required to perform, we're extremely selective about the steel we use and its heat treatment.

Precise Design

After having a long association with world- renowned manufacturers, we have gained the engineering expertise required to produce the ideal gear.

Micron Accuracy

No effort or expense is spared in making the most accurate jigs and fixtures, either. After all, no compromise on quality and accuracy, is what makes them India's favourite OE and replacement gears.

Backed by a nation-wide network of expert after-sales-service, which provide you with all the technical advice and expertise you need.

We make them:
- Straight
- Helical
- Straight Bevel
- Spiral Bevel
- Hypoid Bevel
- Worm & Worm Wheel
- Curvic Couplings

They use them:
- Trucks
- Buses
- Tractors
- Cars
- Railways
- Jeeps
- Hydraulic Pumps
- 3-Wheelers

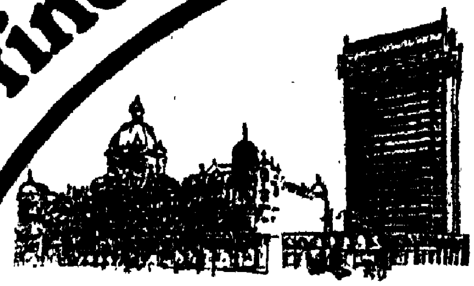
Ramon & Demm Ltd.

Ramon House, 169, Backbay Reclamation
Churchgate, Bombay 400 020 (India)
Tel: 256246 Grams:Ramongroup Telex: 011-2661 Ramn in
Works: S.V. Road, Thane 400 607 Maharashtra
Tel:592483/4 Grams: Ramongroup Telex.011-2382 Ramn in

Ramon-Demm Gears-engine to wheel, the No. 1 drive

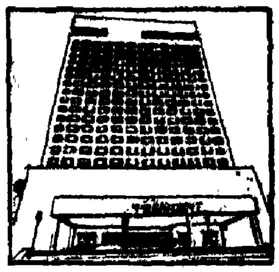
JAISONS RD 279

The finest hotel chain in India...



The Taj Mahal and The Taj Inter-Continental, Bombay.
Two great hotels combining old world panache with 20th century splendour. The two hotels are, quite simply, like few others in the world.

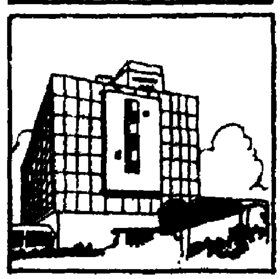
Hotel President, Bombay
A recent addition. Hotel President is situated right in the city's business, shopping and entertainment area, offering excellent service. Ideal for guests on a budget.





The Fort Aguada Beach Resort, Goa
Where a gentle sea beats ...an old Portuguese ruin presides over a beautiful poem in brick and wood ...The Fort Aguada Beach Resort.

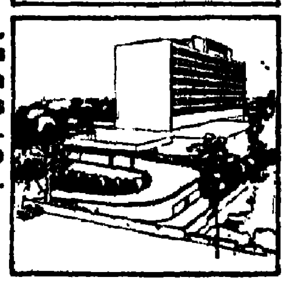
Pandyan Hotel, Madurai
In the heart of Madurai, where transcendent architecture and sculpture are living monuments from the past.

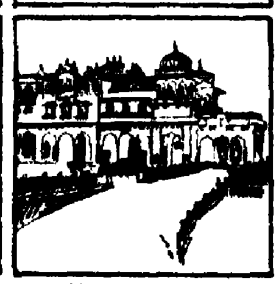




The Fisherman's Cove, Covelong Beach, Madras
Located on a secluded casuarina-fringed beach .. like a golden secret. Just a 32 km drive from Madras.

Taj Coromandel Hotel, Madras
The finest hotel in Madras, mere minutes from the city centre. A serene reflection of the age-old Taj tradition.

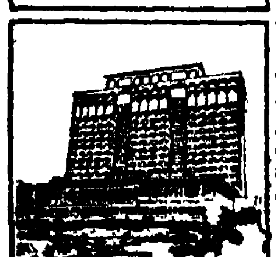




The Rambagh Palace, Jaipur
Created at the height of the graciousness and splendour of Jaipur. Now offered to you as a hotel. A delicate fusion of the medieval and the contemporary.

The Lake Palace, Udaipur
Once upon a time, the Ranas of Mewar held court here. Now it is a unique hotel. Complete with all manner of 20th century fittings and amenities.



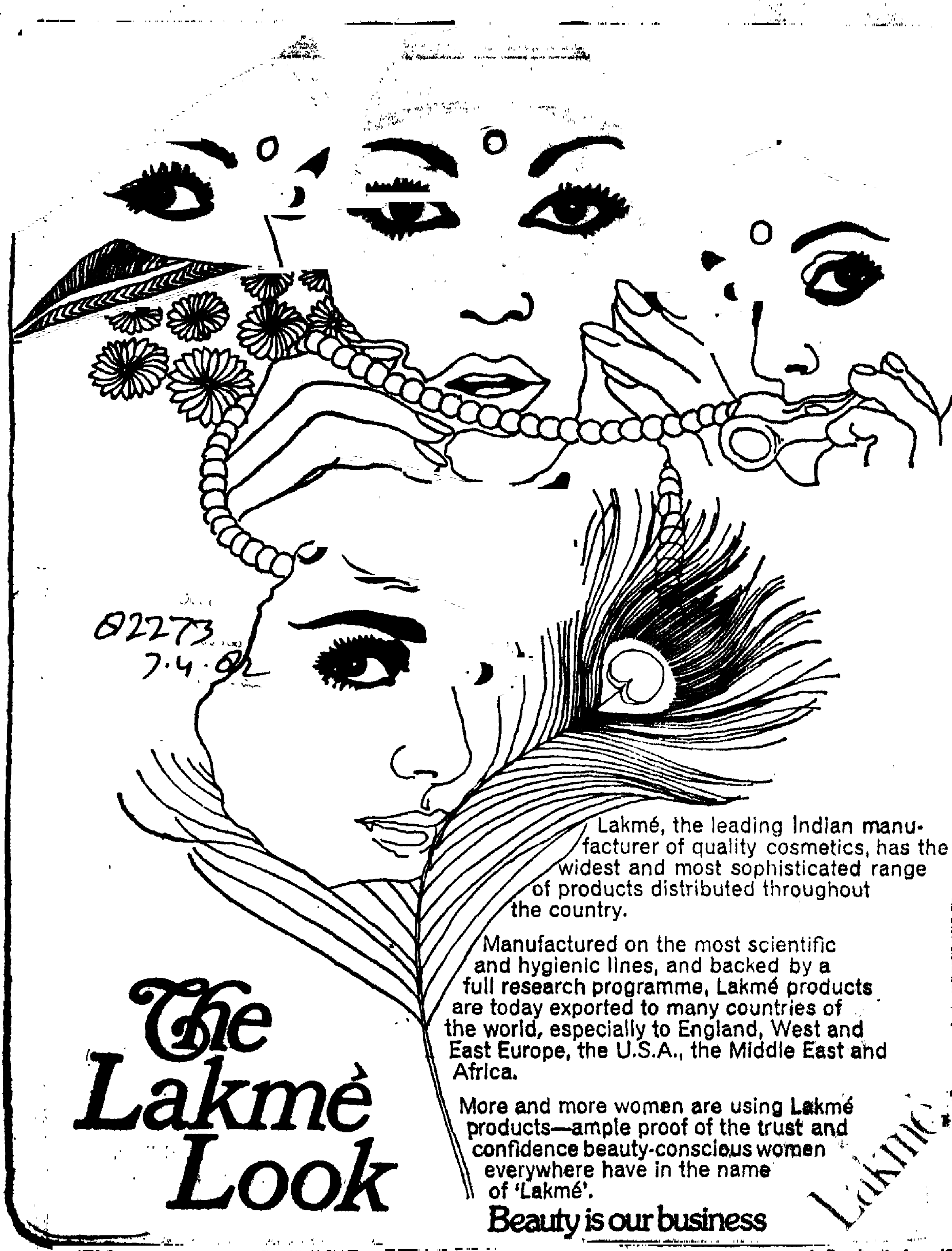


The Taj Mahal Hotel, New Delhi
The latest addition to the Taj chain. A splendid abode of grace, created to accentuate the magnificence of India's capital.

For reservations contact: Hotel Reservation Service,

Bombay — 292329/297755 Delhi — 322333/322256
Calcutta — 443795/443721 Madras — 810441.

THE TAJ GROUP OF HOTELS, INDIA



daCunha/Lakme/2

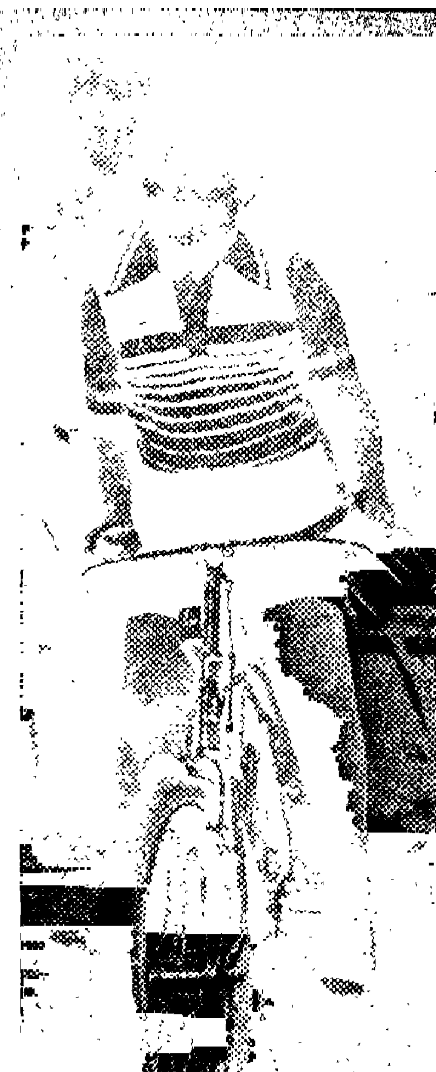
The growing years are

Calcium-Sandoz

years.







Even before a child is born, his teeth and bones begin to form. From infancy through the growing years, calcium is vital.

If your child does not get sufficient calcium at any stage of his growth, it could be too late. Start him on Calcium-Sandoz. Today.

Four tablets a day of Calcium-Sandoz provide essential calcium through the growing years and build strong teeth and healthy bones. Fortified with vitamins C, D and B12, Calcium-Sandoz tablets have a delicious vanilla flavour which children love.

Calcium-Sandoz — the world's best calcium developed by Sandoz in Switzerland.



Calcium-Sandoz®

For strong teeth and healthy bones



daCunha/CS/26/Rev.

"A customer is the most important visitor on our premises. He is not dependent on us. We are dependent on him. He is not an interruption on our work. He is the purpose of it. He is not an outsider on our business. He is a part of it. We are not doing him a favour by serving him. He is doing us a favour by giving us an opportunity to do so."

Gandhiji

